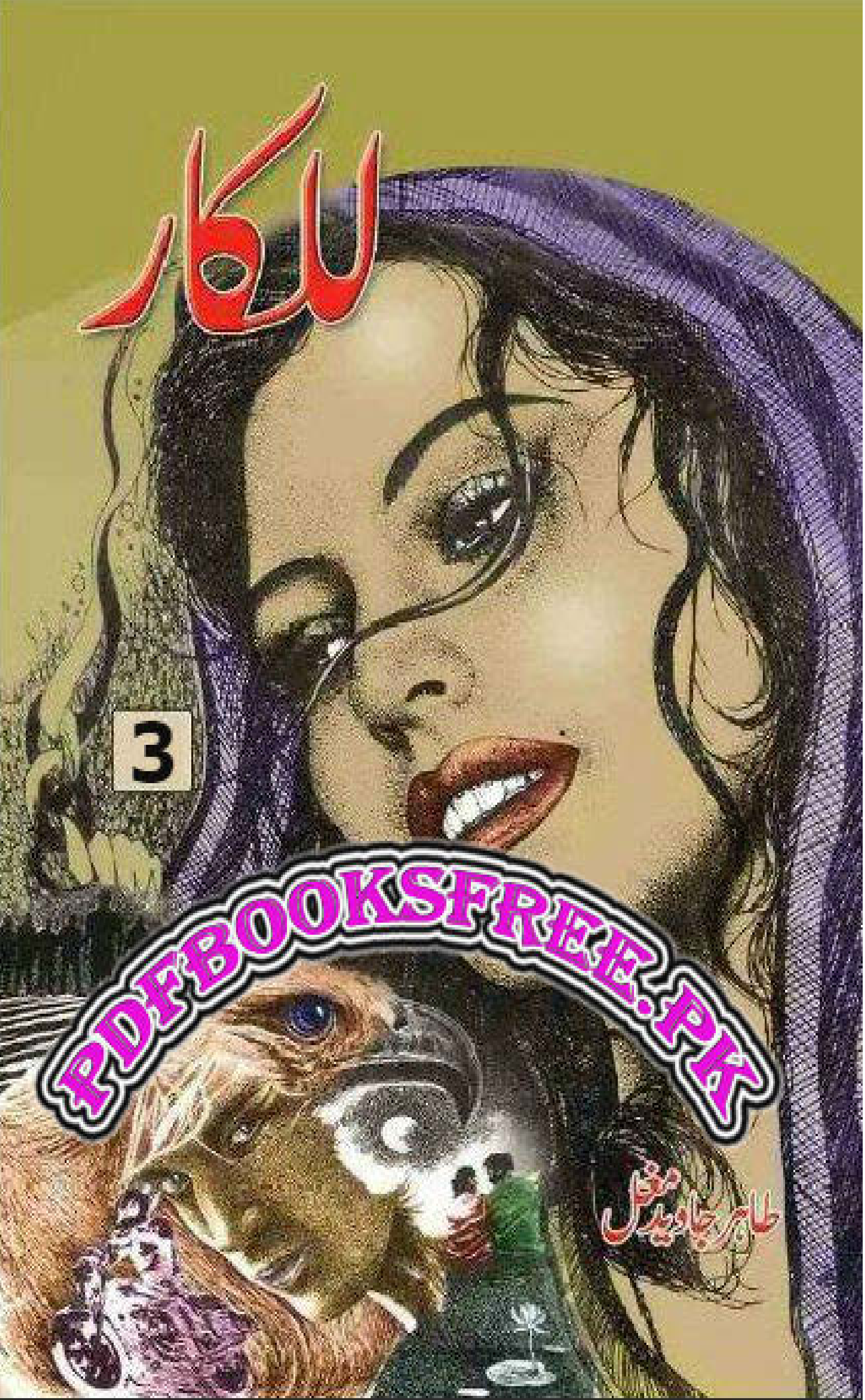

للکار
3
PDFBOOKSFREE.PK

انور خاں نے مجھے ایک جگہ بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''تابی! ہمارے بعد نل پانی اور زرگاں میں حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ اس حرام زادی ماریا کے ہمارے ہاتھ سے نکلنے کے بعد حکم اور جارج ایک دم شیر ہو گئے ہیں۔ وہ بڑے جوش میں ہیں اور جوش میں بندے سے بے وقوفیاں بھی ہوتی ہیں۔ حکم جی نے کل دوپہر پورے بیس بندوں کو زرگاں کی جیل سے نکال کر سرِ عام سولی چڑھا دیا ہے۔ ان پر بغاوت اور غداری کے الزام لگائے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے اور ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے پچھلے بدھ کی صبح جارج کی رہائش گاہ پر حملہ کیا اور وہاں سے سلطانہ اور اس کے بچے کو نکالا۔''

''یہ تو واقعی ظلم ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''اس ظلم نے پوری اسٹیٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ نے اب تک بہت تحمل سے کام لیا ہے...... لیکن اب حالات کو سنبھالنا ان کے بس میں بھی نہیں رہا۔ کل سہ پہر حکم جی کے کچھ سپاہی نل پانی کی ایک قریبی بستی میں گھس گئے۔ وہ وہاں اپنے دو مزدور قیدیوں کو پکڑنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک مراد شاہ کا ہم زلف بھی ہے۔ اس واقعے کے بعد حکم جی اور چھوٹے سرکار کے سپاہیوں میں جھڑپ ہو گئی۔ یہ پہلی براہِ راست جھڑپ تھی اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے زوردار لڑائی میں بدل گئی۔ وہاں دونوں طرف کے کم از کم چالیس بندے مارے گئے ہیں۔ اس کے بعد دو زبردست جھڑپیں اور ہوئی ہیں جن میں ابھی تھوڑی دیر پہلے والی جھڑپ بھی شامل ہے۔''

یہ اطلاعات سنسنی خیز تھیں۔ میں نے انور خاں سے پوچھا۔ ''یہ سلطانہ آپ کو کہاں ملی؟''

''مراد شاہ کے حکم پر کچھ لوگ نل پانی سے ہمیں تلاش کرنے کے لئے نکلے تھے۔ سلطانہ

بھی اصرار کر کے ان میں شامل ہوگئی۔ ساتھ میں جو نوعمر لڑکا ہے، وہ اس کا بھتیجا طلال ہے ان لوگوں سے ہماری ملاقات وہیں جوہڑ کے کنارے پر ہوگئی جہاں سے تم پرسوں رات، چکر ہوئے تھے۔ سلطانہ کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ تم ہمارے ساتھ موجود نہیں ہو۔ ہم بھی تمہارے لئے پریشان تھے۔ ہم کل رات تمہیں ڈھونڈتے رہے۔ پھر ہمیں خبر ملی کہ پانڈے اور اس کے ساتھ ستر ساتھی پرانی چوکی پر موجود ہیں۔ انہوں نے چوکی کے گرد گھیرا ڈالا ہوا ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ پانڈے نے جس شخص کو گھیر رکھا ہے، وہ تم ہی ہو۔ جیکی کے بارے میں مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ہم پوری تیاری کے ساتھ یہاں پہنچ گئے اور پھر جو کچھ ہوا وہ تم نے دیکھا ہی ہے۔''

''بہت وقت پر پہنچے تم لوگ۔ میں تقریباً بے بس ہو چکا تھا۔ تم نے میری رائفل دیکھی ہی ہے، اس کا بیرل ہی بیکار ہو گیا تھا۔''

''شاید ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر لگتی لیکن یہاں پہلے سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ اس فائرنگ نے ہمیں راستہ دکھایا۔''

''سلطانہ کیسے زخمی ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسے ایک بہادر سپاہی ہوتا ہے۔'' انور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بڑی انوکھی لڑکی ہے تابش! اور اس کا انوکھا پن پچھلے دو تین سالوں میں بہت دفعہ ثابت ہوا ہے۔ تم تو بہت سی باتیں بھول چکے ہو لیکن حقیقت تو اپنی جگہ موجود ہے نا۔''

''سلطانہ نے لڑائی میں حصہ لیا ہے؟''

''حصہ ہی نہیں لیا، لڑائی جیتی بھی ہے۔'' وہ بہت جذباتی انداز میں بولا۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''یقیناً تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ جی تھری اور اس کو چلانے والوں کو سلطانہ نے ہی ٹھنڈا کیا ہے۔ لڑائی کے دوران میں پتا نہیں وہ کس وقت پیچھے سے آئی اور اپنے بھتیجے طلال راجپوت کے ساتھ ٹیلے پر چڑھ گئی۔ دونوں کے پاس خاندانی تلواریں تھیں۔ انہوں نے جی تھری چلانے والوں کو چیر کر رکھ دیا۔ پھر ہمیں آوازیں دیں کہ ہم ٹیلے پر آجائیں۔''

میں سناٹے میں تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ''وہ زیادہ زخمی تو نہیں؟''

''نہیں، پاؤں اور ٹانگ پر ایک دو زخم آئے ہیں۔ چوہان اسے سنبھال لے گا۔''

''اور بچہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ وہیں نل پانی میں...... چاچا عبدالغنی کے پاس۔ سنا ہے کہ وہ اسے اپنا دودھ نہیں

پلاتی۔ وہ بہت بیمار ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اب ایک اور عورت اسے دودھ پلا رہی ہے۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ انور خاں بھی خاموش رہا۔ کوئی زخمی بلند آواز سے چلا رہا تھا۔ پس منظر میں گھوڑوں کی مضطرب ہنہناہٹ سنائی دیتی تھی۔ نل پانی کے باوردی سپاہی پوری طرح چوکس تھے۔ ان میں سے بیشتر کی رائفلیں ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھیں۔

انور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اسے تمہاری بہت زیادہ ہمدردی اور توجہ کی ضرورت ہے۔ جو زخم اسے لگا ہے اسے صرف تم ہی بھر سکتے ہو۔''

''میں کیا کروں؟''

''میں اس بارے میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں لیکن ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ سلطانہ ان عورتوں میں سے ہے جو اپنے شوہر کو زبانی کلامی نہیں، واقعی مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ تم اگر ٹھان لو کہ تم نے اسے نارمل کرنا ہے تو یہ ناممکن نہیں ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، سیٹی کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بار بار ابھر رہی تھی۔ پھر یہ آواز قریب آتی چلی گئی۔ ایک باوردی شخص نمودار ہوا۔ اس کی پگڑی پر ہلکے پیلے رنگ کی تین پٹیاں تھیں۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ چھوٹے سرکار کے سپاہیوں میں اعلیٰ عہدہ رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں وہی انٹینا نما شے تھی جو ٹیلے کے پاس جھاڑیوں سے ملی تھی۔ سیٹی یا بیپ کی آواز اسی میں سے آ رہی تھی۔ اس باوردی شخص نے انور خاں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بھائی! اس میں سے یہ آواز آ رہی ہے۔ شاید اس کا کوئی کھٹکا دب گیا ہے۔''

آواز کے ساتھ ساتھ انٹینا پر ایک ننھا سا بلب بھی اسپارک کر رہا تھا۔ اسی دوران میں چوہان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے انٹینے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چوہان نے باوردی شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اجے! انٹینے کو لے کر ٹیلے کی طرف جاؤ۔''

اجے نامی وہ شخص انٹینے کے ساتھ ٹیلے کی طرف بڑھا۔ جب وہ پچاس ساٹھ قدم چلا گیا تو چوہان نے پکار کر پوچھا۔ ''سیٹی کی آواز کم ہوئی؟''

''ہاں...... لگتا ہے کہ ذرا کم ہوگئی ہے۔'' اجے نے بھی پکار کر کہا۔

''اب اور آگے جاؤ۔''

اجے پھر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد چوہان نے پھر بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ اس بار بھی اجے کا جواب اثبات میں تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں...... کچھ اور کم ہوئی ہے۔''

چوہان نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''کچھ سمجھ میں آیا؟''

میرے دماغ میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ ایک دم میرا ذہن اصل صورتِ حال کی طرف منتقل ہو گیا۔ تو یہی وہ ریسیور تھا جس کے ذریعے میرا کھوج لگایا جاتا تھا...... اور یہی ریسیور پانڈے اور اس کے ساتھیوں کو مقناطیس کی طرح یہاں اس کھنڈر چوکی تک کھینچ لایا تھا۔

اردگرد اور لوگ موجود تھے۔ اس موقع پر اس بارے میں تبصرہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں اور چوہان ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر رہ گئے۔

میرا بھوک سے برا حال تھا۔ دیکھا جاتا تو پچھلے تقریباً 48 گھنٹے سے میرے منہ میں اناج کا ایک دانہ تک نہیں گیا تھا...... انور خاں نے میری صورت سے ہی میری کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے فوری طور پر میرے لئے خشک گوشت اور پانی کا انتظام کیا۔ نمکین گوشت کے چند ٹکڑے کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر میرے جسم میں جیسے جان آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ بھوک اور ذائقے کا آپس میں کتنا گہرا اور حیرت انگیز تعلق ہے۔ بھوک نہ ہو تو فائیو اسٹار ہوٹل کا بوفے بھی بیکار اور بھوک ہو تو روٹی کے سوکھے ٹکڑے بھی ہفت رنگ دسترخوان کی طرح۔

اُجالا ہونے سے پہلے ہی ہم نل پانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیکی بھی ایک گھوڑے پر سوار ہمارے ساتھ تھا۔ پانڈے کے ساتھیوں میں سے تین افراد زخمی حالت میں ہمارے ساتھ تھے۔ ان کی مشکیں کس کے انہیں اوندھے منہ گھوڑوں پر لاد دیا گیا تھا۔ اس خوں ریز لڑائی میں پانڈے اور اسٹیل وغیرہ کے چودہ ساتھی ہلاک ہوئے تھے۔ اجے اور انور خاں کے ساتھیوں میں سے آٹھ نو بندوں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ مرنے والوں کی لاشوں کو بعدازاں چھکڑوں کے ذریعے وہاں سے ہٹایا جانا تھا۔ نو دس بجے کے قریب ہم نل پانی میں داخل ہو گئے۔ پہلی بار میں چند ہفتے پہلے سلطانہ اور رستم کے ساتھ اس خوب صورت بستی میں داخل ہوا تھا۔ اس بار بھی سلطانہ میرے ساتھ تھی لیکن کسی اجنبی کی طرح۔ راستے میں بھی وہ بالکل الگ تھلگ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور منہ سر لپیٹے گھوڑے پر بیٹھی رہی۔ وہ بس اپنے بھتیجے طلال سے تھوڑی بہت بات کرتی تھی۔ اس کے مزاج میں عجیب سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔

نیلی جھیل کے کنارے نل پانی کی بستی میں زندگی رواں دواں تھی۔ نیم پختہ راستوں پر گھوڑا گاڑیاں حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔ گھاگرے چولی والی عورتیں اور رنگ برنگی پگڑیوں والے مرد روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ سرسبز ڈھلوانوں پر بکریوں اور گائے بھینسوں کے

ریوڑ چر رہے تھے۔ جھیل پر تیرتی کشتیوں کے پس منظر میں پُرشکوہ عمارتوں کے کلس سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ گھنے جنگلوں کے بیچوں بیچ یہ واقعی ایک دلکش بستی تھی۔

نل پانی میں مجھے دو نئی چیزیں نظر آئیں۔ ایک تو ہر چہرے پر ایک جوش سا تھا۔ دوسرے میں نے کئی نوجوانوں کے کندھوں پر رائفلیں دیکھیں۔ مجھے لگا ایسا موجودہ صورتِ حال کی وجہ سے ہے۔ ہم بستی کے بارونق علاقے میں داخل ہوئے تو جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں موجود تھیں۔ کچھ گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں میں بھی لوگ نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور نعرے لگائے۔ ایک چوک میں کچھ جوشیلے جوانوں نے اجے کو گھیر لیا اور اس کے ساتھ انور خاں کو بھی۔ پھر ان دونوں کو کندھوں پر اُٹھا لیا گیا۔ صورتِ حال سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج رات کھنڈر کے سامنے والی جھڑپ اور جیت کی خبر عام لوگوں تک پہنچ چکی ہے۔

ہمیں سیدھا دیوان میں لے جایا گیا۔ دیوان کے صدر دروازے پر ہم نے جھومتے ہوئے ہاتھی دیکھے۔ دیوان، وہی وسیع و عریض عمارت تھی جس کے اندرونی حصے میں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ وغیرہ کی رہائش گاہیں تھیں۔ اسی عمارت کے ایک حصے میں، میں نے چھوٹے سرکار کی عدالتی کارروائی بھی دیکھی تھی۔ چوہان مجھے لے کر تین چار کمروں کی ایک خوبصورت رہائش گاہ میں آ گیا۔

''سلطانہ کہاں ہے؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''یہیں پر ہے۔ تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''لیکن مجھے تو پتا چلا تھا کہ وہ چاچا عبدالغنی کے گھر میں ہے؟''

''حالات خراب ہو گئے ہیں۔ عبدالغنی کے گھر میں اسے خطرہ ہو سکتا تھا۔ چھوٹے سرکار کی ہدایت پر اسے یہاں لایا گیا ہے۔''

''اور بچہ؟''

اس سے پہلے کہ چوہان جواب میں کچھ کہتا، بچے نے خود ہی جواب دے دیا۔ اس کے رونے کی آواز آئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک ملازمہ بچے کو گلے سے لگائے اس کی پیٹھ تھپکتی ہوئی برآمدے میں سے گزری۔

''یہی مسلمان عورت ہے جو تمہارے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ میرے خیال میں صفیہ نام ہے اس کا۔ اس کا اپنا بچہ بھی یہیں پر ہے۔''

اسی دوران میں عقبی کمرے سے سلطانہ کے کراہنے کی آواز آئی۔ چوہان مدھم آواز میں

بولا۔ ''سلطانہ کو معمول پر لانے کے لئے تمہارے پاس یہ بہترین موقع ہے۔ وہ زخمی ہے۔ اسے تیمارداری کی ضرورت ہے۔ تمہاری ہمدردی اس کے لئے مرہم کا کام دے گی۔ تمہاری خاطر اس نے بڑے دکھ اُٹھائے ہیں تابش! اب وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ سمجھو کہ نیم مردہ ہوگئی ہے۔ تم اسے سہارا دو گے تو پھر سے جی اُٹھے گی۔''

چوہان نے اپنے بیگ میں سے چند دوائیں نکال کر مجھے دے دیں۔

باروندا جیکی کو بھی دیوان کے اندر ہی ایک دوسری جگہ رکھا گیا تھا۔ چوہان نے مجھے اس کے بارے میں تسلی دی کہ وہ بالکل خیریت سے اور محفوظ جگہ پر ہے۔ اس کے علاوہ اسے وافر مقدار میں شراب بھی مہیا کر دی گئی ہے۔ چوکی کے کھنڈر میں جیکی کے ساتھ اپنی ڈرامائی ملاقات کی تفصیل میں انور خاں اور چوہان کو پہلے ہی بتا چکا تھا۔

اس گھر میں میرے، سلطانہ اور بالو کے علاوہ تین افراد اور موجود تھے۔ ایک تو وہی صفیہ نامی عورت جو بالو کو دودھ پلا رہی تھی۔ دوسرا گونگا ملازم ہاشم اور تیسرا سلطانہ کا جواں سال بھتیجا طلال۔ طلال کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ تاہم کھلے ہاتھ پاؤں کی وجہ سے وہ دو چار سال بڑا نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ اُجلا اور آنکھوں میں دلیرانہ چمک تھی۔ وہ سلطانہ کو بڑی محبت سے چچی جی کہتا تھا۔ میں نے اسے بس دو چار دفعہ ہی بولتے سنا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب میں خاموشی سے سلطانہ کے کمرے میں چلا گیا۔ میرے پاس چوہان کا دیا ہوا مرہم اور پٹی وغیرہ تھی۔ وہ ایک آرام دہ بستر پر کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ فرش پر کپاس کی پھول دار چٹائی بچھی تھی اور اس کے پھول لالٹین کی زرد روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس کے سرہانے دودھ کا گلاس ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ جاگ رہی تھی۔ اس کا زخمی پاؤں جس پر پٹی بندھی تھی، کمبل سے باہر تھا۔ میں نے پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کے زخمی پاؤں کو چھوا۔ وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف، گریز، شرمندگی، بہت کچھ یکجا ہوگیا۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''مہروج...... یہ کیا کر رہے ہو؟''

''تمہارے پاؤں پر دوا لگانے لگا ہوں۔''

''خدا کے لئے ناہیں...... ایسا مت کرو...... مجھے گناہ گار نہ کرو۔'' اس نے اپنا پاؤں سمیٹ کر کمبل میں کر لیا۔

''اس میں گناہ والی کیا بات ہے؟''

''ناہیں...... تم میرے پاؤں کو ہاتھ مت لگاؤ۔ اس سے مجھے گناہ لگے گا۔''

''کیوں؟ کیا اس لئے کہ میں تمہارا شوہر ہوں؟''

اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

''تو اگر میں تمہارا شوہر ہوں تو تم مجھ سے دور کیوں ہو...... میری بات کیوں نہیں مان رہیں؟''

''میں نے تمہیں کہا ہے نا، میں تمہارے قابل ناہیں۔ میری ناپاکی تمہیں بھی ناپاک کر دے گی۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں مہروج! میرے بچے کو لے کر مجھ سے کہیں دور چلے جاؤ۔ میں ناہیں چاہتی کہ میری چھایا بھی تم دونوں پر پڑے۔''

''دیکھو سلطانہ! جو کچھ ہوا، وہ برا تھا لیکن جو کچھ تم اب کر رہی ہو یہ بہت ہی برا ہے۔ ایک طرف تم مجھے اپنا شوہر کہتی ہو، دوسری طرف تمہیں یہ بھی گوارا نہیں کہ میں دوا لگانے کے لئے ہی تمہارے جسم کو ہاتھ لگاؤں۔ تم اس معصوم بچے کو بھی بھوکا مار رہی ہو جس کی خوراک اللہ نے تمہارے جسم کے اندر رکھی ہے۔ تم دنیا میں کوئی پہلی عورت نہیں ہو جس کے ساتھ اس طرح کا ظلم ہوا ہے۔ بے شک وہ تکلیف دہ حادثہ تھا لیکن ایسے حادثوں کے بعد بھی لوگ سنبھلتے ہیں۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرتے ہیں اور نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں اب تک قصوروار نہیں سمجھا لیکن اگر تم اپنا رویہ نہیں بدلو گی تو میں ایسا سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

اس نے سر جھکایا اور سسکیاں لے کر روتی رہی۔ کتنا فرق تھا اس سلطانہ میں اور اس سلطانہ میں جو کل رات کھنڈر کے سامنے اچانک اپنی خاندانی تلوار سونت کر نکلی تھی اور ٹیلے پر چڑھ گئی تھی۔ اس نے وہ کیا تھا جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ واقعی انوکھی تھی۔

میں نے ذرا تحکم سے کہا۔ ''اپنا پاؤں باہر نکالو۔'' وہ ساکت بیٹھی رہی۔ ''میں نے کہا ہے، پاؤں باہر نکالو۔'' میں نے دوبارہ کہا۔

اس مرتبہ اس نے پاؤں سرکا کر کمبل سے باہر نکال دیا۔ میں نے اس کی وہ پٹی کھولی جو علی الصباح جنگل میں باندھی گئی تھی۔ اس کے پاؤں پر اوپر کی طرف زخم آیا تھا۔ غالباً دستی بم کا کوئی ٹکڑا لگا تھا یہاں۔ میں نے چوہان کی ہدایت کے مطابق زخم کو روئی سے صاف کر کے مرہم لگایا اور تازہ پٹی باندھ دی۔ اس کی پیشانی اور رخساروں پر بھی نیل موجود تھے۔ دوسرا زخم اس کی کہنی پر تھا۔ میں نے یہاں بھی دوا لگائی اور پٹی باندھی۔ اس دوران میں وہ مسلسل آنسو بہاتی رہی۔ میں نے کچھ عرصے پہلے جب اسے پہلی بار ایک نیم تاریک کھوہ میں دیکھا تھا تو وہ مجھے ایک نہایت مضبوط اور باہمت لڑکی نظر آئی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ شاید اس لڑکی کی آنکھ میں کبھی آنسو نہیں آیا ہوگا اور شاید اس نے کبھی آہ بھی نہ بھری ہوگی...... اور نے

والے دنوں میں وہ واقعی ایسی ہی نکلی تھی۔ میں نے اسے کئی مشکلوں کا سامنا مردانہ وار کرتے دیکھا تھا لیکن یہ جو آخری آفت اس پر ٹوٹی تھی، اس نے اسے واقعی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے حصے میں آنے والے تمام آنسو انہی دو چار دنوں میں بہا دینا چاہتی ہے۔ کچھ احساسات پر انسان کا بس نہیں ہوتا، شاید سلطانہ بھی ایسے ہی احساسات کی زد میں تھی۔

میں اس کے قریب بیٹھا رہا اور اس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ میں نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے اس حوالے سے اس پر اپنی احسان مندی ظاہر کی کہ وہ کل رات میرے لئے بہت نیک شگون ثابت ہوئی ہے...... اور حقیقت بھی یہی تھی کہ کل رات کھنڈر کے سامنے ہونے والی خونی لڑائی میں سلطانہ کا انوکھا کردار پوری طرح کھل کر سامنے آیا تھا۔ وہ اگر اپنے بھتیجے طلال کے ہمراہ دیوانہ وار ٹیلے پر نہ پہنچتی اور جی تھری چلانے والوں پر ٹوٹ نہ پڑتی تو شاید..... صورتِ حال کیا سے کیا ہو جاتی...... اور شاید میں بھی اس وقت یہاں اس آرام دہ کمرے میں زندہ سلامت موجود نہ ہوتا۔

وہ سب کچھ سنتی رہی لیکن یوں لگ رہا تھا کہ بس اس کے کان سن رہے ہیں۔ اس کا باقی سارا جسم میرے الفاظ کی نرمی، شیرینی اور محبت سے لاتعلق ہے۔ وہ بس میری فرماں برداری کر رہی تھی کہ میرے سامنے خاموش بیٹھی تھی۔ اسی دوران میں چھ سات ماہ کے بالو نے رونا شروع کر دیا۔ اس کا رونا بلند ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں اتنا درد تھا کہ ترس آنے لگا۔ جواں سال عورت صفیہ اسے شاید دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی...... وہ چند سیکنڈ کے لئے چپ ہوتا تھا پھر آہ و پکار شروع کر دیتا تھا۔

"یہ آواز سن کر تمہارا دل نہیں کانپتا سلطانہ؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے اِچ تو تمہاری منت کرتی ہوں کہ اسے مجھ سے کہیں دور لے جاؤ۔ جن بچوں کی مائیں ان کے جنم کے وخت اِچ مر جاتی ہیں، وہ بھی تو جندہ رہتے ہیں اور پل جاتے ہیں۔ یہ تو پھر چھ سات ماہ کا ہے۔"

"تم اتنی پتھر کیوں ہو گئی ہو سلطانہ! میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔"

"میں کیا کروں مہروج! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے اپنے جسم سے گھن آتی ہے۔ میں اس قابل ناہیں ہوں مہروج کہ اپنے بچے کو اپنی گود میں لے کر پیار کروں۔"

"تم ہو..... تم ہو اس قابل۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "اور تمہیں ایسا کرنا پڑے گا..... اگر نہیں کرو گی تو اس کا مطلب ہے کہ تم میری بیوی نہیں ہو اور نہ میں تمہارا شوہر

ہوں۔"

میرے لب و لہجے نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ اس نے پہلی بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے عقب میں سرخ انگارہ تھیں۔

میں تیزی سے باہر نکلا اور دوسرے کمرے میں جا کر بالو کو لے آیا۔ اس کا رونا تو بند ہو چکا تھا لیکن ننھا سا سینہ مسلسل ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔

میں نے اسے زبردستی سلطانہ کی گود میں ڈال دیا۔ ایک لمحے کے لئے تو لگا کہ وہ اُٹھ کر بھاگ جائے گی لیکن پھر اس نے پتا نہیں کس طرح ضبط کیا۔ میری نافرمانی کے خوف سے اس نے اسے بانہوں میں لے لیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا سارا وجود لرز رہا ہے۔ اس کے اناروں جیسے رخسار زرد ہو چکے تھے۔ ہونٹ سفید تھے اور جسم کی لرزش کچھ اس طرح تھی جیسے اسے تپ لرزہ ہو گیا ہو۔

بالو اس کی گود میں آتے ہی پُرسکون ہو گیا تھا۔ وہ اپنی گول گول پیاری آنکھوں سے اسے دیکھتا چلا گیا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ماں کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے۔ جیسے کہہ رہا ہو..... 'مجھ سے دور کیوں ہو گئی ہو؟ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔'

میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ بالو کو دودھ پلائے لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ 'بری ہدایت' پر عمل کر سکے گی یا نہیں۔ میں اس پر ایک دم زیادہ دباؤ بھی ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں اور بچے کو ایک ساتھ چھوڑ کر میں باہر آ گیا۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو بالو ایک بار پھر زور و شور سے رو رہا تھا۔ اس وقت اس کے رونے میں ایک طرح کا درد بھی لہریں لے رہا تھا۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر اُٹھ کر سلطانہ کے کمرے کی طرف گیا۔ بالو اور سلطانہ دونوں بستر پر موجود نہیں تھے۔ جواں سال ملازمہ صفیہ کمرے کے وسط میں پریشان کھڑی تھی۔

بالو کے رونے کی آواز غسل خانے سے آ رہی تھی۔ میں غسل خانے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا لیکن کنڈی نہیں لگائی گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سلطانہ بالو کو نیم گرم پانی سے نہلا رہی تھی۔ وہ بالکل عریاں تھا اور اس کا سارا جسم سرخ ہو رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سلطانہ ایک پتھر سے جسے جھانواں بھی کہا جاتا ہے، بالو کے نازک جسم کو رگڑ رہی تھی۔ وہ درد سے بلبلا رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" میں گرجا۔

وہ چونک کر مجھ کو دیکھنے لگی۔ میں نے بالو کو اس کے صابن لگے ہاتھوں سے چھین لیا۔ وہ

بیٹھ گئی اور دیوار سے سر ٹکا کر پھر رونے لگی۔
اس نے بالو کو اتنے زور سے رگڑا تھا کہ کئی جگہ خراشیں آ گئی تھیں۔ ''تم اپنے ہوش میں تو
ہو...... یہ کیا کیا ہے تم نے؟''
''مہروج! تم نے بہت غلط کیا۔ اس کو میری گود میں ڈال دیا...... تم کیوں اسے بھی
میری طرح گلیج کر دینا چاہتے ہو؟''
میں نے سلطانہ کو چند جھڑکیاں دیں اور بالو کو تولیے میں لپیٹ کر کمرے میں لے آیا۔
سلطانہ نے غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ملازمہ صفیہ نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر اس
نے نہیں کھولا۔ پہلے تو مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کچھ کر ہی نہ بیٹھے مگر پھر پانی گرنے کی آواز
سنائی دینے لگی۔ اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی نہا رہی ہے۔
ملازمہ صفیہ نے بچے کو اپنا دودھ پلایا اور میں نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ میری نگاہ
بار بار اس کے معصوم چہرے پر ٹک جاتی تھی اور میں سوچنے لگتا تھا کہ کیا یہ واقعی میرا بچہ
ہے...... میرا خون؟
سچی بات یہ ہے کہ میں اس سے کوئی خاص لگاوٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ جس طرح معصوم
بچے نگاہوں کو پیارے لگتے ہیں، یہ بھی مجھے پیارا لگتا تھا۔ بس...... اس کے علاوہ اور کچھ نہیں
تھا۔

سلطانہ کا غسل طویل ہوتا جا رہا تھا۔ شاید وہ خود بھی کھرچ کھرچ کر نہا رہی تھی۔ قریبا
ایک گھنٹے بعد وہ صفیہ کے آوازیں دینے پر ہی باہر نکلی۔ اس نے اپنا منہ سر اوڑھنی میں لپیٹ
رکھا تھا۔ گیلے بال کمر پر جھول رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھے بغیر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پھر کمبل اوڑھ کر
لیٹ گئی۔ جب وہ کمبل اوڑھ رہی تھی، میں نے اس کے دونوں ہاتھ دیکھے۔ اس نے اپنے
بدن کے ساتھ بھی بالو والی سختی روا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ اور بازو جھانوے کی رگڑوں سے
سرخ ہو رہے تھے۔ یقینا یہی صورت حال اس کے پورے جسم کی رہی ہو گی۔ میرے ذہن
میں پھر چنگاریاں سی بھر گئیں۔ جارج گورا کی منحوس صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ پتا نہیں
اس رات اس خبیث نے سلطانہ کے جسم اور روح پر کتنے زخم لگائے تھے۔ یقیناً یہ اس رات کی
تلخ یادیں ہی تھیں جنہوں نے اسے نیم دیوانہ کیا ہوا تھا۔
وہ لیٹ گئی تو میں نے بالو کو پھر اس کے پہلو میں لٹا دیا۔ اس مرتبہ اس نے زیادہ
مزاحمت نہیں کی۔ بس کسمسا کر رہ گئی۔ میں نے دونوں ماں بیٹے پر کمبل اچھی طرح ڈال دیا۔
سلطانہ کے پاؤں کی پٹی بھیگ کر اُتر چکی تھی۔ میں نے سلطانہ کے منع کرنے کے باوجود تازہ

پٹی باندھی اور کہنی کی پٹی بھی بدل دی۔
اب صبح ہونے والی تھی۔ میں بستر پر چت لیٹا رہا اور سلطانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے رویے میں تھوڑی سی نرمی دکھائی دے رہی تھی۔ اس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ اگلے دو چار دن میں وہ خود کو مزید سنبھال لے۔ تاہم ڈاکٹر چوہان نے کہا تھا کہ سلطانہ کو مکمل طور پر نارمل کرنے کے لئے مجھے بہت تعاون کرنا ہو گا۔
ہماری میزبانی میں یہاں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی جا رہی تھی۔ بہترین رہائش اور کھانا مہیا کیا جا رہا تھا۔ شام کو میری ملاقات اپنے سابقہ میزبان چاچا عبدالغنی سے بھی ہوئی۔ ان سے اسٹیٹ کے ہنگامہ خیز حالات کے بارے میں کچھ مزید معلومات ملیں۔ کئی جگہ نل پانی اور زرگاں کے سپاہیوں میں جھڑپیں ہوئی تھیں اور اب کسی بڑی لڑائی کی توقع کی جا رہی تھی۔ عبدالغنی نے یہ بھی بتایا کہ زرگاں میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے لوگوں کو موقع ملتا ہے، وہ زرگاں کو اور حکم جی کو چھوڑ کر نل پانی کی طرف آ جاتے ہیں۔
عبدالغنی صاحب سلطانہ کے بارے میں بھی بہت پریشان تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''وہ ایک خوددار اور غیور خاندان سے ہے۔ جارج گورا اس کی انا اور پندار کا دشمن تھا۔ آخر کار وہ اس کو رسوا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس واقعے (واقعہ) نے سلطانہ کے دل پر ایک بہت گہرا گھاؤ لگایا ہے۔ مجھے نا ہیں لگتا کہ یہ گھاؤ کبھی بھر سکیں گے۔''
میں سلطانہ کے والد اور بھائی سے ملنا چاہتا تھا۔ ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح اس کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ ان دونوں سے تو فوری طور پر ملاقات نہیں ہو سکی تاہم رات کے کھانے کے فوراً بعد حجام عبدالرحیم ملنے کے لئے آ گیا۔ ماریا کے بدلے کُل سات افراد کو جارج کی جیل سے رہائی ملی تھی۔ ان سات میں سے صرف دو افراد جان بچا کر نل پانی پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے اور عبدالرحیم ان دو خوش قسمتوں میں سے ایک تھا۔
چوہان نے عبدالرحیم کو وہ سب بتا دیا تھا جو میری یادداشت کے ساتھ ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں، میں پچھلے دو ڈھائی سال کی باتیں فراموش کر چکا تھا۔ عبدالرحیم کو اس کے باوجود یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بار بار پوچھتا تھا...... کیا میں یہ بات بھی بھولا ہوا ہوں؟ کیا مجھے یہ واقعہ بھی یاد نہیں ہے؟ وہ مجھے میرے پرانے نام ''مہروز'' سے ہی مخاطب کرتا تھا۔
وہ کہنے لگا۔ ''مہروز بھائی! وہ دن مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ آپ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سلطانہ بی بی بہت خوش نظر آوت تھی۔ وہ ہر وقت سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگی رہت تھی۔ اسے ڈر رہت تھا کہ تم کہیں گم نہ ہو جاؤ...... یا پھر جارج گورا صاحب کے کارندوں

میں سے کوئی تم کو نقصان نہ پہنچا دے۔ تم بولتے بھی تو بہت کم تھے۔ ہر وقت بس کھوئے کھوئے رہتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہر بات، سنی اَن سنی کر دیتے ہو۔ ایک دن سلطانہ بڑی گھبرائی ہوئی میری دکان میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ رحیم بھائی! آپ نے مہروز کو تو ناہیں دیکھا؟ میں نے انکار میں جواب دیا۔ وہ اور بھی گھبرا گئی۔ بالکل جیسے تم کوئی چھوٹے سے بچے ہو اور اس سے اپنی انگلی چھڑا کر بھاگ گئے ہو۔ وہ اس روز دیوانوں کی طرح تم کو ڈھونڈتی رہی۔ میں، طلال، ہاشم اور مختار صاحب بھی اس کے ساتھ شامل تھے۔ آخر تم دوپہر کے وقت ایک باغ سے ملے۔ تمہاری جھولی میں گیندے اور موتیے کے بہت سارے پھول تھے۔ تم نے یہ پھول سلطانہ کو دے دیئے اور محبت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سلطانہ تمہیں دیکھ کر رونے لگت تھی۔ بعد میں پتا ہے اس نے کیا کیا تھا؟''

''کیا کیا تھا؟''

''اس نے ان سارے پھولوں کو دھاگے میں پرو دیا تھا۔ اس کے گجرے، بُندے اور ہار وغیرہ بنائے تھے اور بڑے چاؤ سے یہ زیور پہنا تھا۔ اس نے کبھی کوئی زیور ناہیں پہنا۔ وہ پہلا زیور تھا جو اس نے تمہاری وجہ سے پہنا...... اور بعد میں بھی وہ کبھی کبھی گیندے اور موتیے کا زیور پہنتی رہی۔''

مجھے یاد آیا کہ جب میں سلطانہ سے پہلی بار نیم تاریک کھوہ میں ملا تھا، تب بھی مجھے اس کے بالوں کے جُوڑے میں موتیے اور گیندے کے پھول نظر آئے تھے۔

عبدالرحیم جذباتی انداز میں اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ وہ تمہیں پوجنے کی حد تک پیار کرنے لگت تھی۔ اس کو تمہارے علاوہ جیسے کوئی کام ہی ناہیں تھا۔ تمہارے آرام کا خیال رکھنا، تمہیں وقت پر دوا دینا بلکہ تمہیں نہلانا دھلانا تک اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ جو کچھ تمہیں پسند ہووت تھا وہ خود بھی آنکھیں بند کر کے اسے پسند کرنے لگت تھی۔ لوگن کہوت ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد عورت کا پریم دو خانوں میں بٹ جاوت ہے لیکن ہم سب جانت ہیں کہ کم از کم سلطانہ بی بی کے معاملے میں تو ایسا ناہیں ہوا۔ ایسا لگت تھا اور اب بھی لگت ہے کہ اس کا جینا مرنا صرف اور صرف تمہارے لئے ہے......''

عبدالرحیم باتیں کر رہا تھا مگر میں ابھی تک گیندے اور موتیے کے پھولوں میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے کچھ بہت پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ لاہور یاد آ رہا تھا، باغِ جناح یاد آ رہا تھا اور ثروت یاد آ رہی تھی۔ گیندے اور موتیے کے پھول تو ثروت کو بھی پسند تھے۔ وہ ان کی مشترکہ خوشبو سے مدہوش ہو جایا کرتی تھی۔ یہ دونوں پھول اس پر علیحدہ علیحدہ تو کچھ خاص اثر نہیں

کرتے تھے لیکن ان کی ''اشتراکی'' باس اس کے دل کی گہرائی میں اُتر جاتی تھی۔ میں اس کے لئے جب بھی پھول لیتا تھا، وہ یہی دونوں ہوتے تھے...... تو کیا میں دو ڈھائی سال کے عالم بےخبری میں بھی کچھ ایسے کام کرتا رہا ہوں جن کا تعلق ثروت اور اس کی محبت سے تھا؟

رات بھیگ رہی تھی۔ عبدالرحیم واپس اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ نل پانی کی گلیوں میں گاہے بگاہے گھوڑے دوڑنے کی آوازیں آتی تھیں اور کچھ ایسے نعرے گونجتے تھے جن پر جنگی للکاروں کا گمان ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ اسٹیٹ کی موجودہ کشیدہ صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ میں جیکی سے ملنے کے لئے بےتاب ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ بے شک یہاں پہنچتے ہی اسے وافر مقدار میں شراب مل گئی تھی اور اس حوالے سے وہ میرا محتاج نہیں رہا تھا...... پھر بھی ہم دونوں کے درمیان ایک تعلق سا پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے جانے سے پہلے سلطانہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ حسبِ معمول سر لپیٹے لیٹی ہوئی تھی، تاہم یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ بالو اس کے پہلو میں تھا۔ میں باروندا جیکی کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا محلِ وقوع مجھے ڈاکٹر چوہان نے بتا دیا تھا۔ وہ دیوان خانے کے اندر ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ میں ایک باغیچے کی روش پر سے گزرا۔ یہاں چاندنی رات میں فواروں کا پانی چمک رہا تھا اور مصنوعی جھرنوں کی قلقل تھی۔ پھولوں کے تختوں کے آس پاس پتھریلی کرسیوں پر خوش لباس مرد و زَن بیٹھے تھے۔ تاہم ہر چہرے پر سنجیدگی نظر آتی تھی۔ ایک دم میں چونکا۔ مجھے موتیے کی مسحور کن مہک محسوس ہوئی۔ میں نے ایک کیاری میں سے کچھ پھول توڑ لئے۔ ایک باوردی ملازم نے ادب سے پوچھا۔ ''میں جناب کی کچھ خدمت کر سکت ہوں؟''

''یہاں کہیں گیندے کے پھول بھی ہوں گے؟''

''یہاں تو ناہیں سرکار! ساتھ والی بڑی باغیچی میں ہوں گے۔ میں ابھی لا دیتا ہوں۔''

اس نے کہا اور تیزی سے ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ دو منٹ بعد وہ ایک گول طشت میں تازہ پھول لے آیا۔ میں نے اس طشت میں موتیے کے پھول بھی رکھے اور واپس جا کر خاموشی سے انہیں سلطانہ کے سرہانے رکھ دیا۔ وہ بےحرکت لیٹی رہی۔ تاہم چند سیکنڈ بعد اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے مڑ کر پھولوں کی طرف دیکھا۔ ایک لحظے کے لئے اس کے چہرے پر چمک سی نمودار ہوئی لیکن پھر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ تب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ گڑبڑا گئی اور اخلاقی انداز میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں اور بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔

''نہیں......نہیں......تم لیٹی رہو۔ میں ویسے ہی آ گیا تھا۔'' میں نے کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ مجھے چلنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو رہی تھی۔ ران کے زخم میں غالباً ٹھنڈ کی وجہ سے درد ہو رہا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد میں بارونداجیکی کے رُوبرو اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ جیکی بدستور اپنے تہ در تہ لنگوٹ میں تھا۔ حالانکہ میزبانوں نے اس کے پاس ہی ایک صاف ستھرا لباس بھی رکھ دیا تھا۔ رات کا جوشاندار کھانا اسے پہنچایا گیا تھا، وہ بھی تقریباً جوں کا توں ایک طرف رکھا تھا۔ اس میں سے غالباً دو چار کباب لئے گئے تھے۔ جیکی شراب کی بوتلوں کے درمیان یوں بیٹھا تھا جیسے راجا اندر حسین وجمیل عورتوں کے درمیان بیٹھتا ہوگا۔

مجھے دیکھ کر ایک دم اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ''تو آخر تم آ گئے؟'' وہ شستہ انگریزی میں گویا ہوا۔

''مجھے تو کل ہی آ جانا چاہئے تھا مگر پتا ہی نہیں تھا کہ آپ کو کہاں ٹھہرایا گیا ہے۔''

''یہ لوگ مجھے یوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں چڑیا گھر میں بند کوئی جانور ہوں...... چھوٹے سرکار کے افسروں نے سوال پوچھ پوچھ کر میرا دماغ پلپلا کر دیا ہے......تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ تم نے کتنے دن جارج کی بہن کو سکھشا دی تھی؟ تمہیں کیسے غائب کیا گیا؟ تم کیسے رہا ہوئے وغیرہ وغیرہ۔'' بات کرتے کرتے وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''کوئی دوا وغیرہ بھی دی گئی ہے آپ کو یا نہیں؟''

وہ بولا۔ ''دوا کیا یہاں تو معالجوں کی پوری ٹیم آئی تھی۔ وہ میرا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ مجھے پھر سے بھلا چنگا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاید انہیں پتا نہیں کہ مرض الموت کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دوا مجھے تھوڑا بہت افاقہ دے سکتی ہے تو وہ یہی ہے۔'' اس نے شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ ''یہ دوا نہیں زہر ہے اور اسی نے آپ جناب کو اس حال تک پہنچایا ہے......اور دوسری بات میری سمجھ میں یہ نہیں آتی کہ آپ ہر وقت مرنے کی بات کیوں کرتے ہو؟ آپ زندگی کی بات کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے اپنے اندر جینے کی خواہش پیدا کر لو گے تو پھر حالات بھی بدلنا شروع ہو جائیں گے۔ حالات بدل سکتے ہیں۔''

اس نے ایک بار پھر سنی اَن سنی کر دی جیسے میری بات اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہ ہو۔ اس نے آتشیں سیال کا ایک طویل گھونٹ لیا اور اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

تب میری نظر پہلی بار ایک نیڈ بیگ پر پڑی۔ یہ نیڈ بیگ اس آرام دہ کمرے کے ایک گوشے میں جھول رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں حیران رہ گیا۔

''نیڈ بیگ کو تم نیڈ بیگ ہی کہو گے۔'' پیرا شوٹ یا ہیلی کاپٹر تو نہیں کہو گے۔''

''لیکن یہ یہاں کیسے آیا؟''

''میں نے منگوایا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ تم آج نہیں تو کل ضرور آؤ گے اور ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔''

میں تعجب سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والا معما تھا۔

یوں لگتا تھا کہ جس طرح میرے اندر یہ طلب پیدا ہو چکی ہے کہ میں جیکی سے زیادہ سے زیادہ سیکھوں، اس میں بھی یہ خواہش پیدا ہو گئی ہے کہ وہ تھوڑے سے وقت میں مجھے بہت کچھ سکھا دے۔

میں نے کہا۔ ''کیا آپ میرا انتظار کر رہے تھے؟''

''بالکل......ادھورے کام سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کام میں نے اور تم نے شروع کیا ہے، وہ پورا ہو۔''

''میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کا شاگرد کہلواؤں۔ کیا آپ ایسا سمجھتے ہو؟''

''سچی بات یہ ہے کہ میں بھی ایسا نہیں سمجھتا......لیکن تمہارے اندر ایک تڑپ ضرور ہے اور اسی تڑپ نے مجھے آمادہ کیا ہے۔ تمہاری یہ تڑپ آنے والے دنوں میں تمہارے بہت کام آ سکتی ہے۔ اس کو اپنے اندر مرنے نہ دینا۔''

''آپ کس تڑپ کی بات کر رہے ہو؟ میری سب سے بڑی تڑپ تو یہی ہے کہ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔''

''میں اسی کی بات کر رہا ہوں لیکن اس تڑپ کے پیچھے بھی تو کوئی وجہ ہے۔ وہی لڑکی جو تمہارے قریب آتے آتے تم سے بہت دور چلی گئی ہے۔ جس کو تم کھو چکے ہو لیکن بھولے نہیں ہو۔ شاید کبھی بھول بھی نہیں سکو گے۔''

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ ثروت اپنی تمام تر محبوبیت کے ساتھ میرے تصور میں آ گئی۔ میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... یہ تو ہے لیکن......ڈھائی برس بیت چکے ہیں کہ اس کا کچھ پتا نہیں۔ اپنے آخری خط میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں جرمنی میں ایک یوسف نامی لڑکے سے اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے......اب تک تو

شاید......اب تک تو شاید......''

میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک گولا سا میرے گلے میں اٹک گیا۔ ثروت کے لئے اس طرح کی بات سوچنا بھی میرے لئے مشکل ہے۔

''میں تمہارے احساس کو سمجھتا ہوں۔ ان مرحلوں سے میں بھی گزرا ہوں۔ میری اور تمہاری کہانی میں فرق یہ ہے کہ...... تمہاری کہانی میں، کنول جھیل میں گزرے ہوئے وہ سات دن نہیں ہیں۔ ہاں...... وہ سات دن جن پر سات زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔''

''لیکن میں نے......''

''اچھا، یہ باتیں چھوڑو۔'' اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''اس وقت میں بہت سرور میں ہوں پھر یہ سرور غنودگی میں بدلنے لگے گا۔''

وہ میرا سہارا لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے لے کر نیڈ بیگ کی طرف بڑھا۔ ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ریت سے بھرا ہوا تھیلا ہمارے درمیان تھا۔ بلب کی روشنی میں شفاف دیوار پر اس سارے منظر کا سایہ بن رہا تھا۔ اس ''دیوان'' نامی پوری عمارت میں جنریٹرز کی برقی روشنی موجود تھی۔

''درد کیا ہے؟'' جیکی نے مسرور آواز میں کہا۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''درد ایک احساس کے سوا اور کچھ نہیں اور یہ احساس چوٹ کی جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے...... یہاں۔'' اس نے انگلی سے اپنے سر کو ٹونکا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے الفاظ کو دہراؤ۔ پوری توجہ اور پورے یقین کے ساتھ۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ''درد ایک احساس کے سوا اور کچھ نہیں اور یہ احساس چوٹ کی جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے۔''

وہ آنکھیں بند کئے بولا۔ ''درد کے ساتھ اندیشے اور واہمے شامل کر لئے جائیں تو درد بڑھ جاتا ہے...... خالص درد کی حیثیت زیادہ نہیں ہوتی اور اگر خالص درد کی گہرائی میں ڈوب کر اس کی اصلیت محسوس کی جائے تو یہ اور بھی کم ہونے لگتا ہے۔''

''جی۔'' میں نے کہا۔

''صرف ''جی'' نہیں۔ ان الفاظ کو دہراؤ۔ میری طرح۔ آنکھیں بند کرلو۔'' اس نے حکم دیا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے الفاظ دہرائے۔ وہ جب اس انداز میں سکھاتا تھا تو عجیب موڈ میں آجاتا تھا۔ وہ ایک ماسٹر فائٹر سے زیادہ ایک سائیکاٹسٹ دکھائی دینے لگتا تھا۔

اس روز باروندا جیکی نے مجھے نیڈ بیگ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سخت مشق کرائی۔ اتنی مشق جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کی کھال چھل گئی۔ خون رسنے لگا اور قطرے سنگِ مرمر کے فرش پر گرنے لگے۔ میں ذرا سُست پڑتا تو وہ مجھے جھڑکتا اور بیساکھی سے میرے سر یا پیٹھ پر ضرب لگاتا۔ وہ جنونی موڈ میں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کا جنون برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ جنون جیسے میرے جنون سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ یہ ایک تند و تیز لہر کی طرح مجھے اپنے ساتھ بہائے لئے چلا جا رہا تھا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تکلیف میرے لئے مزہ بنتی جا رہی تھی...... نشہ بنتی جا رہی تھی۔ میں جیکی کی ہدایات پر عمل کرتا رہا، یہاں تک کہ بالکل بے جان ہو کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔

اگلی صبح سلطانہ کے بھائی اور والد سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ صبح سویرے سلطانہ سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ اس وقت میں سو رہا تھا۔ میں جاگا تو وہ جانے کے لئے تیار تھے لیکن جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ہماری ملاقات میرے کمرے میں ہوئی۔ سلطانہ کے والد مختار راجپوت کی عمر پچپن ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ کسی وقت وہ خاصے صحت مند رہے ہوں گے لیکن اب جیسے زندگی کے بوجھ نے انہیں نڈھال سا کر رکھا تھا۔ سلطانہ کا بھائی کافی کمزور تھا۔ جواں سالی میں ہی اس کے ہاتھ میں بیساکھی آ گئی تھی۔ کمر کی تکلیف کے سبب وہ بہ مشکل چلتا پھرتا تھا۔

سلطانہ کے والد نے میرے سر پر پیار دیا۔ پھر دونوں نے مجھ سے معانقہ کیا اور اسی گرم جوشی سے ملے جس سے کسی قریبی عزیز کو ملا جاتا ہے...... جبکہ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں انہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

مختار صاحب نے میرے دونوں ہاتھ تھام لئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''مہروج! مجھے پورا یَخین (یقین) ہے۔ اگر کوئی سلطانہ کو پھر سے سلطانہ بنا سکتا ہے تو وہ تم ہو۔ وہ تمہاری بڑی سے بڑی بات مان سکتی ہے...... اور مجھے لگتا ہے کہ وہ کچھ کچھ مان بھی رہی ہے۔ اب وہ پہلے سے کچھ اچھی نجر آ رہی ہے۔ خدا کے بعد اب تم اِچ ہمارا سہارا ہو مہروج!''

''میں اپنی کوشش کر رہا ہوں۔''

''لیکن...... لیکن تم الگ کمرے میں کیوں سو رہے ہو؟ تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہئے۔ اسے تمہاری جرورت ہے مہروج...... بہت جیادہ جرورت ہے۔''

میں اب اس بات کا کیا جواب دیتا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں اس کا شوہر ہونے کے باوجود شوہر نہیں ہوں۔ میں نے اسے اپنے ہوش و حواس میں قبول نہیں کیا اور نہ ہی اپنی مرضی

سے اس کے ساتھ کوئی ازدواجی تعلق رکھا ہے۔ وہ جو کچھ تھا، ایک عالم بےخبری کا دروانیہ تھا۔

دونوں باپ بیٹا بہت دکھی تھے۔ میں اس موقع پر کوئی ایسی ویسی بات کر کے انہیں مزید دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکے نبیل نے میرے ہاتھوں کی چھلی ہوئی کھال دیکھی اور بے تکلفی سے بولا۔ ''مہروج بھائی! یہ کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں، گر گیا تھا۔'' میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''آپ...... آپ بہت بدلے ہوئے نظر آتے ہیں مہروج بائی! چاچا غنی بتا رہے تھے کہ آپ پچھلے دو ڈھائی سال کی باتیں بھول چکے ہیں۔ یقین ناہیں آتا۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟''

مجھے ایسی باتوں سے بہت اُلجھن ہوتی تھی۔ میرے چہرے پر اُلجھن دیکھ کر ہی شاید مختار صاحب نے جلدی سے مداخلت کی اور بولے۔ ''کوئی بات ناہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائیں گا۔ بس تم سے ایک ہی درخواست کرنی ہے...... بلکہ ہاتھ جوڑ کر کرنی ہے۔'' انہوں نے واقعی میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''تم سلطانہ کا خیال رکھنا۔ اسے تمہاری بہت سخت جرورت ہے۔''

ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا کہ سلطانہ کو میری ضرورت ہے اور میں خود بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے سنبھالنے میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہوں...... لیکن میں کیا کرتا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کیا میں ایک شوہر کی طرح اس کے قریب جا سکتا تھا؟ اسے پیار دے سکتا تھا؟

جب میں اس طرح سوچتا تھا تو ایک دم ثروت ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے آ جاتی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہتی تھی۔ 'بس تابی! اتنی ہی طاقت تھی میرے پیار میں؟ یہی تھا ہمارا اٹوٹ بندھن؟ یہی تھا تمہارا ختم نہ ہونے والا انتظار؟'

میں ایک دوراہے پر تھا۔ کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ میں جسمانی طور پر سلطانہ کے قریب جائے بغیر بھی تو اسے سہارا دے سکتا تھا۔ جسمانی قربت تو میاں بیوی کی محبت کا آخری درجہ ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بھی تو کئی مدارج ہوتے ہیں۔ محبت سے بات چیت کرنا، اکٹھے کھانا پینا، دکھ سکھ بانٹنا۔

اس شام میں پھر سلطانہ کے لئے باغیچے سے گیندے اور موتیے کے تازہ پھول لے کر آیا...... میں نے ایک باوردی باغبان سے کہا اور اس نے وہیں پر مجھے ایک گجرا بنا دیا۔ میں سلطانہ کے پاس واپس آ رہا تھا جب میری ملاقات اسحاق اور عبدالرحیم سے ہو گئی۔ اسحاق ہمیشہ کی طرح بہت سنجیدہ بلکہ مشتعل نظر آتا تھا۔ اس کے اشتعال کی وجہ ماریا فرگوسن ہی تھی۔ اس نے غم زدہ لہجے میں مجھے بتایا۔ ''وہ حرام زادی بچ گئی ہے۔ تمہاری چلائی ہوئی گولی سے

س کی پنڈلی پر معمولی زخم آیا تھا۔ ابھی زرگاں سے آنے والے ایک بندے نے بتایا ہے کہ ہارج گورا نے ماریا کے باڈی گارڈ کو گولی سے اُڑا دیا ہے۔ یہ باڈی گارڈ اس گھر میں موجود تھا جہاں سے ہم نے ماریا کو اُٹھایا تھا۔''

''زرگاں کی عام صورتِ حال کیا ہے؟'' میں نے اسحاق سے پوچھا۔

''حکم اور جارج گورا غصے سے بھرے ہوئے ہیں۔ تمہیں پتا چلا ہی ہووے گا کہ حکم نے یں بے گناہ لوگن کو سرِ عام سولی پر چڑھایا ہے۔ یہ تماشا دیکھنے کے لئے جارج کی وہ خبیث ہن خود بھی موقع پر موجود تھی۔ جارج نے سب لوگن کے سامنے اپنی بہن سے وعدہ کیا ہے کہ س کی ایک انگلی کے بدلے جب تک وہ انگلی کاٹنے والوں کے سر ناہیں کاٹے گا، چین سے اہیں بیٹھے گا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا کوئی بڑی لڑائی ہوگی؟''

''ضرور ہوگی۔'' اسحاق نے یقین سے کہا۔ ''دونوں بھائی اب کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے ہیں۔ پتا چلا ہ کہ زرگاں میں عام لوگن کو بھی اسلحہ دے کر لڑنے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ چھوٹے سرکار نے آج دوپہر کو اعلان کیا ہے کہ اگر ہم پر حملہ ہوا تو پوری طاقت سے جواب دیویں گے۔ مراد شاہ صاحب نے بھی کہا ہے کہ جن لوگن کو ہم نے پناہ دی ہے، ان کی حفاظت جان پر کھیل کر بھی کی جاوے گی۔''

گھڑ سوار سپاہیوں کا ایک بڑا دستہ دیوان خانے کے سامنے سے گزرا۔ ان کے علم بیرونی دیوار کے اوپر سے دکھائی دیئے۔

میں نے اسحاق سے کہا کہ وہ ذرا جا کر بارونداجیکی کی خبر لے لے۔ میں ابھی کچھ دیر میں اس کے پاس آؤں گا۔

عبدالرحیم نے کہا۔ ''وہ سہ پہر کے وقت بہت شور مچاوت تھا۔ اسے پھر اپنی کشتی میں واپس جانے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ بلند آواز میں چلا رہا تھا...... پھر چلاتے چلاتے ہی سو گیا۔''

''میں نے تو ایک اور بات سنی ہے۔'' اسحاق نے قدرے مدھم آواز میں کہا۔

''کیا؟''

''زرگاں سے بھاگ کر یہاں آنے والے لوگن میں راج بھون کی کچھ کنیزیں بھی شامل ہیں اور ان میں اشوک ساہنی کی بیٹی بھی ہے۔''

''کون اشوک ساہنی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی شکنتلا کا پتا...... مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں پہنچنے والی عورتوں میں شکنتلا بھی

ہے۔"

میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ شکنتلا کے بارے میں، میں نے جیکی سے اتنا کچھ سنا تھا کہ اسے دیکھے بغیر بھی میں اسے جاننے پہچاننے لگا تھا۔

"کیا...... تم یقین سے...... کہہ سکتے ہو کہ ان میں شکنتلا بھی ہے؟"

"پورے یقین سے تو ناہیں...... لیکن سنا یہی ہے۔"

میں نے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ "ایک کام کرو اسحاق...... پتا کرو کہ واقعی ایسا ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ یہاں آ گئی ہے؟"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہ ہو لیکن میں جاننا چاہتا ہوں۔"

اسحاق نے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کرے گا۔

جیکی کی ساری کہانی اور اس کی ساری ذہنی کیفیت مجھے معلوم تھی۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اب شکنتلا سے اس کی ملاقات دوبارہ ہوگی...... لیکن اگر وہ واقعی یہاں آ گئی تھی تو پھر ایسا ہو بھی سکتا تھا...... اور اگر ایسا ہو جاتا تو یہ بارونداجیکی کے لئے انتہائی سنسنی خیز واقعہ ہوتا۔ شکنتلا اور جیکی کے بارے میں سوچتا ہوا ہی میں واپس اپنی آرام دہ قیام گاہ میں پہنچ گیا۔

سلطانہ پھر غسل خانے میں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ روزانہ نہا رہی تھی اور اس کا غسل طویل تر ہوتا تھا۔ آج بھی اس نے باہر آنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور بازو پتھر کی رگڑ سے سرخ نظر آ رہے تھے۔

بالو رو رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے گود میں تو نہیں اُٹھایا تاہم اتنی مہربانی کی کہ اسے دیکھنے لگی۔

"دودھ پلایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے مزید تفصیل نہیں پوچھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ میری معلومات کے مطابق اس نے دودھ نہیں پلایا تھا۔ وہ ابھی صفیہ کا دودھ ہی پی رہا تھا۔ میں ابھی اس صورتِ حال کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔

"ہاتھ آگے کرو سلطانہ۔" میں نے کہا۔

وہ ہاتھ کو بس تھوڑی سی حرکت دے کر رہ گئی۔

میں نے اس کا بھیگا ہوا سرخ ہاتھ پکڑا اور گجرا اس کی کلائی میں باندھ دیا۔ اس کا جسم پھر

لرزنا شروع ہو گیا۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہوتی تھی یہ۔ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے سر پر لادا گیا ہو...... اور اس بوجھ کے ساتھ اسے اونچے نیچے راستے پر چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ اس کی "سوچ کی کمر" کانپ رہی ہو، بل کھا رہی ہو۔

"کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے اثبات میں سر ہلانے سے اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو گرے مگر ان آنسوؤں کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی بھوری چٹان کی سی سختی اور خاموشی تھی۔ اس سختی اور خاموشی کے پیچھے کیا پوشیدہ تھا، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سے باتیں کرتا رہا۔ بالو بھی اُٹھ گیا اور اس کی گود میں بیٹھ کر ہمکنے لگا۔ سلطانہ کا چہرہ زرد ہونے لگا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کہیں اسے دھکیل کر پیچھے نہ ہٹا دے۔ میں نے بالو کو اپنی گود میں لے لیا۔

سامنے ایک منقش پلیٹ میں پھل رکھے تھے۔ چھری بھی پڑی تھی۔ میں نے سلطانہ سے کہا۔ "ایک سیب کاٹو۔"

وہ شدید تذبذب میں نظر آئی لیکن جب میں نے دوبارہ کہا تو وہ لرزاں ہاتھوں سے سیب چھیلنے لگی۔ ایک دم تیز دھار چھری اس کی انگلی میں لگ گئی۔ خون بہنے لگا۔ میں نے اس کی انگلی کو اپنے انگوٹھے سے دبا دیا۔ خون کا اخراج ذرا کم ہوا تو میں نے پٹی باندھ دی۔

"مہروج! مجھ کو معاف کرنا۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

رات کو میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک پھر بارونداجیکی کے پاس رہا۔ ہم نے مارشل آرٹ پر بہت سی باتیں کیں اور عملی مشق بھی کی۔ میرے کل کے زخموں کی وجہ سے جیکی نے آج مجھ پر زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ وہ ایسے ہی کرتا تھا۔ اگر ایک دن بہت سخت مشق ہو جاتی تھی تو اگلے روز ہاتھ تھوڑا سا ہلکا رکھتا تھا۔ آج وہ اپنی کشتی کے بارے میں واقعی بہت دکھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "کیا بات ہے، آج کشتی بہت یاد آ رہی ہے؟"

"ہاں، جب کسی چیز کے دوبارہ ملنے کی امید کم ہونے لگتی ہے تو پھر اس کی یاد زیادہ کٹھور ہونے لگتی ہے۔"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہو جیکی؟"

"زرگاں اور نل پانی میں ٹھن گئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب میں پھر زرگاں کی طرف جا

سکوں گا اور کشتی تک پہنچ سکوں گا۔"

"کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ اس کشتی سے بڑھ کر آپ کو کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔"

"ہاں، کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"کشتی والی بھی نہیں؟" میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

اس کے ہڈیوں بھرے چہرے پر کرب اور اداسی کے گہرے سائے پھیل گئے۔ وہ لمبی آہ بھر کر بولا۔ "اس کی بات کیوں کرتے ہو؟ اس کی چاہت تو ہر پیمانے اور موازنے سے جدا چیز ہے۔ وہ تو ایک ایسی ہستی ہے جس نے مجھے تھوڑے سے وقت میں ہزار ہا برس کی پُر بہار زندگی کی راحتیں دیں اور جو اب مجھے مرنے کا حوصلہ بھی بخش رہی ہے۔ اس کی بات مت کرو۔"

"آپ اسے ایک بار دوبارہ دیکھنے کی چاہت تو رکھتے ہوں گے؟"

"آج تم بے معنی سوال کر رہے ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ہوا سے پوچھے کہ کیا تم چلنے کی چاہت رکھتی ہو۔ پانی سے پوچھے تم بہنے کی چاہت رکھتے ہو اور سرما کی طویل رات، گھونسلے میں گزارنے والے پرندے سے پوچھے...... کیا تمہیں صبح کا انتظار ہے؟"

"ہاں، کبھی کبھی لگتا ہے کہ آپ واقعی شاعری کر سکتے ہو۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنی یادوں کو کچھ یادگار نغموں میں ڈھال دو۔"

"یہ ایک اور بے معنی بات۔" وہ زچ ہو کر بولا۔ "میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب تو کشتی پر واپس پہنچنے کی آس بھی ختم ہو گئی ہے۔ اب تو میں کسی بھی وقت...... کہیں سے بھی عالم بالا کی طرف رخصت ہو سکتا ہوں...... یوں کر کے۔"

اس نے اپنے ہاتھ سے ہوائی جہاز کی طرح اڑنے کا اشارہ دیا۔

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مارشل آرٹ کے آسمان کا تابندہ ستارہ تھا...... اب آہستہ آہستہ مجھے اس کے بارے میں اور بھی کئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ تین چار سال پہلے اس نے ہانگ کانگ میں بنی ہوئی کسی فلم میں کام بھی کیا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ عنقریب ہالی وڈ کی کسی بڑی فلم میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے ابھر رہا تھا۔ غالباً کسی انگلش آرٹیکل میں، میں نے اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ فائٹ کے وقت جیکی کا جسم ہی نہیں، اس کی اسپرٹ بھی مقابلے میں حصہ لیتی ہے۔ وہ اپنے مدِ مقابل کو مسمرائز کر دیتا ہے۔ اس کے ایک معروف برطانوی حریف نے اعتراف کیا تھا کہ وہ جب بھی جیکی سے مقابلہ کرتا ہے، اسے اپنی توانائی میں غیر معمولی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پھر ایک جاپانی

فائٹر نے لکھا تھا...... حریف کو چوٹ لگا کر بھی اگر آپ اسے درد میں مبتلا نہیں کر پاتے تو آپ کا حوصلہ ٹوٹنے لگتا ہے اور جیکی کے ساتھ لڑتے ہوئے یہی حوصلہ شکنی اعصاب کو جکڑ لیتی ہے۔ وہ چوٹ کو حیران کن صلاحیت سے جھیل لیتا ہے اور اگر اس نے اپنی یہ صلاحیت مزید پروان چڑھا لی تو بہت جلد...... کوئی اس کے سامنے ٹک نہیں سکے گا......

یہ...... اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں کہی جا رہی تھیں لیکن پھر اچانک یہ ابھرتا ہوا ستارہ مارشل آرٹ کے اُفق سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس تیز رفتار دور میں کسی کو تادیر کہاں یاد رکھا جاتا ہے۔ یقیناً جیکی کے بارے میں بھی چند ماہ تک مختلف خبریں گردش کرتی رہیں ہوں گی۔ ایسی دو چار اُڑتی اُڑتی خبریں ہم نے بھی سنی تھیں۔ کسی نے کہا کہ جیکی کو اس کے مخالفوں نے ہنگری کے کسی نائٹ کلب میں قتل کر ڈالا ہے۔ ایک دفعہ یہ سنا کہ وہ شو بز اور فائٹنگ آرٹ سے بالکل کنارہ کش ہو کر بدھ مت کا پیروکار بن گیا ہے اور کسی اسٹوپا میں رہتا ہے...... وغیرہ...... وغیرہ......

آج ماضی کا وہ معروف کردار یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کے اس دیوان خانے میں میرے سامنے موجود تھا۔ اس کے ساتھ طوفانی عشق کی ایک حیران کن داستان نتھی تھی۔ پچھلے دو ڈھائی سال میں وقت کی مہیب لہریں اس سے یوں ٹکراتی ہوئی گزری تھیں کہ وہ جسمانی اور روحانی طور پر تہ و بالا ہو کر ناقابلِ شناخت ہو گیا تھا۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو؟" جیکی نے مجھے چونکایا۔

"آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"ماضی کے بارے میں سوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مستقبل کے بارے میں سوچو۔ میں اتنی بُری حالت میں بھی، تم پر محنت کر رہا ہوں۔ اس محنت کا چالیس پچاس فیصد تو تم میں ظاہر ہونا چاہئے۔ اگر نہیں ہوگا تو میری روح بے چین رہے گی۔"

میں ابھی جیکی کو شکنتلا کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس بات کا انتظار کرنا تھا کہ اسحاق، شکنتلا کے بارے میں اصل صورتِ حال معلوم کر لے۔

اس رات جیکی پھر نشے کی حالت میں اپنا پسندیدہ نیپالی نغمہ گاتا رہا۔ اسے آج کافی تیز بخار بھی تھا۔ بخار کی مدہوشی، شراب کے نشے سے مل کر دو آتشہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے لنگوٹ کی تہوں میں سے، کاغذ میں لپٹی ہوئی شکنتلا کی تصویریں نکال لیں۔ انہیں اَن گنت بوسے دیئے اور پھر انہیں دوبارہ لنگوٹ کی تہوں میں محفوظ کر کے سو گیا۔

دوسرے روز دوپہر کو ڈاکٹر چوہان آیا۔ اس نے بتایا کہ چھوٹے سرکار مجھ سے ملنا چاہتے

ہیں۔انہوں نے مجھے دیوان کے مہمان خانے میں طلب کیا ہے۔

کوئی دو گھنٹے بعد میں اس محل نما عمارت کے وسیع احاطے سے گزرا۔ یہاں مجھے شان دار ہاتھی ''بادل'' بھی نظر آیا۔ یہی بادل نامی ہاتھی تھا جس نے ایک مسلمان مزدور کو زخمی کیا تھا اور جس کی پاداش میں ہاتھی کا مالک یعنی چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی آج کل باقاعدہ عمر قید کاٹ رہا تھا۔ میں عمارت کے عالی شان مہمان خانے میں پہنچا۔ ایک بلند و بالا محرابی دروازے سے گزر کر اور مخملی قالینوں پر پاؤں دھرتا ہوا میں ایک خوب صورت ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں وکٹوریہ طرز کی ایک شان دار کرسی پر چھوٹے سرکار اجیت رائے موجود تھا۔ وہ حسبِ سابق بند گلے کے کوٹ اور سفید پتلون میں تھا۔ سر پر ایک زرنگار پگڑی تھی اور گلے میں بیش قیمت مالائیں۔ اس کی بارعب شخصیت نے جیسے اس سارے کمرے کو چکا چوند سے بھر دیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں چند اور کرسیاں موجود تھیں۔ ان میں سے دو کرسیوں پر انور خاں اور کپتان اجے بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں داخل ہونا کسی مہاراجا کے دربار میں داخل ہونے کی طرح سنسنی خیز تھا۔ ایک طرف شیشے کی اٹالین تپائی پر چند جدید رائفلیں اور ان کے لوازمات رکھے تھے۔ شاید میرے یہاں آنے سے پہلے اس اسلحے پر ڈسکشن ہو رہی تھی۔

میں نے ادب سے سلام کیا۔ چھوٹے سرکار نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں قدرے جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد چھوٹے سرکار نے اپنی بارعب آواز میں کہا۔ ''ہمیں مراد شاہ اور ڈاکٹر چوہان سے تمہارے بارے میں کافی جان کاری مل چکی ہے۔ تمہاری روداد کافی انوکھی ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ مختار راجپوت کی بیٹی نے زرگاں میں تمہاری جیون بچانے کے لئے وہ انگوٹھی استعمال کی تھی جو ہمارے سورگ باشی پتا نے اس کے پریوار کو بخشی تھی۔ یہ ایک بڑا بلیدان ہے۔ اس لڑکی نے دوسرا بلیدان کچھ ہی دن پہلے دیا ہے۔ اسے جارج کے ستم کا شکار ہونا پڑا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس صورتِ حال کے لئے ہم بھی ذمے دار ہیں۔ ہمارا دوش یہ ہے کہ ہم نے اس لڑکی کی فریاد کے باوجود اسے اور تمہیں زرگاں واپس بھیج دیا...... ہم اس کے لئے شرمندہ ہیں۔''

میں چونک کر چھوٹے سرکار کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہاں واقعی شرمساری نظر آ رہی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی۔ اس دور میں کوئی چھوٹا موٹا افسر یا زمیندار وغیرہ بھی اپنی انا کے خول سے باہر نہیں نکلتا۔ اپنا قصور تسلیم کرنا تو دور کی بات ہے۔ چھوٹے سرکار ایک وسیع اسٹیٹ کا مختارِ کل تھا اور وہ مجھ جیسے ادنیٰ شخص کے سامنے شرمسار دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے خلوصِ دل سے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! یہ آپ کی بڑائی ہے کہ آپ ایسا کہہ رہے

ہیں لیکن ہم آپ کو دوشی کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس وقت آپ نے وہی کیا جو آپ کو کرنا چاہئے تھا۔ اس وقت تو موہن کمار وغیرہ نے آپ کے سامنے ثابت کر دیا تھا کہ سلطانہ ہی ہارون کی قاتلہ ہے۔''

''پھر بھی ہم سمجھت ہیں کہ ہم سے جلد بازی ہوئی۔ اس کے لئے ہمیں بہت افسوس ہے۔ ہم بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ تمہاری پتنی کو صحت دیوے اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں سپل ہو جاوے۔ ہم نے یہاں اجے کو ہدایت دے دی ہے کہ تمہارے سمیت مختار راجپوت کی فیملی کی سیکیورٹی کا پورا انتظام کیا جاوے۔ ہم نے مختار کے بیٹے کے علاج کے لئے بھی خاص ہدایات دی ہیں۔''

''بہت شکریہ، چھوٹے سرکار!'' میں نے کہا۔

اجیت رائے کچھ دیر تک بغور میری طرف دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت و چمک تھی۔ اس کے تیکھے خدوخال والے چہرے پر ناک کا اونچا پانسہ بے حد نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ وہ بولا۔ ''مجھے انور خاں اور چوہان نے بتایا ہے کہ پچھلے کچھ عرصے میں تم بہت زیادہ بدل گئے ہو۔ تم نے خود کو حالات کے مطابق ڈھالا ہے اور رائفل اُٹھانا سیکھ لیا۔ ہے۔'' میں جواب میں خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ بہت اچھی بات ہے۔ یہ سنسار کمزور کو دباتا چلا جادت ہے۔ یہاں تک کہ زمین کے ساتھ زمین کر دیوت ہے۔ سر اُٹھا کر جینا ہی جینا ہے اور اس کے لئے بلیدان دینے پڑتے ہیں۔''

انور خاں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''چھوٹے سرکار! تابش کے لئے جارج گورا کی قید کایا پلٹ ثابت ہوئی ہے۔ یہ بڑی دلیری کے ساتھ جارج کے گھر سے نکلا ہے۔ کئی لوگوں کو اب بھی یقین نہیں کہ یہ کسی کی مدد کے بغیر جارج کا کڑا پہرا توڑ کر آیا تھا۔ بعد میں یہ ان تین لڑکوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے جارج کو قتل کرنے کا عہد کیا تھا۔ یہ بھی بڑی جرأت والی کارروائی تھی۔ ان چار لڑکوں میں سے صرف دو زندہ بچے ہیں۔ بے شک یہ لڑکے ناکام ہوئے سرکار! مگر یہ جارج کی خودسر بہن کو سخت حفاظت کے باوجود اُٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔''

چھوٹے سرکار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''پتا چلا ہے کہ تم ایک ایسے نیپالی کو اپنے ساتھ لائے ہو جس کا ایک بازو اور پاؤں کٹا ہوا ہے اور یہ وہی ہے جو کچھ برس پہلے زرگاں میں جارج کی بہن کا ٹیچر بن کر آیا تھا؟''

''جی سرکار! یہ وہی ہے...... باروندا جیکی...... زرگاں میں لوگ سمجھتے تھے کہ وہ تین ماہ

اسٹیٹ میں رہ کر واپس چلا گیا تا لیکن وہ جارج گورا کی جس بے جا میں تھا۔ پھر وہاں سے فرار ہوا اور گارڈز سے بچ کر چھوٹی ندی کے کنارے ایک جنگل میں چھپا رہا۔"

"وہاں اس نے بہت سا عرصہ ایک فش بوٹ میں گزارا ہے سرکار! تابش وغیرہ نے اس فش بوٹ میں ہی اسے دیکھا تھا۔" انور خاں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

چھوٹے سرکار نے زرنگار کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی شفاف ٹھوڑی کھجائی اور بولا۔ "کیا واقعی...... یہ شخص اشوک ساہنی کی بیٹی کے عشق میں گرفتار تھا؟"

"بے شک چھوٹے سرکار! ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "بلکہ وہ اب بھی گرفتار ہے اور شاید زندگی کی آخری سانس تک رہے گا۔ وہ بہت بیمار ہے۔ کسی بھی وقت ختم ہوسکتا ہے لیکن اسے اپنی موت کا بھی کوئی غم نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے عشق نے اس کے لئے مرنا بھی آسان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ......"

ایک دم مجھے شکنتلا والی بات یاد آئی اور میں خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔ "چھوٹے سرکار! اگر آپ اجازت دیں تو ایک سوال پوچھنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ ہولے سے مسکرایا۔ "پوچھو۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بولنے کا پڑھا لکھا انداز اسے متاثر کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔ "سرکار! مجھے پتا چلا ہے کہ زرگاں کے راج بھون سے کچھ لوگ بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ ان میں ساہنی صاحب کی بیٹی شکنتلا بھی ہے؟"

چھوٹے سرکار نے کہا۔ "ہاں، کسی نے مجھے یہ بات بتائی تو تھی۔ بعد میں ہم نے اس لڑکی کو پیش کرنے کا حکم دیا لیکن وہ ملی ناہیں۔ اس کے ساتھ راج بھون سے آنے والی تین چار اور عورتیں بھی ناہیں تھیں۔ دراصل زرگاں سے آنے والے لوگن جانت ہیں کہ ٹل پانی میں زرگاں کے جاسوس موجود ہیں۔ اس لئے وہ یہاں آ کر اِدھر اُدھر روپوش ہو جانا بہتر سمجھت ہیں۔"

باوردی اجے نے چھوٹے سرکار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب! اگر آپ حکم دیویں تو میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرت ہوں؟"

"ہاں ضرور کرو...... بلکہ ہم تو چاہت ہیں کہ اگر وہ مل جاوے تو اسے خاص حفاظت میں رکھا جاوے۔ وہ راج بھون کی فیریز (پریوں) میں سے ہے...... اور بھائی صاحب (حکم جی) کے جاسوس اس کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کریں گے۔"

ہماری بات چیت کے دوران میں ہی فوجی افسروں اور انتظامی عہدے داروں کا ایک وفد چھوٹے سرکار سے ملنے پہنچ گیا۔ میں اور انور خاں چھوٹے سرکار سے رخصت ہو کر واپس آ گئے۔

O......❖......O

آٹھ دس روز مزید گزر گئے۔ حالات میں کوئی خاص تبدیلی رُونما نہیں ہوئی۔ دونوں طرف جنگی تیاریاں ہو رہی تھیں تاہم اس کے ساتھ ساتھ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ میری اور باروندا جیکی کی ملاقات روز ہو رہی تھی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ مجھ پر فائٹنگ آرٹ کے نئے عقدے کھل رہے تھے۔ حقیقت ہے کہ میں خود کو ایک بدلا ہوا شخص محسوس کر رہا تھا...... میں اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو بھی شاید نہ کر سکوں۔

سلطانہ کی کیفیت میں بھی معمولی تبدیلی آئی تھی۔ تاہم وہ اب بھی بالکل الگ تھلگ اور گم صم رہتی تھی۔ کوئی اس سے اظہارِ ہمدردی کی کوشش کرتا تو وہ غصے سے پھٹ پڑتی لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ بہت نرم اور اطاعت گزاری والا ہوتا تھا۔ وہ الگ کمرے میں ہی سو رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس نے ابھی بالو کو اپنا دودھ پلانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔

ایک رات میں اسے دیکھنے اس کے کمرے میں گیا تو وہ ریشمی تکیے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کے گھنے بالوں کی چند لٹیں اس کے چہرے پر تھیں۔ بالو اس کے پہلو میں آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ خوب صورت نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر ایک صحت مند و توانا کشش تھی۔ جیسے کوئی خودرو پودا یا جنگلی پھول۔ اور وہ میری بیوی تھی۔ میں قریباً ڈیڑھ سال تک اس کے قریب رہا تھا اور ہماری قربت کی نشانی یہ بچہ تھا۔

مجھے سلطانہ کے ریشمی تکیے کے نیچے ایک ابھار سا محسوس ہوا۔ میں نے آگے جا کر دھیان سے دیکھا تو یہ ایک چھوٹی تلوار کا دستہ تھا۔ یہی وہ تلوار تھی جس سے سلطانہ نے چند دن پہلے مردانہ وار کام لیا تھا۔ اس نے ٹیلے پر "جی تھری" چلانے والوں کے پیٹ پھاڑ ڈالے تھے اور یہ تلوار وہ اب بھی تکیے کے نیچے رکھ کر سوئی ہوئی تھی۔

میں نے بہت آہستگی کے ساتھ یہ چھوٹی تلوار اس کے تکیے کے نیچے سے نکال لی...... میری احتیاط کے باوجود وہ جاگ گئی۔ مجھے دیکھا اور جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اوڑھنی اپنے سر پر رکھ لی۔

"یہ تلوار نیچے کیوں رکھی ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بب……بس یونہی۔" وہ ہکلائی۔

"تمہیں اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں اب تمہارے ساتھ ہوں۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے……شاید صرف ایک لمحے کے لئے ہم دونوں کی نگاہوں میں وہ ناقابلِ فراموش منظر گھوم گیا جب جارج گورا نے میرے گلے میں ذلت کا ہار پہنایا تھا اور سلطانہ میری بے مثال بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔

پھر سلطانہ نے نگاہ جھکالی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "سلطانہ! میں جانتا ہوں کہ میرے اوپر تمہارے کچھ قرض ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انہیں اتارنا آسان نہیں ہے……لیکن اتنا ضرور کہوں گا، اس رات کے بعد میں بتدریج تبدیل ہوا ہوں۔ میرے اندر بہت کچھ بدلا ہے سلطانہ……جس طرح جارج کا نام تمہارے ذہن میں گڑا ہوا ہے، میرے ذہن میں بھی گڑا ہے۔"

وہ دل دوز انداز میں سر جھکا کر رہ گئی۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ سوئے ہوئے بالو کا ماتھا چوما اور تلوار سمیت باہر آ گیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ریشمی پردے والے جھروکے میں سے آتش بازی کے مناظر دکھائی دیئے۔ رنگ برنگی ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں اور چھوٹے بڑے پٹاخے چل رہے تھے۔ اسی دوران میں حجام عبدالرحیم بھی آ گیا۔ میں نے اس سے آتش بازی کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ "اس کی ایک ناہیں دو وجہ ہیں مہروز بھائی……مم……میرا مطلب ہے تابش بھائی۔"

"وہ کون سی؟"

"پہلی وجہ تو شب برأت کا تہوار ہے۔ کل یہاں اسٹیٹ کے مسلمان شب برأت منائیں گے۔ دوسری وجہ کا پتا ابھی تھوڑی دیر پہلے چلا ہے۔ نل پانی اور زرگاں کے درمیان لڑائی وقتی طور پر ٹل گئی ہے۔ ہمری جان کاری کے مطابق کل نل پانی اور زرگاں کے خاص لوگن میں بات چیت ہوئی ہے جس میں دونوں طرف سے تھوڑی اور سوچ وچار کا فیصلہ کیا گیا ہے۔"

میں اور عبدالرحیم جھروکے کے سامنے کھڑے ہو کر آتش بازی کا نظارہ کرتے رہے……

نل پانی کا کافی بڑا حصہ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ جھیل کا ایک حصہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ جھیل کے کنارے کی آبادی میں سے گاہے بگاہے ہوائیاں چھوٹتی تھیں اور ان کے رنگ آسمان پر بکھرنے کے ساتھ ساتھ جھیل میں بھی منعکس ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ خوب صورت لگتا تھا۔

عبدالرحیم نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ "تابش بھائی! کیا واقعی……تم کو……کچھ یاد ناہیں؟ پچھلی شب برأت کی کوئی بات بھی تمہارے دماغ میں ناہیں؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"میں نے تمہارے گھر میں کھانا کھایا تھا۔ سلطانہ بی بی نے بڑے پیارے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پر مہندی لگائی ہوئی تھی۔ اسے یہ مہندی تم نے ہی لگائی تھی۔ وہ ہر ایک کو بتاتی پھرتی تھی کہ تم نے اسے مہندی لگائی ہے۔ بے ڈھنگی سی مہندی تھی، پر وہ اتنی خوش تھی کہ کچھ ناہیں پوچھو……اور پھر ہم اوپر چھت پر چلے گئے تھے۔ آتش بازی دیکھتے رہے تھے…… اور تم نے سلطانہ بی بی کے ساتھ مل کر درجنوں موم بتیاں روشن کی تھیں…… کچھ تو یاد ہوگا تمہیں؟"

مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ "نہیں…… مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ میں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے رحیم نے بھی گفتگو کا رخ بدل دیا۔

ہم اس کے جانے کے بعد میں اس کی بات پر غور کرتا رہا۔ کل شب برأت کا تہوار تھا۔ اس موقع کو سلطانہ کو نارمل کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اگلے روز سلطانہ کو مجبور کیا کہ وہ نیا لباس پہنے۔ میں اس کے لئے گیندے اور موتیے کے بہت سے پھول اور گجرے لایا۔ میں نے اس سے فرمائش کی کہ وہ آج مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ پکا کر کھلائے۔ میری اس فرمائش نے اس کا چہرہ زرد کر دیا۔ بہرحال، میرے اصرار کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی۔ وہ جھلمل کپڑوں میں ملبوس پہلی بار گھر کے باورچی خانے میں گئی تو ملازمائیں اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ خوش گوار ٹھنڈک والی ایک خوشبودار شام تھی۔ سلطانہ نے لکھنوی طرز کے چاول بنائے اور بادام کشمش والا زعفرانی حلوہ پکایا۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر پہلی بار ہم دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ جھروکوں سے باہر تاروں بھرا آسمان تھا اور آتش بازی کے رنگ تھے۔ کہتے ہیں کہ ننھے بچے اور اس کے والدین کے درمیان ایک نادیدہ رابطہ ہوتا ہے۔ بالو کی آنکھوں میں بھی آج مسکراہٹ تھی۔ اس شام مجھے

پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ ایک بڑے حادثے کے بعد سلطانہ نارمل زندگی کی طرف آ سکتی ہے۔ اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے زہرناک مایوسی کے بادل چھٹ سکتے ہیں۔

لیکن میں غلط تھا۔ جو کچھ میں سوچ رہا تھا، وہ ہونے والا نہیں تھا...... اور وہ ہونے وا
تھا جو اس شام میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب میں نے سلطانہ اور بالو کو کمرے میں چھوڑا اور اپ
کمرے میں واپس آ کر سو گیا۔

میری آنکھ صبح سویرے ایک تیز آواز سے کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ملازمہ صفیہ برآمدے میں کھڑی چلا رہی تھی۔ ''سلطانہ بی بی...... سلطانہ بی بی......!''

پھر وہ میری طرف مڑی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مالک! سلطانہ بی بی کمرے میں ناہیں ہیں۔ وہ کہیں بھی ناہیں ہیں۔''

''غسل خانے میں دیکھا؟''

''جی مالک......''

میں صفیہ کے ساتھ دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچا۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ کل رات میرے اصرار پر جو لباس سلطانہ نے پہنا تھا، وہ ایک طرف فرش پر پڑا تھا۔ پھولوں کے سارے گہنے بھی ٹوٹے پھوٹے ایک طرف دھرے تھے۔ بالو بستر کے ایک گوشے میں سو رہا تھا۔ باقی بستر پر بہت کم سلوٹیں تھیں اور یوں لگتا تھا کہ سلطانہ اس پر تھوڑی دیر کے لئے ہی لیٹی ہے۔

''کہاں جا سکتی ہے؟'' میں نے اضطراب کے عالم میں کہا۔

''کچھ پتا ناہیں جی! بی بی کا بھتیجا طلال بھی ناہیں ہے۔ لگت ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گئی ہیں۔''

ایک دم میرا دھیان اس چھوٹی تلوار کی طرف گیا جو میں نے ایک دن پہلے سلطانہ کے تکیے کے نیچے سے نکالی تھی۔ میں نے وہ ساتھ والے اسٹور نما کمرے کی الماری میں رکھی تھی۔ میں نے الماری کھولی۔ تلوار اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

میں تیزی کے ساتھ اپنی قیام گاہ سے باہر آیا۔ میں نے باوردی پہرے داروں سے پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان سلطانہ بی بی اپنے نوعمر بھتیجے طلال کے ساتھ یہاں سے گزری تھی۔ اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی اور چہرہ بھی نصف چھپا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شدید بخار میں ہے اور چھوٹے سرکار نے اس سے کہہ رکھا ہے کہ وہ

جب چاہے، ان کے ذاتی معالج کو دکھا سکتی ہے۔

میں پہرے داروں سے بات کر ہی رہا تھا جب چوہان اور رحیم بھی وہاں آ گئے۔ ہم فوراً چھوٹے سرکار کے ذاتی معالج حکیم خدا بخش کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ حکیم صاحب دیوان کے اندر ہی ایک رہائشی حصے میں رہتے تھے۔ ہم ان کے پاس پہنچے تو میرے دل میں چھپا ہوا اندیشہ درست نکلا۔ سلطانہ اور طلال رات کو یہاں آئے ہی نہیں تھے......

چوہان نے کہا۔ ''وہ دیوان کے شمالی گیٹ کی طرف گئے ہوں گے۔''

ہم شمالی گیٹ پر پہنچے۔ ابھی رات کی ڈیوٹی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ یہاں وہی پہرے دار موجود تھے جنہوں نے رات بھر اس گیٹ کی نگہبانی کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس راستے سے کوئی باہر نہیں گیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں ابھی دیوان کی چاردیواری میں ہی ہیں۔'' رحیم نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔'' چوہان پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''اس کی نگاہیں دور ایک سرخ رنگ کے بند پھاٹک کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ نل پانی کے سرکاری اصطبل کا پھاٹک تھا اور یہ اصطبل دیوان خانے کے اندر ہی تھا۔ پھاٹک کے سامنے ایک دو گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''اگر وہ دونوں، رات کو حکیم خدا بخش صاحب کی طرف نہیں گئے اور نہ ہی اس گیٹ سے باہر نکلے ہیں تو پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اصطبل کی طرف گئے ہوں۔''

''مطلب؟''

چوہان نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے انچارج پہرے دار سے پوچھا۔ ''رات کو یہاں سے گھوڑا گاڑیاں گزرتی رہی ہیں؟''

''جی ہاں۔'' پہرے دار نے جواب دیا۔ ''تین چار گزری ہیں۔ چھوٹے سرکار کے کچھ مہمان تھے جو آدھی رات کے بعد واپس گئے۔ ایک دودھ لانے والی گاڑی تھی...... ایک شاید اور تھی۔''

''تم اندر آنے والی گاڑیوں کو ہی چیک کرتے ہو یا باہر جانے والی گاڑیوں کو بھی؟''

''اندر آنے والیوں کو ہی چیک کیا جاتا ہے جی...... یا پھر کوئی خاص آرڈر ہو تو......''

چوہان نے ایک گہری سانس لی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے

تابش...... سلطانہ اب ہمیں یہاں نہیں ملے گی۔ پھر بھی ہم تسلی کے لئے چیک کر لیتے ہیں۔''

...... چوہان نے بالکل درست کہا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے میں ہم نے ہر جگہ دیکھ لیا...... سلطانہ کے غائب ہونے کی خبر پورے دیوان میں پھیل چکی تھی۔ ہر جگہ ہلچل نظر آ رہی تھی۔ سلطانہ دیوان کی عمارت میں کہیں نہیں تھی۔

اب اس کی تلاش کا سلسلہ دیوار کی عالی شان عمارت سے باہر شروع ہوا۔ مراد شاہ کے فوری حکم کے تحت گھڑسواروں کی ٹولیاں اردگرد کے علاقے میں پھیل گئیں اور خاص و عام سے پوچھ گچھ ہونے لگی۔

میں شدید شاک کی کیفیت میں تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ کل رات تک وہ بہت نارمل نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بہتری کی طرف اس کا سفر شروع ہو جائے گا لیکن اب وہ منظر سے اوجھل تھی۔ اس کے اوجھل ہونے کا انداز ذہن میں مزید اندیشے ابھارتا تھا۔

چوہان کے ذہن میں بھی ایسے ہی اندیشے تھے۔ وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''تابش مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے خطرے پیدا کرے گی۔''

''دوسروں سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''جارج گورا اور اس کے قریبی ساتھی...... وہ جارج گورا کو معاف نہیں کر سکی۔ وہ جس خانوادے سے تعلق رکھتی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ آن پر مر مٹنے والے لوگ ہیں۔ حاکم لوگ پیار سے ان کی جان بھی لے لیں تو دے دیتے ہیں مگر ان کو سر جھکا کر جینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ راجپوت برادری کی وہ لڑکی ہے جو انگریزوں کے دور میں حیدرآباد دکن سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھی۔ یہ لوگ فن سپاہ گری میں ہمیشہ سے تاک ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی عورتیں بھی تلوار کی دھنی ہوتی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اور طلال یہاں سے نکل کر زرگاں کی طرف گئے ہوں گے؟''

''یہ ایسی ناممکن بات نہیں ہے۔ وہ اپنی عزت کے لٹیرے کے لئے سرتاپا قہر ہے۔ ایسے میں وہ راستے کی مشکلوں کے بارے میں زیادہ نہیں سوچے گی۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہئے۔ اسے پتا ہو گا کہ عام حالات میں بھی جارج گورا کے گرد سخت حفاظتی حصار ہوتا ہے۔ ان حالات میں تو اس کے قریب چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہو گی۔ وہ اپنی جان گنوانے کے سوا اور کچھ نہیں کر پائے گی۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ فوری طور پر زرگاں کی طرف نہ جائے۔ ابھی یہیں کہیں نل پانی میں چھپ کر لائحہ عمل بنائے...... طلال اس کے ساتھ ہے۔ وہ اپنی برادری کے کچھ اور افراد کی مدد لینے کے بارے میں بھی سوچ سکتی ہے۔''

''ایسی سوچ بچار تو ٹھنڈے دل و دماغ سے کی جا سکتی ہے تابش! وہ جس طرح یہاں سے گئی ہے، لگتا ہے کہ اس کے اندر ایک آگ ہے۔ وہ آگ اسے شاید ہی کہیں رکنے دے۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق مراد شاہ صاحب نے راستے کی چوکیوں کو خبردار کر دیا ہے۔ اگر وہ زرگاں کے رخ پر گئی ہے تو ہو سکتا ہے کہ اسے راستے میں کہیں ٹریس کر لیا جائے۔''

''یہ بات وہ بھی تو سوچ سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے وہ فوری طور پر زرگاں کا رخ نہ کرے......''

اسی دوران میں اجے تیز قدموں پر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے اس کے دو باوردی ماتحت تھے۔ ماتحت دروازے پر ہی کھڑے رہے۔ اجے نے اندر آ کر ہمیں بتایا۔ ''اندرونِ شہر سے اطلاع ملی ہے کہ اسلحے کی ایک دکان پر ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ ڈاکو ایک اکیلا لڑکا تھا۔ وہ ایک رائفل، ایک پستول اور کچھ ایمونیشن لوٹ کر لے گیا ہے...... دکان دار کے بازو پر تلوار کا زخم آیا ہے۔ تفتیش کرنے والے تھانے دار نے شک ظاہر کیا ہے کہ یہ لڑکا، سلطانہ بی بی کا ساتھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال، اس حوالے سے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

یہ اہم اطلاع تھی۔ ہم نے مشورہ کیا اور فوراً اجے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ایک فوجی گھوڑا گاڑی میں ہم دیوان کی عالی شان عمارت سے نکلے اور اندرون شہر کی طرف چل دیئے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ نل پانی کے گلی کوچوں میں زندگی معمول کے مطابق رواں تھی۔ جنگی تناؤ وقتی طور پر ختم ہو گیا تھا اور اس تبدیلی کے آثار لوگوں کے چہروں پر بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ بازاروں میں خریداروں کا رش تھا۔ باغوں اور دیگر تفریح گاہوں میں بھی رونق تھی۔ بہرحال، لوگوں کے ذہنوں میں یہ شک بھی موجود تھا کہ اس صورتِ حال کے پیچھے زرگاں والوں کی کوئی سازش نہ ہو۔

گھوڑا گاڑی ایک ایسی آبادی میں پہنچی جہاں پرانی طرز کی دو تین منزلہ گنجان عمارتیں تھیں۔ یہاں گلیاں تنگ اور راستے پیچ دار تھے۔ ایک جگہ گاڑی سے اُترنے کے بعد ہم پیدل ہی ایک بازار میں داخل ہوئے۔ ایک دکان کے سامنے پولیس کے باوردی سپاہی موجود تھے۔ پولیس کی وردی یہاں، انڈیا کی عام پولیس سے ملتی جلتی تھی۔ بس پگڑی کا اضافہ تھا۔

پولیس والوں نے اجے کو فوجی افسر کا پروٹوکول دیا۔ اسے سیلیوٹ کیا گیا اور بڑے احترام سے موقع واردات پر پہنچایا گیا۔ زخمی دکان دار مدن لال دکان میں ہی موجود تھا۔ اس کے بازو پر بڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور فربہ چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

تھانے دار کے اشارے پر اس نے کراہتے ہوئے بتایا۔ ''جناب! دوپہر کے سمے گاہک وغیرہ کی آشا کم ہی ہووت ہے۔ بھوجن کے بعد میں ذرا آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا...... ملازم لڑکا سامنے کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے ہی سویا تھا کہ ایک دم آنکھ کھل گئی۔ اس کے منہ پر کالا نقاب اور ہاتھ میں دو فٹ لمبی تلوار تھی۔ اس نے تلوار یہاں...... میری گردن پر رکھ دی اور کہا کہ میں بولا تو وہ گلا کاٹ دیوے گا۔ اس نے مجھ سے شوکیس کی چابی مانگی۔ میں چابی لینے کے بہانے تھوڑا سا آگے گیا اور پھر میں نے جلدی سے باہر نکلنا چاہا۔ وہ میرے وچار سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے تلوار چلا کر میرا بازو گھائل کر دیا...... میں یہاں گر پڑا، اس کرسی کے پاس۔ یہ دکان کا پچھلا کمرا ہے۔ بازار سے گزرنے والے کسی بندے کو پتا بھی ناہیں چلا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ اس نے شوکیس کی چابی مجھ سے لی۔ بڑے سکون کے ساتھ شوکیس کھولا۔ اس میں سے ایک سات ایم ایم رائفل اور ایک کولٹ پسٹل نکال لیا۔ رائفل کے کوئی دو سیکڑے راؤنڈ بھی وہ خبیث اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اس نے جاتے جاتے ہم کو دھمکی دی کہ اگر ہم نے زبان کھولی تو وہ پھر آوے گا اور تب ہماری ہتھیا کئے بنا ناہیں جاوے گا......''

دکان دار نے اپنی ساری بپتا ایک ہی سانس میں کہہ ڈالی۔

''جس وقت یہ سب ہو رہا تھا، تمہارا ملازم کہاں تھا؟'' اجے نے پوچھا۔

''اس غریب کو اس نے یہ سامنے والے غسل خانے میں بند کر چھوڑا تھا جی۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے آواز تک ناہیں نکالی۔''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''وہ ذرا کمزور دل کا ہے جی۔'' تھانے دار نے کہا۔ ''اس کو بے ہوشی ہو رہی تھی۔ اسے ساتھ والے اسپتال میں بھرتی کرایا ہے۔''

ہمارے یہاں آنے سے پہلے تھانے دار محمود نے تفتیش کا کچھ کام کیا تھا۔ اس نے فوجی افسر اجے کو اس تفتیش سے آگاہ کیا۔ اجے اور تھانے دار محمود کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ یہاں گھوڑوں کے بھی نمبر ہوتے ہیں اور یہ نمبر ان کی پیٹھ پر بڑے اہتمام سے داغے جاتے ہیں۔ ان نمبروں کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو عام جگہوں پر گاڑیوں کے نمبروں

وغیرہ کی ہوتی ہے۔ ایک قریبی دکان دار نے بتایا تھا کہ واردات کرنے والا گھوڑے پر آیا تھا۔ اس گھوڑے کی پیٹ پر داغا ہوا نمبر بھی اس دکان دار کو کسی حد تک یاد تھا۔ اجے نے اس دکان دار کو طلب کیا۔ وہ مزید گواہوں کے بیان بھی سننا چاہتا تھا۔ میں اس طویل تفتیشی کارروائی سے اُکتا کر گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھا۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔ سلطانہ اور اس کا بھتیجا کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہ سوال ایک آہنی میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑا ہوا تھا۔

فوجی گاڑی اندر سے بہت آرام دہ تھی۔ اس کی کھڑکیوں پر مخملی پردے پڑے ہوئے تھے۔ تاہم ان پردوں کی جھریوں میں سے باہر کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔ بازار کی گہما گہمی کی جھلکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک ایک منظر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ ایک تئیس چوبیس سالہ نوجوان تھا۔ اس نے ایک ڈبی دار چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ ایک ٹھیلے والے کے عقب میں کھڑا وہ کھوجی نظروں سے فوجی گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز مشکوک تھا لیکن جس چیز نے مجھے چونکایا، وہ اس کی صورت تھی۔ میری نگاہوں میں وہ مناظر گھوم گئے جب اپنے ہوش و حواس میں واپس آنے کے بعد میں نے پہلی بار اسٹیٹ سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور تیواری لال اور ڈیوڈ وغیرہ مجھے جنگل سے پکڑ کر واپس لائے تھے۔ ان واقعات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مجھے ان سب لوگوں کے چہرے یاد تھے۔ یہ شخص بھی ان میں سے تھا...... میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی لیکن یہ شخص زرگاں سے کوسوں دور یہاں تل پانی کے اس بازار میں کیسے موجود تھا؟ میں نے کھڑکی کے قریب جا کر دیکھا۔ وہ مضطرب نظر آتا تھا۔

میں گھوڑا گاڑی سے باہر آ گیا۔ میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ مجھے دیکھ کر وہ گہرا سانولا شخص بری طرح بدکا اور ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے جسم میں لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مڑا اور مخالف سمت میں چل دیا۔ میں نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ واضح طور پر بوکھلا گیا۔ اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں نے بھی رفتار تیز کر دی۔ یہ گنجان بازار تھا۔ وہ کسی بھی وقت نگاہوں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ میں مسلسل اس کے پیچھے ہوں تو وہ ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اس کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس بازار میں زیادہ تر خواتین ہی خریداری کر رہی تھیں۔ کپڑوں، چوڑیوں اور گہنوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ہر طرف برقعے یا رنگ دار چادریں دکھائی دیتی تھیں۔ میں دوڑا تو مرد و زن سے میرا تصادم شروع ہو گیا۔ کئی خواتین میرا دھکا لگنے

سے گریں اور چلائیں۔ ایک فربہ اندازم قلفی فروش میری ٹکر لگنے سے آرائشی سامان کی ایک دکان میں جا گرا اور وہاں کھلبلی مچ گئی۔ مجھے اردگرد کا ہوش نہیں تھا۔ میری نگاہ بس بھاگنے والے شخص پر تھی اور میں کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک جگہ وہ ایک گھوڑا گاڑی سے ٹکرا کر گرا اور پھر فوراً اُٹھ کر ایک تنگ گلی میں گھس گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گلی میں گیا۔ یہ کوئی مرچ مسالے کا بازار تھا۔ ہر طرف مسالوں کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

''پکڑو......پکڑو۔'' میں نے پکارنا شروع کیا۔

میری پکار پر کسی نے فوری عمل تو نہیں کیا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ مجھے ہجوم میں سے بھاگنے کے لئے نسبتاً آسانی سے راستہ ملنے لگا۔

......اگلے دو منٹ میں اندرونِ شہر کی ان بھری پُری گلیوں میں یہ اندھا دھند تعاقب جاری رہا۔ اس دوران میں کئی خوانچے الٹے اور کئی مرد و زن کو چوٹیں وغیرہ سہنا پڑیں۔ وہ شخص بھاگتا بھاگتا ایک سہ منزلہ پرانی عمارت میں داخل ہو گیا۔ دو تین سیکنڈ بعد میں بھی عمارت کے اندر تھا۔ ایک عجیب سی تلخ، جھلاہٹ مجھ پر سوار تھی۔ اس کے علاوہ ایک ترنگ سی بھی تھی۔ یہ ترنگ کیا تھی؟ شاید خود کے اندر ہونے والی اہم تبدیلیوں کے بعد میں لاشعوری طور پر کہیں اپنا حوصلہ آزمانا چاہتا تھا۔ کسی سے ٹکرانا چاہتا تھا، نبرد آزما ہونا چاہتا تھا۔

......اور اس عمارت میں گھسنے کے بعد یہ موقع مجھے مل گیا بلکہ اتنی شدت سے ملا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔

دو ہٹے کٹے افراد تیزی سے میرے سامنے آئے۔ وہ بھی سانولے تھے اور صورتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہندو ہیں۔

''اوئے......کون ہو؟'' ان میں سے ایک نے ہراساں آواز میں کہا پھر وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔

میں نے ایک کے چہرے پر کہنی کی بھرپور ضرب لگائی۔ وہ ڈکراتا ہوا لکڑی کے ایک تخت پر گرا اور وہاں رکھے تاش کے پتے چاروں طرف بکھر گئے۔

میں نے دوسرے شخص کی ناف میں گھٹنا مارا اور پھر سر کی ٹکر سے اسے دور پھینک دیا۔ اسی دوران میں دو افراد سیڑھیوں سے چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے آ گئے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس کا پیچھا کر کے میں یہاں پہنچا تھا۔ اب اس شخص کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ کلہاڑی کا خوفناک پھل چمک رہا تھا مگر وہ مجھے کسی کھلونے کی طرح لگی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کلہاڑی مجھے خراش تک نہیں پہنچا سکتی۔ شاید یہی وہ اعتماد تھا جسے میں

آج تک تلاش کرتا رہا تھا......اور یہی وہ اعتماد تھا جس کے بارے میں بارونداجیکی کہتا تھا کہ جب یہ بندے کے پاس ہو تو پھر اسے لڑنے اور جیتنے کے لئے کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں رہتی۔

کلہاڑی کا اندھا دھند وار جو میرے سر پر کیا تھا، میں نے آسانی سے بچایا اور کلہاڑی بردار کے جبڑے پر ٹانگ رسید کی۔ جبڑا ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح اور شفاف تھی۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ یہی وقت تھا جب اس گھر کا بیرونی دروازہ ایک بار پھر دھماکے سے کھلا۔ اس مرتبہ اندر داخل ہونے والے میرے ہی ساتھی تھے......چوہان اور کپتان اجے وغیرہ......

اجے کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے عقب میں اس کے باوردی سپاہی تھے۔

''خبردار......خبردار!'' اجے گرجا۔ ''گولی ماردوں گا۔''

یکایک ایک فائر ہوا اور گولی میرے کان کے پاس سے سرگوشی کرتی گزر گئی۔ یہ فائر زمین پر گرے ہوئے اسی بندے نے کیا تھا جس کا اندھا دھند تعاقب مجھے یہاں تک لایا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں کلہاڑی کی جگہ پستول نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری مرتبہ مجھے نشانہ بناتا، اجے کی چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں اُتر گئی۔

گولی لگنے سے اس کے جسم نے جھٹکا کھایا مگر اس نے پستول پر اپنی گرفت قائم رکھی۔ تڑپ کر اس نے پستول کا رخ اجے کی طرف کیا۔ تب اجے نے پھر ٹریگر دبایا۔ پستول نے دھماکے سے شعلہ اُگلا اور یہ دوسری گولی اس شخص کے جسم کے اسی حصے میں لگی جو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ یعنی اس کا جبڑا۔ وہ ایک کرب ناک کراہ کے ساتھ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔

اجے کے سپاہیوں نے رائفلیں سونت لی تھیں۔ ان کے خطرناک تیور دیکھ کر باقی افراد ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ ان کے رنگ اُڑ گئے اور جانیں بچانے کے لئے انہوں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر دیئے۔ شوٹ ہونے والے شخص کا خون تیزی سے اس کی ڈبی دار چادر کو بھگوتا چلا جا رہا تھا۔

عمارت سے باہر گلی میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ یہ ہجوم ہر لمحے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین گولیوں کی آواز نے اس گنجان علاقے میں ہر طرف سنسنی پھیلا دی تھی۔

چوہان نے مجھے ٹٹولا اور ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا تابش؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہان اور اجے وغیرہ کس چڑھی ہوئی سانسیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ میرے پیچھے

ہی پیچھے بھاگتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔

اجے کے سپاہیوں نے مرنے والے کے ساتھیوں کو ایک قطار میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ کچھ سپاہی عمارت میں پھیل گئے اور دیگر افراد کو تلاش کرنے لگے۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' اجے نے دھیمی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

''باقیوں کا تو پتا نہیں...... مگر اس بندے کو میں کسی حد تک جانتا ہوں۔'' میں نے ٹائل دار فرش پر مردہ پڑے گہرے سانولے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''کون ہے یہ؟'' اس مرتبہ چوہان نے پوچھا۔

''حکم کا ایک قریبی ساتھی۔ شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو گا لیکن تمہارے ذہن سے نکل گیا ہے۔ جب مجھے اور سلطانہ کو یہاں تل پانی سے واپس زرگاں بھجوایا گیا تو یہ شخص موہن کمارے کے ساتھیوں میں شامل تھا......''

چوہان نے چونک کر مردہ شخص کا خونچکاں چہرہ دیکھا۔ پھر شاید اس نے بھی کسی حد تک اسے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔ ''تم نے اسے کہاں دیکھا؟'' چوہان نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے تفصیل بتا دی۔ اس دوران میں اجے کے ماتحت افراد عمارت کے مختلف حصوں سے قریباً پانچ مزید افراد کو ہانک کر گراؤنڈ فلور پر لے آئے تھے۔ یہ سارے افراد کٹر ہندو لگتے تھے۔ یہ سب کے سب جواں سال تھے۔ اس عمارت کی مختلف دیواروں پر تلواریں، کلہاڑیاں اور رائفلیں آویزاں تھیں۔ بجرنگ بلی، ہنومان اور کالی ماتا کی مورتیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک دو جگہ ہندی کے کچھ پوسٹر بھی نظر آئے۔ پوسٹروں کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ یہ عسکری نوعیت کے ہیں۔

جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ جگہ جوشیلے ہندو نوجوانوں کی ایک بیٹھک ہے۔ اس عمارت کی دوسری منزل پر ایک بڑا جمنازیم تھا۔ وہاں جسمانی کسرت کی جاتی تھی اور لڑائی بھڑائی کے گر بھی سیکھے جاتے تھے۔ عمارت میں موجود پوسٹرز سے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ مسلمان مخالف پروپیگنڈے کا اڈا بنی ہوئی ہے۔

کپتان اجے کی ہدایت پر تھانے دار محمود نے مرنے والے شخص کی لاش کو قبضے میں لے لیا اور عمارت میں موجود افراد کو گرفتار کر لیا۔ امید تھی کہ گرفتار ہونے والوں کے ذریعے مزید انکشافات ہوں گے۔

''تمہاری پنڈلی پر چوٹ آئی ہے۔'' چوہان کی آواز نے مجھے چونکایا۔

میں نے دیکھا، واقعی پنڈلی پر ایک گہرا کٹ آیا تھا۔ لڑائی کے دوران میں کوئی آہنی شے لگی تھی۔ خون بہہ کر ٹخنے تک جا رہا تھا مگر یہ جان کر مجھے تعجب ہوا کہ اس چوٹ نے مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں دی تھی۔ اپنا بہتا ہوا خون دیکھ کر مجھے پریشانی کے بجائے عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔ شاید جیکی کی تربیت نے مجھ پر اپنا رنگ چڑھانا شروع کر دیا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم دیوان میں واپس پہنچ گئے۔ یہاں سلطانہ اور اس کے بھتیجے کی گمشدگی سب سے اہم موضوع تھی۔ ہر کوئی اس بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اجے کو امید تھی کہ اگلے چوبیس گھنٹے میں کوئی نہ کوئی کھوج ہاتھ آ جائے گا۔ یہ بات تو اب تقریباً ثابت ہو چکی تھی کہ آج سہ پہر اسلحے کی دکان پر واردات کرنے والا سلطانہ کا بھتیجا طلال ہی تھا۔ یہاں گھوڑے کی پیٹھ پر داغا ہوا نمبر سامنے آیا تھا۔ اجے کو یقین تھا کہ اس نمبر کے ذریعے پیش رفت ہو گی۔

رات کو باروندا جیکی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کمزور تر ہوتا جا رہا تھا۔ گاہے بگاہے اسے تیز بخار بھی ہو جاتا تھا لیکن وہ اپنا ہر دکھ درد شراب میں ڈبوئے ہوئے تھا۔ نشے کی وجہ سے اس کی خوش طبعی بھی برقرار رہتی تھی۔

میں نے اسے سہ پہر والی کارکردگی بتائی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ ''میں سمجھ گیا۔ یہ ہندو اکھاڑے کے لوگ تھے۔ یہ تو کافی سخت جان ہوتے ہیں۔ نئے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ پرانے ہتھیار چلانے کی بھی انہیں مہارت ہوتی ہے۔ اگر تم نے انہیں نیچا دکھایا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ میری محنت بالکل ہی بیکار نہیں جا رہی۔''

''بالکل ہی بیکار نہیں جا رہی...... سے کیا مطلب؟ کیا آپ میری کارکردگی سے مطمئن نہیں ہو؟''

''مطمئن تو ہوں لیکن پوری طرح نہیں۔'' اس نے کہا پھر میری پنڈلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا باندھ رکھا ہے؟''

''میں نے بتایا ہے نا، یہاں چوٹ لگی ہے۔ کافی خون بہا ہے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے۔ تم چوٹ کو چوٹ سمجھ رہے ہو۔ تم اس سے خوف زدہ ہو۔ تم نے اسے چھپا دیا ہے، باندھ دیا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی جنگلی جانور شیر، چیتے، ٹائیگر وغیرہ کے بارے میں بھی سنا ہے کہ اس نے زخم پر پٹی باندھی، دوا لگائی؟ حالانکہ انہیں زخم لگتے ہی رہتے ہیں اور ہم سے زیادہ تیزی کے ساتھ ٹھیک بھی ہوتے رہتے ہیں۔ فطرت خود سب سے بڑا مرہم ہے۔''

"میں سمجھا نہیں۔"

"اگر سمجھنا چاہتے ہو تو آہستہ آہستہ سمجھ میں بھی آنے لگے گا۔" اس نے کہا اور میری پنڈلی کی پٹی اپنے ہاتھ سے کھول دی۔

اس دن مجھے ایک نیا تجربہ ہوا۔ زخمی پنڈلی کے ساتھ ہی میں نے اور جیکی نے سخت ترین مشق کی۔ میرے زخم سے پھر خون رسنے لگا۔ میرا پاؤں لہو رنگ ہو گیا۔ زخم پر لگنے والی پہلی ایک دو ضربوں نے مجھے تکلیف دی لیکن پھر یہ تکلیف ایک طرح کی توانائی میں بدلنے لگی۔ ہر بار جب زخم پر چوٹ لگتی تو میرے اندر ایک ہیجان سا پیدا ہوتا۔ ایک تلخ لہر ابھرتی اور آتش بن کر میرے رگ و پے میں دوڑ جاتی۔ میں درد اور برداشت کے نئے پہلوؤں سے آشنا ہو رہا تھا۔

اس رات باروندا جیکی کو ایک بار پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ یوں لگا کہ اس کی سانس رک جائے گی۔ اس کا ہڈیوں کا بھرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ جیکی تک وہ اطلاع پہنچا دوں جو میں نے کئی دن سے خود تک محدود رکھی ہوئی ہے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی تو جیکی کو اضافی دکھ برداشت کرنا پڑے گا۔ ابھی تک کپتان اجے کو نل پانی میں شکنتلا کی موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ بہرحال، وہ تن دہی سے اپنی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

......اگلے تین دن تک سلطانہ اور طلال راجپوت کی تلاش شد و مد سے جاری رہی مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ گھوڑے پر داغے ہوئے نمبر سے بھی کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ اس سلسلے میں تین مختلف افراد مشکوک قرار دیئے گئے تھے اور ان سے پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔

اکھاڑے سے جو نوجوان پکڑے گئے، انہوں نے کئی انکشافات کئے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حکم اور جارج وغیرہ کو نل پانی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ہم آہنگی ایک آنکھ نہیں بھا رہی۔ نل پانی میں مسلمان اکثریت میں تھے، اس کے باوجود وہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری سے رہ رہے تھے۔ اس رواداری اور ہم آہنگی کو ختم کرنے کے لئے حکم نے اپنے سازشی عناصر یہاں چھوڑے ہوئے تھے۔ اس کی ایک مثال چار دن پہلے اکھاڑے میں ہلاک ہونے والا شخص ستیش آنند تھا۔ یہ شخص ہندو نوجوانوں میں مراد شاہ وغیرہ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مراد شاہ اور اس کے ساتھی چھوٹے سرکار پر حاوی ہو چکے ہیں اور وہ عنقریب اپنا مذہب بدل کر مسلمان ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان عالموں کے

پاس بیٹھتا ہے۔ ان کی باتیں سنتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں دن بہ دن مسلمانوں کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سلطانہ کی گمشدگی نے مجھے ازحد مضطرب کر رکھا تھا۔ مجھے ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اچانک اس کے بارے میں کوئی اندوہناک خبر آ جائے گی۔ اس کی تلاش میں چھوٹے سرکار کے ہرکارے دور دور کی خاک چھان رہے تھے۔ میں خود بھی دیوان سے باہر نکل کر اس تلاش میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن چوہان نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "تم ایک بات بھول رہے ہو تابش! تم آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہو۔ تمہارے اندر "چپ" موجود ہے اور یہاں نل پانی میں حکم کے بہت سے جاسوس موجود ہیں۔ وہ تمہیں کسی بھی وقت ٹریس کر سکتے ہیں۔" اس نے مجھے انٹینا والی بات بھی یاد دلائی اور کہا کہ اب مجھے اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہئے۔

وہ تو اس بات پر بھی ناخوش تھا کہ میں نے تین چار دن پہلے بازار میں اچانک ستیش کو دیکھ کر اس کا اندھا دھند تعاقب شروع کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں سیکیورٹی کے بغیر بالکل دیوان کی عمارت سے باہر نہ نکلوں۔

ننھا بالو بھی آج کل بہت مضطرب تھا۔ ماں کی دوری اکثر اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبریز رکھتی تھی۔ وہ اسے بانہوں میں نہیں لیتی تھی، اسے اپنا دودھ نہیں پلاتی تھی لیکن اس کے قریب تو رہتی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں لیٹنے کی اجازت تو دیتی تھی مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کی گود میں بلکتا رہتا تھا۔ اب بھی وہ یہی کچھ کر رہا تھا۔ اس کی درد بھری آواز سن کر میں اس کے پاس چلا گیا۔ صفیہ اسے بانہوں میں لئے برآمدے میں چکرا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ لاڈ بھرے انداز میں اسے پچکار رہی تھی۔ "کاکے کی امی جان آئے گی...... کاکے کو گانا سنائے گی...... کاکے کو جھولا جھلائے گی...... کاکے کو دودھ پلائے گی...... کاکے کی امی آئے گی۔"

وہ واقعی چپ ہو گیا۔ اپنی اشک بار معصوم آنکھوں سے صفیہ کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اس کی ساری بات سمجھ رہا ہو۔ اس دوران میں صفیہ نے بھی مجھے دیکھ لیا اور جلدی سے اپنی اوڑھنی درست کرنے لگی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر بالو کو اُٹھا لیا۔ مجھے اس سے انس محسوس ہوا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے، اس کا نرم گال چوما۔ اس کا ننھا سینہ اب بھی چھوٹی چھوٹی ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ اس کی ہر ہچکی میں ممتا کی تلاش تھی۔

اسی اثنا میں مجھے چوہان تیز قدموں سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ''خیریت ہے چوہان؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچا کر بولا۔ ''پرانے شہر سے ایک لاش ملی ہے۔''

''کس کی؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ایک جواں سال عورت ہے۔ چہرہ بُری طرح مسخ ہے...... پہچانا نہیں جارہا۔ اجے کو شک ہے کہ......'' چوہان کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کے ادھورے فقرے کا اشارہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔'' میں نے دہل کر کہا۔ ''وہ کوئی اور ہوگی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ چلو میرے ساتھ آؤ۔ تم شناخت میں مدد دے سکتے ہو۔''

میں نے لرزاں ہاتھوں سے بچہ واپس صفیہ کی گود میں دیا اور ڈاکٹر چوہان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑا۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جب میں نے سلطانہ کو آخری بار دیکھا تو اس نے کون سے کپڑے پہن رکھے تھے...... اس کی جوتی کون سی تھی؟ وہ زیور تو سرے سے پہنتی ہی نہیں تھی۔ اسے لباس وغیرہ سے ہی شناخت کیا جاسکتا تھا۔

ہم گھوڑا گاڑی میں بیٹھے اور شہر کے بارونق راستوں سے گزرتے ہوئے پرانی آبادی میں پہنچ گئے۔ اب شام ہوچکی تھی۔ گھروں میں چراغ، لالٹینیں اور گیس لیمپ وغیرہ روشن ہوچکے تھے۔ کہیں کہیں کسی خوش حال فیملی کی چاردیواری میں جنریٹر کی برقی روشنی بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہاں بائیسکلوں پر لیمپ روشن کرنے کا رواج تھا۔ گھوڑا گاڑیوں اور چھکڑوں وغیرہ کی دونوں سائیڈز پر بھی کیروسین آئل کے لیمپ روشن کئے جاتے تھے۔

ہم ایک تین چار منزلہ عمارت کے سامنے پہنچے۔ بالکونیوں اور محرابی دروازوں والی اس عمارت کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کے سپاہی اس ہجوم کو موقع واردات سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کررہے تھے۔ ایک فوجی گھوڑا گاڑی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اجے بھی یہیں موجود ہے۔

میں چوہان کے ساتھ عمارت کے ایک اندرونی حصے میں پہنچا۔ یہاں لکڑی کے ایک بوسیدہ تخت پر ایک لاش سفید چادر سے ڈھکی رکھی تھی۔ چادر پر سر کی طرف خون کے بڑے بڑے داغ نظر آرہے تھے۔ میری رگوں میں خون کی گردش عروج پر پہنچ گئی۔ کیا اس چادر کے نیچے سلطانہ تھی؟

اجے کے حکم پر باقی افراد کمرے سے باہر نکل گئے...... تھانے دار محمود بھی چلا گیا۔ اب صرف ڈاکٹر چوہان، اجے اور میں کمرے میں تھے۔ اجے کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ ہولے سے بولا۔ ''چہرہ بالکل خراب ہوچکا ہے۔ شاید کلہاڑی کے وار کیے گئے ہیں...... دل کڑا کر کے دیکھنا پڑے گا۔''

چوہان نے کمرے کا دروازہ بند کردیا۔ اجے نے لاش کے چہرے پر سے خون آلود چادر ہٹائی اور اسے کندھوں تک کھسکا دیا۔ واقعی کچھ نظارے آنکھوں کے لئے سخت اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ میں اندر تک لرز گیا۔ قاتل نے بڑی بے رحمی سے چہرہ مسخ کردیا تھا۔ اس نے کلہاڑی وغیرہ سے پے در پے وار کرکے سر اور چہرے کی ہڈیاں چُور کرڈالی تھیں۔

کپتان اجے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''نہیں۔ چہرے سے تو کوئی اندازہ نہیں ہورہا۔'' میں نے رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

چوہان نے بھی میری تائید کی۔

''کپڑوں سے کچھ پتا چل رہا ہے؟'' اجے نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں، کپڑوں سے بھی نہیں۔''

''لیکن یہ اسی طرح کے کپڑے ہیں جیسے سلطانہ بی بی پہنتی تھی۔'' اجے بولا۔ اس نے لاش کا چہرہ تو ڈھکا رہنے دیا لیکن پہلو سے چادر ہٹا کر ایک بار پھر مقتولہ کے خون آلود کپڑے ہمیں دکھائے۔

میں نے کپڑوں کو دھیان سے دیکھا۔ یہ اسی طرح کی چیک دار...... فراک نما قمیص تھی جو سلطانہ پہنتی تھی۔ زیریں جسم پر تنگ موری کا پاجامہ تھا۔ میں نے ہاتھوں اور بازوؤں کی ساخت دیکھی لیکن ایک بار پھر کوئی اندازہ قائم کرنے میں ناکام رہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اجے بولا۔ ''ابھی تھوڑے سمے پہلے سلطانہ بی بی کے پتا مختار صاحب بھی یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔''

''وہ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو چند سیکنڈ سے زیادہ دیکھ ناہیں سکے۔ ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ انہیں یہاں سے لے گئے ہیں۔ ویسے انہوں نے بھی پہچان ناہیں ہے۔''

چوہان میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے تابش...... کہ سلطانہ تمہاری بیوی ہے۔ بیوی اور شوہر کا رشتہ سب سے

نزدیکی ہوتا ہے۔ ایک شوہر کی حیثیت سے تم اسے اس کی کسی جسمانی نشانی کی وجہ سے بھی پہچان سکتے ہو۔'' چوہان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

وہ یوں تو ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اسے بھی معلوم تھا کہ میرا کیس کتنا مختلف ہے۔ پچھلے ڈھائی سال کا عرصہ میرے ذہن میں ایک بالکل صاف سلیٹ کی طرح تھا۔ اس پر کوئی نقش کوئی یاد موجود نہیں تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور میں بے طرح چونک گیا۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی لیکن اجے یا چوہان کے ذہن میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی شاید سلطانہ کے والد کے ذہن میں۔ کبھی کبھی یوں ہو جاتا ہے۔ کسی واقعے پر غور کرتے ہوئے نہایت دانا بینا لوگ بھی بالکل سامنے کے نکتے کو فراموش کر جاتے ہیں۔

میں نے چوہان سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔''

ہم واپس کمرے میں پہنچے جہاں مسخ لاش رکھی تھی۔ دراصل مجھے کچھ روز پہلے کا وہ خون ریز واقعہ یاد آ گیا تھا جب نل پانی کے نواحی جنگل میں ''کھنڈر چوکی'' پر پانڈے اور اجے کے بندوں میں زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ سلطانہ نے بھی اس لڑائی میں مردانہ وار حصہ لیا تھا اور ٹیلے پر چڑھائی کرتے ہوئے اس کا ایک پاؤں زخمی بھی ہو چکا تھا۔ یہاں دستی بم کا کوئی چھوٹا ٹکڑا لگا تھا۔

اب یہی زخم سلطانہ کی شناخت بن سکتا تھا۔ میں لکڑی کے بوسیدہ تخت پر پڑی لاش کی طرف بڑھا تو میرے اعصاب چٹخنے لگے۔ یہ بڑا جگر پاش مرحلہ ہوتا ہے۔ چادر اُٹھا کر لاش شناخت کرتے ہوئے دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں اور سینے پھٹ جاتے ہیں۔ کیا اگلے چند سیکنڈ میں، میں اس اندوہناک خبر سے آگاہ ہونے والا تھا کہ میری مبینہ بیوی اور بالو کی ماں کبھی ہمارے درمیان واپس نہ آنے کے لئے جا چکی ہے۔

میں نے لاش کے خون آلود پاؤں پر سے چادر ہٹائی۔ میری نگاہ دھندلا گئی۔ اس دھندلائی ہوئی نگاہ نے دیکھا کہ لاش کے پاؤں پر زخم نہیں تھا۔ یہ سلطانہ کی لاش نہیں تھی۔

''نہیں چوہان۔'' میں نے بدنصیب مقتولہ کے پاؤں دوبارہ چادر سے ڈھک دیئے۔ ''یہ سلطانہ نہیں ہے۔''

چوہان اطمینان کی طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی تو وہ خود بھی اس بات پر بھونچکا رہ گیا کہ یہ بنیادی بات اس کے اور اجے کے ذہن میں کیوں نہیں آ سکی۔

''شدید تشویش میں اس طرح کی غلطیاں ہو جاوت ہیں۔'' اجے نے کہا۔

میں نے تائید کی اور پوچھا۔ ''یہ لاش ملی کیسے؟''

اجے نے بتایا۔ ''یہ مکان کافی عرصے سے خالی پڑا ہے۔ مالک مکان نئے شہر میں جا چکا ہے۔ آج دوپہر کو بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ ان کی گیند ٹوٹی ہوئی کھڑی میں سے اندر چلی گئی۔ دو بچے گیند لینے کے لئے اندر گئے تو انہیں یہ تازہ لاش نظر آئی۔ انہوں نے شور مچا دیا۔''

''یہ کسی مسلمان لڑکی کی لاش ہے۔'' چوہان نے کہا۔ ''اور خاص بات یہ ہے کہ یہ جگہ اس گلی سے زیادہ دور نہیں جہاں تین چار دن پہلے ہندو اکھاڑے میں ستیش آنند کو گولی لگی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اس قتل کا تعلق اکھاڑے والے واقعے سے ہو سکتا ہے؟''

''یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔'' چوہان نے کہا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میں لاش والے کمرے سے باہر نکل آیا۔ دل کی دھڑکنیں ابھی تک زیروزبر تھیں۔ اگر یہ سلطانہ کی لاش ہوتی تو کیا ہوتا؟ اس کا جواب کافی تکلیف دہ تھا...... تو کیا میں لاشعوری طور پر سلطانہ سے وابستگی محسوس کرنے لگا تھا؟ اس کی زندگی اور موت میرے لئے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی؟

لاش میں سے ایک ہلکی ہلکی بو اُٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ میں اس بو سے گھبرا کر باہر گلی میں نکل آیا۔

ایک گھڑسوار بڑی تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اس کے جسم پر فوجی وردی تھی اور وہ اجے کے ماتحتوں میں سے تھا۔ یقیناً اس کے پاس اجے کے لئے کوئی خاص خبر تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اجے کے پاس پہنچ گیا۔ اس ماتحت نے سیلیوٹ کرنے کے بعد کپتان اجے کو اطلاع دی۔ ''جناب! شہر کے شمالی برج کے پاس ایک لڑکی کا کھوج لگا ہے۔ وہ ایک چھوٹی بگھی پر سوار تھی اور اسے خود ہی چلا رہی تھی۔ اسے ایک ناکے پر روکا گیا لیکن وہ رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ سپاہیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ گنجان علاقے میں چلی گئی اور پھر بگھی چھوڑ کر ایک گودام میں گھس گئی۔ وہ اب بھی اسی تین منزلہ گودام میں ہے۔ ہمرے ساتھیوں نے گودام کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

''تو اس کو پکڑا کیوں ناہیں؟'' کپتان اجے نے چیخ کر پوچھا۔

''اس گودام میں بہت سا آتش گیر مادہ پڑا ہے جی۔ گندھک اور سلفر وغیرہ۔ اگر لڑکی کے پاس کوئی ہتھیار ہے اور اس نے گولی وغیرہ چلا دی تو بڑا مسئلہ ہو جاوے گا......''

"وہ اکیلی ہے؟" اجے نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ہمرے سامنے تو اکیلی ہی اندر گھی ہے۔ اگر اندر پہلے سے اس کا کوئی ساتھی وغیرہ ہو تو کہا ناہیں جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔" اجے نے کہا۔

تھانے دار محمود کو لاش کے حوالے سے ضروری ہدایات اور مشورے دینے کے بعد اجے میرے اور چوہان کے ساتھ فوجی گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھا۔ ہم تیز رفتاری سے نل پانی کے شمالی علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب رات کے نو بجنے والے تھے۔ زیادہ تر گلیاں اور سڑکیں نیم تاریک دکھائی دے رہی تھیں۔

کہاں تو سلطانہ کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی تھی اور کہاں اب اوپر نیچے اطلاعات مل رہی تھیں۔ راستے میں اجے نے اپنے ماتحت سے پوچھا۔ "تم نے لڑکی دیکھی ہے؟"

"جی جناب! لیکن بس ایک جھلک ہی دکھائی پڑی تھی۔ اس نے برقع پہنا ہوا ہے۔ نقاب میں سے بس آنکھیں ہی نظر آوت تھیں۔ وہ کافی ہوشیار اور دلیر لگت ہے جی۔ اس نے سپاہیوں کو اپنے پیچھے کوئی تین میل تک دوڑایا ہے......"

اسی گفتگو کے دوران میں ہم موقع پر پہنچ گئے۔ یہ نسبتاً کشادہ علاقہ تھا۔ یہاں درخت وغیرہ بھی تھے۔ دائیں طرف سے تازہ ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ یقیناً اس طرف نل پانی کی بڑی جھیل تھی۔ یہاں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایک سراسیمگی سی پائی جا رہی تھی۔ پولیس اور فوج کے جوانوں نے گودام کی عمارت کو گھیرا ڈالا تھا۔ تماشائی دور گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں پر موجود تھے۔

اجے نے بڑی بڑی مونچھوں والے اس پولیس افسر سے بات کی جس نے لڑکی کا تعاقب شروع کیا تھا۔ اس نے دور کونے میں کھڑی ایک چھوٹی بگھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ اس پر آئی تھی جی۔ ہم نے روکا تو یہ سیدھی نکلتی چلی گئی۔ اس نے کالے رنگ کا برقع پہنا ہوا ہے......اور بالکل نڈر لگت ہے۔"

"تمہیں یہ کیسے شبہ ہوا کہ یہ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سلطانہ بی بی کے ساتھ اس کا نوعمر بھتیجا بھی ہے۔ ہمرے خیال میں اس بگھی میں بھی ایک لڑکا موجود تھا لیکن وہ راستے میں کہیں اُترا اور تنگ گلیوں میں غائب ہو گیا۔"

"کسی نے اس لڑکے کو دیکھا؟" کپتان اجے نے پوچھا۔

"ناہیں، صاف تو ناہیں دیکھ سکے......بس کشمیری دروازے کے پاس اس کی ایک جھلک دیکھی گئی ہے......"

کچھ دیر صلاح مشورہ ہوا۔ میں نے اجے سے کہا۔ "اگر اندر سلطانہ ہی ہے تو پھر اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ میں اندر جاؤں......اور اکیلا ہی جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے اپنی بات سننے پر مجبور کر لوں گا۔"

"اس کام میں بہت احتیاط کرنا پڑے گی جی۔" پولیس افسر نے کہا۔ "وہ کسی کی بات ناہیں سن رہی۔ آتما ہتھیا کی دھمکیاں بھی دے رہی ہے۔"

"کیا کوئی اس سے پہلے گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

موچھیل پولیس افسر نے ایک پٹھان چوکیدار کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ درمیان عمر کے اس شخص کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ وہ قدرے شرمندہ بھی نظر آ رہا تھا کہ اس کی موجودگی میں ہی لڑکی گودام کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ "بی بی اوپر کی منزل پر دائیں طرف والے کمرے میں ہے جی۔ اس کمرے کا ایک کھڑکی باہر گلی میں کھلتا ہے۔ ام اوپر گیا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے ام سے کہا کہ اگر ام آگے آیا تو وہ کھڑکی سے چھلانگ لگا دے گا۔ ام ذرا سا اور آگے گیا تو اس نے اپنا پاؤں کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور کودنے کے لئے ایک دم تیار ہو گیا......وہ بہت خطرناک نظر آ رہا ہے جی۔"

"کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ہے اس کے پاس؟" میں نے پوچھا۔

"ام بھروسے سے کچھ نہیں کہہ سکتا جی۔ اس نے برقع پہنا ہوا ہے۔"

میں نے اجے سے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں اندر جاتا ہوں۔"

اس معاملے پر تھوڑی سی بحث ہوئی پھر اجے اور چوہان نیم رضامند ہو گئے۔ چوہان نے کہا۔ "وہ جو کوئی بھی ہے، اسے سب سے پہلے یہ بتا دو کہ یہاں بہت سا آتش گیر سامان پڑا ہے۔ اگر اس کے پاس ہتھیار ہے اور اس نے گولی وغیرہ چلانے کی غلطی کی تو سب کچھ دھماکے سے اُڑ جائے گا......"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

جسم میں سنسنی دوڑنے لگی تھی۔ وہی میٹھی میٹھی لہر جو اب مجھے خطرے سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ دیتی تھی۔ گودام میں گہری تاریکی تھی۔ بس ایک دو کمروں میں لالٹین یا گیس لیمپ کی روشنی موجود تھی۔ میں صرف ایک ٹارچ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ایک پستول بھی

میرے لباس میں موجود تھا لیکن یہ پستول مجھے صرف اسی وقت استعمال کرنا تھا جب کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہتا۔

گودام کے اندر گھستے ہی مجھے ایک ہال کمرے میں لکڑی کی بہت سی پیٹیاں نظر آئیں...... یہاں گندھک کی بو صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں تاریک سیڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی اور پھر دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے آواز دی۔ ''سلطانہ......سلطانہ......کہاں ہو تم؟''

جواب ندارد۔ میں کچھ اور آگے بڑھا۔ چند آخری سیڑھیوں پر رک کر میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ دائیں بائیں پھینکا۔ کوئی متنفس نظر نہیں آیا۔ مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ وہ کہیں، یہاں سے کسی طرح نکلنے میں تو کامیاب نہیں ہوگئی۔ میں نے پھر آواز دی۔ ''تم کہاں ہو؟ میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔ جو تم کہو گی ویسا ہی ہوگا لیکن پتا تو چلے کہ تم چاہتی کیا ہو؟ میری بات کا جواب دو۔ تم کہاں ہو؟''

اس بار بھی جواب میں مکمل خاموشی رہی۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ سیڑھیوں پر اور گرد آلود فرش پر پھینکا۔ زنانہ قدموں کے نشان واضح طور پر نظر آئے۔ ان نشانات کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا جس کا ذکر پٹھان چوکیدار نے کیا تھا۔ مجھے چوہان والی بات یاد آئی اور میں نے بہ آواز بلند پکار کر کہا۔ ''دیکھو...... تم جو کوئی بھی ہو...... ایک بات ذہن میں رکھنا۔ یہاں ان کمروں میں بہت سا بارود پڑا ہے۔ اگر یہاں کوئی گولی وغیرہ چلی یا اس طرح کی کوئی اور بے احتیاطی ہوئی تو سب کچھ ختم ہوسکتا ہے۔ میں بھی بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ تم میرے سامنے آؤ اور بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟''

نیم روشن کمرے میں ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے کسی سے کچھ لینا دینا ناہیں......بس مجھے یہاں سے چلے جانے دو۔ خدا کے لئے......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

مجھے جھٹکا سا لگا۔ یہ سلطانہ کی آواز نہیں تھی۔ یہ کوئی اور تھی لیکن ابھی میرے ذہن میں شک موجود تھا۔ میں آواز دوبارہ سننا چاہتا تھا۔

میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ''ٹھیک ہے لیکن تم سامنے تو آؤ۔''

''مم...... میں......سامنے آنا ناہیں چاہتی۔ کچھ لوگن کی طرف سے...... میرے جیون کو خطرہ ہے...... وہ مجھے مار دیویں گے۔'' وہ روہانسی ہوکر بولی۔ وہ سلطانہ نہیں تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھ کو جانے دو۔ میں بالکل نردوش ہوں۔ میں بھگوان کی سوگند کھاوت ہوں......''

میں نے سیڑھیوں کے بالائی سرے پر کھڑے ہوکر دیکھا۔ کمرے میں اس کا ہیولا نظر آیا۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا۔ وہ ادھ کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور کسی سہمے ہوئے جانور کی طرح لگتی تھی۔ اسے دیکھنے اور اس سے بات کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا رویہ جارحانہ نہیں ہے۔ غالباً اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی نہیں تھا۔ وہ بس خوف زدہ تھی اور اس خوف کی وجہ سے خودکشی کی دھمکی دے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی آواز سن کر مجھے لگا کہ وہ خوب صورت رہی ہوگی۔ اب معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا جو وہ خود کو سپاہیوں کے حوالے کرنے کے بجائے اپنی جان دینا زیادہ آسان محسوس کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو، میں تمہیں ہر طرح کی تسلی دیتا ہوں۔ اگر تم بغیر کچھ بتائے یہاں سے جانا چاہتی ہو تو بھی جاسکتی ہو لیکن اگر تم اپنا کوئی مسئلہ بتانا چاہتی ہو تو ہم اس کے لئے بھی حاضر ہیں۔ میں تمہاری مدد کے لئے کسی زنانہ پولیس افسر کو بلا لیتا ہوں......''

''ناہیں، میں کسی سے کچھ کہنا ناہیں چاہتی۔ میں بس یہاں سے جانا چاہت ہوں۔''

میں ذرا آگے بڑھا تو وہ ایک دم کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ وہ اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کا سراپا یکسر دھمکی آمیز دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک لڑکی کے عقب میں واقع ایک کھڑکی کے شیشے زوردار چھناکے سے ٹوٹے اور ایک پرچھائیں برق رفتاری سے لڑکی پر جھپٹی۔ لڑکی بلند آواز سے چلائی۔ دونوں اوپر نیچے فرش پر گرے۔ شومئی قسمت، گرتے وقت لڑکی پر جھپٹنے والے شخص کا سر دیوار سے ٹکرایا، اس کی گرفت ایک سیکنڈ کے لئے لڑکی پر کمزور پڑی۔ وہ چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گئی۔ وہ اندھا دھند کھڑکی کی طرف بڑھی۔ انداز سے عیاں تھا کہ وہ نتیجے سے بے پروا ہوکر چھلانگ لگا دے گی۔ میں اس سے قریباً پانچ میٹر کی دوری پر تھا۔ یہ حتی الامکان تیزی سے حرکت میں آنے کا وقت تھا......اور میں نے حرکت کی۔ اپنی ٹانگوں کی پوری طاقت میں نے لڑکی کی طرف ''رش'' کیا۔ یہ سیکنڈ کے ایک مختصر ترین حصے کا کھیل تھا۔ وہ جب کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ چکی تھی، میں نے اسے کمر سے دبوچ لیا اور پھر پلٹ کر کمرے میں پھینک دیا۔ اس کے برقعے کا بالائی حصہ اُتر کر دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار سے لٹکی ہوئی لالٹین بھی فرش پر لڑھک گئی۔ لالٹین سے اچھلنے والے تیل نے فوراً آگ پکڑ لی۔ دو کرسیاں دھڑا دھڑ جلنا شروع ہوگئیں۔ یہ سنگین ترین صورت حال تھی۔ ہم بارود کے ڈھیر پر تھے اور چنگاری کے بجائے پورا الاؤ روشن ہوگیا تھا۔ اس الاؤ کی روشنی میں مجھے دو چہرے نظر آئے۔ ایک تو اس

شخص کا چہرہ جو کھڑکی توڑ کر لڑکی پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ کپتان اجے تھا۔ دوسرا لڑکی کا چہرہ۔ وہ میری گرفت میں تھی۔ بالائی برقع اُترنے سے اس کے بال کھل چکے تھے۔ یہ بہت لمبے بال تھے...... غیر معمولی حد تک لمبے۔ میں نے لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھی...... ہرگز نہیں تھی۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے اس حسین لڑکی کی تصویر دیکھی ہوئی تھی۔ اگر میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو یہ شکنتلا تھی۔ بارونداجیکی کی گمشدہ محبوبہ۔ وہ بہت حد تک میری دیکھی ہوئی تصویر سے مل رہی تھی۔

اس بارے میں زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔

''دروازہ بند کر دو اجے۔'' میں نے پکار کر کہا۔

اجے خود بھی محسوس کر چکا تھا کہ آگ کو محدود رکھنے کے لئے دروازہ بند کرنا ضروری ہے۔ اس نے لپک کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور دونوں جلتی ہوئی کرسیاں یکے بعد دیگرے کھڑکی سے باہر گلی میں پھینک دیں۔ اس کا یہ اقدام اس کی حاضر دماغی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ آگ ایک دم سمٹ گئی۔ اگلے چند سکنڈ میں اجے نے اسے مکمل طور پر بجھا دیا۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی بم کا سلگتا ہوا فیتہ کاٹ کر اسے پھٹنے سے روک دیا جائے۔ اجے کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔

لڑکی ابھی تک میرے بازوؤں میں دبی ہوئی تھی اور خود کو چھڑانے کے لئے اندھا دھند زور لگا رہی تھی۔ اجے کے جوان دندناتے ہوئے سیڑیوں پر نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھ سے برسرِ پیکار ماہ جبیں کو سنبھال لیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ لمبے ریشمی بال بار بار چہرے کو چھپا رہے تھے۔ وہ چلا رہی تھی۔ ''چھوڑ دو مجھے...... مر جانے دو مجھے......''

میں حالات کی دھما چوکڑی پر حیران ہو رہا تھا۔ ہم یہاں سلطانہ کے شبہے میں پہنچے تھے۔ یہ خیال تو ذہن میں موجود تھا کہ جو لڑکی یہاں موجود ہے، شاید وہ سلطانہ نہ ہو...... لیکن یہ خیال ہرگز ذہن میں نہیں تھا کہ سلطانہ کی تلاش تو ناکام رہے گی لیکن ایک اور تلاش کامیاب ہو جائے گی۔ اجے اور اس کے ساتھی چھوٹے سرکار کے حکم پر کئی روز سے شکنتلا کو ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے اور اب وہ کسی حد تک مایوس بھی ہو چکے تھے...... لیکن آج شب اس گودام میں بالکل اتفاقیہ طور پر ایک ایسی لڑکی سامنے آ گئی تھی جو میرے اندازے کے مطابق شکنتلا ہی تھی۔ اس کے غیر معمولی لمبے بال اس کی شناخت کو معتبر کر رہے تھے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں میرا یہ اہم ترین اندازہ درست ثابت ہو گیا کہ آج رات اس گودام میں ہم اتفاقیہ طور پر شکنتلا کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ

شکنتلا ساہنی ہے۔

وہ واقعی حسین تھی۔ اس کی خوبرو پیشانی پر پسینا موتیوں کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ بند کمرے میں میرے، اجے اور چوہان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ ''میں تمہاری منت کرت ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں جانت ہوں، چھوٹے سرکار اگر مجھ سے ملنا چاہت ہیں تو میری بھلائی کے لئے ہی چاہت ہوں گے...... لیکن میں یہ بھی جانت ہوں کہ ان کی یہ کرپا مجھ کو مہنگی پڑے گی۔''

''کیوں مہنگی پڑے گی؟ کیا آپ کو چھوٹے سرکار پر اور ہم سب پر وشواس ناہیں ہے؟'' اجے نے تنک کر پوچھا۔

''میں وشواس کی بات ناہیں کرتی...... لیکن میں یہ بھی ناہیں چاہتی کہ آپ لوگن کو میرے کارن کسی آزمائش سے گزرنا پڑے۔ سب جانت ہیں کہ نل پانی میں بھی حکم جی اور جارج کے جاسوس موجود ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکت ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' اجے نے رعب سے کہا۔ ''آپ کو چھوٹے سرکار کی خاص حفاظت میں دیوان کے اندر رکھا جاوے گا۔''

''کچھ لوگن تو یہ کہت ہیں کہ دیوان کے اندر بھی حکم جی کے بندے موجود ہیں۔'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔ وہ واضح طور پر بہت خوف زدہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ نل پانی میں گمنام رہے۔

''آپ کو ضرورت سے زیادہ ڈرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے افسوس ہے کہ آپ دیوان کی طاقت کا غلط اندازہ لگا رہی ہیں۔'' اجے نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم شکنتلا کو خاص فوجی گھوڑا گاڑی میں سوار کر کے دیوان کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ میری نگاہیں اس کے سراپا پر اور اس کے سیاہ آبشار جیسے طویل بالوں پر جمی تھیں...... تو یہ زرگاں کے شاہی محل کا وہ نومیدہ پھول تھا جس نے بارونداجیکی جیسے مضبوط شخص کو عشق میں دیوانہ کیا تھا...... اور کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ میری نگاہوں میں بارونداجیکی کا چہرہ گھومنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ جب میں اسے شکنتلا کی موجودگی کے بارے میں اطلاع دوں گا تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ کہیں وہ شادیٔ مرگ کا شکار تو نہیں ہو جائے گا؟

راستے میں شکنتلا نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ نل پانی میں آنے کے بعد وہ جان بوجھ کر اوجھل ہوئی ہے۔ وہ یہاں ایک متوسط آبادی میں اپنی ایک پرانی سہیلی کی ملازمہ کے ہاں قیام پذیر تھی۔ نوراں نامی یہ لڑکی اور اس کا خاوند چینی کے برتنوں پر نقش نگاری کا کام

کرتے تھے۔ آج وہ دونوں میاں بیوی شدید بخار میں مبتلا تھے۔ انہوں نے کچھ کام کر رکھا تھا جو بازار میں دے کر آنا ضروری تھا۔ مجبوراً شکنتلا نے نوراں کے ملازم کو ساتھ لیا اور بازار میں برتن دے کر آئی۔ واپسی پر پولیس والے پیچھے لگ گئے۔ شکنتلا ہرگز ان پر اپنی شناخت ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے اس نے بگھی دوڑا دی۔ راستے میں جو بندہ خوف زدہ ہو کر بگھی سے اُترا، وہ نوراں کا ملازم تھا۔ وہ بھی چینی کے برتنوں پر پھول بوٹے بنانے کا کام کرتا تھا۔ میں نے شکنتلا کی باتوں میں حکم کے خطرناک ہرکارے رنجیت پانڈے کا نام بھی سنا۔ وہ اس شخص سے خاص طور پر خوف زدہ نظر آتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔

O.....❖.....O

رات کا وقت تھا۔ میں باروندا جیکی کے پاس اس کے کمرے میں موجود تھا۔ جھروکوں سے باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور پھول مہک رہے تھے۔ دیوان کے کسی اندرونی حصے میں کوئی ستار نواز بڑے بیٹھے سُروں میں ستار بجا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی سنگت میں ہارمونیم کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔

جیکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ پہلے سے کمزور نظر آ رہا تھا۔ ''کیا خیال ہے، آج آرام نہ کریں؟'' جیکی نے کہا۔

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے اس طرح کی بات کی تھی۔ ورنہ وہ تو چھٹی کی بات پر آگ بگولا ہو جاتا تھا اور اپنا پسندیدہ فقرہ دہراتا تھا...... وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ تم ہڈحرامی دکھاؤ گے تو کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔

''کیا بات ہے جیکی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں، ایک دم فرسٹ کلاس ہوں۔ بس دوپہر کو بخار نے چھوٹی سی چھلانگ لگائی تھی اور ایک سو دو سے ایک سو چار پر چلا گیا تھا۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی شرارتیں تو یہ میرے ساتھ کرتا ہی رہتا ہے۔ شام کو کھانے کے بعد کھانسی کا دورہ پڑا اور ناک سے تھوڑا سا خون بھی آیا۔ لگتا ہے کہ خون کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے میرے اندر۔'' وہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں بولا۔

''آپ دوا بھی تو نہیں کھاتے ہو۔ حالانکہ......''

''چھوڑو دوست!'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''جب دوا کھا کر بھی مرنا ہے تو پھر کیوں نہ دوا کے بغیر ہی یہ گھاٹی پار کر لی جائے۔''

آج وہ واقعی تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور محبت سے کہا۔ ''آپ مرنے کی باتیں نہیں

چھوڑو گے اور ہم آپ کو مرنے کے لئے نہیں چھوڑیں گے...... آپ جو مرضی کر لو، ہم آپ کو کھینچ کر واپس زندگی کی طرف لے آئیں گے۔''

''بہت مشکل ہے۔''

''آپ خود ہی تو کہتے ہو، مشکل کو آسان کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ میں نے کل ہی انور خاں اور مراد شاہ صاحب سے بات کی ہے۔ ہم آپ کے لئے ایک بہت اچھے ڈاکٹر کا انتظام کر رہے ہیں۔ اس جاپانی ڈاکٹر کو مقامی لوگ بہت مان رہے ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم آپ کو اسٹیٹ سے باہر بھی بھجوائیں گے۔''

''اسٹیٹ سے باہر جا کر کیا کرنا ہے؟ میری روح اسٹیٹ کے اندر ہے۔ میں یہیں دفن ہونا چاہتا ہوں۔''

اس نے آتشیں سیال کے کئی تلخ گھونٹ بھرے اور ترنگ میں آ گیا۔ تکیہ اپنی کمر کے ساتھ رکھ کر وہ نیم دراز ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنا پسندیدہ نیپالی گیت گانے لگا۔

اس کی آواز دل سوز تھی۔ اس میں درد لہریں لیتا تھا اور ''سوچ کی گہری نیلی جھیلوں'' میں سنہری دھوپ کے اندر یادوں کی کشتیاں ڈولتی تھیں۔

وہ گاتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگتے رہے۔ وہ چپ ہوا تو میں نے اس کا استخوانی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''جیکی! آپ جس کو دن رات یاد کرتے ہو...... وہ آپ کے سامنے آ جائے تو پھر؟''

''کس طرح؟'' اس نے آنکھیں بند کئے پوچھا۔

''جس طرح کوئی انہونی ہوتی ہے...... جس طرح کالی سیاہ رات کے اندر سے سورج نکلتا ہے...... جس طرح دم گھونٹنے والا حبس، بارشوں کو کھینچ کر لاتا ہے...... جیسے تپتی ریت کے اندر سے چشمہ پھوٹتا ہے۔''

اس نے آنکھیں تھوڑی سی کھولیں اور مجھے قدرے حیرت سے دیکھ کر بولا۔ ''آج تو تم بھی شاعری کر رہے ہو۔''

''آپ کی صحبت کا اثر ہے جیکی...... لیکن...... آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اگر آپ کی شکنتلا ایک بار پھر آپ کے سامنے آ جائے تو......''

''ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جن سے میرا درد بڑھ کر ناقابلِ برداشت ہو جائے۔''

''میں صرف بات نہیں کر رہا۔ میں آپ سے ایک سنجیدہ سوال پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم بُری طرح چونک گیا۔ اس کے میلے کچیلے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔ وہ چند سیکنڈ تک تحیر کے عالم میں مجھے دیکھتا رہا پھر لرزاں ہونٹوں کے ساتھ بولا۔ ''کیا..... تم نے..... اسے کہیں دیکھا ہے؟''

میں نے اس کا کلوتا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور دبے دبے جوش سے کہا۔ ''ہاں، میرے محترم استاد! میں نے اسے دیکھا ہے..... اور دیکھا ہی نہیں..... وہ میرے ساتھ ہے..... اسی چار دیواری میں..... اسی چھت کے نیچے۔''

فرطِ حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں..... وہ ہکلایا..... ''دیکھو..... ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔''

''میں آپ سے مذاق کی جرأت نہیں کرسکتا۔''

''تو پھر..... یہ کیا ہے؟''

''آپ کی طلب کا صلہ۔ آپ کے دکھ درد کا مداوا۔ آپ کے انتظار میں اتنی شدت تھی کہ کوئی کھنچ کر آپ کی طرف آ گیا۔ ہاں جیکی..... وہ یہاں ہے۔ ہم نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ آپ کی شکنتلا ہی ہے۔ وہ کئی دوسری عورتوں کے ساتھ زرگاں کے راج بھون سے بھاگ نکلی ہے.....''

جیکی پر واقعی شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے راکھ کے ڈھیر تھے۔ اب وہاں عجب سی چمک نظر آنے لگی۔ وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے بیساکھی اپنی بغل کے نیچے رکھ لی۔ میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ انتہائی اضطراب سے بولا۔ ''وہ کہاں ہے؟ مجھے بتاؤ..... وہ کہاں ہے؟''

''یہیں پر ہے۔ سلطانہ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔''

''تم نے اسے میرے بارے میں بتایا ہے؟'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔

''نہیں، ابھی کچھ نہیں۔''

''وہ شکنتلا ہی ہے نا؟ میرا مطلب ہے، تم نے اسے اچھی طرح پہچان لیا ہے نا؟''

''ایک سو ایک فیصد۔''

''مم..... مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں..... میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ بے تابی کی انتہا کو چھونے لگا۔

اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔

روازے تک پہنچ کر وہ یک لخت رک گیا۔ اس کے اندر کی چکاچوند جیسے ایک دم تاریکی میں ل گئی۔ کوئی چیز بجھ گئی اس کے اندر۔ میں نے محسوس کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم ڈھیلا گیا ہے۔

وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہا، تب بے دم سا ہو کر وہیں دہلیز کے پاس ٹھ گیا۔ اس نے اپنا ایک کندھا آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ٹیک دیا۔ ''کیا ہوا جیکی؟'' میں نے اس کا دوسرا کندھا تھام کر پوچھا۔

اس کا سر گھٹنوں کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے یہ جھکا ہوا سر نفی میں ہلا دیا۔ تب نقاہت بھری دل دوز آواز میں بولا۔ ''نہیں..... تابش..... اگر وہ واقعی یہاں ہے تو ی..... میں اس سے مل نہیں سکتا۔ میں ایسی بُری حالت میں اس کا سامنا نہیں کرسکتا۔ ہم نے بہت اچھے دن دیکھے ہیں..... جب دونوں خوب صورت تھے۔ دونوں کے چہرے گلاب تھے۔ اب نہیں..... اب نہیں..... میں اسے اپنی بدبودار..... برباد زندگی کا تماشا نہیں دکھا سکتا۔'' اس کی آواز بھیگتی چلی جا رہی تھی۔

''آپ ایسا کیوں کہتے ہو جیکی..... جو کچھ بھی ہے لیکن آپ جیکی ہو۔ جس طرح آپ نے اسے چاہا ہے، اس نے بھی چاہا ہے اور جو چاہتے ہیں وہ ظاہری حالت پر نہیں جاتے۔ وہ ہا ہی نہیں سکتے۔''

''نہیں تابش، نہیں۔'' اس نے سر جھکائے رکھا اور اسے مسلسل نفی میں ہلاتا رہا۔ اس کے لمبے جھاڑ جھنکاڑ بال اس کے چہرے پر جھولتے رہے۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ بلب کی روشنی میں جیسے ہر جاندار و بے جان شے محوِ حیرت کھائی دیتی تھی۔ جھروکوں سے باہر سرو اور سفیدے کے بلند درختوں پر چاندنی اٹکھیلیاں کرتی تھی۔ دیوان کی بلند و بالا بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ رکھوالی کے کتے اپنی موجودگی کا احساس لا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جیکی کے سراپا میں ایک نئی طرح کی ترنگ پیدا ہوئی۔ اس نے اپنا گرد آلود سر اُٹھایا اور میرا بازو تھام کر بولا۔ ''تابش! میں نے تمہیں آج تک جو کچھ دیا ہے اس کے دلے میں تم سے ایک چیز..... صرف ایک چیز مانگتا ہوں۔ کیا تم..... دو گے؟''

''آپ نے جو کچھ دیا ہے جیکی..... وہ اَن مول ہے۔ پلیز! آپ اس کو بیچ میں نہ لاؤ۔ آپ صرف یہ کہو کہ آپ کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا۔

اس نے کانپتے ہاتھ اور ہانپی سانسوں کے ساتھ وہسکی کے دو بڑے گھونٹ لئے۔ وہسکی

کے قطرے اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں چمکنے لگے۔ وہ نم ناک لہجے میں بولا۔ ''تابش! میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں...... لیکن...... لیکن اس طرح کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔''

''مگر جیکی آپ......''

''نہیں تابش! اب کچھ نہیں کہنا۔ میں نے یہی چیز تم سے مانگی ہے، یہ مجھے ویسے ہی دے دو، جیسے میں چاہتا ہوں۔ اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔ نہ کوئی دلیل دینا۔ اگر ایسا کرو گے تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری پہلی اور آخری خواہش پوری نہیں کی۔''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں خاموش رہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ وہ عجیب موڈ میں تھا۔ اس کے پورے جسم میں ہلکی سی لرزش طاری تھی۔ وہ ہیجانی انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ساری تفصیل پوچھی کہ شکنتلا سے میری ملاقات کیسے اور کیونکر ہوئی۔ میں نے اسے کافی کچھ بتا دیا...... پھر ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ وہ شکنتلا کو کہاں اور کیسے دیکھے گا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات کو تفصیل میں جا کر سوچ رہا تھا اور اپنی سوچ میں مجھے بھی شریک کر رہا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے میں سب کچھ طے ہو گیا۔ وہ انوکھا تھا اور اس کی سوچ بھی انوکھی تھی۔

پروگرام کے مطابق مجھے کل شام کے وقت جیکی کو اس کمرے میں لے جانا تھا جہاں میں سوتا تھا۔ یہ کمرا سلطانہ کے کمرے کے ساتھ واقع تھا۔ شکنتلا چونکہ سلطانہ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی، لہٰذا جیکی کے لئے ممکن تھا کہ وہ میرے کمرے سے اسے تسلی کے ساتھ دیکھ سکے۔ پروگرام کے مطابق میرے کمرے میں بالکل تاریکی رہنی تھی اور دونوں کمروں کی ایک درمیانی جالی دار کھڑکی کو میں نے تھوڑا سا کھول دینا تھا۔ جیکی کو گاہے بگاہے کھانسی بھی ہونے لگتی تھی۔ اگر کہیں ایسا کچھ ہو جاتا تو وہ کمرے کے ملحقہ غسل خانے میں گھس سکتا تھا۔

اگلی صبح شکنتلا سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب کافی حد تک نارمل تھی۔ ایک وحشت زدہ ہرنی کی سی کیفیت جو اس کی آنکھوں میں نظر آتی تھی، اب معدوم ہو چکی تھی۔ چھوٹے سرکار سے اس کی ملاقات ہو چکی تھی اور اس نے اپنی گفتگو سے شکنتلا کی تشویش کافی حد تک دور کر دی تھی۔ صفیہ سمیت تین ملازمائیں ہمہ وقت شکنتلا کی خدمت پر مامور کر دی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ شکنتلا کی اضافی تسلی کے لئے قیام گاہ کے باہر گارڈ بھی بٹھا دیا گیا تھا۔

شکنتلا نہایت نفیس مزاج کی مالک تھی۔ لباس اور خوشبو وغیرہ کے معاملے میں اس کا انتخاب بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس کی نشست و برخاست میں وہ شاہانہ رکھ رکھاؤ تھا جس کا تعلق یقیناً راج بھون کے ماحول سے تھا۔

شکنتلا میرے بارے میں فقط اتنا جانتی تھی کہ میں ان افراد میں سے ہوں جو ماضی میں بدھا کا مقدس مجسمہ چوری کرنے کے الزام میں پاکستان سے پکڑ کر یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں لائے گئے تھے...... اور بعد میں مختار راجپوت کی بیٹی نے خود کو ''راج بھون کی فیری'' بننے سے بچانے کے لئے مجھ سے شادی کر لی تھی۔

وہ پاکستان کے بارے میں کافی کچھ جانتی تھی۔ خاص طور سے کھلاڑیوں اور اداکاروں کے بارے میں۔ اس نے مجھ سے لاہور، انارکلی، کلفٹن اور موہنجوداڑو جیسی جگہوں کے متعلق دلچسپی سے سوالات کئے۔ اپنی ہندی میں وہ انگریزی کے الفاظ بھی روانی سے استعمال کر جاتی تھی۔

وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئی تھی۔ اس کی سفید رنگت میں گلابی پن کی آمیزش تھی اور خدوخال سے خاندانی نجابت جھلکتی تھی۔ راج بھون میں یقیناً اسے حکم جی کی دراز دستیوں اور من مانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس اکھاڑ پچھاڑ نے اس کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو کچھ زیادہ گہنایا نہیں تھا۔

وہ ذرا کھوئے کھوئے انداز میں میری طرف دیکھنے کے بعد بولی۔ ''مجھے ایک بات بتاؤ تابش! کیا رات کو یہاں کوئی گا رہا تھا؟''

میں چونک گیا۔ تاہم اپنے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''مہمان خانے کی طرف ہارمونیم بج رہا تھا لیکن گانے کا تو پتا نہیں۔''

''ہارمونیم تو میں نے بھی سنا تھا لیکن...... یہ اور آواز تھی اور یہ زیادہ دور سے بھی نہیں آ رہی تھی۔''

''کس طرح کی آواز تھی؟'' میں نے تفصیل چاہی۔

اس کے چہرے پر شدید اُلجھن نظر آئی۔ وہ در و دیوار کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کوئی بہت مدھم آواز میں گا رہا تھا۔ پتا نہیں کون سی زبان تھی لیکن...... طرز...... کچھ سنی ہوئی سی لگتی تھی۔''

''یہاں بہت سے گانے والے ہیں۔ چھوٹے سرکار خود بھی اچھی موسیقی کو پسند کرتے ہیں۔ شام کے بعد اکثر راگ رنگ کی محفل جمتی ہے۔''

''نا ہیں، یہ محفل والا میوزک نا ہیں تھا۔'' وہ بدستور اُلجھن زدہ تھی۔

میں کچھ دیر تک شکنتلا کے ساتھ موجود رہا۔ ملازمہ صفیہ بھی بالو کو لے کر وہاں آ گئی۔ شکنتلا نے بالو کو اُٹھا کر پیار کیا۔ وہ سلطانہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے سلطانہ کی ساری روداد معلوم ہو چکی تھی۔ وہ بھی اس خبر پر پریشان تھی کہ سلطانہ کسی خطرناک ارادے کے ساتھ دیوان

کو چھوڑ چکی ہے۔ شکنتلا کا دھیان بھی سیدھا جارج کی ستم ظریفیوں کی طرف ہی جا رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ سلطانہ، جارج سے بدلہ لینے کی کوشش کرے گی اور یہ کوشش خود سلطانہ کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔

وہ بالو کو پیار کرتی رہی۔ مجھ سے سلطانہ کی تلاش کے بارے میں باتیں بھی کرتی رہی اور صفیہ کو چھوٹی موٹی ہدایات بھی دیتی رہی لیکن اس کے چہرے پر اُلجھن کی لکیریں موجود رہیں۔

اس کی اُلجھن کی وجہ تک پہنچنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ اس نے کل رات جیکی کو گاتے سنا تھا۔ یقیناً وہ نیپالی گیت پہلے بھی کبھی اس کے کانوں میں پڑ چکا تھا۔ اب وہ آواز اس کے دل و دماغ میں ماضی کا کوئی نقشہ کھینچ رہی تھی۔ یہ تو وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ جیکی زندہ حالت میں یہاں اس چار دیواری میں موجود ہوگا...... مگر بھولی بسری آواز نے اسے پریشان ضرور کیا تھا۔

شام کو میں نے ایک بار پھر شکنتلا کو اُلجھن زدہ حالت میں دیکھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کے ساتھ ایک اندرونی روش پر ٹہل رہی تھی۔ وہ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ ایک دو جملے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ صفیہ سے پوچھ رہی تھی۔ ”دیوان کے اس رہائشی حصے میں کتنے گھر ہیں؟“

”دس بارہ تو ہوں گے جی۔ ایک دو بڑی کوٹھیاں بھی ہیں۔“

”یہاں کون کون رہتا ہے؟“

”زیادہ تر تو چھوٹے سرکار اور مراد شاہ جی کے مہمان ہی ہووت ہیں۔ ان میں سے دو چار ایسے بھی ہیں جو زرگاں سے آپ کی طرح جیون بچا کر یہاں پہنچے ہیں۔“ وہ دونوں باتیں کرتے کرتے آگے نکل گئیں۔

صفیہ اور دیگر ملازموں کو جیکی کے بارے میں کچھ خاص معلوم نہیں تھا۔ انہیں بس یہ پتا تھا کہ کوئی سخت بیمار، شرابی شخص یہاں آیا ہے۔ کسی لڑائی میں اس کی ایک ٹانگ اور بازو جسم سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔

...... وہ شام میرے لئے ایفائے وعدہ کی شام تھی۔ آج میں نے اپنے محسن بارونڈا جیکی کے لئے کچھ ایسا انتظام کرنا تھا کہ وہ اپنی گمشدہ محبت کو جی بھر کر دیکھ سکے...... پوری تسلی کے ساتھ اس چہرے کا دیدار کر سکے جس کی یاد وہ کئی موسموں سے اپنے فگار سینے میں چھپائے پھرتا ہے۔ شکنتلا مجھ سے وہ ساری روداد پوچھنا چاہتی تھی جب میں جارج گورا کے محل نما گھر

سے نکلا تھا اور چھپتا چھپاتا انور خاں وغیرہ تک پہنچا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں شام کو اس کے پاس آؤں گا اور سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔ میرے اس وعدے کے پیچھے دراصل بارونڈا جیکی سے کیا ہوا وعدہ ہی تھا۔

شام کے بعد میں تھوڑے سے تناؤ میں تھا لیکن سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہی ہوا۔ میں جیکی کو پہلے ہی ساتھ والے کمرے میں پہنچا چکا تھا۔ شکنتلا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ باتیں تو میرے ساتھ کر رہی ہے لیکن اسے دیکھ کوئی اور رہا ہے۔ اس کی آواز، اس کی مسکراہٹ، اس کے اُٹھنے بیٹھنے کا انداز سب کچھ کسی کی بے حد مشتاق نگاہوں کے گھیرے میں تھا۔ آج وہ کچھ زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ شاید یہ شام کچھ زیادہ حسین تھی یا پھر اس کی اپنی ذات کی وجہ سے شام کا حسن بڑھ گیا تھا۔ وہ خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ اس کے گلابی آنچل کے نیچے اس کے طلائی جھمکے دمکتے تھے اور اس کی صراحی دار گردن کے پس منظر میں اس کے لمبے بالوں کا آبشار نظر آتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ دو آنکھیں اس کے سراپا کو پلکوں سے چوم رہی ہیں۔

ہاں...... وہ بڑی رومانی شام تھی لیکن اس شام میں جس طرح کا رومان ہو رہا تھا، وہ عام ڈگر سے بہت مختلف تھا۔ کوئی سراپا شوق تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کوئی سراپا غفلت تھا اور اسے دیکھا جا رہا تھا۔

ہماری نشست ختم ہونے کے قریب تھی جب قریبی کمرے سے کھانسی کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ یہ جیکی کی آواز ہی تھی۔ کھانسی شروع ہونے کے فوراً بعد اس نے شاید اپنا منہ ڈھانپ لیا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ شکنتلا نے قدرے چونک کر پوچھا۔ اس کے انداز میں بیزاری تھی۔

”کوئی ملازم ہے شاید۔“ میں نے کہا اور اُٹھ کر جالی دار کھڑکی کا اَدھ کھلا پٹ بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد میں شکنتلا سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

O......❖......O

جیکی اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ یہ جیکی ہی کا کمرا تھا۔ جیکی کے بیمار جسم کی ہلکی سی باس کمرے میں رچی بسی تھی۔ جیکی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ ان آنکھوں میں تشکر، خوشی، حسرت اور ممنونیت کے جذبات گڈمڈ تھے۔

”مجھے لگتا ہے کہ اب میرے لئے مرنا اور آسان ہوگیا۔“ وہ شستہ انگریزی میں بولا۔

"آپ پھر وہی بات کر رہے ہو...... اب تو آپ کو جینے کی بات کرنی چاہئے اور آپ کو کرنی پڑے گی۔ بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے، اب آپ کو بھی تبدیل ہونا پڑے گا۔ ہم نے اب آپ کو بھلا چنگا کر کے چھوڑنا ہے۔ کل بہت اچھے ڈاکٹر صاحب آپ کو دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں۔"

اس نے اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کو چھت کی طرف اُٹھایا اور کھانستے ہوئے بولا۔

"میں بہت سا سفر طے کر چکا ہوں۔ اب مجھے واپس بلانے کی باتیں نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔"

"اب آپ کو واپس آنا پڑے گا جناب...... کیونکہ اب واپسی کی نہایت خوب صورت اور شان دار وجوہات موجود ہیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"اب ایسا نہیں ہو سکے گا تابش! اب تو زندگی کی شام گہری ہو چکی ہے۔"

"یہ شام نہیں تھی جناب! بس بادل تھے جن کی وجہ سے آپ نے دوپہر کو شام سمجھ لیا تھا۔ بہت جلد آپ کی زندگی کا سورج نصف النہار پر چمکے گا۔"

وہ نفی میں سر ہلاتا رہا پھر بولا۔ "میں ایک بار پھر تمہیں تاکید کرنا چاہتا ہوں۔ کہیں غلطی سے بھی شاکن (شکنتلا) کو میرے سامنے مت لانا۔ یہ میرے لئے اتنا ہی سخت ہو گا جتنا ایک ہزار بار جان کنی کے عذاب میں سے گزرنا۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ میری اپنی سوچ جو بھی ہو، میں وعدے کی پابندی کروں گا۔ اس کی مرضی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ اس رات جیکی نے معمول سے زیادہ پی۔ اس کی گندی خود رو داڑھی تر بتر ہو گئی۔ وہ اپنی آنکھیں بہت کم کھول رہا تھا۔ جیسے وہ شکنتلا کے دیدار کی راحت کو اپنی پلکوں میں محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔ مجھے اس کی باتوں سے شک ہو رہا تھا کہ وہ اب کسی طرح یہاں سے نکل جانے کا سوچ رہا ہے...... اس کے سونے کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ موسم میں اب کافی خنکی آ چکی تھی۔ غالباً ٹھنڈ کی وجہ سے ہی میں بیدار ہوا تھا۔ میں کمبل لینے کے لئے الماری کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب میری نظر کھڑکی سے گزر کر اس رہائشی پورشن کی طرف گئی جہاں جیکی قیام پذیر تھا۔ یہ پورشن باقی حصے سے علیحدہ تھا اور وہاں تک جانے کے لئے، ایک خم دار گلی سے گزرنا پڑتا تھا۔ مجھے جیکی کے کمرے کی طرف ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ یہ خلاف معمول تھا۔ وہ تاریکی میں سونا پسند کرتا تھا۔ میں کمرے سے نکلا۔ چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ بس کہیں کہیں بوجھل آنکھوں والے پہرے دار منڈلا رہے تھے۔ میں خم دار گلی سے گزر کر جیکی کے کمرے تک پہنچا۔ یہ دیکھ

کر مجھے شاک پہنچا کہ جیکی کے کمرے کا تالا کھلا ہوا ہے۔ اندر نیلگوں بلب کی ہلکی سی روشنی تھی۔ میں دروازہ کھولنے کے بجائے کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف گیا۔ کھڑکی کے ایک نیم وا پٹ میں سے میں کمرے کا وسطی منظر دیکھنے میں کامیاب رہا۔ اس منظر نے میرے پاؤں زمین میں گاڑ دیئے اور میں جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ میں نے کمرے کی خاموش نیلی روشنی میں شکنتلا کو دیکھا۔ وہ فرش پر دوزانو بیٹھی تھی۔ اس کے بال اس کی گود میں کنڈلی مارے ہوئے تھے۔ شکنتلا کے سامنے جیکی تھا۔ وہ گہرے نشے میں بے سدھ پڑا تھا۔ بس اس کی سانس کی آمدورفت سے پتا چلتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے سنولائے ہوئے جسم پر بس وہی ایک لنگوٹ تھا۔ اس کی ایک ایک پسلی اور ہڈی علیحدہ سے گنی جا سکتی تھی۔ اس کا چہرہ خستہ جانی کی بدترین مثال تھا۔

شکنتلا یک ٹک اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں سے تواتر کے ساتھ پانی کے موتی گر رہے تھے۔ میں تحیر کے عالم میں دیکھتا چلا گیا۔ شکنتلا کے چہرے پر محبت کسی پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ اس کے نازک نتھنے جذبات کی شدت سے بے ساختہ پھڑک رہے تھے۔ پھر میں نے ایک اور منظر دیکھا۔ جیکی کی حالت اور بدبو کی پروا کئے بغیر وہ آگے بڑھی۔ جیکی کے سرہانے کی طرف بیٹھ کر اس نے جیکی کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ "جیکی...... جیکی......!" شب کے جادوئی سناٹے میں اس کی جذباتی سرگوشی گونجی۔ یہ سرگوشی محبت کے اس عظیم رشتے کی گواہ تھی جو بظاہر کچے دھاگے سے بھی کمزور ہوتا ہے لیکن جس کی طاقت دو انسانوں کو اس طرح باندھتی ہے کہ جبر وستم کی سخت ترین آندھیاں بھی انہیں علیحدہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ حکم اور جارج گورا جیسے ہزار ہا لوگ اس نازک دھاگے کو توڑنے کے لئے ہر زمینی حربہ آزماتے رہے ہیں لیکن ہر بار انہیں منہ کی کھانی پڑی ہے۔ بے شک وہ پیار کرنے والوں کو مارنے میں کامیاب ہوئے لیکن پیار کو نہ مار سکے۔ ہاں...... یہ وہی پیار بھری سرگوشی تھی۔

اس نے اپنی حنائی انگلیوں سے اس کے گرد آلود بال سہلائے، اس کے گال تھپتھپائے۔ اسے کئی بار ہولے ہولے جھنجوڑا۔ "جیکی...... جیکی...... آنکھیں کھولو۔" اس نے اس کا سر اپنی بانہوں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی گھنی زلفوں نے بکھر کر جیکی کا سر اور کندھے ڈھانپ لئے۔ وہ اسے چومنے لگی، ہولے ہولے پکارنے لگی۔ پھر میں نے جیکی کے جسم میں حرکت دیکھی۔ ہڈیوں کا وہ قریب المرگ ڈھانچا بیدار ہو رہا تھا......

شکنتلا نے اسے خود سے جدا کیا۔ تر بتر آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھی دیکھنے

لگا۔ بالکل خالی خالی نگاہوں سے...... جیسے اس منظر کو اپنے کسی حسین سپنے کا حصہ سمجھ رہا ہو۔ پھر ہولے ہولے جیکی کے ہڈیوں بھرے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے اور پھیلتے چلے گئے۔ شکنتلا نے ایک بار پھر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ سسکنے لگی۔ ''جیکی! یہ کیا ہو گیا؟ تم کیا سے کیا بن گئے...... جیکی! یہ سب میرے کارن ہوا ہے نا؟ میں ہی تمہاری دوشی ہوں نا؟ جیکی! مجھے بتاؤ، میں ہی دوشی ہوں نا؟''

جیکی خاموش تھا۔ بس کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اُسے جیسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک حقیقی منظر دیکھ رہا ہے۔ میں کھڑکی میں سے ہٹ گیا۔ میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔ حسن و عشق کی جو ملاقات آج میں نے دیکھی تھی، وہ کبھی میرے تصور میں بھی نہ آئی تھی۔

یہ بات سمجھنا اب میرے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا کہ مضطرب شکنتلا رات کو ان در و دیوار میں چکراتی رہی تھی اور آخر جیکی کے کمرے تک جا پہنچی تھی۔

......قریباً ایک گھنٹے بعد میں نے دوبارہ جا کر کھڑکی سے آنکھ لگائی۔ وہ اسی طرح اس کے بدبودار جسم کو اپنی خوشبودار ریشمی آغوش میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ اس کے لئے وقت کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ جیکی کا اکلوتا ہاتھ شکنتلا کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ منظر دیگر لوگ بھی دیکھیں۔ میں نے اس پورشن کی طرف آنے والے تمام دروازے مقفل کرا دیئے۔

صبح کے وقت میں نے محسوس کیا کہ جیکی کی سانس رک رک کر آ رہی ہے۔ درحقیقت اس کی طبیعت کل رات سے ہی مسلسل بگڑ رہی تھی۔ اسے فوری طور پر ڈاکٹر کی ضرورت تھی اور جاپانی ڈاکٹر کو دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں پہنچنا تھا۔

میں ڈاکٹر چوہان کے پاس پہنچا۔ اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ وہ بھی تفصیل جان کر حیران رہ گیا۔ وہ اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ آیا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے اور جیکی کو بہ مشکل شکنتلا سے علیحدہ کیا۔ پھر بھی وہ مکمل طور پر علیحدہ نہیں ہوئی۔ اس نے جیکی کا ہاتھ مسلسل اپنے ہاتھ میں رکھا۔ چوہان نے جیکی کے وائٹل سائنز چیک کئے۔ اس کا بلڈ پریشر بہت کم ہو چکا تھا اور نبض ڈوب کر بھر رہی تھی۔

جیکی کی حالت کے پیش نظر جاپانی ڈاکٹر لی وان نو بجے ہی دیوان میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک اسسٹنٹ اور ایک بڑا میڈیکل باکس بھی لایا تھا۔

قریباً دو گھنٹے تک جاپانی ڈاکٹر لی وان، جیکی کی حالت کے ساتھ نبرد آزما رہا...... اس کی مسیحائی سے جیکی کی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ اس کی سانس میں بھی قدرے روانی آ گئی لیکن

ڈاکٹر لی وان ابھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ مریض ابھی خطرے سے باہر نہیں۔ خاص طور سے اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔

رات بارہ ایک بجے کے قریب جیکی کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔ شکنتلا نے اسے مسلسل اپنی بانہوں میں لے رکھا تھا۔ اس کا سر شکنتلا کی گود میں تھا۔ وہی اسے دوا وغیرہ بھی کھلا رہی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ جیکی شراب کے سوا کسی اور شے کے لئے منہ کھول ہی نہیں سکتا اور دوا کے لئے منہ کھولنا تو اچھے بھلے لوگوں کے لئے کافی مشکل ہوتا ہے۔ شکنتلا کے کہنے پر جیکی نہ صرف دوا کے لئے منہ کھول رہا تھا بلکہ دوا کو نگل بھی رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر شکنتلا اس کے منہ میں جلتا ہوا انگارہ بھی رکھ دے گی تو وہ بغیر آہ کئے اسے گلے میں اتار لے گا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی مگر جیکی کی حالت میں کوئی خاص بہتری نظر نہیں آئی۔ چوہان ہی کی ہدایت پر دو تین بار شکنتلا نے تھوڑی تھوڑی شراب بھی جیکی کو پلائی مگر لگتا تھا کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ یا تو وہ اتنی کم مقدار میں تھی کہ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا...... یا پھر اس کی طبیعت ابتر تھی۔

دوپہر کو چوہان اور میں نے شکنتلا کی بہت منت سماجت کی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے آرام کر لے اور کچھ کھا پی لے لیکن وہ تو اپنی جگہ سے ایک انچ سرکنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ شام کو جاپانی ڈاکر لی وان نے جیکی کو گلوکوز کی ڈرپ لگائی اور ڈرپ میں کچھ دوائیں بھی انجیکٹ کیں۔ اس سے یہ ہوا کہ جیکی غنودگی میں چلا گیا۔ اس کی سانس بھی کچھ ہموار ہو گئی۔ رات کو ہم نے پھر زور لگایا اور شکنتلا کو ایک دو گھنٹے آرام کے لئے آمادہ کر لیا لیکن وہ کہیں گئی نہیں۔ وہیں جیکی کے کمرے میں ایک گوشے میں سمٹ کر لیٹی رہی۔

میں نے جیکی کا سر اپنے زانو پر لے لیا۔ آج سردی خاصی زیادہ تھی۔ کھڑکیوں کی درزوں میں سے سرد ہوا سرسراتی ہوئی اندر داخل ہوتی تھی۔ جیکی حسبِ معمول ایک لنگوٹ میں تھا۔ میں نے اس پر ایک کمبل ڈالنا چاہا۔ اس نے اضطراب کا اظہار کیا اور کمبل پیچھے ہٹا دیا۔

پھر اس نے سر کے اشارے سے کہا کہ میں اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی سرگوشی میں بولا۔ ''تم...... بھی...... اپنا کمبل اتار پھینکو۔''

میں نے کمبل نہیں لیا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تا کہ جیکی علامتی یا رمزیہ بات کر رہا ہے۔ مجھے بتا رہا ہے کہ میں بھی جسمانی راحتوں کے حوالے سے اپنا وطیرہ بدلوں۔ وہ پہلے بھی مجھ

سے اس موضوع پر بات کرتا رہا تھا۔ آج پھر اس نے اسی موضوع پر چند سرگوشیاں کیں۔ اس نے اٹک اٹک کر بے حد لڑکھڑاتی آواز میں جو کچھ کہا، وہ اس طرح تھا ”......تن آسانی ہمیں کمزور کرتی ہے۔ ہم جتنی زیادہ جسمانی سختیاں جھیلتے ہیں، اتنے ہی مضبوط اور زور آور ہوتے ہیں۔ افریقا کے ریگستانوں میں جہاں دوپہر کے وقت ریت انگاروں کی طرح دہکتی ہے، جاندار زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح جمی ہوئی برف کے اندر بھی آبی مخلوق سانس لیتی ہے......تو پھر ہم کیوں موسموں کا جبر نہیں جھیل سکتے؟ ہم کیوں...... بھوک پیاس...... تھکن اور درد سے نہیں لڑ سکتے...... ایسا ہو سکتا ہے......اور جو لوگ ایسا کرنا سیکھ جاتے ہیں......کوئی ان سے جیت نہیں سکتا۔“

بات کرتے کرتے اس نے میری طرف دیکھا۔ جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے اس کی پیشانی سہلائی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی سرگوشی جاری رہی۔ ”جو درد، تکلیف اور سختی کا سامنا کرتے ہیں، وہی راحت، خوشی اور فتح کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔ بڑا ہی سادہ فارمولا ہے...... جتنا زیادہ دکھ، اتنی زیادہ خوشی...... جتنی زیادہ تکلیف، اتنی زیادہ کامیابی......“

وہ دھیرے دھیرے بولتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس کی باتیں میرے دل کے اندرونی تاروں کو چھیڑتی تھیں۔

”کچھ“ تھا اس میں جو وہ مجھے دینا چاہتا تھا......اور جو کچھ وہ دینا چاہتا تھا اس کے لئے میرے اندر ایک خلا موجود تھا۔

صبح سے کچھ دیر پہلے اس کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ شکنتلا پھر بے چین ہو کر اس کے سرہانے آن بیٹھی۔ اس نے اس کا سر پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔

شکنتلا کا لمس پاتے ہی جیکی جیسے پھر سے جی اُٹھتا تھا۔ امید پیدا ہونے لگتی تھی کہ وہ بے شمار دیگر مقابلوں کی طرح موت سے یہ مقابلہ بھی جیت جائے گا۔

صبح سویرے ڈاکٹر لی وان بھی آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ کچھ خاص انجکشن لایا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ یہ انجکشن جیکی کی طبیعت سنبھالنے میں بہت مدد دیں گے۔ اپنی دواؤں میں سے ان انجکشنز کا مل جانا لی وان ایک کرشمہ سمجھ رہا تھا۔

یہ انجکشنز بھی گلوکوز کی ڈرپ کے ذریعے ہی جیکی کی ورید میں انجیکٹ کئے جانے تھے۔ ڈاکٹر لی وان ڈرپ لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ شکنتلا کو موقع سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن وہ تو جیسے جیکی کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ کسی صورت جدا ہونے کو تیار نہیں تھی۔ ابھی ڈاکٹر نے جیکی

کو ڈرپ لگائی نہیں تھی کہ اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا مدقوق چہرہ بالکل زرد پڑ گیا اور سانس رک رک کر آنے لگی۔ ڈاکٹر لی وان نے جیکی کے وائٹل سائنز چیک کئے اور وہ بھی پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس نے کہا۔ ”ٹمپریچر بہت شوٹ کر گیا ہے۔ فی الحال ڈرپ نہیں لگائی جا سکتی۔“

”بلڈ پریشر کیا ہے؟“ ڈاکٹر چوہان نے پوچھا۔

”وہ بھی بڑھا ہوا ہے۔“ ڈاکٹر لی وان کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”اسے اسپتال لے جانا پڑے گا۔ یہاں مشکل ہو جائے گی۔ آپ لوگ گاڑی کا انتظام کریں۔ اگر کار وغیرہ ہو جائے تو بہتر ہے۔“

چوہان بھاگتا ہوا باہر گیا اور دو چار منٹ بعد واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کار تو نہیں ملی لیکن گھوڑا گاڑی آ گئی ہے۔

ہم نے ہلکے پھلکے باروندا جیکی کو احتیاط سے اُٹھایا اور گاڑی میں پہنچا دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ادھورے جسم کا وزن بیس پچیس کلو سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ ایک آرام دہ فوجی گاڑی تھی۔ چار نہایت توانا گھوڑے اسے کھینچ رہے تھے۔ ہم برق رفتاری سے ڈاکٹر لی وان کے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ اب سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں نشیب و فراز کو روشن کر رہی تھیں۔ بلند عمارتوں کے خوب صورت چوبارے اور عبادت گاہوں کے گنبد وکلس اس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ آرام دہ گاڑی حتی الامکان رفتار سے جا رہی تھی۔ جیکی کا سر شکنتلا کے زانو پر تھا۔ اس نے خود کو پوری طرح جیکی پر جھکا رکھا تھا۔ یکا یک جیکی کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ وہ بل کھا کر رہ گیا۔ ڈاکٹر چوہان اور شکنتلا نے سہارا دے کر اسے بٹھا دیا۔ شکنتلا نے بہ مشکل اسے ایک گھونٹ پانی پلایا۔ اس نے جیکی کو اپنے سہارے بٹھایا ہوا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور خالی خالی نظروں سے گھوڑا گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر نل پانی کے باغات نظر آ رہے تھے۔ ہم اب آبادی کے مضافات میں تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ جیکی کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹ نیلے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے پہلے میری طرف دیکھا پھر شکنتلا کو اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر شکنتلا نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ بہت مدھم آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ شکنتلا بھیگی آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کھڑکیوں سے باہر بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر شکنتلا نے ڈاکٹر چوہان سے مخاطب ہو کر دل فگار آواز میں کہا۔

”ڈاکٹر! گاڑی رکوائیے۔“

چوہان چند لمحے تذبذب میں رہا پھر اس نے شاہی کوچبان سے کہا کہ وہ گاڑی روک دے۔ گاڑی رک گئی۔ جہاں گاڑی رکی، وہاں سرسبز کھیتوں کے درمیان دور تک شفاف پانی پھیلا ہوا تھا۔ اس پانی پر عجیب سی نیلاہٹ تھی۔ یہ نیلاہٹ دراصل کنول کے بے شمار پھولوں کی تھی۔ جیکی نے شاید اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر ہی گاڑی رکوائی تھی۔ شکنتلا اب سسکیوں سے رو رہی تھی۔ اس نے کوچبان کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا گاڑی اس پانی میں جا سکتی ہے؟

کوچبان نے آگے جا کر پانی کا جائزہ لیا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب وہ روتے ہوئے بولی۔ ''گاڑی کو پانی میں لے جاؤ۔''

ہم سب جان گئے تھے کہ یہ جیکی کی خواہش ہے اور شاید یہ خواہش آخری خواہش کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ بس تھوڑی دیر کا مہمان تھا اور لگتا تھا کہ جاپانی ڈاکٹر لی وان نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس نے جیکی کی اس انوکھی خواہش کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔

ہم گھوڑا گاڑی سے اُتر گئے۔ صرف جیکی اور شکنتلا موجود رہے۔ وہاں زمین پر پانی دو تین فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ کوچبان گھوڑوں کو آہستہ آہستہ ہانکتا ہوا آگے تک لے گیا۔ وہاں چاروں طرف سنہری دھوپ تھی اور کنول کے ہزارہا پھول سرما کے اوّلین جھونکوں میں ہولے ہولے رقص کر رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی سفید بطخ یا مرغابی کی جھلک بھی نظر آ جاتی تھی۔ گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ کوچبان گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلتا ہوا واپس آ گیا۔

سب کی آنکھیں نم تھیں۔ چمکیلی منقش گاڑی کنول کے اَن گنت پھولوں کے درمیان ساکت کھڑی تھی اور اس گاڑی میں شکنتلا اور جیکی کے ہیولے نظر آ رہے تھے...... جیکی کو وہ کشتی اور وہ جھیل تو نہیں مل سکی تھی جو اس کی سنہری یادوں کا حصہ تھی لیکن اس سے ملتا جلتا منظر ضرور مل گیا تھا...... اور پھر اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ شکنتلا کی بانہوں میں تھا۔ ایسا تو شاید کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ ایک عظیم نیپالی فائٹر تھا لیکن اس کے چٹانی جسم کے اندر ایک شاعر کا سا گداز بھی موجود تھا اور یہ شاعر ایک آئیڈیل موت چاہتا تھا۔ ایک خوب صورت الوداعی منظر...... اور یہ سب کچھ اسے مل گیا۔

ہونی ہو کر رہتی ہے اور قدرت کے اصول آسانی سے نہیں بدلتے۔ سورج نصف النہار کے قریب تھا جب جیکی مر گیا۔ چمکیلے پانی کے درمیان اور ہزارہا پھولوں کے بیچ۔ اس کی آخری ہچکی شکنتلا کی ریشمی گود میں جذب ہوئی۔ شکنتلا کے رونے کی آوازوں سے ہمیں پتا چلا کہ کھیل

ختم ہو چکا ہے۔ ہم کنارے سے پانی میں چلے گئے۔ وہ گھوڑا گاڑی کی ایک آرام دہ نشست پر ساکت لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر آسودگی تھی اور نقوش گواہی دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہموار طریقے سے زندگی کی سرحد پار کر گیا ہے۔ چوہان نے اس کا جسم ایک کمبل سے ڈھانپ دیا۔ گاڑی کے اندر سے یہی لگ رہا تھا کہ یہ کوئی جھیل ہے اور ہم کشتی میں بیٹھے ہیں۔

ہم گھوڑا گاڑی کو اس پانی سے باہر لائے۔ شکنتلا اب بھی جیکی کے ساتھ پیوست تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ اس نے اپنے جھمکے اتار دیئے۔ قیمتی ہار بھی اتار پھینکا۔ اس کے بعد اس نے کسی بیوہ کی طرح اپنی چوڑیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر مار کر توڑ ڈالیں اور ایک سفید چادر سے اپنا سراپا ڈھانپ لیا۔

دِل دریا سمندروں ڈونگے، کون دِلاں دیاں جانے ہُو

O.....❖.....O

جیکی کی موت نے مجھے گہری افسردگی کا شکار کر دیا۔ میں اس کمرے میں تنہا بیٹھا رہتا جہاں میں اور جیکی مشق کیا کرتے تھے...... میں چھت سے جھولتے ہوئے سینڈ بیگ کو دیکھتا رہتا اور وہ سارے مناظر میری نگاہوں کے سامنے آتے جن میں جیکی میرے ساتھ تھا...... شکنتلا بھی بے پناہ غم کے گھیرے میں تھی۔ وہ ایک کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ صفیہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار بہ مشکل اس کو تھوڑا بہت کھلا دیتی تھی۔ اسے دیکھ کر بعین یہی لگتا تھا کہ وہ ایک جوان بیوہ ہے۔

ایک دن چوہان میرے پاس آن بیٹھا۔ وہ اجے کے ساتھ مل کر سلطانہ کی تلاش سرگرمی سے جاری رکھے ہوئے تھا۔ تاہم اس سلسلے میں ابھی تک کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ ہم کچھ دیر تک سلطانہ کے بارے میں بات کرتے رہے پھر گفتگو کا رخ حسبِ معمول جیکی اور شکنتلا کی طرف مڑ گیا۔

میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''کاش! ہم کسی طرح جیکی کو بچا سکتے۔''

چوہان بولا۔ ''ہم نے اپنی سی کوشش تو کی ہے تابش! اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو بڑی تیزی سے خرچ کیا...... شاید وہ خود بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔''

''لیکن اگر اسے پتا ہوتا کہ وقت ایک بار پھر اسے شکنتلا کے رُوبرو لائے گا تو وہ موت کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتا۔'' میں نے کہا۔

''مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم آنے والے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں اور یہی نظامِ قدرت ہے۔ بہرحال...... اس بات کا تو اطمینان ہے کہ جیکی کا آخری وقت نسبتاً آسان ہو

گیا۔اس نے اس ہستی کی بانہوں میں جان دی جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی۔"

میں تصور کی نگاہ سے جیکی کا وقتِ رخصت دیکھنے لگا۔آخری لمحوں میں جیکی کی خواہش پر ہم نے گھوڑا گاڑی کنول کے پھولوں کے درمیان کھڑی کر دی تھی۔ وہ دونوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیسے جان دی۔ مگر میرا خیال تھا کہ شکنتلا آخری وقت تک اسے چومتی رہی ہو گی۔اسے اپنی بانہوں کا گداز دیتی رہی ہو گی۔

چوہان بولا۔"چلو آؤ، باہر چلتے ہیں۔آج کئی دن بعد دھوپ نکلی ہے۔ ذرا گھومیں پھریں گے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"تمہارا غم ذرا ہلکا ہو گا۔جیکی کی طرف سے دھیان ہٹے گا۔"

"لیکن میں دھیان ہٹانا نہیں چاہتا۔ میں اسے یاد رکھنا چاہتا ہوں اور وہ سب کچھ یاد رکھنا چاہتا ہوں جو وہ مجھ سے کہہ گیا ہے...... اور وہ بھی جو وہ کہہ نہیں سکا۔"

"کیا کہہ نہیں سکا؟"

"وہ جو اس کی جسمانی حالت کہتی تھی۔اس کی اجاڑ آنکھیں کہتی تھیں...... وہ بھی ہماری طرح حکم جی اور جارج کا ڈسا ہوا تھا۔ وہ زبان سے نہیں کہتا تھا لیکن جارج کی بے رحمی کے لگائے ہوئے چرکے اس کے سینے میں تو تھے نا۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" چوہان نے سرد آہ بھری۔

"میں اپنا حوصلہ آزمانا چاہتا ہوں چوہان۔" میں نے گمشدہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"میں جارج گورا سے رُوبرو ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے بہت سارے قرض ہیں مجھ پر۔"

"تم جذباتی باتیں کر رہے ہو تابش! جارج کوئی پہلوان نہیں ہے جسے تم للکارو گے تو وہ کشتی لڑنے کے لئے تمہارے سامنے آ جائے گا۔"

"وہ ہے پہلوان...... چوہان! ہمیں ماننا پڑے گا کہ وہ فلموں کا کوئی روایتی ولن نہیں ہے جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور صرف اپنے چمچوں کے زور پر دادا گیری کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر یورپین کی طرح خود کو بہت اسمارٹ سمجھتا ہے اور اسے اپنی طاقت کا گھمنڈ بھی ہے۔ میں اس کے اس گھمنڈ کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے میرے سامنے پستول پھینکا تھا اور مجھے دعوت دی تھی کہ میں یہ پستول اُٹھا کر اس پر چلاؤں...... تب میں ایسا نہیں کر سکا تھا لیکن

اب میرا دل کہتا ہے کہ میں ایسا کر سکوں گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرا دل سچ کہہ رہا ہے یا پھر اب بھی مجھے دھوکا دے رہا ہے۔"

"جلد بازی نہ کرو تابش! تمہیں خود کو آزمانے کے بڑے موقع ملنے والے ہیں۔" چوہان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"لڑائی ختم نہیں ہوئی، صرف ٹلی ہے۔کوئی بھی نیا واقعہ کسی بھی وقت اس آگ کو بھڑکا سکتا ہے۔تمہیں پرسوں رات والی خبر ملی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔"ابھی یہ خبر پوری طرح پھیلی نہیں لیکن چند گھنٹوں میں ہر ایک کی زبان پر ہو گی۔کل رات زرگاں میں تین بندے قتل ہوئے ہیں۔ یہ تینوں زرگاں کی جیل کے افسر ہیں اور جارج کے ماتحت۔ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ جگہوں پر قتل کیا گیا ہے۔دو کو گھر میں اور ایک کو عیاشی کے اڈے پر۔ان تینوں بندوں کو بڑی بے دردی سے تیز دھار آلے کے وار کر کے مارا گیا ہے۔شہر میں سخت خوف و ہراس پایا جا رہا ہے۔"

"کس کا کام ہو سکتا ہے؟"

"زرگاں میں تو عام خیال یہ ہے کہ قاتل وہی ہیں جنہوں نے کچھ دن پہلے جارج کی بہن ماریا کو اغوا کیا اور پھر اپنے مطالبے منوانے کی کوشش کی...... لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ماریا کو اغوا کرنے والوں میں تمہارے اور اسحاق کے علاوہ فیروز اور احمد تھے۔ وہ دونوں تو ختم ہو چکے ہیں اور تم دونوں یہاں نل پانی میں ہو۔"

"تو پھر کون ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

چوہان خاموش نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اچانک میرے ذہن میں برق سی کوندگئی۔ دھیان سیدھا سلطانہ اور اس کی دو فٹ لمبی تلوار کی طرف گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس کی آنکھیں یاد آئیں...... اور ان آنکھوں میں خاموشی سے کوندتی ہوئی وہ بجلی جو خون کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی تھی۔

میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔"تم صاف کیوں نہیں بتاتے...... یہ کس نے کیا ہے؟"

وہ گہری سانس لے کر بولا۔"ابھی وشواس سے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جو شک تمہارے ذہن میں آیا ہے، وہ میرے ذہن میں بھی ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے

ذہن میں بھی آئے گا۔ ابھی تک جو اطلاع پہنچی ہے اس کے مطابق ان تینوں وارداتوں کا کوئی چشم دید گواہ تو نہیں لیکن شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو افراد کا کام ہے...... اور انہوں نے خاص قسم کی تلواریں استعمال کی ہیں۔"

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سلطانہ واقعی وہاں پہنچ چکی ہو؟"

"ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔" چوہان نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہو چکا ہے......"

ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح چوہان کا دماغ بھی گھڑ دوڑ کا میدان بن چکا ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔ "اب کیا ہوگا چوہان؟ اگر وہ واقعی زرگاں میں ہے تو پھر وہ لوگ اسے اور طلال کو وہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔"

"ابھی اس بارے میں کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے تابش! ابھی تو ان لوگوں کو اپنی پڑی ہوگی...... تین اہم ترین بندے قتل ہوئے ہیں۔ وشوا ناتھ نام کا جو اسسٹنٹ اپنے گھر کے کمرے میں مارا گیا ہے، وہ پرلے درجے کا عیاش مشہور تھا۔ زرگاں کے بازارِ حسن میں جو بھی خوب صورت طوائف پیشہ شروع کرتی تھی، اسے پہلے وشوا ناتھ کے پاس حاضری لگوانی پڑتی تھی۔ اس اصول کی خلاف ورزی کرنے والی طوائف اور اس کے وارثوں پر سخت مصیبت نازل ہوتی تھی۔ کل رات بھی وشوا ناتھ اپنے بیڈروم میں ایک نئی لڑکی کو پیشے کا "اجازت نامہ" دے رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اتفاقاً اس کے دونوں ملازم نشے میں مدہوش پڑے تھے، اُٹھ نہیں سکے۔ وشوا ناتھ نے پہلے ملازموں کو گالیاں دیں پھر دستک دینے والے کی ایسی کی تیسی کرتا ہوا باہر نکلا۔ نوجوان طوائف زادی کمرے میں انتظار کرتی رہی۔ جب کافی دیر گزر گئی تو وہ ڈرتی ڈرتی باہر نکلی۔ اسے گھر کے اندرونی دروازے کے سامنے ہی وشوا ناتھ منہ کے بل پڑا نظر آیا۔ اس کے فربہ جسم پر درجنوں زخم تھے۔ لگتا تھا کہ اس کی لاش پر بھی تیز دھار آلے کے وار کئے گئے ہیں۔ اس کا پستول بھی قریب ہی پڑا ہوا ملا ہے۔ شاید آخری وقت میں اس نے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی۔ لڑکی روتی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی اور لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دوسری واردات جارج گورا کے گھر کے بالکل پاس ہوئی ہے۔ یہاں بھی جیل کے ایک بڑے افسر ارون لال کو قتل کیا گیا ہے۔ وہ غسل خانے میں قتل ہوا ہے۔ اس کا گلا پہلے اس کے ازار بند سے گھونٹا گیا پھر تیز دھار آلے کے پے در پے وار کئے گئے۔ ارون کی پتنی ساتھ والے کمرے میں بے خبر سوتی رہی۔ تیسرے قتل کے بارے میں ابھی تفصیل سامنے نہیں آئی

ہے۔"

ہم کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ اگر ہمارا شک درست تھا اور ان واقعات کے پیچھے واقعی سلطانہ اور طلال تھے تو پھر آنے والے دنوں میں حالات کوئی بھی سنگین رخ اختیار کر سکتے تھے۔

میں نے چوہان سے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی کسی طرح زرگاں چلا جاؤں؟"

"لگتا ہے کہ تمہاری سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے۔ تم جارج تک پہنچنا چاہتے ہو۔"

"اب یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے چوہان...... سلطانہ زرگاں میں ہے۔ وہ جارج کو نشانہ بنانا چاہ رہی ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ اس کوشش میں اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔ تو کیا مجھے اس کی مدد نہیں کرنی چاہئے؟ یہاں بیٹھ کر اس بات کا انتظار کرنا چاہئے کہ وہ اپنی جان گنوا لے یا کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو جائے؟"

چوہان مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "ابھی تو یہ سب مفروضے ہی ہیں تابش! ہم ابھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ زرگاں میں درحقیقت کیا ہوا ہے...... اور جو کچھ ہوا ہے، اس میں سچ مچ سلطانہ اور طلال ملوث ہیں بھی یا نہیں۔" اس نے دو لمحے توقف کر کے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ "تابش! میرے خیال میں فی الوقت سوچنے والی جو سب سے اہم بات ہے، وہ کچھ اور ہے۔"

"کھل کر بات کرو۔"

"ہمیں سب سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ ہم اس نظر نہ آنے والی زنجیر کو کیسے کھول سکتے ہیں جو حکم اور جارج نے تمہارے پاؤں میں ڈال رکھی ہے...... میرا مطلب اس مائیکرو چپ سے ہے جو تمہارے جسم میں رکھی گئی ہے۔"

میرے اندر ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ کسی وقت میں واقعی اس اہم ترین نکتے کو بھول جاتا تھا کہ میں آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہو چکا ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں گا، کچھ نادیدہ نگاہیں میرے تعاقب میں رہیں گی اور میری ہر جدوجہد کو ناکام کر دیں گی۔

"تم چاہتے ہو کہ میں آپریشن کے ذریعے وہ چپ اپنے جسم سے نکلواؤں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، یہ بے حد ضروری ہے۔ آئندہ تم نے جو کچھ بھی کرنا ہے تابش، اس کی بنیاد اس بات پر ہوگی کہ تم واقعی آزاد ہو یا نہیں۔ مثال کے طور پر اگر تم اس اسٹیٹ سے نکلنا ہی چاہو تو بھی تمہارے اندر کی یہی چپ تمہارے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بنے گی...... تم ہمیشہ کی طرح لاچار ہو کر رہ جاؤ گے۔"

"لیکن اب تو صورتِ حال بدل چکی ہے، میں یہاں نل پانی میں ہوں۔ چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن چکی ہے۔ اگر میں چھوٹے سرکار سے یہ درخواست کروں گا وہ مجھے یہاں سے نکلنے دیں تو کیا وہ میری درخواست کو رد کر دیں گے؟"

"بات درخواست کی نہیں ہے تابش! شاید تمہیں اس بات کی جانکاری نہیں کہ اسٹیٹ سے باہر جانے والے راستوں پر چھوٹے سرکار اور حکم کی مشترکہ نگرانی ہے اور یہ بڑی سخت نگرانی ہے۔ نکاسی کے راستوں پر موجود ان ساری چوکیوں پر نل پانی کے ساتھ ساتھ زرگاں کی سیکیورٹی فورس بھی موجود رہتی ہے۔ دونوں طرف کے اہلکاروں کی مکمل اجازت اور تسلی کے بغیر کوئی شخص سرحد پار نہیں کر سکتا......"

چوہان نے اس حوالے سے مجھے مزید تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔ جنگل میں اپنی بھاگ دوڑ کے دوران میں، میں جابجا پرانی حفاظتی چوکیاں اور مچانیں وغیرہ دیکھ چکا تھا۔ انور خاں نے بھی مجھے اس راجواڑے کی سرحدی نگرانی کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔

مجھے سوچ میں دیکھ کر چوہان نے کہا۔ "میری رائے تو یہ ہے کہ ہم فوری طور پر ڈاکٹر لی وان سے رابطہ کریں اور انہیں اس بارے میں پوری تفصیل بتائیں۔ وہ ایک اچھے سرجن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر وہ تمہارا آپریشن کریں تو وہ کامیاب رہے گا۔"

......ہم اسی روز رات کو ڈاکٹر لی وان سے ملے۔ اس کا چھوٹا سا اسپتال نل پانی کے مضافات میں ایک خوش گوار آب و ہوا والی جگہ پر تھا۔ لی وان کو چھوٹے سرکار اور دیوان کے خصوصی معالج کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ وہ بہت کم لیکن کارآمد بات کرتا تھا۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ "مجھے باروندا جیکی کی موت کا بہت دکھ ہے۔ درحقیقت اس میں کچھ باقی ہی نہیں بچا تھا۔ ہاں...... اگر وہ چار چھ مہینے پہلے ہمارے پاس آ جاتا تو شاید ہم کچھ کر سکتے۔"

"آپ کو پتا ہے کہ وہ اصل میں کون تھا؟" چوہان نے پوچھا۔

"ہاں، مجھے چھوٹے سرکار اجیت رائے نے بتایا ہے اور یہ سب جان کر میرے دکھ میں اضافہ ہوا ہے۔ جاپان میں، مارشل آرٹ کی قدر دیگر ملکوں سے زیادہ ہے۔ نیپالی فائٹر جیکی کا نام وہاں بھی بہت سنا جاتا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ نامور ہیرو کبھی ایک لاغر مریض

کی شکل میں میرے سامنے آئے گا اور لاغر بھی ایسا کہ اس پر حسرت کی نظریں ڈالنے کے سوا اور کچھ بھی نہ کیا جا سکے گا۔"

ہم نے کچھ دیر تک جیکی یاد کیا...... پھر چوہان اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے ڈاکٹر لی وان کو میرے انوکھے مسئلے کے بارے میں بتایا۔ حسبِ توقع ڈاکٹر لی وان بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ چوہان کے کہنے پر اس نے میرے سر کے عقبی حصے کو ٹٹول کر دیکھا اور ان اسٹچز کا معائنہ بھی کیا جو میری گدی پر موجود تھے۔ ڈاکٹر چوہان اور ڈاکٹر لی وان انگریزی میں بات کرتے رہے۔ ان کی گفتگو میں میڈیکل کی مشکل اصطلاحات بھی آ رہی تھیں۔

ابتدائی معائنے کے بعد ڈاکٹر لی وان مجھے اپنی لیبارٹری میں لے گیا۔ یہاں ایک چھوٹی ایکسرے مشین اور الٹرا ساؤنڈ کی سہولت بھی موجود تھی۔ ڈاکٹر نے میرے دو تین ٹیسٹ لئے...... اس نے فوری طور پر تو کچھ نہیں بتایا تاہم ہمیں ایک دن بعد دوبارہ آنے کے لئے کہا۔

......میں اور چوہان تیسرے روز دوپہر کے وقت پھر لی وان کے شفاخانے پہنچے۔ وہ کچھ خاموش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر چوہان کو الٹرا ساؤنڈ کے، پرنٹس دکھائے۔ ایکسرے پر غور و خوض ہوا۔ ایکسرے میں چمکی ہوئی مائیکرو چپ بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مجھ سے دو چار سوال پوچھنے کے بعد چوہان اور لی وان دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے دس پندرہ منٹ مشورہ کیا۔ مشورے کے بعد وہ باہر آئے اور ڈاکٹر چوہان نے مجھے چلنے کے لئے کہا۔

ڈاکٹر لی وان نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب اچھا ہو جائے گا۔"

راستے میں گھوڑا گاڑی کے اندر چوہان نے مجھے بتایا۔ "لی وان کا خیال ہے کہ یہ آپریشن یہاں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بہتر سہولتوں کی ضرورت ہے۔"

"کیوں؟"

"وہی بات جس کا ہمیں بھی ڈر تھا۔ تم نے بھی ایکسرے وغیرہ دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر اسٹیل وغیرہ نے چپ پلانٹ کرتے ہوئے پوری پوری خباثت دکھائی ہے۔ یہ چپ تمہاری ریڑھ کے بالائی حصے سے بالکل اٹیچ ہے...... اور تمہیں پتا ہی ہوگا کہ ریڑھ میں 'اسپائنل میرو' ہوتا ہے جو جسم کا بہت نازک حصہ ہے۔"

"تو پھر؟"

''لی وان کا کہنا ہے کہ چپ کو نکالنا ناممکن نہیں ہے مگر اس کے لئے ایک اچھے نیورو سرجن اور جدید آپریشن تھیٹر کی ضرورت ہے۔''

میں نے لمبی سانس لی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ڈھاک کے وہی تین پات۔ چپ نکلوانے کے لئے ضروری ہے کہ میں اسٹیٹ سے باہر جاؤں اور باہر جانے کے لئے ضروری ہے کہ میں چپ نکلواؤں۔''

''فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

''اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر لی وان رسک لینا نہیں چاہ رہا۔ ورنہ وہ خود بھی یہ سب کچھ کرسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ ایک اچھا سرجن ہے۔ اگر اس کام میں خطرہ محسوس کر رہا ہے تو پھر یقیناً خطرہ ہو گا۔''

''لیکن اگر میں خطرہ مول لینا چاہوں تو پھر؟ میرا مطلب ہے کہ میں لی وان سے ہی آپریشن کرانا چاہوں تو؟''

''میں نہیں سمجھتا کہ لی وان مانے گا۔ ایسے لوگ اپنے پروفیشن سے بڑے کمٹڈ ہوتے ہیں۔ انہیں ایسے معاملوں میں گائیڈ نہیں کیا جا سکتا۔''

گھوڑا گاڑی اب شہر کی گنجان آبادی میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ نیلگوں جھیل پر کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کنارے کے لاتعداد مکانوں میں روشنیاں جگمگانے لگی تھیں اور ان روشنیوں کے عکس پانی میں جھلملا رہے تھے۔ کنارے کے سبزہ زاروں میں بچے چہک رہے تھے اور خوش پوش لوگ ہنس کھیل رہے تھے...... یہ دلکش مناظر تھے لیکن میرے سینے میں عجیب سی یاسیت بھرتی جا رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ اتر پردیش کے جنگلات میں واقع بھانڈیل اسٹیٹ نہیں ہے، یہ ایک بہت بڑی جیل ہے اور میں اس جیل کی بلند و بالا دیواروں کو کبھی پار نہیں کرسکوں گا۔

یہ بڑے عجیب دن تھے۔ مجھ پر عجیب سی بے حسی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ سردی شروع ہو چکی تھی لیکن میرے جسم پر اب بھی گرمیوں والا لباس ہی رہتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ میں رات کو کمبل یا لحاف بھی نہ لیتا۔ اسی طرح پڑا رہتا۔ یوں لگتا کہ میں جان بوجھ کر اپنے جسم کو اذیت دینا چاہتا ہوں۔ اذیت کا حصول میرے لئے ایک مشغلہ بنتا جا رہا تھا۔ میں بند کمرے میں گھنٹوں سینڈ بیگ سے مصروف رہتا اور خود کو سخت ترین ورزشوں میں غرق کر دیتا۔ میرے پاؤں سُوج جاتے، ناخنوں سے خون رِسنے لگتا۔ مجھے لگتا کہ میں بے ہوش ہونے والا ہوں

لیکن میں رکتا نہیں۔ میرے کانوں میں جیکی کی سرگوشیاں گونجتیں۔ اس نے کہا تھا۔ ''...... جہاں برداشت کی حد ختم ہو جاتی ہے، وہاں سے کچھ حاصل کرنے کی حد شروع ہوتی ہے۔'' میں دیوانوں کی طرح اپنا کام جاری رکھتا پھر نیم جان ہو کر یا چکرا کر گر جاتا۔

میرے جسم پر کوئی زخم لگ جاتا تو میں دوا لگانے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ اگر چوہان زبردستی اس پر کچھ باندھ دیتا تو میں موقع ملتے ہی اتار پھینکتا۔ اپنے زخم کو مزید زخمی کرنا بھی مجھے اب اچھا لگتا تھا۔ میرے اندر کچھ زبردست تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ میرا جسم بتدریج تکلیف سہنے کا عادی ہو رہا تھا۔ اب چوٹ میری ہمت کو توڑتی نہیں تھی، میرے اندر کی آگ کو کچھ اور بھڑکاتی تھی۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنے کسی دشمن کا سامنا کروں۔ کوئی ہو جو اپنی تمام تر نفرت کے ساتھ میرے سامنے آئے۔ میں اسے ماروں اور وہ مجھے مار دے۔ کوئی بھی ہو۔ انگلینڈ کا جارج گورا ہو جس نے مجھے خود میری نظروں میں گرایا تھا، زرگاں کا حکم جی ہو جو ایک آسیب کی طرح اسٹیٹ کے باشندوں کے ذہنوں پر سوار تھا یا پاکستان کا سیٹھ سراج ہو جس کے ہاتھوں پر میری مقتول ماں کا خون تھا...... ہاں، کوئی بھی ہو۔ وہ پوری وحشت سے مجھ پر جھپٹے اور میں پوری وحشت سے اس کو جواب دوں۔ اسے پتا چلے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور مجھے پتا چلے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔

سلطانہ کا ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا۔ ایک ہی رات میں قتل کی تین وارداتوں کے بعد کوئی نیا واقعہ بھی نہیں ہوا تھا۔ حالات میں ایک پُراسراری خاموشی تھی۔

ایک دن سردی زیادہ تھی۔ بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ کمروں میں انگیٹھیاں روشن تھیں اور مرد و زن گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں اپنے اندر کی آگ کو بجھانے کے لئے کھلی جگہ پر چلا آیا۔ بارش کی سرد بوچھاڑوں نے مجھے لمحوں میں شرابور کر دیا۔ میں نے بالائی جسم پر فقط ایک پتلی سی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ میرے جسم سے چپک گئی۔ میں چلتا ہوا دیوان کی عمارت سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر بھی میں رکا نہیں اور جھیل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ سخت سردی اور بارش کے سبب ہر طرف سناٹا تھا۔ میں کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ یوں، پانی کی یخ بستہ بوچھاڑوں میں بھاگنا مجھے اچھا لگا۔ شاید میں لاشعوری طور پر اپنی برداشت کو آزمانا چاہتا تھا، اپنا دم خم پرکھنا چاہتا تھا۔ اکثر شام کے وقت میں جھیل کے کنارے کنارے تین چار میل تک بھاگتا تھا لیکن آج کا بھاگنا مجھے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ جس نے مجھے دیکھا حیرت سے دیکھا۔ میں بھاگتا بھاگتا درختوں

کی طرف نکل آیا۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں اور سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی اور یہی کیفیت میرے دل کو بھاتی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ چند گھڑسوار میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ جلد ہی میں جان گیا کہ یہ کوئی اور نہیں دیوان کے ہی محافظ تھے۔ جب میں باہر نکلتا تھا، یہ حفاظت کی غرض سے اکثر میرے آس پاس رہتے تھے اور آج تو میں کچھ زیادہ آگے نکل آیا تھا۔

میں گھنے درختوں میں داخل ہوا تھا تو گھڑسوار میرے قریب پہنچ گئے۔ یہ کپتان اجے کے ہی ماتحت تھے۔ ایک حوالدار نے آگے آ کر کہا۔ ''جناب! آپ زیادہ آگے نہ جائیں۔ موسم بھی ٹھیک نا ہیں ہے۔''

''میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

''لیکن آپ کی حفاظت ہمری ذمے داری ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تم اپنی یہ لعنتی ذمے داری پوری کرتے رہو۔'' میں نے کہا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ گیلا جوتا میرے پاؤں سے نکل گیا۔ میں نے دوسرا بھی اتار پھینکا۔ اب میں ننگے پاؤں تھا۔ میرے تلوے راہوں کی سختی سے آشنا ہو رہے تھے۔ میں انہیں مزید آشنا کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندر خواہش جاگتی تھی کہ میرے پاؤں میں کانٹے ٹوٹیں اور میں دوڑتا رہوں۔

دوڑتے دوڑتے میری سانس ٹوٹ گئی اور ٹانگیں یکسر جواب دے گئیں۔ میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جہاں گرا تھا، وہیں پڑا رہا۔ میں نے اپنا رخ تابڑتوڑ پانی برساتے آسمان کی طرف کر لیا۔ اپنی ٹانگیں اور بازو پھیلا دیے۔ کڑکتی سردی میں برفیلے پانی کی ساری سختی اپنے سراپا پر جھیلنے لگا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میرے نگراں گھڑسوار مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گئے ہوں گے اور وہیں میرے اُٹھنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

لیکن مجھے اُٹھنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں وہیں لیٹا رہا۔ باروندا جیکی کے فلسفے کے مطابق درد میں ڈوب کر درد کی حقیقت معلوم کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے درد، اذیت اور بے سکونی کا احساس کم ہوتا گیا...... یخ بستہ پانی میرے جسم پر اپنا اثر کھونے لگا۔ مجھے غنودگی سی ہونے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں گزری۔ تب اچانک مجھے لگا کہ کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے۔ میں نے بوجھل پلکیں اُٹھائیں۔ یہ ڈاکٹر چوہان تھا۔ شام کے جھٹپٹے میں وہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اجے کے باوردی حوالدار رب نواز نے اس کے اوپر ایک بڑی چھتری تان رکھی تھی۔ چوہان بولا۔ ''تابش! یہ کیا حماقتیں کر رہے ہو؟ تم اپنے دشمن آپ بنے

ئے ہو۔ یہ کوئی طریقہ ہے، ایسے موسم میں اس طرح باہر نکلنے کا؟''

''کیا ہوگا؟ مر ہی جاؤں گا نا؟'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''اپنا نہیں تو ان لوگوں کا خیال ہی کرو جو تم سے وابستہ ہیں۔''

''کون لوگ؟''

''سلطانہ...... تمہارا بچہ......''

''سلطانہ جا چکی ہے...... اور جن بچوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ بھی تو پل جاتے ہیں۔''

''سلطانہ جا تو چکی ہے...... لیکن زندہ ہے۔ اسے کسی بھی وقت تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کے بارے میں تازہ اطلاع شاید تم نے نہیں سنی۔''

''کیسی اطلاع؟'' میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند ذرا کم ہوئی۔

''زرگاں والوں نے کھوج لگا لیا ہے کہ جارج کے تین ماتحتوں کو قتل کرنے والی سلطانہ ہی ہے۔''

''کیسا کھوج؟''

''ایک مقتول کی ہاتھوں کی انگلیوں سے کچھ لمبے بال ملے ہیں۔ اس کے علاوہ زرگاں کے ایک بیل گاڑی والے نے گواہی دی ہے کہ واردات کی شام ایک عورت اور ایک لڑکے نے اس کی گاڑی میں سفر کیا ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ عورت، مختار راجپوت کی بیٹی ہی تھی۔''

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''اس سے یہ فرق پڑے گا کہ سلطانہ کے پکڑے جانے کا امکان زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس کی رکھشا کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''اب تک سوچ ہی تو رہے ہیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

چوہان نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور واپس دیوان میں آ گیا۔ راستے میں وہ مجھے مسلسل سمجھاتا رہا۔ میرے طرزِ زندگی کو حماقت قرار دیتا رہا اور میانہ روی کے مشوروں سے نوازتا رہا۔ اس کی باتیں مجھ پر بے اثر تھیں۔ میں کسی اور ہی رنگ میں رنگتا چلا جا رہا تھا۔ قریب الرگ باروندا جیکی کچھ بیج بو گیا تھا میرے اندر اور یہ بیج اب لہلہاتے پودے بن رہے تھے۔

قیام گاہ پر واپس پہنچ کر میں نے چوہان کے بے حد اصرار پر کپڑے بدلے۔ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر ہم دونوں نے چائے پی اور لکھنوی طرز کے کباب کھائے۔ رات نو دس بجے کے قریب چوہان واپس چلا گیا۔ میں نے آتش دان بجھا دیا۔ مجھے ہر طرح کی آسائش سے

نفرت ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر تک کھڑکی میں بیٹھ کر رم جھم برستی بارش کا نظارہ کرنے کے بعد میں اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ میں بے چینی کے اس احساس کو کوئی نام تو نہیں دے سکا تاہم بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے ساتھ والے کمرے میں ایک چھوٹا بلب روشن رہنے دیا تھا۔ اس کی ہلکی نیلی روشنی آنکھوں کو تکلیف نہیں دیتی تھی۔

اچانک وہ بندہ اسٹور روم کے دروازے سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کا سیاہی مائل چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے سگریٹ سلگایا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ میرا پستول ہولسٹر میں تھا اور یہ ہولسٹر دیوار سے لٹک رہا تھا۔ میں نے تیزی سے اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر اس کی سرسراتی سرگوشی نے میرے قدم روک دیئے۔ ''ناہیں، میرے پپو صاحب! جیادہ پھرتی دکھانے کی جرورت ناہیں۔ پستول بہت دور ہے۔ اس سے بہت پہلے آپ کی کھوپڑیا اڑ جائے گی۔'' وہ پھنکارا۔

میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ وہ رنجیت پانڈے تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ رنجیت پانڈے ہے۔ اس سے پہلے سرنگ کے دہانے پر میں نے اس کی ادھوری سی جھلک دیکھی تھی۔ آج وہ پورے کا پورا میرے سامنے تھا۔ وہ کسی گینڈے کی طرح ٹھوس تھا۔ گہری سانولی رنگت کے ساتھ براؤن آنکھیں بہت کم دیکھی جاتی ہیں لیکن اس کی آنکھیں براؤن تھیں اور ان میں دنیا بھر کی خباثت جمع تھی۔ یہ ایک نہایت عیار و سفاک شخص کی آنکھیں تھیں۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ''تو تم ہو پانڈے؟''

''جی پپو صاحب! مجھ کھاکسار (خاکسار) کو ہی پانڈے کہوت ہیں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر زہریلے انداز میں کہا۔

''تم یہاں کیسے آئے؟''

اس نے ٹانگیں پھیلا کر اطمینان سے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑا۔ ''آپ جناب نے بڑا مجے دار سوال پوچھا ہے۔ اس کا جواب تو کئی میٹر لمبا ہے...... مختصر یہ کہوں گا کہ ایسا کبھی ہوا ناہیں ہے کہ آپ کے اس کھاکسار نے کہیں پہنچنا ہو...... اور پہنچ نہ سکا ہو۔ بس یہ درواجے اور دیواریں اسے کھد بہ کھد رستہ دیتے چلے جاتے ہیں۔''

اس کے کالے ماتھے پر ایک چھوٹا قشقہ تھا جو اس کے کٹر ہندو ہونے کی نشانی تھا۔ میں نے ایک بار پھر کچھ کرنے کا سوچا لیکن اس کی سانپ جیسی نظریں ایک ساتھ اس پورے کمرے اور کمرے کی ہر شے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ پھر پھنکارا۔ ''ناہیں پپو صاحب! آپ

حرکت کریں گے تو گولی چلانا پڑے گی اور آپ کی بدقسمتی یہ ہووے گی کہ میرا نشانہ کبھی کھتا (خطا) ناہیں جاتا۔''

میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے موت ہے اور وہ مجھے ویسا ہی لگ رہا تھا۔ اس نے پستول اپنی پتلون میں سامنے کی طرف اڑسا ہوا تھا۔ یہ اس کا بے پناہ اعتماد تھا کہ اس نے پستول اپنے ہاتھ میں رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ درجنوں پہرے داروں کی موجودگی میں نہ صرف دیوان کی عمارت کے اندر پہنچا بلکہ میرے کمرے تک بھی پہنچ گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

میں نے اسے نگاہوں نگاہوں میں تولا۔ میرے جسم میں عجیب میٹھا میٹھا سا درد ہونے لگا۔ ایک لہر سی سر کی طرف سے چلی اور پورے بدن میں پھیل گئی۔ میرا سینہ ہلکے ہلکے جوش سے دھڑکنے لگا۔ رگ پٹھوں میں ایک بے نام حرارت جاگ اُٹھی۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ''آپ کے گھر مہمان آیا ہے یہ کمی کمین بندہ۔ کوئی کھاطر تواجع ناہیں کریں گے؟''

''کس قسم کی خاطر تواضع چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ قہقہہ لگا کہ ہنسا۔ ''اجی کوئی شراب یا لونڈیا تو ناہیں مانگ رہا۔ بس ہنس کر بات کر دیجئے۔ یہی ہمری کھاطر ہو جاوے گی۔''

''سیدھی بات کرو۔ چاہتے کیا ہو؟'' میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

اس نے میری سنجیدگی محسوس کر کے سگریٹ کے وہ دو طویل کش لئے اور دھوئیں کے گاڑھے مرغولے چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''پپو صاحب! یہ کھاکسار آپ کو لینے آیا ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہووے گا۔''

''کہاں؟''

''زرگاں۔ حکم جی کے پاس۔''

''کیوں؟''

''اس کیوں کے دو تین جواب ہیں پپو جی...... لیکن سب سے کھاص جواب یہ ہے کہ آپ کی پتنی کی ناک میں کوئی بہت زہریلا مچھر گھس گیا ہے۔ اس نے ڈنک مار مار کر اس کے بھیجے میں آگ لگا دی ہے۔ اب وہ ہر ایک پر جھپٹے مارتی پھرتی ہے۔ اس جھانسی کی رانی کے گلے میں پٹا ڈالنے کا بس ایک ہی طریقہ سمجھ میں آوت ہے۔ آپ جناب کو اپنا مہمان بنا لیا جاوے اور ہم جیسے کمینے دن رات آپ کی سیوا میں مصروف ہو جاویں۔ جب اسے آپ کی سیوا

کی سماچار ملے گی تو یقیناً وہ سوچنے پر مجبور ہو جاوے گی۔"

اس کی بک بک اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ جوشیلی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ "اگر میں تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟"

"میں نے آپ کو بتایا ہے ناپو صاحب...... کہ میں بہت کھاص قسم کا حرامی ہوں۔ بھگوان نے میری آنکھ میں ایک بہت پلید جانور کا بال رکھا ہوا ہے۔ یہ کبھی ہوا ناہیں کہ میں نے آپ جیسے کسی پپو کو مہمان بنانا چاہا ہو اور وہ بن نہ سکا ہو۔ ہاں جی، یہ کبھی ہوا ناہیں۔" اس نے حیرت انگیز سکون سے دونوں ٹانگیں میز پر رکھیں اور بے پروائی سے رانیں کھجانے لگا۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی ایک مسئلہ ہو تو آپ جناب کو بتاؤں بھی۔ یہاں تو اب مسئلوں کا ڈھیر لگ گیا ہے اور سب سے منحوس مسئلہ تو تمہارا یہ مراد شاہ صاحب ہی ہے۔ کھبر ناہیں یہ کس لا پتا بندے کا نطفہ ہے۔ میں تو اس کی حرام کاریوں کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہووت ہوں۔ یہ کچھ برس پہلے اسٹیٹ کی فوج میں ایک معمولی کپتان تھا۔ آج سیاہ سفید کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ اس کی ہوس کسی طرح کھتم ہونے میں ناہیں آتی۔ آج یہ راج گدی پر بیٹھنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ اس کے یہ سپنے بس اسی صورت میں پورے ہو سکت ہیں کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے کھون کے پیاسے بن جاویں اور پھر لڑ لڑ کر سورگ باشی ہو جاویں...... اور وہ حرامی جو کچھ کر رہا ہے اسی کارن کر رہا ہے۔"

"تم اپنی زبان کو لگام دو۔ میں مراد شاہ صاحب کے خلاف اب ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔"

"اوہو، گلتی ہو گئی پپو صاحب! مجھے شما کر دیجئے۔ مجھے ایسا ناہیں کہنا چاہئے تھا۔ بے شک میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ مراد شاہ کی شان بیان کرنے کے لئے بالکل بھی کافی ناہیں ہے لیکن کچھ بھی ہے، وہ آپ کا میج بان ہے۔ آپ کی دُم پر تو پاؤں آئے گا ہی۔" آخری الفاظ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہے تھے تاہم میرے کانوں تک پہنچ گئے۔

"کیا کہا تم نے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ ناہیں۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں کہ شاہ صاحب نے نل پانی کی راج گدی حاصل کرنے کے لئے جو راستہ چنا ہے، وہ کچھ جیادہ ٹھیک ناہیں۔ شاید وہ اپنا دھیرج کھو بیٹھے ہیں اور دونوں بھائیوں کو لڑانے پر تُل گئے ہیں۔ لڑائی ہوئی تو بہت جیادہ کھون بہے گا۔ بہت سارے لوگن مریں گے۔ بس چند ایک ہی جندہ بچیں گے۔ چند ایک پر حکومت کرنے کا کیا

کھاک مجا آوے گا اپنے شاہ صاحب کو...... وہ جس راستے پر پہلے چل رہے تھے، وہ جیادہ اچھا تھا۔"

"تم کس راستے کی بات کر رہے ہو؟" میں نے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

"شاہ صاحب کا راستہ آپ کو ناہیں پتا پپو صاحب! یہ تو بڑا سیدھا سادہ راستہ ہے۔ ایک دم فنٹاسٹک...... جو بھی نجر آوے اس کو پکڑ کر مسلمان بنا دو...... نہ بنے تو لالچ اور دھونس سے کام لو...... پھر بھی نہ مانے تو اس کا جینا حرام کر دو۔ یہاں نل پانی میں یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔ لوگن کو پکڑ پکڑ کر مُسلا بنایا جا رہا ہے اور تو اور سنا ہے کہ اپنے چھوٹے سرکار بھی اپنے دھرم کو دغا دینے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ہو سکت ہے کہ ان سے یہ راج گدی چھن جاوے۔ پھر اس گدی پر اپنی تشریف کا ٹوکرا رکھیں گے اپنے یہی شاہ صاحب...... اور پھر اس کے بعد پتا ہے کیا ہو گا......؟"

میں سوالیہ نظروں سے پانڈے کا سانولا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

وہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ "اس کے بعد شاہ صاحب کی نجریں جمیں گی زرگاں پر۔ وہ زرگاں کو سومنات سمجھ لیوے گا اور محمود گجنوی بن کر بار بار اس کو ڈھانے کی کوشش فرماوے گا۔ بڑا فتور ہے سالے کی نیت میں...... بڑا فتور ہے......"

میں پانڈے کی صورت دیکھ رہا تھا اور میرے سینے میں انگارے سلگ رہے تھے۔ وہ کش لے کر بولا۔ "باہر برکھا ہو رہی ہے۔ کھاصی سردی ہے۔ تم کوئی چادر وغیرہ لے لو۔ ہم کو کافی لمبا سفر کرنا ہے۔"

میرے اندر کی جلن میں گھلا ہوا میٹھا میٹھا درد فزوں تر ہو گیا۔ کہیں گہرائی میں ایک انگڑائی سی بیدار ہونے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پانڈے! میں جانتا ہوں کہ تُو کمزور شخص نہیں ہے...... اور ناکام بھی نہیں ہے لیکن آج کی رات کو بڑا بدقسمت ثابت ہوا ہے۔"

"کیا مطلب پپو صاحب؟"

"آج تُو ایک غلط وقت پر، غلط جگہ پر، غلط شخص کے سامنے ہے۔ کاش! تیرے ساتھ ایسا نہ ہوا ہوتا۔"

اس نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے اسے توقع نہیں تھی کہ میرے منہ سے ایسی بات سنے گا۔

سگریٹ کی راکھ کباب والی پلیٹ میں جھاڑ کر اس نے طویل کش لیا۔ "پپو صاحب!

آپ بڑی بڑی باتیں کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی نشہ وشہ تو ناہیں کیا ہوا...... یا پھر آپ اس کھاکسار کے بارے میں جیادہ جانت ناہیں ہیں۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کے لہجے میں نیلا زہر اُتر آیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے پتلون کی بیلٹ میں سے اپنا کولٹ پسٹل نکال لیا۔ نال کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ وہ کسی شیش ناگ کی طرح پھنکارا۔ "میں صرف دھمکاتا ناہیں ہوں پپو...... گولی مارتا ہوں اور میرا نشانہ کھتا ناہیں جاتا۔"

ابھی اس کے الفاظ منہ میں تھے کہ میرے اندر کا سرکش ریلا اچھل گیا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی۔ میرے پاؤں کی ضرب بالکل نشانے پر لگی۔ میرے پاؤں کی "اُپر پام" نے پانڈے کے پسٹل اور پسٹل والے ہاتھ کو ایک ساتھ نشانہ بنایا۔ کولٹ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر چھت سے ٹکرایا اور ایک الماری کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ میں اندھا دھند پانڈے پر جا پڑا۔ میرا سر پوری شدت کے ساتھ اس کے سینے پر لگا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میرا مدِمقابل کوئی عام شخص نہیں ہے۔ اس کے سیاہ جسم میں گوشت پوست کے بجائے جیسے فولاد بھرا ہوا تھا۔ میرے سر کی ضرب سے وہ اچھل کر پیچھے کی طرف گیا اور اس کی پشت دیوار سے ٹکرائی۔ بعین یہی محسوس ہوا کہ دیوار میں طاقتور اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ وہ جتنی تیزی سے ٹکرایا تھا، اس سے کئی گنا تیزی سے واپس میری طرف آیا۔ اس کا فولادی ہاتھ میرے جبڑے پر پڑا اور آنکھوں میں ستارے سے رقص کر گئے۔ یکا یک وہ کسی مشتعل جانور کی طرح مجھ پر پل پڑا۔ وہ خالی ہاتھ تھا مگر لگتا تھا کہ اس نے ہتھوڑے پکڑے ہوئے ہیں۔ چند سیکنڈ میں مجھے درجنوں تہلکہ خیز ضربیں اپنے جسم پر سہنا پڑیں۔ میں کئی بار سنگ سرخ کی دیواروں سے ٹکرایا، گرا اور اُٹھا...... اور پھر میرا داؤ چل گیا۔ میں نے اسے ایک ایسی چوٹ لگائی جو کسی فائٹنگ مقابلے میں تو سراسر فاؤل ہوتی لیکن اس دوبدو لڑائی میں بالکل برمحل تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اس کی رانوں کے عین درمیان ٹھوکر ماری۔ وہ تڑپ کر پیچھے کی طرف گیا۔ مجھے اُٹھنے اور سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اگلے تین چار منٹ تک ہم دونوں کے درمیان ایک خطرناک معرکہ ہوا۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چُور ہو گئے، فرنیچر ٹوٹ گیا اور قیمتی ڈیکوریشن پیسز کمروں کے فرش پر بکھرے دکھائی دیئے۔

یہ ایسا پُر زور ہنگامہ تھا کہ اردگرد موجود ہر شخص ہڑبڑا کر اُٹھا اور موقع کی طرف لپکا۔ ان میں کئی مسلح پہرے دار بھی تھے۔ وہ رنجیت پانڈے کی طرف بڑھنا چاہتے تھے مگر میں نے دہاڑتے ہوئے انہیں پیچھے ہٹا دیا۔ میں پانڈے سے دوبدو لڑنا چاہتا تھا۔ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا

اور پھر میں نے دیکھا کہ میری وحشت نے پانڈے جیسے خطرناک مدِمقابل کو بھی ٹھٹکا دیا ہے۔ وہ جو مجھے "پپو پپو" کہہ کر اپنے اندر کے گھمنڈ کا اظہار کر رہا تھا، اب چونکا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے اپنی گرے پتلون کی جیب میں سے چمک دار پھل کا چاقو نکال لیا۔ اس کے چاقو کے دو جان لیوا وار میں نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر روکے۔ اس کے بعد اس کرسی سے اسے اندھا دھند دھکیلتا ہوا برآمدے میں جا گرا۔ میں دہاڑ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنے خالی ہاتھوں سے پانڈے کو پھاڑ کر رکھ دوں لیکن فولاد کو ہاتھوں سے پھاڑنا بھی تو ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ایک سخت جان فائٹر تھا۔ میری ضربیں سہہ رہا تھا اور ان سے بچنے کی کامیاب کوشش بھی کر رہا تھ۔ اچانک پانڈے کا داؤ چل گیا۔ اپنے سینے پر میری ٹانگ کھا کر وہ برآمدے کی ایک دیوار سے ٹکرایا تھا۔ یہاں دیوار پر بجلی کا "ڈی پی" لگا ہوا تھا۔ مین سوئچ بھی موجود تھا۔ اس نے پھرتی سے مین سوئچ آف کر دیا۔ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔

"دیکھو...... پکڑو" ایک دم بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

پھر کوئی پہرے دار کرب ناک انداز میں چلایا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کسی نے ہوائی فائر کیئے۔ کوئی ٹارچ لینے کے لئے بھاگا۔ "تم کہاں ہو تابش؟" چوہان کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں ٹٹولتا ہوا مین سوئچ کی طرف گیا اور اسے آن کر دیا۔ ایک دم قرب و جوار روشن ہو گئے۔ بیرونی دروازے کے پاس ایک پہرے دار تڑپ رہا تھا۔ چاقو کے وار نے اس کے پیٹ کو اس طرح چاک کیا تھا کہ انتڑیاں باہر آ گئی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس شخص نے بے جگری کا مظاہرہ کیا تھا اور تاریکی میں اندازے سے پانڈے پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی تھی۔

دیوان میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ زبردست سرگرمی نظر آ رہی تھی۔ پانڈے کی تلاش میں پہرے دار ہر طرف دوڑے پھر رہے تھے۔ دیوان کے بیرونی گیٹ کے پاس ہوائی فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔ رکھوالی کے کتوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔

اجے کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ اپنے ماتحتوں سے مخاطب تھا۔ "ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی اندر ہی ہو۔ باہر نکلنے کے رستے "سیل" کر دو۔"

انور خاں بولا۔ "بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ کچھ بھی کر جائے گا۔"

اجے کی ہدایت پر دو بڑے گھڑسوار دستے تیزی سے بیرونی گیٹ کی طرف گئے۔ انہیں

آس پاس کی آبادی کا محاصرہ کرنا تھا۔ یہ احساس ہر چہرے کو وحشت زدہ کر رہا تھا کہ پانڈے جیسا خطرناک بندہ اس وقت دیوان کے آس پاس یا دیوان کے اندر موجود ہے۔

میرے منہ سے خون رِس رہا تھا۔ ایک پاؤں پر بھی شدید چوٹ آئی تھی۔ چوہان نے مجھے ٹٹول کر دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور الماری کے پیچھے گرا ہوا رنجیت پانڈے کا سرکاری پستول نکال لیا اور پھر وہ ہوا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ پانڈے موقع سے غائب ہو گیا تھا مگر جاتے جاتے اپنی سفاکی کا انمٹ ثبوت دے گیا تھا۔ ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ چوہان اور میں لڑکھڑا کر رہ گئے۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ میں نے ایک کمرے کے دروازے کو اُڑ کر برآمدے میں گرتے دیکھا۔ بارود کی بُو ناقابلِ برداشت تھی۔ ہر طرف سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں نسوانی آوازیں بھی تھیں اور یقیناً شکنتلا اور ملازمہ صفیہ کی آوازیں بھی ان میں شامل تھیں۔

''یہ کیا ہوا چوہان؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے خیال میں بم بلاسٹ ہے۔'' چوہان کی آواز جیسے کہیں دور سے میرے سیٹیاں بجاتے کانوں میں پڑی۔

ہم دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ یہاں دل دوز مناظر تھے۔ اجے کے کم از کم پانچ ماتحت لاشوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ کسی کا بازو غائب تھا، کسی کی ٹانگ۔ کئی افراد شدید زخمی تھے۔ ان میں سے کچھ آہ و بکا کر رہے تھے۔ لاشوں میں مجھے اجے کا ماتحت حوالدار رب نواز بھی نظر آیا۔ اس کے سر کا ایک حصہ صاف اُڑ چکا تھا۔

''اوہ خدایا...... یہ کیا ہو گیا؟'' چوہان نے لرزاں آواز میں کہا۔

''یہ اسی حرامزادے کا کارنامہ ہے۔ وہ جاتے جاتے یہاں کوئی ٹائم ڈیوائس رکھ گیا ہے۔'' اجے پھنکارا۔

''اگر یہاں ایک ڈیوائس ہے تو اور بھی ہو سکتی ہے۔'' چوہان نے کہا۔

چوہان کے اس فقرے نے سراسیمگی میں اضافہ کر دیا۔ اہلکار خوفزدہ نظروں سے اردگرد دیکھنے لگے۔ زخمیوں کو نکال کر سب اس جگہ سے دور ہٹ گئے۔ میرے جسم میں آگ روشن تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ حکم اور جارج کے سفاک اہلکار پانڈے نے ان تین عہدے داروں کی موت کا انتقام لیا ہے جنہیں چند روز قبل زرگاں میں قتل کیا گیا تھا...... تو کیا آگ، خون اور بدلے کا کھیل شروع ہو چکا تھا؟

○......❖......○

اگلے تین چار گھنٹے میں سب کچھ واضح ہو گیا۔ اس بات کا شبہ تو ہر ذہن میں موجود تھا کہ نل پانی میں اور دیوان کی عمارت کے اندر بھی زرگاں کے جاسوس موجود ہیں۔ آج یہ بات پوری طرح ثابت ہوئی تھی۔ رنجیت پانڈے نہ صرف دیوان میں داخل ہوا تھا بلکہ ایک سنگین واردات کے بعد صاف نکلنے میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ پانڈے کے ساتھ ہی دیوان کے دو اہم ترین پہرے دار بھی غائب تھے۔ ان میں سے ایک ہندو اور دوسرا مسلمان تھا۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ پانڈے انہی دو افراد کی مدد سے دیوان میں داخل ہوا اور بعد ازاں صاف بچنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

میرے رہائشی پورشن کے اسٹور میں سے ایک دراز قد عورت کا سیاہ برقع بھی ملا۔ معلوم ہوا کہ دیوان میں داخل ہوتے وقت پانڈے اسی برقعے میں تھا۔ اس کے علاوہ اسٹور میں ہی پلاسٹک کی ایک دستی ٹوکری بھی ملی جس میں چند کیلے اور سیب وغیرہ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پانڈے، دھماکا خیز مواد اس ٹوکری میں رکھ کر اندر لایا تھا۔ صورتِ حال واضح ہونے کے بعد دیوان میں فوری طور پر کئی گرفتاریاں ہوئیں اور بہت سے لوگوں کو شاملِ تفتیش کیا گیا۔ عام لوگوں میں سخت غم و غصہ پایا جا رہا تھا۔ اکثر کا تاثر یہی تھا کہ جارج گورا اور حکم نے ان تین ہلاکتوں کا جواب دیا ہے جو زرگاں میں ہوئی ہیں۔ انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بھی سیکیورٹی انتظامات کو ناکام بنا کر دیوان میں گھس سکتے ہیں اور لوگوں کو مار سکتے ہیں۔

میری اور پانڈے کی لڑائی کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب میں نے ٹانگ چلا کر اس کے ہاتھ سے کولٹ پسٹل چھڑایا تھا۔ یہ بڑا زوردار وار تھا اور اس وار کا بہت سا صدمہ میرے پاؤں کو جھیلنا پڑا تھا۔ پسٹل اور پاؤں کے تصادم سے پاؤں کا بالائی حصہ سوج گیا تھا اور نیلا پڑ گیا تھا۔

اگلے روز صبح تک پورا پاؤں سُوج گیا اور چلنا مشکل ہو گیا۔ صبح سویرے چوہان اور انور خاں میرے پاس آئے۔ انور خاں نے جوشیلے انداز میں کہا۔ ''برادر! تم تو راتوں رات مشہور ہو گئے ہو۔ ہر زبان پر تمہارا نام ہے۔ پانڈے اس اسٹیٹ میں دہشت کی علامت ہے۔ تم نے نہ صرف اس سے دوبدو مقابلہ کیا ہے بلکہ اسے بھگانے میں بھی کامیاب رہے ہو۔''

''لیکن وہ جاتے جاتے ایک زبردست چوٹ تو ہمیں دے گیا نا۔ چھ بے گناہ لوگوں کی موت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

انور بولا۔ ''اس کا صدمہ تو ہر ایک کو ہے لیکن اس بات کی خوشی بھی ہے کہ پانڈے جیسا شخص جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، یہاں سے چوٹیں کھا کر گیا ہے اور یہ چوٹیں ایسے بندے

نے لگائی ہیں جو چند مہینے پہلے تک کسی شمار قطار میں ہی نہیں تھا۔ پانڈے کو لگنے والی ان چوٹوں کا اثر آئندہ حالات پر پڑے گا۔ چھوٹے سرکار بھی تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں کچھ سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے کل رات مجھے بلایا تھا اور تمہارے سارے کوائف معلوم کئے تھے......"

مجھ پر عجیب سی بیزاری طاری تھی۔ میں انور خاں اور چوہان کی باتیں سن تو رہا تھا لیکن مجھے ان میں کسی طرح کی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ دونوں جلد یہاں سے چلے جائیں گے۔ مجھے تنہا چھوڑ دیں گے۔ مجھے اکیلا رہنا اچھا لگتا تھا۔ شاید میں آدم بیزار ہوتا جا رہا تھا۔

چوہان میرے پاؤں کی چوٹ کے بارے میں فکر مند تھا۔ اس نے کوئی وینٹوجین قسم کی دوا میرے پاؤں پر لگائی اور بڑی احتیاط سے پٹی باندھ دی۔ اس نے مجھے گرم پانی کی ٹکور کا مشورہ دیا اور یہ ہدایت بھی کی کہ میں پاؤں لٹکا کر نہ بیٹھوں۔ اس نے مجھے کھانے کے لئے چند گولیاں دیں اور بتایا کہ یہ پین کلر ہیں۔

چوہان کے جانے کے بعد میں نے پین کلر گولیوں کو ہتھیلی پر رکھا...... یہ گولیاں درد کو افاقہ دیتی تھیں لیکن "بتانے والا" مجھے بتا گیا تھا کہ درد سے افاقہ گولیاں کھانے سے نہیں ملتا، درد کا سامنا کرنے سے ملتا ہے۔ میں نے وہی کیا جو کرنا تھا۔ میں نے گولیاں پھینک دیں اور تھوڑی دیر بعد وہ پٹی بھی اتار پھینکی جو چوہان باندھ گیا تھا۔ میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں میرا سینڈ بیگ جھول رہا تھا۔ مضروب پاؤں جیسے منوں بھاری ہو رہا تھا۔ مجھے اس کے درد کا علاج درد سے ہی کرانا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ دانتوں پر دانت جمائے۔ پھر مضروب پاؤں سے ایک ضرب سینڈ بیگ پر لگائی۔ بے ساختہ ایک دردناک کراہ ہونٹوں سے نکل گئی۔ پورا جسم اذیت سے جھنجھنا اُٹھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ میں دیوانہ وار، زخمی پاؤں سے سینڈ بیگ پر ضربیں لگاتا چلا گیا۔

...... رات کو چوہان میرے پاؤں پر پھر پٹی باندھ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ "اپنے دیوانے پن میں تم خود کو تباہ کر لو گے۔"

"تباہ تو ہونا ہی ہے۔ کیا تم مجھے اپنی مرضی سے تباہ بھی نہیں ہونے دو گے؟" میں نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں۔"

"کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ پہلے بھی مرنے کے لئے جگہ ڈھونڈ رہا تھا، اب بھی ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"بہرحال، ایک بات میں تمہیں پھر بتا دینا چاہتا ہوں۔ دوبارہ اس قسم کی حماقت کرو گے تو پاؤں کی ہڈی میں کوئی فریکچر بھی ہو سکتا ہے......اور ممکن ہے کہ پہلے سے کوئی ہیئر لائن فریکچر موجود ہو جو مزید خراب ہو جائے۔"

اس دفعہ اس نے پٹی باندھتے ہوئے بہت ساری کاٹن بھی پاؤں پر رکھی تھی۔ پٹی کرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ بلاسٹ میں مرنے والے ایک اور شخص کی آخری رسوم آج ادا کی گئی ہیں۔ لوگوں میں بہت طیش پایا جا رہا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں میں...... کیونکہ مرنے والے زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ اس نے کہا کہ نئی آبادی میں لوگوں نے آج ایک ٹھاکر کی حویلی کو آگ لگا دی ہے۔ ٹھاکر اور اس کے گھر والے غائب ہیں۔ لوگوں کو شبہ ہے کہ دیوان میں گھسنے سے پہلے رنجیت پانڈے نے اس ٹھاکر کی حویلی میں چند گھنٹے گزارے تھے۔

چوہان پٹی کو آخری گرہ دے رہا تھا جب انور خاں اور اسحاق تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی خاص خبر لائے ہیں۔

انور خاں نے آتے ہی کہا۔ "حکم کا دست راست موہن کمار قتل ہو گیا۔ رات کو کسی نے اسے سوتے میں ذبح کر دیا۔"

"کب...... کیسے؟" چوہان نے پوچھا۔

"پرسوں رات...... لیکن یہاں آج خبر پہنچی ہے۔ قتل کرنے والے نے اس کا سر دھڑ سے علیحدہ کر دیا اور اس کے پاؤں کی طرف رکھ دیا۔ زرگاں میں سخت خوف پایا جاتا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ بھی سلطانہ اور اس کے بھتیجے کا کام ہے۔ اس بار واردات کی جگہ پر لوگوں نے انہیں پکڑنے کی کوشش بھی کی۔ اس کوشش میں تین چار بندے سخت زخمی بھی ہوئے ہیں۔ ایک کی حالت نازک بتائی جاتی ہے۔ اسے گولی کا زخم آیا ہے۔"

"اوہ خدایا! اب کیا ہو گا؟" چوہان نے کہا۔

"حالات تیزی سے خراب ہو رہے ہیں۔ کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی ہے۔ دوسری طرف سلطانہ کے پکڑے جانے کا امکان بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کہا جا رہا ہے کہ وہ اس خونی واردات کے بعد قریبی جنگل میں گھسی ہے۔ حکم کے سیکڑوں سپاہی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا اندیشہ ہمارے ذہنوں میں بہت پہلے سے موجود تھا۔ سلطانہ جس انداز میں یہاں سے غائب ہوئی تھی، اس سے کوئی اور مطلب لیا ہی نہیں جا سکتا تھا اور اب نتیجہ سامنے آ رہا تھا۔ موہن کمار کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ شخص حکم کے نہایت قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ یہی شخص تھا جو مجھے اور سلطانہ کو چھوٹے سرکار کی پناہ سے نکال کر واپس زرگاں کی نحوست میں لے گیا تھا۔

اسحاق نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آج ہمارے ساتھی فیروز کی روح کو سکون ملا ہووے گا۔ وہ زندہ ہوتا تو آج اپنے دوست ہارون کے قاتل کا انجام جان کر ضرور جشن مناتا۔''

یہ مکافاتِ عمل کی ایک جھلک تھی۔ چند ماہ پہلے چوڑے جبڑوں والے کرخت چہرہ موہن کمار نے اپنے ایک وفادار ماتحت کو قتل کر کے ڈراما رچایا تھا۔ مقتول ہارون کی موت کا الزام سلطانہ پر دھر کر وہ اسے زرگاں واپس لے گیا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کارنامے کے بدلے حکم جی اس پر ترقی اور منزلت کے نئے دروازے کھول دے گا لیکن اس سے پہلے ہی اس پر موت کا دروازہ کھل گیا تھا اور وہ اپنے ادھورے ایجنڈے سمیت اس میں داخل ہو گیا تھا۔

......اسی دوران میں ایک باوردی سپاہی اندر آ گیا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد انور خاں کو بتایا کہ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ اسے یاد کر رہے ہیں۔ انور نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ کوئی خاص قسم کی گفتگو ہونے والی ہے۔''

یہ واقعی خاص گفتگو تھی۔ اس کے موضوع کا پتا مجھے شام کے بعد چلا۔ شکنتلا کو ہلکا بخار تھا۔ میں اس کی مزاج پُرسی کے لئے اس کے رہائشی پورشن میں آیا ہوا تھا۔ وہ ایک سفید ساڑھی میں غم اور الم کی تصویر بنی لیٹی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے آنسو تو خشک ہو گئے تھے، وہ کسی وقت ہنس بول بھی لیتی تھی لیکن اس کے اندر جو چوٹ آئی تھی، وہ دکھ بن کر اس کی آنکھوں سے چھلکتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر ہلکان ہو جاتی تھی کہ جیکی اس کی وجہ سے برباد ہوا۔ چند دن کی خوشیوں کے عوض وہ جاں گسل مصائب کا شکار ہوا اور پھر جواں عمری میں ہی خاک کے نیچے جا سویا۔

میں شکنتلا کا دل بہلانے کے لئے اس سے باتیں کر رہا تھا جب چوہان اندر داخل ہوا۔ اس نے نئی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ حکم اور جارج کے لوگوں نے سلطانہ کو ایک ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا ہے۔ طلال بھی سلطانہ کے ساتھ ہے۔ وہ کسی بھی وقت پکڑے جا سکتے ہیں۔''

یہ پریشان کن خبر تھی۔ میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔

چوہان کو جو کچھ پتا تھا، اس نے بتا دیا۔ وہ بولا۔ ''موہن کمار کے قتل کے بعد جب سلطانہ اور طلال نے بھاگنا چاہا تو پہرے داروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ طلال نے فائرنگ کی۔ اس میں دو بندے زخمی ہوئے۔ ایک کو معمولی اور دوسرے کو شدید زخم آیا۔ پھر طلال کے پستول میں گولی پھنس گئی۔ سلطانہ اور طلال نے اپنی چھوٹی تلواریں نکال لیں اور خود کو گھیرنے والوں کو بے دریغ زخم لگائے۔ اس افراتفری میں وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے پاس گھوڑے تھے۔ موہن کمار کے پہرے داروں اور عام لوگوں نے گھوڑوں پر ان کا پیچھا کیا۔ ایک رات پہلے بارش ہوئی تھی اس لئے جنگل میں سلطانہ اور طلال کا کھرا ڈھونڈنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ قریباً آٹھ گھنٹے کے تعاقب کے بعد ان دونوں کو انگریزوں کے زمانے کے ایک ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا گیا ہے......''

چوہان کی گفتگو سے پتا چل رہا تھا کہ سلطانہ اور طلال سخت مصیبت میں ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمارے درمیان اس معاملے میں طویل تبادلہ خیال ہوا۔ اسی دوران میں اسحاق، انور خاں اور اجے بھی آ گئے۔ یہ کمرا ایک کانفرنس روم کی شکل اختیار کر گیا۔

اجے نے بتایا۔ ''چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب پل پل کی صورتِ حال پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ سلطانہ اور طلال کی مدد کرنا چاہت ہیں لیکن یہ ایک بڑا اقدم ہووے گا۔ یہ قدم اُٹھانے سے پہلے وہ اپنے مشیروں اور ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہیں گے۔ ہو سکت ہے کہ کل چھوٹے سرکار ایک بڑی میٹنگ بلائیں جس میں طریقہ طے کیا جاوے۔''

''لیکن اندازہ ہو رہا ہے کہ سلطانہ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ کل یا پرسوں تک حکم کے درجنوں لوگوں کو خود سے دور رکھ سکے گی؟''

''ہاں، یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔'' اجے نے کہا۔ ''لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ یہ ایک بڑا اقدم ہووے گا۔ اس کے بعد یقیناً نل پانی اور زرگاں میں لڑائی چھڑ سکت ہے۔ یہ چھوٹے سرکار کی مجبوری ہے کہ وہ ایسی کسی کارروائی سے پہلے ذمے دار لوگن کو اعتماد میں لیں۔''

انور خاں نے اجے سے پوچھا۔ ''برادر! تمہارے خیال میں چھوٹے سرکار کے ذہن میں کیا چل رہا ہے...... وہ کیا کارروائی کر سکتے ہیں؟''

''ان کے ذہن میں دو تین تجویزیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بڑے دستے کے ساتھ ان لوگن پر حملہ کیا جاوے جنہوں نے ریسٹ ہاؤس کو گھیر رکھا ہے۔ انہیں تتر

بتر کر دیا جاوے اور یوں سلطانہ اور طلال کو وہاں سے نکلنے کا موقع مل جاوے۔ سلطانہ اور طلال کے پاس وہی سات ایم ایم کی طاقتور رائفل ہے جو طلال نے مدن لال کے اسلحہ اسٹور سے لوٹی تھی۔ یہ رائفل ان کے بہت کام آسکت ہے......"

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میرا دل اور دماغ گواہی دے رہے تھے کہ سلطانہ کو فوری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر قاعدے ضابطے کی کارروائیوں میں وقت ضائع کر دیا جاتا تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

جب میٹنگ برخاست ہوئی تو میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ رات کے آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ ٹھنڈ پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ بلندی پر سے نل پانی کی روشنیاں دور تک دکھائی دیتی تھیں۔ جھیل میں ان روشنیوں کا جھلملاتا ہوا عکس یوں دکھائی دیتا تھا جیسے چمکیلے پیراہن والی جل پریاں رقص کر رہی ہوں۔ جھیل کی تاریک سطح پر کہیں کہیں روشنی کے ہنڈولے سے متحرک تھے۔ یہ کشتیاں اور بجرے وغیرہ تھے۔ سرِ شام تو ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، اب بھی یہ کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔

میں دیوان سے نکل آیا۔ اپنے اندر کی بے قراری کو کم کرنے کے لئے میں حسبِ معمول جھیل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ شروع میں ہوا سرد لگی لیکن پھر جسم گرم ہوتا چلا گیا اور پسینا آنے لگا۔ سانس تیزی سے چلنے لگی۔ یہ مشقت مجھے لطف دینے لگی۔ دیوان سے نکلتے ہی کچھ لوگ میرے پیچھے ہو لئے تھے۔ یہ چھ عدد گھڑ سواروں کا وہی نگران دستہ تھا جو دیوان خانے سے باہر میرے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ پہلے اس دستے کا سالار حوالدار رب نواز ہوتا تھا۔ اب وہ تو دیوان میں ہونے والے بم دھماکے کا شکار ہو چکا تھا، لمبے قد کے ایک اور حوالدار نے اس کی جگہ لے لی تھی۔

یہ نگرانی مجھے ہمیشہ جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتی تھی اور آج یہ جھنجلاہٹ ہمیشہ سے زیادہ تھی۔ میرے دماغ میں کچھ اور طرح کی ہلچل تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نل پانی سے نکلنا چاہتا ہوں اور کسی طرح سلطانہ کی مدد کو پہنچنا چاہتا ہوں تو اس کے لئے مجھے سب سے پہلے ایک صحت مند و توانا گھوڑے کی ضرورت ہے۔ دیوان کے اندر بے شمار گھوڑے تھے۔ اصطبل ہر قسم کے جانوروں سے بھرا پڑا تھا مگر میں دیوان کے اندر سے گھوڑا لے کر نہیں نکل سکتا تھا۔ اگر میں ایسا کرنا چاہتا تو فوراً چھوٹے سرکار یا مراد شاہ صاحب کو خبر کر دی جاتی۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ میں دیوان سے باہر آنے کے بعد کسی گھڑ سوار کا گھوڑا چھینوں...... یا پھر کسی گھوڑا فروش یا سائیس سے گھوڑا خرید لوں۔ یہاں اسٹیٹ میں انڈین کرنسی ہی چلتی تھی۔ میرے پاس

معقول رقم موجود تھی۔ یہ چھوٹے سرکار نے بذریعہ اجے مجھے جیب خرچ کے طور پر بھجوائی تھی۔ یہ رقم میرے لئے کوئی بھی اچھا جانور فوری طور پر خریدنے کے کام آسکتی تھی۔

مجھے اسحاق سے معلوم ہوا تھا کہ پرانے اور نئے شہر کے سنگم پر "فیروزہ دروازے" کے سامنے ایک بڑا مویشی خانہ ہے جو دن رات کھلا رہتا ہے۔ وہاں سے کوئی شخص کسی بھی وقت رقم دے کر جانور حاصل کر سکتا ہے۔

میں فیروزہ دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن نگران دستہ کراماً کاتبین کی طرح میرے ساتھ تھا۔ یہ لوگ مجھ سے قریباً 100 میٹر کا فاصلہ رکھتے تھے۔ تاہم ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی بھی وقت مجھے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ آج میں ان کی یہ کوشش ناکام بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے فیروزہ دروازے کی طرف جانا تھا اور کسی بھی نگران کے بغیر جانا تھا۔

جھیل کے ایک نواحی راستے پر بھاگتا بھاگتا میں دفعتاً گنجان آبادی کی طرف مڑ گیا۔ بازار ابھی کھلے تھے۔ بیشتر دکانیں گیس لیمپس اور جنریٹرز کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں...... آج ہندو برادری کا کوئی تہوار بھی تھا۔ اکثر جگہوں پر دیے روشن تھے اور پرشاد وغیرہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ کہیں کہیں بھجن گانے والوں کی ٹولیاں بھی نظر آتی تھیں۔ مختلف پکوانوں کی خوشبو اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ گھڑ سوار دستے نے مجھ سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کر دیا تھا۔ جب میں زیادہ بارونق علاقے میں داخل ہوا تو حوالدار اور اس کے دو ساتھی گھوڑوں سے اُتر آئے اور پیدل ہی میرے پیچھے چل دیئے۔ مجھے ان کے اس طرح پیچھے آنے سے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ ایک بار تو جی چاہا کہ واپس پلٹوں اور ان کے منہ توڑ دوں۔ انہیں اس قابل ہی نہ چھوڑوں کہ وہ اپنی منحوس نظریں مجھ پر جمائے رکھیں۔ مگر یہ اضطراری سوچ تھی۔ وہ حکم کے بندے تھے اور انہیں وہی کرنا تھا جو انہیں کہا گیا تھا۔

سیدھا چلتے چلتے میں تیزی سے ایک چھوٹی گلی میں داخل ہوا اور اپنے نگرانوں کو چکمہ دینے میں کامیاب رہا۔ یہ کپڑے کی دکانوں کا ایک تنگ سا بازار تھا۔ کچھ دکانیں بند ہو رہی تھیں، کچھ ہنوز جگمگا رہی تھیں۔ خوش لباس مرد و زن خریداری میں مصروف تھے۔ میں اس تنگ بازار سے گزر کر دوسری طرف نکل آیا۔ یہاں مٹھائی اور کھلونوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ایک طرف گھوڑا گاڑیاں کھڑی کرنے کا بہت بڑا احاطہ تھا۔ سو دو سو قدم چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے اپنی "نگرانی" سے واقعی پیچھا چھڑا لیا ہے۔

میں نے ایک ادھیڑ عمر عطر فروش سے مقامی لب و لہجے میں پوچھا۔ "جناب! آپ مجھے

فیروزہ دروازے جانے کا راستہ بتا سکت ہیں؟''

عطر فروش نے جو اپنے لباس سے مسلمان نظر آتا تھا، اُگال دان میں پان کی پیک تھوکی اور رومال سے ہونٹ صاف کر کے بولا۔ ''جی سیدھا چلتے جائیے۔ پہلے چوراہے سے دائیں طرف مڑ جائیے۔ آگے دو مینار والی مسجد آوے گی۔ وہاں کسی سے پوچھ لینا، وہ بتا دیوے گا۔''

میں شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ بازار بارونق تھا۔ کہیں پاس سے کبابوں کی زبردست خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ انڈیا کے کئی علاقوں کی طرح اس راجواڑے کے لوگ بھی چٹ پٹے پکوانوں اور تہواروں میلوں کے شوقین ہیں۔ میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اچانک ٹھٹک گیا۔ میں نے اپنے سامنے صرف بیس پچیس قدم کے فاصلے پر اپنے نگران حوالدار کو دیکھا۔ اپنے دراز قد کی وجہ سے وہ مجھے دکھائی دے گیا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یقیناً مجھے ہی تلاش کر رہا تھا۔ اس کی نظر سے بچنے کے لئے میں تیزی سے ایک مندر کے ادھ کھلے دروازے میں گھس گیا۔

یہ ایک بڑا مندر تھا۔ تہوار کی وجہ سے اندر کافی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے وغیرہ بھی تھے۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں، خوشبوئیں سلگ رہی تھیں اور پرشاد تقسیم ہو رہا تھا۔ میں ہجوم میں چلا گیا۔

''یہ تم کیا کرت ہو بھائی؟'' ایک خشک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ مندر کا ایک چاکر خشمگیں نظروں سے میرے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بے دھیانی میں، مَیں جوتوں سمیت اندر آ گیا تھا۔ ''اوہو...... شما چاہتا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا اور احاطے کے کنارے پر جوتے اتار دیئے۔

چاکر بدستور اُلجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ سر پر رومال رکھا اور پرارتھنا کرنے والے انداز میں دُرگا دیوی کی مورتی کے سامنے جا بیٹھا۔ جونہی میں نے پرارتھنا کا انداز اختیار کیا، میری دائیں جانب بیٹھا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص بُری طرح چونک گیا۔ وہ اپنے حلیے سے سکہ بند کٹر ہندو نظر آتا تھا۔ ماتھے پر قشقہ تھا اور سر پر بالوں کی ایک بڑھی ہوئی لٹ بھی تھی جسے بودی کہا جاتا ہے۔ وہ سفید دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ اس کے چونکنے اور دیکھنے کے انداز نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ شاید وہ مجھے پہچانتا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ چالیس پینتالیس سال کی ایک عورت، ایک بڑھیا اور ایک جواں سال عورت بھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ بھی مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔

مجھے پرارتھنا کا صحیح طور طریقہ تو معلوم نہیں تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی

ایک دو بار ماتھا ٹیکا اور اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ میرے اُٹھتے ہی ادھیڑ عمر شخص اور اس کے گھر والے بھی اُٹھ گئے۔ بس بڑھیا اپنی ناتوانی کی وجہ سے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ ادھیڑ عمر شخص میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں اندیشے کلبلانے لگے۔ اگر وہ مجھے ایک مسلمان کی حیثیت سے پہچانتا تھا تو اس بھرے پُرے مندر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

ادھیڑ عمر شخص نے محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تمہارا شبھ نام بیٹا؟''

''گو...... گوپال۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

ادھیڑ عمر شخص کا ہاتھ بدستور میرے کندھے پر دھرا رہا۔ وہ بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہمری ماتا جی ہیں اور یہ ہمری دھرم پتنی ہیں شانتی، اور یہ بہو ہے مالا۔''

دونوں عورتوں نے بڑی عقیدت سے مجھے پرنام کیا۔ میں نے بھی جواب دیا۔

ادھیڑ عمر شخص بولا۔ ''میرا نام رام پرشاد ہے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''کیا ہم کہیں دو گھڑی بیٹھ کر بات کر سکت ہیں؟''

''در...... دراصل میں ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ...... کیا کہنا چاہت ہیں؟''

اس نے دبے دبے جوش کے ساتھ میرا کندھا دبایا اور بولا۔ ''اگر بھگوان نے ہمیں یہاں، اس پوجا کے کمرے میں بلایا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے...... بہت خاص وجہ ہے۔''

رام پرشاد کی پتنی بولی۔ ''ہاں بیٹا! یہ بڑی شبھ گھڑی ہے کہ تم ہمیں یہاں ملے ہو۔ بھگوان نے چاہا تو اس میل کے کارن بہت بھلائی کا کام ہووے گا۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ فرش پر بیٹھی بوڑھی عورت بھی اپنی عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے مجھے مسلسل دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں اس کے پاس جھکا تو اس نے میرا سر چوما اور کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ شلوک کے انداز میں کچھ بڑبڑانے لگی۔

''تمرے ساتھ کوئی اور تو ناہیں ہے؟'' رام پرشاد نے پوچھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ بولا۔ ''چلو پھر آؤ ہمرے ساتھ۔ گھر جا کر سکون سے بات کرت ہیں۔''

وہ مجھے لے کر مندر کے بغلی دروازے کی طرف آ گیا۔ اس کے گھر والے بھی ساتھ تھے۔ اسّی پچاسی سال کی بڑھیا کو رام پرشاد کی بہو سہارا دے کر لا رہی تھی۔ بغلی دروازے کے سامنے ہی ایک بڑی شاندار گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ سفید وردی والا کوچبان گاڑی کے

پاس ہی موجود تھا۔ رام پرشاد اور اس کی فیملی کو دیکھ کر وہ ایک دم مؤدب ہو گیا۔

میں نے سوچا، یہاں آس پاس حوالدار اور اس کے ساتھی موجود ہیں۔ مجھے کم از کم یہاں سے تو نکلنا چاہئے۔ میں رام پرشاد اور اس کی فیملی کے ساتھ اس شان دار گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کھڑکیوں پر مخملی پردے تھے اور نشستیں کسی مرسیڈیز کی طرح آرام دہ تھیں۔

''پریشان ہونے کی ضرورت ناہیں۔'' رام پرشاد نے کہا۔ ''واپسی پر تم جہاں کہو گے، یہ گاڑی بان تم کو چھوڑ آوے گا۔''

گاڑی کے اندر بھی ایک سنہری طاق میں لکشمی دیوی، دُرگا دیوی اور رام کرشن وغیرہ کی مورتیاں موجود تھیں۔ رام پرشاد کی پتنی نے پرارتھنا کے انداز میں کئی بار مورتیوں کے سامنے ہاتھ جوڑے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بیٹا! ہم کو پوری آشا تھی کہ تم آؤ گے۔ جو کام صرف تم کر سکت ہو، وہ کوئی اور بھلا کیسے کرتا۔ بھگوان کے ہر کام میں کوئی بھید ہووت ہے۔''

اب مجھے اس معاملے میں کچھ دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو پرانی کہانیوں کے اس کردار کی طرح محسوس کیا جو اتفاقاً صبح سویرے سب سے پہلے کسی شہر کے دروازے میں داخل ہو جاتا ہے اور شہر کے لوگ اسے پکڑ کر کوئی خاص ذمے داری سونپ دیتے ہیں، کیونکہ انہوں نے یہی طے کر رکھا ہوتا ہے۔

گاڑی دھیمی رفتار سے شہر کے بازاروں سے گزر رہی تھی۔ مجھے ایک جگہ ایک گھڑسوار فوجی نظر آیا۔ میں نے پہچان لیا، یہ حوالدار کے ساتھیوں میں سے تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے بالکل سامنے سے گزرنے والی شاندار گاڑی کے اندر اس کا ''مطلوب'' موجود ہے۔ جلد ہی گاڑی کھلے راستوں پر آ گئی اور اس کی رفتار تیز ہو گئی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے رام پرشاد سے پوچھا۔

''زیادہ دور ناہیں۔ ہمرا گھر پاس ہی ہے۔''

''لیکن...... میں آپ کے کیا کام آ سکت ہوں؟'' میں نے مقامی لہجے میں پوچھا۔

رام پرشاد کے بجائے اس کی پتنی شانتی بولی۔ ''تم ہمرا ناہیں بھگوان کا کام کرو گے۔ اس کام کے لئے بھگوان نے ہی تمہیں چنا ہے۔''

اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور سیاہ آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے لہجے میں مذہبی جوش وخروش تھا اور بات صرف شانتی ہی کی نہیں تھی، لگتا تھا کہ یہ پوری فیملی ہی کٹر قسم کے خیالات رکھتی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد گھوڑا گاڑی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئی اور پھر ایک حویلی کے اندر چلی گئی۔ کوچبان نے جلدی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ میں نیچے اُتر آیا۔ رام پرشاد کی والدہ کو سہارا دے کر نیچے اتارا گیا۔ وہ اپنی بہو اور پوتے کی بیوی کے ساتھ اندر چلی گئی۔ میں اور رام پرشاد حویلی کی نشست گاہ میں آ بیٹھے۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ اندر کا ماحول وہی تھا جو ہندی فلموں میں ہوتا ہے اور خالص ہندووانہ رہن سہن کی عکاسی کرتا ہے۔ طاقوں میں جا بجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں سجی ہوئی تھیں اور دیے روشن تھے۔ دیواروں پر آویزاں پینٹنگز میں بھی یہی رنگ ڈھنگ تھا۔ ہندومت میں لاتعداد دیوی دیوتا ہیں۔ کسی وقت تو ایسا لگتا ہے کہ ہر جاندار و بے جان چیز کو دیوی دیوتا کا روپ دے دیا گیا ہے۔

ہم نشست گاہ میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک پنڈت جی آ موجود ہوئے۔ ان کی عمر ساٹھ ستر کے قریب تھی۔ ایک چرمی بیگ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے بھی مجھے توجہ اور دلچسپی سے دیکھا۔ میرا شانہ تھپکا۔ میرا نام، تاریخ پیدائش اور وقت وغیرہ پوچھا۔ یہ سب کچھ ایک کاغذ پر لکھا اور باہر چلے گئے۔

میری اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جلد از جلد اس صورتِ حال کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر رام پرشاد صورتِ حال پر کوئی بات کرنے کے بجائے میری خاطر تواضع میں لگ گیا۔ پہلے پھلوں اور مربہ جات سے تواضع کی گئی پھر بھوجن پر اصرار کیا جانے لگا۔ میں بہ مشکل انہیں روک پایا۔ میں نے کہا۔ ''انکل......! سب سے پہلے میری اُلجھن دور کیجئے۔ آپ مجھے اس طرح یہاں کیوں لائے ہیں؟''

رام پرشاد نے کہا۔ ''میں تمہیں سب کچھ بتاوت ہوں لیکن اس سے پہلے ایک دو میرے سوال بھی ہیں۔''

''جی پوچھیے۔''

اس نے میرے کوائف دریافت کئے۔ یعنی میں کہاں رہتا ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ بیاہتا ہوں یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں ان سوالوں کے جواب ذہن میں پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ میں نے اپنی رہائش چاچا عبدالغنی والے محلے میں بتائی۔ میں نے اسے بتایا کہ فیروزہ دروازے کے پاس میری کپڑے کی دکان ہے۔ میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ رہتا ہوں اور غیر شادی شدہ ہوں۔

وہ میرے جوابات سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''گوپال پتر! اس سنسار میں دھرم سے بڑی کوئی شے ناہیں اور

دھرم کا پالن ہم سب کا فرض ہے۔ جب دھرم وِرودھی لوگن کوئی غلط کام کرت ہیں تو پھر یہ دھرم پریمیوں کا ہی کام ہوتا ہے کہ وہ ان کا سامنا کریں اور دھرم کی رکھشا کریں۔ میں لمبی چوڑی تمہید باندھنا ناہیں چاہت ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ہمرے راجواڑے میں کچھ لوگن دھرم کو نشٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل بھگوان سے یدھ چھیڑنے جیسا ہے۔ یہ لوگن ایک ایسے اپرادھی کو جیون دے رہے ہیں جس کی کم از کم سزا موت ہے۔ ہم تو دھرم کے ادنیٰ چاکر ہیں۔ ہمری سمجھ بوجھ معمولی ہے لیکن بڑے پنڈت مہاراج تو جو دیکھتے ہیں، ٹھیک ہی دیکھتے ہیں نا...... انہوں نے جو کنڈلیاں نکالی ہیں، اس کے مطابق اگر اس اپرادھی کو شما کر کے اسے جیون دیا گیا تو یہ پوری ہندو جاتی پر ایک بڑا ظلم ہووے گا۔ اور اس کی سزا ہر اس منش کو بھگتنا ہووے گی جو اس ظلم کو روکنے کی شکتی رکھتا تھا۔"

"آپ کس اپرادھ کی بات کر رہے ہیں، انکل پرشاد؟" میں نے اپنائیت سے پوچھا۔

"ایک ناری نے ایک برہمن کی ہتھیا کی ہے۔ اس کو بے دردی سے مارا ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ پرارتھنا میں مصروف تھا۔ یہ برہمن اس راجواڑے کے سب سے پوتر پریوار کا فرد تھا۔ اوتاروں کی لڑی میں سے تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس پلید ناری کو وہیں ٹکڑے کر دیا جاتا اور اس کا ماس کتوں کو کھلا دیا جاتا لیکن اب کچھ لوگن اسے جیون دینے کا سوچ رہے ہیں۔ اسے زندہ رکھنا چاہت ہیں تاکہ وہ اس دھرتی پر چلے، اس ہوا میں سانس لے اور کھائے پیئے۔"

میرے ذہن میں کھدبد شروع ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "انکل! آپ کس ناری کی بات کر رہے ہیں؟"

"ہے ایک نیچ ذات کی ہتھیارن۔" وہ مبہم انداز میں بولا۔

"وہ مسلمان تو ناہیں؟"

"ہاں...... مسلمان ہی ہے۔" رام پرشاد کے چہرے پر بہت سی نفرت یلغار کر آئی۔

ایک دم میرے ذہن میں دروازہ سا کھل گیا۔ لہو کی گردش رگوں میں تیز ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "انکل پرشاد! مجھے لگ رہا ہے کہ آپ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کی بات کر رہے ہیں۔"

رام پرشاد کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "ہاں گوپال! تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے...... یہ وہی ہے جس نے کچھ دن پہلے موہن کمار جی کو ان کے گھر میں گھس کر قتل کیا تھا۔ اس کتیا نے ان کا سر کاٹ کر شریر سے علیحدہ کر دیا اور ان کے

چرنوں میں رکھ دیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ یہ سب کس کے ساتھ کر رہی ہے۔ تم جانت ہو کہ موہن کمار کون تھے؟"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ناہیں، مجھے ٹھیک سے پتا ناہیں۔"

رام پرشاد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "موہن کمار اوتاروں کی لڑی میں سے ہیں۔ یہ زرگاں کے بڑے پنڈت مہاراج کے داماد بھی تھے۔ کہا جاوت ہے کہ دو ہزار سالوں سے اس لڑی (نسل) کے لوگن کا سر بھگوان کے سوا کسی کے سامنے ناہیں جھکا لیکن اس پلید عورت نے یہ سر موہن کمار کے شریر سے کاٹ کر علیحدہ کر لیا اور پھر انہی کے چرنوں میں رکھ دیا۔ ایک طرح سے اس خبیث ناری نے یہ بتایا کہ جو سر جھکتا ناہیں تھا، وہ اپنے ہی چرنوں میں گرا پڑا ہے۔" بولتے بولتے رام پرشاد کی آنکھوں سے چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

میں اس عجیب اتفاق پر حیران ہو رہا تھا۔ میں جو آج دیوان کی عمارت سے اس لئے نکلا تھا کہ کسی طرح سلطانہ کی مدد کو پہنچ سکوں، ایک ایسے کٹر ہندو سے آن ملا تھا جس کا دماغ ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا اور جو پچھلے آدھ گھنٹے سے مجھ سے مسلسل سلطانہ کے بارے میں بات کر رہا تھا لیکن بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "انکل! میں نے تو سنا ہے کہ موہن کمار جی کی ہتھیا کے بعد سلطانہ کو جنگل میں گھیر لیا گیا ہے اور اب وہ اور اس کا بھتیجا بچ ناہیں سکیں گے۔"

رام پرشاد کے چہرے پر پھر عجیب سا رنگ لہرا گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کوئی اشلوک پڑھنے کے بعد بولا۔ "پرنتو! یہی تو بھید ہے اس میں۔ وہ حرامزادی مرے گی ناہیں۔ بالکل ناہیں مرے گی۔ اسے زندہ پکڑا جاوے گا۔"

"آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"اس لئے کہ ہم کو اندر خانے کی جانکاری ہے۔ ہم سب جانت ہیں۔ کچھ لوگن ہیں جو سلطانہ کو زندہ حالت میں زرگاں لے جانا چاہت ہیں۔ ان لوگن کا دھرم سے کوئی واسطہ ناہیں اور نہ ہی ان کو بھگوان کا کوئی خوف ہے۔ ان کو جانکاری ناہیں کہ ان کی یہ من مرضی راجواڑے کے باشندوں پر کتنی بھاری پڑے گی۔ کنڈلیاں سب کچھ بتا رہی ہیں مگر یہ گوری چمڑی والے کنڈلیوں وغیرہ کو مانتے ہی کب ہیں......"

ایک دم میرا دھیان جارج گورا اور سرجن اسٹیل وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ میں نے رام پرشاد کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "انکل! کہیں آپ جارج گورا صاحب کی بات تو ناہیں کر رہے؟"

''اس کا نام اتنی عزت سے مت لو۔ وہ اس قابل ناہیں ہے۔ وہ اپنے مطلب کا بندا ہے۔ وہ بدلے کی آگ میں جل رہا ہے اور اسے بس اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی فکر ہے۔ اگر وہ حکم جی کا سچا دوست ہوتا تو کبھی ایسا سوچتا بھی ناہیں۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہت ہیں کہ جارج گورا، سلطانہ اور اس کے پریوار سے بدلہ لینے کے لئے اسے زندہ اپنے پاس منگوانا چاہت ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سلطانہ کو اپنی رکھیل بنا کر رکھے...... وہ کوئی ایسا چکر چلائے گا کہ عام لوگن یہی سمجھیں گے کہ وہ مرگئی یا جیل سے بھاگ نکلی مگر وہ رہے گی جارج گورے کے پاس ہی...... جارج گورا کی طرح کے بندے کسی کو آسانی سے شما ناہیں کرتے ہیں۔''

''کنڈلیاں کیا کہتی ہیں؟'' میں نے رام پرشاد سے پوچھا۔

''اس ناری کا مرنا بہت ضروری ہے، ورنہ کوئی بہت سخت آفت آوے گی۔ کوئی ایسی بیماری جس میں راجواڑے کے بہت زیادہ لوگن مر جاویں یا پھر کوئی باڑ...... یا آپس کی لڑائی جس میں بے شمار بے گناہوں کی ہتھیا ہو جاوے لیکن کچھ نہ کچھ ہووے گا ضرور۔ یہی پنڈت مہاراج کا وچار ہے اور ان کا وچار کبھی غلط ناہیں ہوتا۔''

''پنڈت مہاراج کیا چاہت ہیں؟''

''ان کی خواہش ہے کہ اس ناری کو زندہ ناہیں رہنا چاہئے اور اگر اسے ایک خاص منش (بندہ) خاص ڈھنگ سے مارے گا تو ٹھیک پرائشچت ہووے گا اور بلا ٹل جاوے گی۔''

''میں سمجھا ناہیں، خاص منش کون؟''

رام پرشاد نے پھر منہ میں کوئی اشلوک پڑھا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔ ''ہمرا اندازہ ہے کہ وہ منش تم ہو۔ بہر حال، ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ کھل کر سامنے آ جاوے گا۔ پنڈت بھگوان داس تمہاری کنڈلی بنا رہے ہیں۔''

''کنڈلی بنا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کنڈلی سے پتا چل جاوے گا کہ وہ منش تم ہی ہو جس کی طرف ایشور نے پنڈت مہاراج کو اشارہ دیا ہے، یا کوئی اور ہے۔''

''کیا پنڈت مہاراج نے آپ کو میرے بارے میں کچھ بتایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ناہیں، انہوں نے بس نشانی بتائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم چوتھی تاریخ کو چاند ڈوبنے کے فوراً بعد کالی کے مندر میں پوجا شروع کر دیں۔ پوجا کے دوران میں جو پجاری

ہمارے پریوار کے دائیں طرف آ کر بیٹھے گا، وہی اصل منش ہووے گا۔ اسی کے ہاتھوں وہ اپرادھن قتل ہووے گی تو ایشور خوش ہوں گے اور ٹھیک پرائشچت بھی ہو جاوے گا۔''

''میں...... میرا مطلب ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے کسی کے پران لوں گا؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

رام پرشاد نے تسلی بخش انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، بلغم زدہ کھانسی کی آواز سنائی دی اور پنڈت بھگوان داس ایک لمبا چوڑا زائچہ لے کر آ گیا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''گوپال سنہا! تمہاری کنڈلی میں کچھ گڑ بڑ نظر آوت ہے۔ کیا تمہارا پورا نام یہی ہے؟''

میں نے تصدیق کی۔ وہ کچھ دیر لفظوں اور ہندسوں میں الجھتا رہا۔ آخر بولا۔ ''پھر ہوسکتا ہے کہ تم نے اپنا جنم دن ٹھیک نہ بتایا ہو کیونکہ اس کنڈلی میں بہت سے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کی نفی کر رہے ہیں...... بلکہ ایک دو لوگ تو ایسے ہیں جو تمہاری کنڈلی میں ہو ہی ناہیں سکتے۔ اس کے علاوہ......''

وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس پنڈت کو نہیں مانتا تھا اور نہ اس کی کنڈلی کو...... لیکن اس کا یوں مخمصے میں پڑ جانا مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''اپنے جنم دن کے بارے میں مجھے پورا وشواس ناہیں ہے۔ میری ماتا ایک تاریخ بتاوت ہیں اور پتا کو دوسری تاریخ پر بھروسا ہے۔''

پنڈت کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ اپنی چندیا کھجا کر بولا۔ ''یہ ہوئی نا بات۔ ہمری کنڈلی کے حساب سے بھی تمہارا جنم دن منگل وار کے بجائے بدھ وار بنتا ہے اور چاند کی اٹھائیس تاریخ۔''

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ پنڈت بھگوان داس نے جلدی جلدی کنڈلی میں کچھ تبدیلیاں کیں اور مطمئن لہجے میں رام پرشاد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھیں، سب کچھ ٹھیک بیٹھ گیا جی...... یہی وہ منش ہے جس کی طرف پنڈت مہاراج نے اشارہ کیا تھا۔ بھگوان نے چاہا تو وہ اپرادھن مرے گی اور اسی کے ہاتھوں مرے گی۔'' پھر وہ میری طرف گھوم کر بولا۔ ''تم خوش قسمت ہو۔ تمہیں ایشور نے ایک بڑے کام کے لئے چنا ہے۔''

''میں کچھ سمجھ ناہیں رہا۔'' میں نے پھر گھبراہٹ ظاہر کی۔

سوکھے سڑے پنڈت نے کچھ بولنا چاہا مگر رام پرشاد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور مجھ سے کہا۔ ''گوپال پتر! گھبرانے کی کوئی بات ناہیں ہے۔ ہم تمہیں کسی مصیبت

میں ناہیں ڈالیں گے۔ میں تمہیں سب سمجھا دوں گا۔"

پنڈت اُٹھ کر چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گھرانے کے باقی افراد کو یہ خوش خبری سنانے کے لئے گیا ہے کہ وہ کالی کے مندر سے مطلوبہ بندے کو ہی لے کر آئے ہیں۔ کچھ دیر بعد مجھے رونے گڑگڑانے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ رام پرشاد کی بوڑھی والدہ ہی تھی۔ وہ شاید کسی مورتی کے سامنے پرارتھنا کر رہی تھی۔ پھر وہ اپنی بہو اور بہو کی بہو کے سہارے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کی بوڑھی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے میرا سر چوما اور کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔

اتنے میں ایک گھوڑا گاڑی حویلی کے پورچ میں آ کر رکی۔ رام پرشاد نے کھڑکی سے جھانکا اور مجھ سے مخاطب ہو کر مسرور لہجے میں بولا۔ "ستیش آیا ہے میرا بیٹا۔ تم سے مل کر بہت خوش ہووے گا۔"

ایک دو منٹ بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ قد چھ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ جسم نہایت ورزشی اور چہرے سے سختی ٹپکتی تھی۔ عام برہمن زادوں کی طرح اس کے ماتھے پر بھی سفید قشقہ تھا۔ وہ بگولے کی طرح اندر آیا۔ سب کو پرنام کیا۔ اس نے اپنی دادی کے چرن چھوئے اور ذرا تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اسے پرنام کیا اور مؤدب کھڑا رہا۔ رام پرشاد اپنے بیٹے کو ایک طرف لے گیا اور چند باتیں کیں۔ یقیناً یہ سب کچھ میرے تعارف کے سلسلے میں ہی تھیں۔ نوجوان واپس پلٹا اور دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ جیسے نظروں نظروں میں مجھے اور میرے قد کاٹھ کو تول رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا۔ اس نے میرے دونوں کندھے تھامے اور انہیں ہلکے ہلکے جوش سے ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے بجلیاں سی تڑپ رہی تھیں۔ وہ بولا۔ "اب تم نے یہیں رہنا ہے۔ ہاں، جب تک کام ناہیں ہو جاتا، تم یہیں رہو گے ہمارے مہمان بن کر۔ تم چاہو تو اپنے گھر والوں کو اطلاع دے سکت ہو بلکہ چاہو تو انہیں بھی یہیں بلا سکت ہو۔"

"ناہیں جی! مجھے ان کی طرف سے کوئی ایسی خاص پریشانی ناہیں۔ میں کام کے سلسلے میں نکلا تھا اور مجھے ایک دو دن گھر سے باہر ہی رہنا تھا۔"

"بہت خوب۔" ستیش نے اپنا بڑا سر اوپر نیچے ہلایا۔

......میرے اگلے چوبیس گھنٹے اس حویلی کے شاندار مہمان خانے میں گزرے۔ میری ہر طرح خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ ایک ملازم نند لال ہر وقت میری خدمت کے لئے موجود تھا۔ نند لال سے میری تھوڑی بہت بات چیت بھی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ حویلی کی

ساری صورتِ حال بھی میرے سامنے تھی۔ میں نے جو نتیجے اخذ کئے، وہ اس طرح تھے۔ یہ نل پانی کے کٹر ہندو گھرانوں میں سے ایک تھا۔ اس گھرانے کا سربراہ رام پرشاد تھا تاہم اس کی بوڑھی ماتا کی بھی بہت مانی جاتی تھی۔ وہ اپنی بوڑھی ماتا، پتنی، بیٹے اور بہو کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ نل پانی میں ان لوگوں کا ایک کارخانہ تھا جہاں کشتیاں اور تفریحی بجرے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ یہ چیزیں پورے راجواڑے میں سپلائی ہوتی تھیں لیکن دس بارہ سال پہلے رام پرشاد کی فیملی نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ یہ بھی ان کی توہم پرستی اور مذہبی جنونیت کی وجہ سے تھا۔ رام پرشاد کی فیملی میں ایک موت ہوگئی جس کے بعد رام پرشاد کی بوڑھی ماتا نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایسا ہمارے کاروبار کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ منحوس کاروبار ہے۔

دراصل پرانے خیال کے ہندوؤں میں یہ عقیدہ بہت پختہ تھا کہ پانی کا سفر پاپ ہے۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ کشتیاں وغیرہ بنانے کا کام دراصل پانی کے سفر سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے گھریلو فرنیچر بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ کاروبار رام پرشاد ہی سنبھالتا تھا۔ اس کے بیٹے ستیش کی مصروفیات کچھ اور طرح کی تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ اب بھی وہ دس پندرہ روز بعد گھر لوٹا تھا۔ پرسوں اسے پھر چلے جانا تھا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ستیش کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ وہ شاید کسی تشدد پسند ہندو تنظیم کا کارکن تھا۔ اس کے جو ایک دو دوست اس سے ملنے گھر آئے، وہ بھی خطرناک صورتوں والے ہی تھے۔ یہ کچھ اس قسم کے لوگ تھے جن سے چند دن پہلے میری اندرونِ شہر کے ایک ڈیرے پر مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ ورزشی جسم، کڑے تیور اور سانولی پیشانیوں پر سفید قشقے۔ ان میں سے ایک کے پاؤں میں کوئی نقص تھا اور آواز بہت بھدی تھی۔

دوسری رات نو بجے کے قریب میں نے گھر کے ایک کمرے میں ستیش اور اس کے دو دوستوں کی تھوڑی سی بات چیت سنی۔ وہ بڑے پُرجوش تھے اس لئے بلند آواز میں بول رہے تھے۔ شاید انہوں نے کسی طرح کا نشہ بھی کیا ہوا تھا۔ ان کی یہ گفتگو سلطانہ کے بارے میں تھی۔

میں نے ایک مالا توڑی اور پھر اس کے باریک دانے اکٹھے کرنے کے بہانے دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ دروازے کی دوسری جانب ستیش کہہ رہا تھا۔ "آج چوتھا دن ہے۔ میرا وشواس ہے کہ وہ دونوں بس ایک دو دن اور نکالیں گے۔ وہاں ریسٹ ہاؤس میں کھانے کا اناج کا ایک دانہ ناہیں۔ پانی بھی بند ہے۔ مٹی کھا کر تو گزارہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہاں، میرا وچار بھی یہی ہے۔" ایک دوسری آواز آئی۔ "حکم جی کے اہلکار کچھ نہ بھی

کریں، صرف اپنا گھیرا ہی قائم رکھیں تو ایک دو دن کے اندر اس حرامزادی کو زندہ پکڑا جا سکت ہے۔ جب بھوجن ہی ناہیں ہووے گا تو کتنے روز اکڑے رہیں گے چچی بھتیجا؟ مگر بلرام رائے کی اپنی سوچ ہے۔ آخر وہ اس آپریشن کا انچارج ہے۔ وہ اپنی کارکردگی دکھانا چاہت ہے۔ ہوسکت ہے کہ اسے یہ ڈر بھی ہو کہ لاچار ہو کر سلطانہ اور اس کا بھتیجا آتما ہتھیا کی کوشش نہ کریں۔"

"تو پھر کیا...... وہ اندر گھسنے کا ارادہ رکھتا ہے؟"

"ناہیں۔ مجھے ایک اور طرح کی جانکاری ملی ہے اور میرا وچار ہے کہ یہ بہت حد تک ٹھیک ہے۔ نل پانی کا ایک مُسلا ہے چاچا عبدالغنی۔ سلطانہ اس کے گھر میں بھی رہتی رہی ہے اور اس پر بڑا وشواس کرت ہے۔ وہ اس کے لئے بھوجن لے کر اندر ریسٹ ہاؤس میں جاوے گا۔ اس بھوجن میں بے ہوشی کی دوا ملی ہووے گی۔"

"لیکن وہ غنی ہوگا تو مُسلا۔ اندر جا کر اس نے بھوجن کا بھید کھول دیا تو؟" ستیش نے پوچھا۔

"وہ ناہیں کھولے گا یار۔" اس کے دوست کی آواز آئی۔ "وہ خود بھی یہ چاہے گا کہ کہیں سلطانہ بالکل نراش ہو کر آتما ہتھیا وغیرہ کی کوشش نہ کرے۔ پرنتو عارضی طور پر ہی سہی لیکن اس کا جیون بچ جائے...... مجھے وشواس ہے کہ عبدالغنی وہی کرے گا جو بلرام وغیرہ اس سے کہہ رہے ہیں۔"

ستیش کے ایک دوست نے دبی دبی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "یار! ویسے ایک بات ہے۔ یہ جارج گورا صاحب ہے بڑی اونچی شے۔ سچویشن جو بھی ہو، یہ اپنی دل پشوری کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ ڈھونڈ ہی لیوت ہے۔ اب دیکھو، کیسے ہاتھ دھو کر اس سلطانہ راجپوت کے پیچھے پڑا ہے۔"

"ناری بھی تو زوردار ہے۔" دوسرے دوست نے لوفر لہجے میں کہا۔

پہلا بولا۔ "ہاں، ناری گورا صاحب کی کمزوری ہے۔ خاص طور سے مسلمان ناریاں۔"

"میں تمہاری اس بات سے اتفاق ناہیں کرتا۔" ستیش نے کہا۔ "ناری اس کے لئے ناری ہی ہے۔ ہندو ہو، چاہے مسلم ہو...... یا کوئی اور...... تم یہ کہہ سکت ہو کہ وہ مقامی عورتوں کا رسیا ہے۔ اگر وہ ایک حد تک رہا تو ٹھیک ہے، اگر اس نے حد پار کی تو پھر اس کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔ حکم جی کو بھی اپنی آشیرباد بس اس سمے تک اس کے ساتھ رکھنی چاہیے جب تک وہ اپنی سیما (حد) کو پار ناہیں کرتا۔"

آہٹ ہوئی اور میں دروازے کے سامنے سے اُٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ کمرے میں آ کر میں دیر تک سوچتا رہا۔ سلطانہ مصیبت میں تھی...... تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی کو فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ریسٹ ہاؤس کو پوری طرح گھیر لیا گیا تھا مگر فوجی افسر بلرام چاہتا تا کہ سلطانہ اور طلال کو زندہ پکڑ کر جارج کے پاس لے جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ لوگ ہر حربہ آزما رہے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ سلطانہ اپنے سابقہ میزبان عبدالغنی پر بھروسا کرے گی۔ وہ اس کے ذریعے اسے بے بس کرنے کا پلان بنا رہے تھے۔

صبح سویرے ہی بھجن کی آواز حویلی میں گونجنا شروع کر دیتی تھی اور پوجا کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ مہمان خانے کے اندر بھی پوجا کا کمرا موجود تھا۔ میں اکیلے پوجا پاٹ کا ڈھونگ رچا لیتا تھا۔ اگر مجھے یہ ڈھونگ سب کے سامنے رچانا پڑتا تو بہت دشواری ہوتی۔ مجھے پوجا کے ابتدائی طور طریقے بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھے۔ میں نے ہندووانہ رہن سہن میں ایک دو غلطیاں بھی کیں تاہم وہ خوش قسمتی سے کسی کی نظر میں نہیں آ سکیں۔

اگلے روز رات کو ستیش واپس چلا گیا۔ تاہم جانے سے پہلے اس نے مجھ سے اپنے کمرے میں ملاقات کی۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک لمبی ناک والا درمیانی عمر کا شخص بھی تھا۔ وہ بالکل کلین شیو تھا۔ سر بھی منڈا ہوا تھا۔ ستیش نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے کچھ باتیں بتائیں۔ یہ باتیں سلطانہ سے ہی متعلق تھیں۔ وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ "ہم اس اپرادھن کو زندہ سلامت زرگاں میں ناہیں جانے دیں گے۔ اس سلسلے میں پوری پلاننگ ہو چکی ہے۔ جب بلرام اور اس کے ساتھ سلطانہ کو ریسٹ ہاؤس سے پکڑ لیں گے اور واپس زرگاں کی طرف روانہ ہوں گے تو ہم ان کو راستے میں روکیں گے اور بھگوان نے چاہا تو کامیابی سے روکیں گے۔"

"کیا ان کے قافلے پر ہلا بولا جاوے گا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ ایسا ہی سمجھ لو......" اس نے گول مول بات کی۔

شاید وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی دیکھ کر ستیش سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ایسا حساس تو نہیں تھا کہ میری خاموشی اسے پریشان کرتی لیکن شاید جو کچھ وہ مجھ سے کرانا چاہتا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ میری باخبری اور پوری رضامندی اس میں شامل ہو۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور جیب سے ایک کاغذ نکال کر مجھے دکھایا۔ اس پر کچھ لکیریں سی کھچی ہوئی تھیں۔ وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ "یہ دیکھو گوپال! یہ ہے وہ ریسٹ ہاؤس

جہاں سلطانہ اور اس کا بھتیجا سپاہیوں کے گھیرے میں ہیں۔ پکڑے جانے کے بعد وہ اس راستے سے زرگاں کی طرف روانہ ہوں گے...... یہ دیکھو...... یہ ریکھا جو نیچے کی طرف جارہی ہے، اس راستے کو ظاہر کرت ہے...... یہاں دیکھو، یہ ریکھا اس بیلے کے درختوں میں سے گزرتی ہے۔ یہ ٹیلے کے ساتھ ساتھ ایک موڑ ہے......'' اس نے ایک قوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ایک دبی دبی سی زہریلی ہنسی اس کے سانولے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

اس نے معنی خیز انداز میں لمبی ناک والے کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس موڑ پر ہم سلطانہ اور اس کے بھتیجے کو باقی قافلے سے علیحدہ کر لیویں گے اور بھگوان نے چاہا تو یہ کام بڑی صفائی سے ہووے گا۔''

''الگ کر لیویں گے؟ میں کچھ سمجھا ناہیں۔'' میں نے کہا۔

ایک دفعہ پھر ایک غیر محسوس لیکن زہریلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی۔ وہ بولا۔ ''جب گاڑیوں اور گھوڑوں کا قافلہ اس موڑ پر سے تیزی سے مڑ رہا ہوگا...... سلطانہ والی گاڑی سیدھی نکلتی چلی جاوے گی...... قریباً سو گز دور ٹیلوں کے اندر یہ تنگ درّہ سا ہے۔ گاڑی اس میں سے گزر کر دوسری طرف چلی جاوے گی...... اور پھر یہ درّہ بند کر دیا جاوے گا۔''

''یہ کیسے ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے بندے اس درے کا راستہ روک لیویں گے۔ جو اس راستے کو کھولنے کی کوشش کرے گا، چھلنی ہو جاوے گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ستیش کی آنکھوں میں پھر چنگاریاں دکھائی دینے لگیں۔

''بات سمجھ میں آ رہی ہے جی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن جناب! سلطانہ والی گھوڑا گاڑی باقی قافلے سے الگ کیسے ہووے گی؟''

''پرنتو! یہ بڑا اہم سوال ہے لیکن اس سوال کا جواب تمہارے سامنے ہی بیٹھا ہے۔'' ستیش نے معنی خیز انداز میں کہا اور لمبی ناک والے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اپنی بھید بھری آنکھوں کے ساتھ بالکل خاموش تھا۔

''میں اب بھی سمجھ ناہیں سکا۔'' میں نے کہا۔

ستیش اپنی آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''یہ اس سرکاری گاڑی کا گاڑی بان ہے جس میں سلطانہ اور طلال کو لے جایا جائے گا۔ یہ وہی کرے گا جو ہم کہیں گے کیونکہ یہ دھرم کی رکھشا کا مطلب سمجھت ہے۔ اسے پتا ہے کہ اس شبھ کام میں اگر اس کے پران بھی چلے گئے تو یہ گھاٹے کا سودا ناہیں۔''

لمبی ناک والے کی لمبوتری آنکھوں میں وہی جنونیت نظر آئی جو ستیش کی آنکھوں کا جزو خاص تھی۔ ستیش نے بتایا کہ لمبی ناک والے کا نام بھولا ناتھ ہے۔ جو نقشہ ستیش دکھا رہا تھا اور جس طرح کی پلاننگ کی بات کر رہا تھا، وہ سب کچھ واقعی متاثر کن تھا۔ ٹیلوں کے درمیان وہ ایک چھوٹا درّہ نما تھا۔ اس کی دونوں جانب چھپنے اور گھات لگانے کے لئے بہت سی جگہیں تھیں۔ اگر کوئی اس درّے میں سے گزرنے کی کوشش کرتا تو اسے بہ آسانی روکا جا سکتا تھا اور نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ ستیش اس ساری صورت حال کے بارے میں بہت پُر امید اور پُر جوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ مختار راجپوت کی اپرادھن بیٹی مرے گی اور اسی طرح مرے گی جس طرح بڑے پنڈت مہاراج کی خواہش ہے۔

ستیش کے جانے کے بعد میری پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں اس حویلی میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ رام پرشاد ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کام مکمل ہونے تک میں حویلی سے باہر قدم نکالوں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس حوالے سے ہر گھڑی میری نگرانی بھی کی جا رہی ہے۔ مجھے باہر کے حالات کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میں کسی کو بتائے بغیر اچانک ہی دیوان کی عمارت سے نکلا تھا اور اب مجھے دیوان سے لاپتا ہوئے کم و بیش تین روز ہو چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری گمشدگی نے وہاں کھلبلی مچائی ہوگی۔ خاص طور سے چوہان اور انور خاں تو بہت پریشان ہوں گے۔ چند دن پہلے رنجیت پانڈے سے میری زبردست ٹکر ہوئی تھی۔ انور خاں اور چوہان یہ بھی سوچ سکتے تھے کہ شاید میری گمشدگی کی وجہ رنجیت پانڈے ہی ہو۔ اس غلط فہمی سے دیگر مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔

سلطانہ اور طلال کے موجودہ حالات کا علم بھی مجھے نہیں ہو رہا تھا...... میرے ایک دو بار پوچھنے پر رام پرشاد نے بس یہی کہا تھا کہ بڑی جلدی اچھی سماچار سننے کو ملے گی۔ وہ جس اچھی سماچار یعنی خبر کی بات کر رہا تھا، اس کی تفصیل مجھے ستیش بتا ہی چکا تھا۔ وہ لوگ سلطانہ کو زرگاں کے سپاہیوں کے چنگل سے نکالنا چاہتے تھے لیکن کسی اچھی نیت سے نہیں بلکہ بدترین انجام سے دوچار کرنے کے لئے۔ خطرہ اس بات کا بھی تھا کہ سلطانہ کو زرگاں کے سپاہیوں سے چھیننے کی کوشش میں ہی کوئی المیہ نہ ہو جائے۔ اس کوشش میں سلطانہ اور طلال کو شدید نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت میں حویلی کے گراسی لان میں بیٹھا تھا جب برآمدے کی طرف سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا، پندرہ سولہ سال کی ایک بالکل دبلی پتلی لڑکی دو موٹی تازی ملازماؤں کی گرفت میں تھی۔ مجھ اندازہ ہوا کہ

وہ اس کے بال کاٹنا چاہ رہی ہیں۔ ایک ملازمہ کے ہاتھ میں قینچی تھی۔ لڑکی کے شہد رنگ بال گھنے اور خوب صورت تھے۔

لڑکی رو رہی تھی۔ اس کے تاثرات برملا کہہ رہے تھے کہ وہ بال کٹوانا نہیں چاہتی۔ رام پرشاد کی بوڑھی والدہ کرسی پر بیٹھی تھی اور زور زور سے بول رہی تھی۔ ''کلموہی! ہم تیرے فائدے کی بات ہی کرت ہیں۔ تجھے پاپ سے بچانا چاہت ہیں۔ نرگ کی اگنی بڑی سخت ہے۔ تجھے اس پر وشواس ہوتو کبھی اس طرح کی بات نہ کرے۔''

رام پرشاد کی نوجوان بہو بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ وہ بولی۔ ''بڑی ماتا! آپ زبردستی نہ کریں۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ آپ اس بے چاری کو تھوڑا سا سمے دیں۔''

''تو بیچ میں مت بول۔'' بوڑھی عورت چلا کر بولی۔ ''تو ہمیشہ دھرم وِرودھی بات کرت ہے۔ یہ میرا گھر ہے...... میرا پریوار ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں، یہاں میرا اُدھیکار رہے گا اور میرا ہی حکم چلے گا۔''

''لیکن ماتا جی! یہ ہماری زرخرید داسی نا ہیں ہے۔ یہ ملازمہ ہے۔ اس کی بھی اپنی مرضی ہے اور دھرم ''مرضی'' کا نام ہے، جور زبردستی کا نام نا ہیں...... بھگوان کے لئے ماتا جی...... آپ دھرم کے نام پر اپنی مرضی نہ چلائیں۔''

''تو اپنی زبان کو لگام دے مالا۔'' بڑھیا کانپتی آواز میں بولی۔ ''بھگوان کا خوف کر۔ یہ ودھوا ہے...... اگر یہ بیاہتا بن کر پھرتی رہے گی تو یہ کلنک ہووے گا۔ اس کی نحوست ہم سب کو لے ڈوبے گی...... اور سب سے پہلے یہ نحوست پڑے گی تجھ پر...... دفع ہو جا یہاں سے...... میں جو کرتی ہوں، مجھے کرنے دے۔'' آخری الفاظ بڑھیا نے بہت زور دے کر کہے۔

نوجوان لڑکی مالا نے ایک دم رخ بدلا اور پاؤں پٹختی ہوئی لان کی طرف آ گئی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور طیش بھرے انداز میں کسی بچے کا سویٹر بننے لگی۔ وہ اچھی صورت کی تھی اور اپنی بول چال سے پڑھی لکھی نظر آتی تھی۔ ایک امیر کبیر گھرانے کی برہمن بہو ہونے کے باوجود اس میں تکلیف اور بناوٹ نہیں تھی۔ ایک دو بار وہ مجھ سے بات بھی کر چکی تھی۔

برآمدے میں، دیکھتے ہی دیکھتے ملازماؤں نے نوعمر لڑکی کے بال قینچی سے کاٹ دیئے۔ وہ اتنے بے ڈھنگے طریقے سے کاٹے گئے تھے کہ ترس آنے لگا۔ وہ خاموش بیٹھی آنسو بہاتی

رہی۔ اس کے کمزور چہرے کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ بعدازاں وہ اندرونی کمروں کی طرف چلی گئی۔ لڑکی کے کٹے ہوئے بالوں کو غالباً جلانے کے لئے یا کسی اور رسم کی ادائیگی کے لئے ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ لیا گیا۔

مالا چپ بیٹھی رہی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے سلائیوں پر حرکت کرتی رہیں۔ اردگرد کوئی نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''مالا بہن! یہ کیا جھگڑا تھا؟''

وہ جیسے ایک دم بھڑک اُٹھی۔ ''تم لوگن کو کبھی سمجھ نا ہیں آئے گی کہ یہ کیا جھگڑا ہے۔ دھرم تو شانتی اور پریم کا نام ہے، تم لوگن نے اسے یدھ بنا رکھا ہے۔ ایک ڈراؤنا تماشا بنا رکھا ہے۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی، ہم اب بھی پتھر کے زمانے میں جی رہے ہیں...... شوہروں کے ساتھ ان کی پتنیوں کو زندہ جلانا چاہت ہیں۔ ذات پات پر مر رہے ہیں۔ کالی رسموں کی آڑ میں ایک دوجے کا جیون تباہ کر رہے ہیں......'' وہ طیش میں بولتی چلی گئی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے بھی رام پرشاد اور ستیش وغیرہ کے مذہبی جنون کا ایک حصہ سمجھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ذرا ٹھنڈی ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''بہن! لیکن یہاں ہوا کیا ہے؟''

''ہونا کیا ہے...... ماتا جی اپنے لئے سورگ کا ٹکٹ پکا کر رہی ہیں۔ یہ لڑکی تم نے دیکھی ہی ہووے گی۔ مشکل سے سترہ سال عمر ہے اس کی۔ یہ حویلی کی پکی ملازمہ ہے۔ دو مہینے پہلے اس کا بیاہ ہوا تھا لیکن ابھی رخصتی نا ہیں ہوئی تھی۔ اس کا پتی چھوٹے سرکار کی سینا میں سپاہی تھا۔ پچھلے دنوں زرگاں والوں کے ساتھ جو جھڑپیں ہوئی ہیں، ان میں وہ گھائل ہوا اور تین دن بعد اس کا دیہانت ہو گیا۔ اب یہ لڑکی ودھوا ہے اور اسے زندہ درگور کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ماتا جی نے اسے ایک علیحدہ کوٹھڑی میں بند کر چھوڑا ہے۔ اسے دن میں بس ایک بار روکھا سوکھا بھوجن دیا جاوت ہے۔ یہ کھدر کے سفید کپڑے پہنتی ہے اور زمین پر سووت ہے۔ اس کا جیون شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ جتنا عرصہ جئے گی، اسی طرح جئے گی۔ یہ ہے ہمارے ''دھرم پریمیوں'' کی بدھی (سمجھ بوجھ) اور ان کا چلن اور یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ تم بھی سب جانت ہو جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔''

ابھی ہم بات کر ہی رہے تھے کہ مالا ٹھٹک گئی۔ کوئی پچاس قدم دور حویلی کے مین گیٹ سے ایک گھوڑا گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ کالے رنگ کی یہ وہی گھوڑا گاڑی تھی جس پر کچھ دن پہلے تند مزاج ستیش حویلی میں آیا تھا۔ گھوڑا گاڑی دیکھتے ہی مالا مجھ سے بے تعلق ہو گئی اور اپنی ساری توجہ سویٹر بننے میں پر مرکوز کر دی۔ گھوڑا گاڑی سے ستیش برآمد ہوا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ اس کے چہرے پر جوش کی سرخی

نظر آنے لگی تھی۔ ان لمحوں میں اس نے اپنی پتنی کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے نمستے کیا۔ مالا نے آگے بڑھ کر اس کے چرن چھوئے۔ ستیش نے مالا کی طرف توجہ دیئے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ لیتا ہوا مہمان خانے کی طرف آ گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ستیش کی بائیں کلائی پر چھوٹا سا تازہ زخم نظر آ رہا ہے۔ میری رگوں میں خون کی گردش بڑھ گئی۔

کمرے میں پہنچ کر ستیش نے جوش سے میرے کندھے دبائے اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''گوپال! ہم سپھل (کامیاب) رہے۔ ہم نے وہ حاصل کر لیا جو چاہتے تھے۔ مختار راجپوت کی بیٹی اب ہمارے پاس ہے......''

مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر محسوس ہوئی۔ تاہم اپنے اندرونی تاثرات چھپاتے ہوئے میں نے بھی ستیش کے سامنے مسرت کا اظہار کیا اور اس سے پوچھا کہ سلطانہ کہاں ہے؟

وہ بولا۔ ''میں تمہیں اس کے پاس لے جانے کے لئے ہی تو آیا ہوں۔''

''اور اس کا بھتیجا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ حرامی بھی ساتھ ہے۔''

''کیا سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہوا؟''

''ایک سو ایک فیصد۔'' وہ دبے دبے جوش سے بولا۔ ''اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ حکم جی کے بندے زیادہ زور نا ہیں مار سکے۔ انہوں نے سلطانہ والی گاڑی کے پیچھے آنے کی کوشش کی مگر ہم نے درّے پر روک لیا۔ بس تین چار منٹ کی فائرنگ کے بعد ہی وہ لوگن بھاگ گئے۔ کچھ ایسا جانی نقصان بھی نا ہیں ہوا۔ دو بندے ان کی طرف سے مرے، تین چار گھائل ہوئے۔ ہماری طرف سے صرف دو بندے گھائل ہوئے ہیں......'' اس نے جلدی جلدی مجھے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کا ہاتھ کیسے گھائل ہوا؟''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''جتنی بڑی سپھلتا (کامیابی) ملی ہے اس کے سامنے ایسے چھوٹے زخم کچھ بھی نا ہیں ہیں۔ یہ کسی شاٹ گن کا چھرا لگا ہے۔ گاڑی بان بھولا ناتھ بھی تھوڑا سا گھائل ہوا ہے۔''

اسی دوران میں رام پرشاد بھی آتا دکھائی دیا۔ اس کی سفید دھوتی بھی جیسے شادمانی سے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ سینہ پہلے سے زیادہ چوڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیٹے کو گلے سے

لگایا اور ماتھا چوما۔ ''شاباش! تم لوگن نے وہ کر دکھایا جس کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ میں بھاگ وان ہوں کہ تم میرے پتر ہو۔''

بڑھیا بھی لاٹھی ٹیکتی ہوئی آ گئی اور پوتے کی بلائیں لینے لگی۔ پھر یہ سارا گھرانا پوجا کے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک پرارتھنا کرنے اور آرتی اتارنے کے بعد یہ لوگ باہر نکلے تو فخر سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ رام پرشاد نے چاکروں کو آوازیں دیں۔ ''ساجن، مہندر امری...... جلدی آؤ یہاں۔''

کئی نوکر دوڑتے ہوئے پہنچ گئے اور مؤدب کھڑے ہو گئے۔ ''بہت سا پرشاد بنواؤ اور تقسیم کرو...... نل پانی کے سارے بڑے مندروں اور استھانوں کے لئے چڑھاوے تیار کرو۔''

بڑھیا نے گنگا جل منگوایا۔ پوتے کو پلوایا اور بیٹے کو بھی۔ پھر وہ ایک لمبی مالا لے کر بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے بیٹھ گئی اور کوئی جاپ کرنے لگی۔ اس نے حکم دیا کہ پچھلی دروازہ بند کر دیا جائے اور کوئی فرد بھی اس دروازے سے پوجا کے کمرے میں داخل نہ ہو۔ اس کا خیال تھا کہ اس شبھ گھڑی میں پچھلی دروازے سے پوجا کے کمرے میں آنا اچھا شگون نہیں ہے۔ یہ سال خوردہ بوڑھی عورت پتا نہیں کون کون سے توہمات اپنے دماغ میں بسائے بیٹھی تھی اور دوسروں کو بھی ان توہمات میں شریک دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی بہو مالا کو مخاطب کر کے بولی۔ ''دیکھ رہی ہے مورکھ! ہم پاپ کے ایک کام سے بچے ہیں تو ایشور نے کتنی کامیابی دی ہے تیرے پتی کو۔ وہ کلموہی اب اپنے کرموں کا پھل پاوے گی۔ اس نے ایک دھرم اوتار کی ہتھیا کی تھی۔ اوتار کی آتما کو شانتی دینے کے لئے اس کلموہی کا مرنا ضروری تھا۔''

بہو مالا برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی دادی ساس کس پاپ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ بیوہ ملازمہ کا سر مونڈ کر اور اسے بے چارگی کی تصویر بنا کر انہوں نے دھرم کا پالن کیا ہے اس لئے ایشور نے انہیں فوری طور پر ایک اچھی خبر سنائی ہے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ستیش مجھے حویلی سے لے کر جانے کے لئے تیار تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک بیگ اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وقتِ رخصت رام پرشاد کی توہم پرست والدہ ایک چودہ پندرہ سال کے خوبرو لڑکے کے ساتھ آئی۔ لڑکے نے بیچ میں سے مانگ نکال رکھی تھی۔ ماتھے پر قشقہ تھا۔ حلیہ سادھو سنتوں جیسا تھا۔ بڑھیا کی ہدایت پر لڑکے نے میرے سر پر ایک نامعلوم خوشبو والا تیل ڈالا اور مجھے گنگا جل کے چند گھونٹ پلائے۔ اس کے بعد نیلگوں

پتھروں کی ایک مالا سی میرے گلے میں ڈال دی۔ بڑھیا نے میرے اور ستیش کے ماتھوں پر تلک لگائے۔

کچھ ہی دیر بعد میں ستیش کے ساتھ اس کی شان دار گھوڑا گاڑی میں حویلی سے روانہ ہو رہا تھا۔ مجھے اب تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں اور کہاں لے جا رہے ہیں۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی تیزی کے ساتھ نل پانی کے مختلف بازاروں سے گزرتی رہی اور مضافات میں آ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ میں سلطانہ کے پاس ہی جا رہا ہوں لیکن سلطانہ کو میں کس حال میں دیکھوں گا اور مجھے سلطانہ کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اس کا مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں، اتنی بات ضرور سمجھ میں آ رہی تھی کہ کچھ انوکھا اور خطرناک ہونے والا ہے۔

کچھ آگے جا کر ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ ستیش کے ہاتھ میں ایک سیاہ پٹی نظر آئی۔ اس نے کہا۔ ''گوپال! میں تم سے شما چاہت ہوں لیکن یہ ہمری مجبوری ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ پٹی تمہاری آنکھوں پر باندھنا پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔'' میں نے کہا۔

ستیش نے پٹی باندھ دی...... گاڑی قریباً ایک گھنٹے تک مزید ہچکولے کھاتی رہی۔ وہ ایک نیم پختہ راستے پر چلنے کے بعد کچے راستے پر آ گئی۔ اس کی رفتار کم ہو گئی۔ جنگلی گلاب اور دیگر نباتات کی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ایک طویل چڑھائی چڑھنے کے بعد گھوڑا گاڑی رک گئی۔ ستیش نے مجھے اسی حالت میں گاڑی سے اتارا اور سہارا دے کر کسی چاردیواری میں لے گیا۔ میری پٹی کھول دی گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ میں جس جگہ پر موجود تھا وہ کسی کھنڈر سے مشابہ تھی۔ لگتا تھا کہ یہ کسی پرانے استھان کی باقیات ہیں۔ ایک طرف کسی قدیم تالاب کے آثار تھے، دوسری طرف چند پختہ روشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس جگہ خوشبو بہت زیادہ تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی رہی تھی اس لئے ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ گھوڑا گاڑی خوشبو کے ایک بڑے ڈھیر میں سے گزر کر یہاں پہنچی ہے اور وہ جس خوشبودار جگہ سے گزری تھی، وہاں شاید بہت سے لوگ بھی کام کر رہے تھے۔ غالباً یہ کوئی بڑی پھلواری تھی۔

ستیش اور گاڑی کا کوچبان مجھے لے کر آگے بڑھے۔ ہم ایک تنگ سے سرنگ نما راستے میں داخل ہوئے۔ یہ سرنگ قدرتی نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں کی بنی ہوئی تھی۔ دیواروں کا پلاستر جھڑ چکا تھا، جا بجا اینٹیں بھی اکھڑی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ جا کر یوں لگا کہ سرنگ ختم ہو گئی ہے۔

یہاں بہت سا جھاڑ جھنکاڑ پڑا تھا۔ سرخ پتھر کی چند ٹوٹی پھوٹی سلیں بھی یہاں پڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سلیں استھان کے کھنڈر کا حصہ ہی ہیں۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ ایسی ہی دو سلوں کے درمیان چھوٹا سا راستہ موجود ہے جسے جھاڑ جھنکاڑ سے چھپا دیا گیا ہے۔ کوچبان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ستیش نے بیگ میں سے ایک ٹارچ نکال کر روشن کر لی۔ دائیں طرف اس سرنگ کی نیم پختہ دیواروں میں کہیں کہیں سوراخ سے تھے جن سے مدھم ہوا اور روشنی اندر آتی تھی۔

مجھے اپنے سامنے لاتعداد سیڑھیوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ یہ سیڑھیاں سرنگ کے پتھریلے فرش کو کھود کر بنائی گئی تھیں۔ ہم آگے بڑھنے لگے۔

''ابھی ہمیں کتنا جانا ہے؟'' میں نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''بس پانچ دس منٹ۔'' ستیش نے جواب دیا۔

اتنے میں سامنے سے بھی ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔ تین بندے نظر آئے۔ انہوں نے قریب پہنچ کر ستیش کو پرنام کیا۔ ستیش نے جواب دیا۔ آنے والے دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کو میں نے پہچان لیا۔ حویلی میں جو دوست ستیش سے ملنے آئے تھے، ان میں یہ بھی شامل تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا اور ہونٹ بہت موٹے تھے۔ یہ چیک دار شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔

ستیش نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں مہندر! کدھر جا رہے ہو؟''

''بس ذرا نالے تک...... ابھی آ جاوت ہیں۔'' اس کے ہاتھ میں ایک جال تھا۔ لگتا تھا کہ شاید یہ افراد کہیں مچھلی وغیرہ پکڑنے جا رہے ہیں۔

''حالات ٹھیک ناہیں...... ذرا خیال رکھنا۔'' ستیش نے تنبیہہ کے انداز میں کہا۔

ستیش اور مہندر کے درمیان دو تین فقروں کا تبادلہ ہوا پھر ہم ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھ گئے۔

کہیں قریب ہی پانی کا شور بھی سنائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ پانی کسی اونچی جگہ سے نشیب میں پتھریلی جگہ پر گر رہا ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے، یہ شور نمایاں ہوتا گیا۔ پھر ایک جگہ ہمیں اس پانی کی جھلک نظر آ گئی۔ یہ پانی کسی نامعلوم سمت سے آ کر ایک چھوٹے آبشار کی صورت میں پتھروں پر گرتا تھا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر ایک تالاب کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ سفید جھاگ اڑاتے اس پانی کے اندر ایک بہت بڑا مجسمہ ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ وہ اوندھی حالت میں تھا۔ اس کی لمبائی تیس چالیس فٹ سے کم نہیں تھی۔ اس کا ایک بازو ندارد

تھا۔ چونکہ وہ اوندھی حالت میں تھا اس لئے صورت نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ ایک بات واضح تھی کہ وہ ہندو دھرم کے کسی دیوی دیوتا کا بت ہے جو استبداد زمانہ کے سبب بلندی سے اس پانی میں گرا ہے اور نا معلوم عرصے سے یہیں پڑا ہوا ہے۔ جس جگہ سے یہ بُت گرا تھا وہ آبشار کے قریب تھی اور مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ہم پتھر میں کھدی ہوئی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آگے نکل گئے۔ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی یہ سرنگ پھر تنگ ہونے لگی۔ اب دائیں دیوار پر نظر آنے والے روزن نما سوراخ بھی نہیں تھے اس لئے قدرے گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ سو ڈیڑھ سو قدم آگے آ کر مجھے ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا۔ میں اس شور کو کوئی واضح معنی نہیں دے سکا، بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ آس پاس کچھ لوگ موجود ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں...... چل پھر رہے ہیں۔ ایک جگہ پہنچ کر کوچبان نے ہاتھ بڑھایا اور ایک زنگ آلود آہنی دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی میں چکرا سا گیا۔ میں جیسے ایک دم ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی سے نکل کر ایک وسیع و عریض اسٹیڈیم میں آ گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا زمین دوز ہال تھا۔ یہاں ستونوں کی دو قطاریں تھیں جنہوں نے بہت بڑی چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور نانک چندی اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ ستون اور ستونوں کے نیچے پتھریلا فرش بھی خستہ حال تھا۔ دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی رنگین شبیہیں دھندلی پڑ چکی تھیں یا یکسر مٹ چکی تھیں۔ چند ایک...... شکستہ مورتیاں بھی نظر آتی تھیں۔ شاید کسی وقت یہ وسیع ہال اس استھان کا ایک اہم حصہ رہا ہو گا لیکن اب یہ ایک کھنڈر تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ یہ کھنڈر بالکل صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ یہاں رہنے والوں نے اسے ایک آباد جگہ کی شکل دے رکھی تھی۔ مجھے ایک ادھیڑ عمر کا فربہ اندام شخص نظر آیا۔ عام ہندوؤں کے برعکس اس کی داڑھی تھی اور سر پر لمبی جٹائیں تھیں۔ وہ پنڈت کے بجائے کوئی سادھو سنت نظر آتا تھا۔ اس کی صورت میں عجیب سی کرختگی تھی۔ اس شخص کے علاوہ یہاں پندرہ بیس جوان لڑکے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ سب ہٹے کٹے اور ورزشی جسموں والے تھے۔ ان میں سے دو چار کے کندھوں پر رائفلیں بھی جھول رہی تھیں۔ ایک طرف سات آٹھ لڑکے اوندھے لیٹے تھے اور ایک شخص سے رائفل چلانے اور نشانہ باندھنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ دیواروں پر کلہاڑیاں، لاٹھیاں اور خنجر وغیرہ آویزاں تھے۔ ایک نظر دیکھنے سے ہی سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ جگہ ایک تربیتی اکھاڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ستیش کو دیکھ کر سب نے اپنی مصروفیات روک دیں اور ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ مجھے خاص دلچسپی سے دیکھا جا رہا تھا۔

ستیش ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ چند نوجوان بھی ان دونوں کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ یقیناً یہ گفتگو میرے بارے میں ہی ہو رہی تھی۔ گاہے بگاہے مجھ پر طائرانہ نظر بھی ڈال لی جاتی تھی۔

میں گاڑی کے کوچبان کے ساتھ ایک ہموار پتھریلے فرش پر کھڑا تھا اور آٹھ دس فٹ نیچے ہال کی گہما گہمی کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے ذہن میں کئی اندیشے کلبلانے لگے۔ یہ کسی تشدد پسند گروہ کا ٹھکانا تھا۔ ایک ایسا ہی ٹھکانا (جو کافی چھوٹا تھا) میں نے نل پانی کی اندرونی آبادی میں بھی دیکھا تھا۔ وہاں فائرنگ میں کپتان اجے کے ہاتھوں سے آنند نامی بندہ ہلاک ہوا تھا اور کئی لڑکے پکڑے گئے تھے۔ اگر ان لڑکوں میں سے کوئی ایک اس جگہ موجود ہوتا تو کیا ہوتا؟ مجھے فوراً پہچان لیا جاتا اور ستیش کو بھی پتا چل جاتا کہ میں گوپال نہیں ہوں...... ایک مُسلا ہوں اور اس سے پہلے آنند جیسے شخص کے قتل میں ملوث رہا ہوں۔

کچھ دیر بعد ستیش میری طرف مڑا اور مجھے لے کر ہال کمرے میں آ گیا۔ یہاں خستہ حال دیواروں میں پرانی لکڑی کے تین چار دروازے موجود تھے۔ ہم ایک دروازے میں داخل ہوئے اور ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر ایک کوٹھڑی نما کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک بستر موجود تھا۔ لکڑی کی ایک الماری اور دو کرسیاں بھی تھیں جن کے آگے تین ٹانگوں والی گول میز رکھی تھی۔ یہاں بھی رادھا، کرشن، لکشمی اور کالی ماتا وغیرہ کی چھوٹی بڑی مورتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑا ترشول پڑا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں ہندو دیو مالا کے کسی قدیم منظر میں داخل ہو گیا ہوں۔

میں نے ستیش سے پوچھا۔ ''مختار راجپوت کی بیٹی یہیں پر ہے؟''

''ہاں...... بہت جلد تم اسے دیکھ سکو گے۔''

''کب تک؟''

''اس کا اصل سے تو مہا گرو ہی بتاویں گے لیکن میرا وچار ہے کہ یہ ملاقات آج رات یا کل شام تک ہو جاوے گی۔''

''یہ مہا گرو کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے ابھی ان کو دیکھا تو ہے۔ وہ داڑھی والے جٹا دھاری، جنہوں نے اپنے چہرے پر بھبوت مل رکھا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ اسی سادھو نما شخص کی بات کر رہا ہے جس نے یہاں آتے ہی ستیش سے سوال جواب کئے تھے۔

میں نے ذرا جھجکتے ہوئے عیش سے کہا۔ ''میں بہت الجھن میں ہوں جی۔ پتا ناہیں کہ آپ اس لڑکی کے ساتھ کیا کرنا چاہت ہیں...... اور اس میں میرا کیا پارٹ ہووے گا؟''

''شاید تم ڈر رہے ہو کہ تمہیں اس اپرادھن کا خون کرنا پڑے گا۔ ایسی کوئی بات ناہیں ہے۔ ماتا جی نے کہا تھا نا کہ تمہیں اپنے ہاتھ سے کچھ ناہیں کرنا۔ اگر کچھ کرنا ہوا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہووے گا کہ تمہیں ایک اگنی جلانا ہووے گی...... بس۔''

''میں چاہت ہوں کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جاوے تا کہ میں واپس جا سکوں۔'' میں نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔

''بالکل ایسا ہی ہووے گا۔ اب تم کچھ کھا پی کر سفر کی تھکاوٹ اتار لو۔ جب سے آوے گا، میں تمہیں خود بلا لوں گا۔''

''نہیں، مجھے کوئی ایسی تھکاوٹ ناہیں اور نہ ہی بھوک ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ عجیب انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''میں تم میں کئی انوکھی چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ اتی سردی میں بھی تم نے عام سے کپڑے پہن رکھے ہیں اور تم سردی کو کچھ زیادہ محسوس بھی ناہیں کر رہے ہو۔ تم باقاعدگی سے بھوجن بھی ناہیں لیتے ہو۔ شاید کبھی کبھی سارا دن فاقے سے بھی گزار دیوت ہو۔ میں نے ایک دن تمہیں ٹھنڈے یخ پانی سے اشنان کرتے دیکھا ہے۔ کسی وقت تو لگت ہے کہ تم نے اپنے شریر کو تکلیف اور دکھ میں رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے......''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات ناہیں۔ بس میرا رہن سہن ہی کچھ اس طرح کا ہے۔''

''ایسا کب سے ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں سمجھا ناہیں عیش صاحب!''

''کسی وقت تو لگتا ہے جیسے تم کوئی چلہ کاٹ رہے ہو۔'' وہ ہولے سے مسکرایا اور خاموش ہو گیا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ میں چلہ ہی کاٹ رہا ہوں۔ ایک ایسا چلہ جو اب شاید میری زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گا۔ مجھے کوئی ایسا ملا تھا جو درد کو میرا اوڑھنا بچھونا بنا گیا تھا۔ وہ مجھے بتا گیا تھا کہ درد کے ساتھ زندہ رہنا کیا ہوتا ہے اور درد کے پانیوں میں ڈوب کر راحت کے موتی کیسے نکالے جاتے ہیں۔ میں اس کی بتائی ہوئی راہ پر چل رہا تھا۔ اس راہ پر کانٹے تھے جو میرے پاؤں میں ٹوٹتے تھے لیکن اب ان کانٹوں کے ٹوٹنے میں ایک مزہ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ میں بدل رہا تھا۔ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔

وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص بڑا سا طشت لے آیا۔ اس میں مٹھائی، خشک میوہ جات اور گرم دودھ وغیرہ تھے۔ موسم اب سرد ہو چلا تھا۔ میں نے تھوڑی سی پیٹ پوجا کی۔ ساتھ ساتھ میں خود کو آنے والے حالات کے لئے تیار کرتا جا رہا تھا...... میں جانتا تھا کہ میں ایک نہایت سنگین صورت حال میں داخل ہو چکا ہوں۔ یہاں سلطانہ راجپوت موجود تھی...... اور وہ میری بیوی تھی۔ وہ بے رحم حالات کی زد میں تھی اور خود بھی بے رحم ہو چکی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک لڑکی جو ایک بچے کی ماں بھی ہے، یکایک زندگی اور زندگی کے سارے تقاضوں سے اتنی دور جا سکتی ہے۔ وہ ذرگاں میں گھسی تھی۔ اس نے پے در پے قتل کئے تھے اور آسیب بن کر لوگوں کے حواس پر چھا گئی تھی۔ صرف چند ہفتوں میں ہی اس کا نام راجواڑے کے ہر باشندے کی زبان پر آ گیا تھا...... خاص طور پر موہن کمار کے قتل کے بعد تو اس کے نام کے حوالے سے تہلکہ مچ گیا تھا...... لیکن وہ حیلے اور سنسنی کا یہ سلسلہ تا دیر برقرار نہیں رکھ سکی تھی۔ بے شک کچھ لوگ توقع کرنے لگے تھے کہ وہ کسی روز کسی آسیب کی طرح جارج گورا یا سرجن اسٹیل وغیرہ کو بھی جا دبوچے گی مگر یہ ہو نہیں پایا تھا۔ موہن کمار کے قتل کے بعد وہ گھیرے میں آ گئی تھی اور اب اپنے نو عمر بھتیجے طلال راجپوت سمیت ان انتہا پسند کٹر ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ وہ اسے اپنے کسی نامعلوم عقیدے کے مطابق قرار واقعی سزا دینے کے لئے بے تاب تھے۔ ایک حیرت ناک اتفاق یہ تھا کہ اس قرار واقعی سزا میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے میں خود بھی گوپال کے روپ میں یہاں موجود تھا۔

میں پچھلے تین چار روز سے یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے سلطانہ کے لئے کیا کرنا ہے؟ اسے کس طرح بچانا ہے؟ کیسے اس کی اور طلال کی زندگی کو محفوظ کرنا ہے اور پھر کسی سلامتی والی جگہ تک رسائی حاصل کرنی ہے؟ لیکن یہ سب کچھ تو تب ہی طے کیا جا سکتا تھا جب مجھے اصل حالات کا علم ہوتا۔ مجھے ابھی تک تاریکی میں رکھا گیا تھا۔ کچھ بھی کھل کر نہیں بتایا گیا تھا اور اب جبکہ ڈراپ سین ہونے میں زیادہ وقت باقی نہیں تھا، میں بدستور اندھیرے میں تھا۔

تو کیا اس اندھیرے کا مطلب یہ تھا کہ میں کچھ نہ کروں گا اور سلطانہ و طلال کو کسی بدترین انجام سے دوچار ہونے دوں گا؟ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ کم از کم آسانی سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں یہاں موجود تھا اور اب ایسا لاچار بھی نہیں تھا کہ بھرپور جنگ وجدل نہ کر سکتا۔ میں اب اپنے اندر مرنے اور مار دینے کی ہمت رکھتا تھا اور اس ہمت کے ساتھ ساتھ میرے اندر کچھ اور بھی موجود تھا۔ یہ جو کچھ بھی تھا، مجھے بارونا جیکی نے دیا تھا...... اس کی باتوں نے، اس کے فن نے، اس کے فلسفے نے۔ وہ راہ عشق کا نیپالی مسافر، وہ صبح کا تارا، وہ ٹمٹماتا ہوا

چراغ...... وہ اپنی بجھتی ہوئی لَو سے میرے سینے میں ایک دیا روشن کر چکا تھا۔ اس دیے کی روشنی دھیرے دھیرے میرے پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ ہاں، ان لوگوں کے لئے اب سلطانہ راجپوت کو مارنا آسان نہیں تھا۔ اگر یہاں سلطانہ کی لاش گرتی تو پھر اور بھی بہت سی لاشیں گرتیں۔

شام کا وقت تھا جب سنکھ بجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر بھجن کی گونج سنائی دینے لگی۔ کچھ دیر بعد میرے کوٹھڑی نما کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی فربہ اندام سادھو اندر آ گیا جسے میں نے باہر کٹہرے میں دیکھا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک دھوتی اور بنیان تھی۔ چہرے پر بھبوت اور گلے میں مالائیں تھیں۔ یہ یہاں کا مہا گرو تھا۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پرنام کیا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کی آگیا دی۔ وہ بولا۔ ''تم خوش قسمت ہو...... تمہیں ایشور نے ایک پوتر کام کے لئے چنا ہے۔ تم نے ضرور پچھلے جنم میں کوئی بڑا پن کیا ہووے گا۔''

میں نے مؤدب انداز میں سر جھکائے رکھا۔

وہ اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا دھرم آشتی اور پریم کا دھرم ہے...... لیکن کبھی کبھی کچھ مورکھ اس آشتی کو تباہ کر دینے پر کمر باندھ لیوت ہیں۔ ایسے میں یہ ممکن ناہیں رہتا کہ آشتی اور پریم کا دامن تھام کر رکھا جاوے۔ پھر کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ لڑکی سلطانہ ہے۔ ناری ذات کمزور ہووت ہے۔ اس کے خلاف کوئی کٹھور فیصلہ کرتے ہوئے دکھ بھی ہووت ہے لیکن اب ہمری مجبوری ہے کہ اسے اس کے کئے کی سزا دیویں اور فوراً دیویں۔ ایسا نہ ہوا تو ہم سب پر سختی آوے گی۔''

''کیا ایسا ہو سکت ہے گرو جی کہ اس لڑکی کو موت کے علاوہ کوئی اور کڑی سزا دے دی جاوے؟''

''ناہیں۔'' گرو نے فوراً اپنا سر نفی میں ہلایا اور اس کی آنکھوں سے نفرت چھلکنے لگی۔ وہ بولا۔ ''یہ لڑکی ابھاگیہ ہے۔ اس سے پے در پے اپرادھ ہوئے ہیں اور ہر اپرادھ ایسا تھا جس پر اسے موت کی سزا دی جا سکت تھی۔ اس کا سب سے پہلا اپرادھ یہ تھا کہ اس نے مقامی رواج کے مطابق حکم جی کی پری بننے سے انکار کیا۔ اس کے باپو نے چالاکی دکھائی اور اس کا بیاہ راتوں رات ایک ایسے مُسلے سے کر دیا جو اپنے ہوش حواس میں ہی ناہیں تھا...... بیاہتا ہونے کی وجہ سے یہ پری بننے سے رہ گئی۔ اس کا دوسرا بڑا دوش یہ تھا کہ اس نے ہاتھا پائی کر کے حکم جی کی چھوٹی پتنی رتنا دیوی کا جبڑا توڑا اور پناہ کے لئے بھاگ کر یہاں چھوٹے سرکار اور مراد

شاہ کے پاس آ گئی۔ اس کی اس حرکت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دھیرے دھیرے حالات خراب تر ہو گئے ہیں اور اب زرگاں اور نل پانی میں یدھ کی نوبت آ گئی ہے۔ اس یدھ میں پتا ناہیں کتنی لاشیں گریں گی۔ اس لڑکی کا آخری اپرادھ تو کسی صورت معافی کے قابل ناہیں ہے۔ اس نے مہاتما پیڑھی کے ایک دھرم اوتار کو بیدردی سے قتل کیا ہے اور ان کا سر کاٹا ہے...... زرگاں کے بڑے پنڈت مہاراج نے اس کے لئے جو سزا تجویز کی ہے، وہ دھرم کا پالن تو کرے گی ہی...... اس اپرادھن کے لئے بھی وہ سزا چھٹکارے کا سبب بنے گی۔ اس کے سارے پاپ اس سزا سے ڈھل جائیں گے۔ اس کی آتما کو شانتی ملے گی......''

''یہ سزا کیا ہے مہا گرو؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ناگ پھنی کی خشک لکڑی سے چتا تیار کی جاوے گی اور اس میں اسے جلایا جاوے گا۔''

''زندہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو گی تو زندہ ہی لیکن اپنے ہوش حواس میں ناہیں ہو گی۔ اسے افیم کا ست پلایا جاوے گا پھر اگنی میں رکھا جاوے گا۔''

میں اندر سے لرز گیا۔ اندھے عقیدے انسان کو کیسے کیسے کاموں پر مجبور کر دیتے ہیں۔ توہم پرستی دھرم کا لبادہ اوڑھ کر کسی آسیب کی طرح انسان سے چمٹتی ہے اور اسے کائنات کی سب سے ناقص العقل شے بنا دیتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''مہا گرو! اس سارے عمل میں میرا کردار کیا ہووے گا؟''

''وہی جو بڑے پنڈت مہاراج نے تمہارے لئے چنا ہے۔ چاند کی چوتھی رات کو تم کالی کے مندر میں داخل ہوئے اور وہ پہلے منش بنے جو رام پرشاد کے پریوار کے ساتھ پوجا کے لئے بیٹھا۔ تم اب اگارش بنو گے۔''

''یہ اگارش کیا ہووت ہے مہا گرو؟''

''جو کسی بُری آتما کو پاپوں سے چھٹکارا دلانے کے لئے اس کی مدد کرت ہے۔ تم سلطانہ کی چتا کو اگنی دکھاؤ گے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں سلطانہ کو زندہ جلایا جانے والا تھا۔ یہ کام ایک خاص شخص کے ہاتھوں ہونا ضروری تھا...... اور پتا نہیں کیسے وہ خاص آدمی میں بن گیا تھا۔ جب کالی کے مندر کے پاس بھرے بازار میں اجے کے حوالدار کی نظر سے بچنے کے لئے میں مندر میں گھسا تھا، مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ میرا یہ اقدام مجھے لے کر کس راستے پر چل نکلے گا۔

مہا گرو نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پرنتو! کیا تم اس کام کے لئے تیار ناہیں ہو؟"

"اگر یہ بڑے پنڈت مہاراج کا حکم ہے تو پھر انکار کی کوئی گنجائش ہی ناہیں ہے گرو جی لیکن......"

"لیکن......کیا؟" گرو نے پوچھا۔

"میں سلطانہ کے بھتیجے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ اس کا کیا کیا جاوے گا؟"

"وہ ابھی یہاں ہمرے پاس ہی رہے گا۔ اس کے بارے میں پنڈت مہاراج بعد میں فیصلہ کریں گے۔"

میرے اور مہا گرو کے درمیان چند منٹ مزید بات چیت ہوئی پھر وہ مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر واپس چلا گیا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چلنے لگی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہاں ایسی سنگ دلی کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو زندہ جلانے کی بات کرنا اور چیز ہے لیکن سچ مچ ایک جیتے جاگتے سانس لیتے وجود کو رسیوں سے باندھ کر آگ میں بھسم کر دینا اور بات۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس زمین دوز ہال میں اور اس سے ملحقہ کوٹھڑیوں اور راہداریوں میں کم و بیش ایک سو افراد موجود ہیں۔ مجھے ابھی تک ان میں کوئی عورت نظر نہیں آئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر کی عمریں بیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ یہ اپنے چہروں مہروں سے ہی شدت پسند لوگ نظر آتے تھے۔ ان میں سے کچھ نے اپنے چہروں پر بھبوت مل رکھا تھا اور گیروا کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں کا کرتا دھرتا تو ایک جگ جیت نامی شخص تھا جو مجھے ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا تاہم ستیش کو بھی یہاں ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔

میں سلطانہ اور طلال کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک ڈر بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہچان لیتے۔ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی یہ پہچان ظاہر بھی کر دیتا۔ ایسی صورت میں میرا بھانڈا فوراً پھوٹ جاتا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک شخص نے دروازہ کھولا اور کمرے میں اندر آ گیا۔ یہ ستیش کے دوستوں میں سے ایک تھا۔ یہ بھدی آواز والا وہی شخص تھا جو ذرا لنگڑا کر چلتا تھا اور جسے میں حویلی میں بھی دیکھ چکا تھا۔

عیار آنکھوں والا یہ شخص بڑی جلدی بے تکلف ہو جانے والوں میں سے تھا۔ اس نے سب سے پہلی اطلاع تو مجھے یہ دی کہ مختار راجپوت کی اپرادھن بیٹی کو پنڈت مہاراج کے حکم کے مطابق موت کے گھاٹ اتارنے کا عمل آج نہیں ہوگا اس میں تھوڑی سی تاخیر ہے۔

اس کی یہ اطلاع میرے لئے سکون کا باعث بنی۔ تاہم ابھی مجھے اس اطلاع پر پوری طرح یقین نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ستیش یا مہا گرو مجھے خود آ کر بتائیں مگر ستیش نہ جانے کن مصروفیات میں الجھا ہوا تھا۔ آدھ پون گھنٹے کی بات چیت میں بھدی آواز والا یہ ارجن نامی شخص مجھ سے مزید بے تکلیف ہو گیا۔ وہ انتہا پسندی کی ہر تعریف پر پورا اُترتا تھا۔ مسلمانوں کے لئے اس میں کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہوا تھا، خاص طور سے مراد شاہ اور ان کے حواریوں کے لئے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ چھوٹے سرکار کو اپنا دھرم تبدیل کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اور دھیرے دھیرے تل پانی کی راج گدی پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے منہ سے جیسے چنگاریاں چھوٹتی تھیں۔

وہ بولا۔ "ہم نے بہت سہہ لیا ہے۔ اب ہم اینٹ کا جواب پتھر سے بلکہ گولی سے دیویں گے۔ اپنے ایک بالک کے بدلے میں ان کے دس بالکوں کی ہتھیا کریں گے۔ اپنی ایک عورت کے بدلے میں ان کی دس عورتوں سے بلادکار کریں گے۔ اب ہمارے ہاتھ کوئی ناہیں روک سکتا۔ اب ہمیں چپ ناہیں رہنا چاہئے۔ ہم میں سے کسی کو بھی چپ ناہیں رہنا چاہئے۔ میں تو تم کو بھی مشورہ دوں گا گوپال......اب کنارے پر رہنے کا ناہیں، طوفان میں کودنے کا وقت ہے۔ جو کنارے سے تماشا دیکھیں گے، وہ پاپ کریں گے۔ تم بھی اپنے آپ کو کسی جتھے میں شامل کر لو۔ ضروری ناہیں کہ یہ ہمارا ہی جتھا ہو۔ بھگوان کی کرپا سے اب اور بھی بہت سے لوگن یہ کام کر رہے ہیں......" وہ جوش کے عالم میں بولتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ارجن نے گفتگو کا رخ ایک اور جانب موڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت چمکنے لگی اور مسکراتے لہجے میں زہر سرایت کر گیا۔ اس نے مجھے ایک اور مسلمان لڑکی کے بارے میں بتایا جو یہاں موجود تھی اور جسے اس کے کرموں کی قرار واقعی سزا مل رہی تھی۔ میں یہ سن کر لرز گیا کہ اس بے بس لڑکی کو یہاں موجود انتہا پسند ڈشکرے کئی روز سے زیادتی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔

ارجن نے ایک آنکھ میچ کر بڑے رازدارانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ "اگر چاہو تو تم بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو سکت ہو۔"

"میں سمجھا ناہیں۔"

وہ اسی لہجے میں بولا۔ "سیانے کہتے ہیں جو چیز بے کار جا رہی ہو، اسے بے کار جانے سے پہلے استعمال کر لینا چاہئے۔ اس چھوکری کو بھی ایک دو دن میں کت (ختم) ہو جانا ہے تو پھر کیوں نہ یہ کسی کے کام آ جاوے۔"

"تمہارا...... مطلب...... بلادکار سے ہے؟"

"بلادکار نا ہیں...... انصاف...... انصاف...... نیائے......" ارجن کے لہجے میں پھر بے پناہ زہر اُتر آیا۔ "اس حرامزادی کے بھائی نے ایک برہمن لڑکی کے ساتھ زیادتی کی...... بیاہ کا جھانسا دے کر اسے اغوا کیا۔ کئی روز تک ایک کرائے کے مکان میں بند رکھا۔ خود اس کے ساتھ سوتا رہا، اپنے دوستوں کو بھی سلاتا رہا۔ اس "پن کام" میں اس حرامزادے کی بہن بھی پوری طرح شریک تھی۔ وچولی بنی ہوئی تھی...... ملاقاتیں کراتی تھی۔"

میں حیرت کے عالم میں سنتا رہا۔ "اب کہاں ہے وہ لڑکا؟" میں نے پوچھا۔

"بھاگ گیا کتا، احمد آباد کی طرف...... لیکن ہمارے بندے پیچھے ہیں۔ ایک نہ ایک روز دھر لیں گے اسے۔"

"اور یہ لڑکی وہی ہے اس کی بہن...... ملاقاتیں کرانے والی؟" میں نے استفسار کیا۔

"نا ہیں، یہ وہ نا ہیں۔ اس بدذات کو تو ہمرے جتھے کے جوانوں نے وہیں مار ڈالا تھا، اس کے گھر میں۔ مار مار بھرتا بنا دیا تھا اس حرامزادی کے تو بڑے کا۔ یہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ زندہ ہاتھ آ گئی تھی گھر کے پچھلے کمرے سے۔ وہاں ایک بڑے جستی صندوق میں چھپ گئی تھی۔"

میری نگاہوں میں اس لاش کا منظر گھوم گیا جو چند دن پہلے ہم نے شہر کے ایک اندرونی محلے میں دیکھی تھی۔ تھانے دار محمود اور کپتان اجے وغیرہ کو شک ہوا تھا کہ یہ شاید سلطانہ کی لاش ہے۔ مجھے لاش کا مسخ چہرہ یاد آیا اور جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ ارجن نامی غنڈا اسی بدقسمت لڑکی کا ذکر کر رہا ہے......

اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھاما اور ایک آنکھ میچ کر بولا۔ "میں رات کو دس گیارہ بجے کے قریب آؤں گا۔ ستیش بابو سے ان باتوں کا ذکر نا ہیں کرنا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ابن آدم جب پستی میں گرتا ہے تو کہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض لوگ انتہا پسندی کو مسلمانوں کے ساتھ منسوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ تو ہم پرستی کے خمیر سے جنم لینے والے انتہا پسند ہر مذہب، ہر قوم میں پائے جاتے ہیں...... اس کی ایک ناقابل تردید کربناک مثال میرے سامنے تھی۔ میں کچھ ایسے لوگوں کے درمیان تھا جو انتہا پسندوں سے بھی آگے کی شے نظر آ رہے تھے۔ وہ بداخلاقی اور سفاکی کی ہر حد سے گزرے ہوئے تھے۔

مقررہ وقت پر ارجن میرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس نے کسی شے کا نشہ بھی کیا ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تاڑی تھی۔ وہ ایک راہداری سے گزار کر مجھے ایک نسبتاً بڑے کمرے میں لے آیا۔ یہاں سات آٹھ بندے موجود تھے۔ کچھ تاش کھیل رہے تھے، کچھ لحافوں میں لیٹے سگریٹ پھونک رہے تھے اور گپ شپ کر رہے تھے۔ ان سب نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور چپکے چپکے مسکرائے بھی۔

شیشے کی ایک لمبی بوتل تاڑی سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ارجن نے مجھے پینے کی پیشکش کی لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔

ہم گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ ارجن کوشش کر رہا تھا کہ میں باقی افراد سے بھی بے تکلف ہو جاؤں۔ وہ سب صورتوں سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ کئی ایک کے چہرے پر نئے و پرانے زخموں کے نشان موجود تھے۔ وہ مراد شاہ کے بارے میں اور اس کے ایک ہم زُلف کے بارے میں نہایت نازیبا گفتگو کر رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ننگی گالیاں ہی بک رہے تھے۔ ساتھ ساتھ بینگن کے پکوڑے کھائے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس کمرے کا ایک بغلی دروازہ کھلا اور ایک لمبا تڑنگا شخص تاڑی کے نشے میں ڈولتا اور اپنی قمیص درست کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ گنگنا رہا تھا...... رام تیری گنگا میلی ہو گئی...... ہو رام تیری گنگا میلی ہو گئی......

اس نے دو تین پکوڑے کھائے اور پھر دھپ سے ایک چارپائی پر گر گیا۔ ارجن نے چند لمحے تک مجھے غور سے دیکھا پھر ایک آنکھ بھینچی اور مجھے ادھ کھلے دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں اس صورت حال کو اب کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اپنے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ سجائی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

ارجن نے مسرور لہجے میں کہا۔ "بجرنگ بلی کی جے...... ببر شیر لگے ہو بھئی۔" میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ "کچھ اور نا ہیں تو یہی لے جاؤ۔"

میں نے پیکٹ ہوا میں دبوچ لیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر لالٹین کی مدھم سی زرد روشنی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ ایک پلنگ پر بوسیدہ سے لحاف کے نیچے مجھے بے بسی کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر آئی۔ یہ ایک بیس بائیس سال کی لڑکی تھی۔ اس کے روکھے پھیکے بال منتشر اور چہرہ لالٹین کی روشنی ہی کی طرح زرد اور بیمار تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں چپ چپی ہو

چکی تھیں اور ہونٹ خشک ہو کر سیاہی مائل ہو چکے تھے۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح اپنے اردگرد سے لاتعلق پڑی تھی۔ رخسار پر ایک دو مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

اس نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا مگر چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ شرم نہ خوف، نہ غصہ نہ بیزاری۔ وہ بس اسی طرح پھول دار لحاف کے نیچے بے لباس پڑی رہی۔ روندی مسلی ہوئی، کچلی ہوئی اجاڑی ہوئی۔ وہ جیسے صدیوں سے ایسے ہی پڑی تھی۔ آدم کے بیٹوں سے پوچھ رہی تھی۔ میں کائنات کا حسن ہوں۔ میں نازک ترین جذبوں کی کہکشاں ہوں۔ میں محبت کی خوشبو اور زندگی کی روح ہوں۔ میرے بے لوث جذبوں نے زندگی کو زندگی بنایا ہے۔ تو پھر...... میں زندگی کو زندگی بنانے والی...... زندگی سے اس قدر دور کیوں کر دی جاتی ہوں؟ کیوں مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے؟ کیوں ہر ظلم و ستم کا رخ کسی نہ کسی طور میری طرف موڑ دیا جاتا ہے؟ مجھے کچل مسل کر ناقابلِ شناخت بنا دیا جاتا ہے؟ جیسے میں اب تمہارے سامنے پڑی ہوں۔ شاید تم بھول رہے ہو، میرے گرم ہونٹوں پر گلاب کھلا کرتے ہیں۔ میرے دل آویز جسم میں خوشبودار محبت کے چشمے بہا کرتے ہیں۔ میری بانہوں میں سما کر تم مرد و زن کی محبت کا ناقابلِ فراموش لمس حاصل کر سکتے تھے...... لیکن اب تم کیا حاصل کرو گے؟ کچھ بھی نہیں۔ مجھے پانے سے پہلے ہی تم مجھے کھو چکے ہو۔ تم ایک سرد باسی گوشت پر جھپٹے مارو گے۔ بالآخر تمہارے حصے میں کراہت، ندامت اور پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔ کچھ بھی نہیں۔

میں لحاف کے نیچے پڑی اس لڑکی کی خاموش آواز سنتا رہا۔ یہ آواز میرے رگ و پے میں سماتی رہی۔ وہ جو کہہ رہی تھی، ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں ہولے سے اس کے قریب کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ قدرے حیران ہوئی۔ اسے جیسے توقع نہیں تھی کہ میں بستر کے بجائے کرسی کی طرف بڑھوں گا۔ کئی سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ وہ میری طرف اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہر سلوک کے لئے تیار تھی لیکن اس سلوک کے لئے تیار نہیں تھی جو میں اس کے ساتھ کر رہا تھا۔ میں نے لحاف کا کونا اوپر کی طرف کھینچا اور لڑکی کا عریاں کندھا اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے لباس پہننے کا کہوں لیکن میرے ایسا کرنے سے ارجن اور اس کے ساتھی چونک سکتے تھے...... اور مجھے اپنا بہروپ برقرار رکھنا تھا۔

میں نے اس کے بوسیدہ بالوں کی لٹیں اس کے چہرے سے ہٹائیں اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ ہلکے سے بخار میں تھی۔ میرا نرم رویہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ میں نے ہولے سے پوچھا۔ ''کب سے ہو یہاں؟''

''کچھ یاد ناہیں۔'' وہ سسکی۔

''کیا واقعی تمہارے بھائی نے کسی لڑکی کو اُٹھایا تھا...... اور اپنے پاس رکھا تھا؟''

''میں...... اس بارے میں کچھ ناہیں کہنا چاہتی...... اور یہ سب کچھ بتانے سے...... کچھ حاصل بھی ناہیں ہے...... ہونا وہی ہے جو پہلے ہوتا آیا ہے۔ تم بھی وہی کرو گے اور چلے جاؤ گے۔'' اس نے بیزاری سے اپنا منہ پھیر لیا۔

''ناہیں...... میں وہ ناہیں کروں گا جو ہوتا آیا ہے...... میں تمہیں سوگند دیتا ہوں۔''

اس نے ایک بار پھر مجھے غیر یقینی نظروں سے دیکھا۔

میں اس کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اسی طرح پھول دار لحاف میں سمٹی پڑی رہی، میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ اس کا بھائی بے قصور تھا۔ وہ برہمن لڑکی خود ہی اس کے بھائی کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ وہ ہر صورت اس سے بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ جب کوئی راستہ باقی نہ رہا تو وہ دونوں گھر چھوڑ گئے۔ بعد میں انہیں پکڑ لیا گیا اور اس کے بھائی پر بے شمار جھوٹے الزامات لگا دیئے گئے۔ اس کی بڑی بہن کو اس الزام میں مار دیا گیا کہ وہ اس برہمن لڑکی کی ملاقاتیں بھائی سے کرواتی تھی۔ وہ لوگ اسے اُٹھا کر یہاں لے آئے اور اب وہ آٹھ دس دن سے یہیں پر بند تھی۔ اس کا نام شکیلہ تھا۔

یہاں سے اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا۔ وہ بدمست خطرناک غنڈوں کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی اور چند ہی دنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں سے زندہ نہیں نکل سکے گی۔ اتنی ہمت اس میں نہیں تھی کہ خودکشی کر سکتی ورنہ کب کا موت کو گلے لگا چکی ہوتی۔

کمرے کے ایک کونے میں اس کا لباس بکھرا پڑا تھا۔ طاق دان میں لالٹین کے ساتھ کھانسی اور بخار وغیرہ کی دوا رکھی تھی۔ یہیں پر ایک کونے میں، میں نے ایک بیلچہ پڑا دیکھا اس کے دستے پر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے...... اور کسی دیوی غالباً کالی ماتا کی شبیہہ کھدی ہوئی تھی۔ بیلچے کے پھل کا رنگ گہرا سیاہ تھا اور زرد لالٹین کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے بیلچے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کالی ماتا کا بیلچہ ہے۔'' وہ نحیف آواز میں بولی۔

''کالی ماتا کا بیلچہ؟ یہ یہاں کیوں رکھا ہے؟''

''میں اس سے مٹی کھودتی ہوں۔'' وہ منمنائی۔ ''وہ کہوت ہیں کہ میں تلسی کے پودے کے نیچے سے مٹی کھودوں گی تو مجھے وہاں سے شیوا جی کے نام کی مہر ملے گی اور اگر چار دن کے

اندر مجھے یہ مہر مل گئی تو پھر وہ مجھے چھوڑ دیویں گے...... لیکن...... میں اب جینا ناہیں چاہتی۔ تم لوگن مجھے مار ہی دو تو اچھا ہے۔" وہ واقعی زندگی سے بیزار نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موت کا خوف تو تھا مگر زندگی کا خوف شاید اس سے زیادہ تھا۔

اس نے اپنے آنسو صاف کرنے کے لئے اپنا ہاتھ لحاف سے باہر نکالا تو مجھے اس کی ہتھیلی پر چھالے نظر آئے۔ اس کے بتائے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ یہ چھالے بیلچہ چلانے کی وجہ سے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "شکیلہ! اگر تم زندگی سے اتنی ہی بیزار ہو چکی ہو تو پھر ان لوگن کے کہنے پر بیلچہ کیوں چلاوت ہو؟"

"یہاں کچھ بھی میری مرضی سے ناہیں ہوتا۔" وہ سسکی۔ "کل میں نے مٹی کھودنے سے انکار کیا تھا، میری قمیص پھاڑ دی گئی اور مجھے مارا گیا۔"

میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک طرف ایک الماری پر تہ شدہ جائے نماز رکھی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کس کی جائے نماز ہے؟"

"میری...... میں اس پر نماز پڑھت ہوں۔"

"کیا یہ لوگن تمہیں پڑھنے دیوت ہیں؟"

"ہاں، ان کو اعتراض ناہیں۔ رات ہونے سے پہلے میں جو کچھ چاہوں کر سکت ہوں۔" وہ دردناک لہجے میں بولی۔

میں اس صورتِ حال پر ششدر تھا۔ شیوا جی کی مہر والی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کیا یہ سب کچھ بھی کسی کنڈلی کی وجہ سے کیا جا رہا تھا؟

میں نے اس شکیلہ نامی بدحال لڑکی سے سلطانہ کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ اسے اس بارے میں کچھ پتا نہیں کیونکہ اسے بہت کم اس کمرے سے باہر نکلنے دیا جاتا ہے۔ ہاں دو دن پہلے رات کے وقت بجرنگ بلی اور ہنومان کی جے کے زوردار نعرے سنائی دیئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان لوگوں کو کوئی بڑی کامیابی ملی ہے۔ اس وقت اس نے گرو جی کی دھرم پتنی رادھا جی کو ایک ملازم سے باتیں کرتے سنا تھا۔ ملازم گرو کی پتنی کو بتا رہا تھا کہ کسی لڑکی کو رسیوں سے باندھ کر یہاں لایا گیا ہے۔ وہ دیوی دیوتاؤں کو بُرے ناموں سے پکار رہی ہے اس لئے اس کے منہ میں مٹی بھر کر اوپر سے کپڑا باندھ دیا گیا ہے۔

"کیا کوئی لڑکا بھی اس کے ساتھ یہاں آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"شاید کسی لڑکے کی بات بھی ہو رہی تھی۔" شکیلہ نے تصدیق کی۔

میں قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک شکیلہ کے پاس رہا۔ اس دوران میں، میں نے دو تین سگریٹ

بھی پھونکے۔ میں شکیلہ سے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ میں اس کی مدد کرنے کی اپنی سی کوشش کروں گا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے اس موضوع سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ وہ جانتی ہے کہ وہ بچ نہیں سکتی اس لئے مرنے کے لئے تیار ہے۔ شاید وہ اپنے طور پر مزاحمت کا حق ادا کر چکی تھی اور اب اس نے خود کو کلی طور پر بدترین حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اس سے رخصت ہو کر باہر آ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا۔

میں اپنے سینے پر ایک بہت بڑا بوجھ لے کر اس کمرے سے نکلا۔ ارجن اور اس کے ساتھیوں نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے باہر آتے ہی ارجن کے ایک اور ساتھی نے اپنی مونچھوں کو سہلایا اور لڑکی والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

میں بستر پر لیٹا رہا۔ میرے اندر آگ سی روشن تھی۔ جی چاہ رہا تھا، اس کڑاکے کی سردی میں تیز بارش ہو۔ میں برہنہ جسم کسی منجمد جھیل کے کنارے، سرد ہواؤں کو چیرتا ہوا بھاگتا چلا جاؤں۔ میرا سینہ اتنا ہانپ جائے کہ پھٹنے لگے، میرے پاؤں خون اگلنے لگیں۔ پھر میرے سامنے میرا کوئی بپھرا ہوا دشمن آ جائے۔ اس کی آنکھوں میں قاتل سرخی ہو۔ وہ پوری وحشت سے مجھ پر جھپٹے اور میں پوری وحشت سے اس پر ٹوٹ پڑوں۔

میری سانس تیزی سے چلنے لگی۔ رگ پٹھے تن گئے۔ میں اُٹھ کر اس مختصر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔ باہر ہال کمرے میں شور تھا۔ لگتا تھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور ہلا گلا کر رہے ہیں۔ میں نے ایک میز پر چڑھ کر ایک روزن میں سے ہال کمرے میں جھانکا۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ ایک طرف فرش پر لمبی چٹائی بچھی تھی۔ اس پر تین چار افراد بیٹھے کچھ گھوٹ رہے تھے۔ لکڑی کے رنگین ڈنڈوں پر گھنگھرو چڑھے ہوئے تھے۔ پیالوں میں بھر بھر کر کچھ پیا بھی جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں بھنگ کا دور چل رہا ہے۔ ایک ہٹا کٹا شخص جس نے چہرے پر بھبوت ملا ہوا تھا، ہونٹوں پر سرخی اور آنکھوں میں گہرا سرمہ لگایا ہوا تھا، مجمعے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین نوک والا نیزہ تھا جسے ترشول کہا جاتا ہے۔ وہ شیو جی کے نام کے نعرے لگا رہا تھا اور کچھ افراد اس کے گرد رقص کر رہے تھے۔ دفعتاً میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور میری تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اردگرد کی ہر شے گردش میں آ گئی ہے اور میں زمین سے اُٹھ کر فضائے بسیط میں معلق ہو گیا

ہوں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پھر غور سے دیکھا۔ جو کچھ نظر آ رہا تھا، وہ تصور یا تخیل نہیں تھا...... ایک جیتا جاگتا منظر تھا...... مجھے عمران دکھائی دیا۔ ہال کی دھواں دھواں فضا میں چہروں کے ہجوم میں، میں نے اس کا روشن چہرہ صاف اور واضح دیکھا۔ اس کے گلے میں ایک گلابی رومال تھا، وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ بس ایک یا دو سیکنڈ کے لئے۔ پھر ایکا ایکی وہ چہروں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

''عمران...... عمران!'' میں پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلایا۔

تب میں جست لگا کر میز سے اُترا۔ ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھولا اور راہداری میں آ گیا۔ اندھا دھند بھاگتا ہوا میں ہال کمرے میں دھواں دھواں فضا میں پہنچا اور اس مقام کی طرف لپکا جہاں میں نے اس کی جھلک دیکھی تھی۔ وہاں خاکستری رنگ کے گول ستون کے پاس وہ موجود نہیں تھا۔ ''عمران...... عمران......!'' میں ایک بار پھر چلایا۔

کئی لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں دیوانوں کی طرح چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا۔ تب مجھے پتھریلی سیڑھیوں کے پاس جہاں ہاتھی کا ایک شکستہ مجسمہ موجود تھا، پھر گلابی رومال کی جھلک نظر آئی۔ میں لوگوں کو چیرتا اور مختلف اشیاء سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھا۔ تاہم میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے گلابی رومال اوجھل ہو چکا تھا۔

''کیا بات ہے...... کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟'' ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں ہر آواز کو نظرانداز کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ دونوں طرف طویل برآمدے تھے اور شکستہ ستونوں کی قطاریں تھیں۔ یہاں بہت سی کوٹھڑیاں بھی موجود تھیں۔ میں دیوانوں کی طرح مختلف کوٹھڑیوں میں جھانکتا رہا...... لیکن کچھ نہیں ملا۔

میں وہاں ایک سیڑھی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کیا میری نظر دھوکا کھا رہی تھی؟ کیا میرا تصور مجھے فریب دے رہا تھا؟ اس کا تصور اکثر و بیشتر میرے حواس پر چھا جاتا تھا اور میں اسے اپنے بہت قریب محسوس کرتا تھا۔ کیا یہ تصور اب اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ تصور اور حقیقت میں تمیز مشکل ہو گئی تھی......؟

''کیا ہوا گوپال؟'' ستیش کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں چونک گیا۔

ستیش میرے سر پر کھڑا تھا۔ چند دیگر افراد آٹھ دس قدم دور کھڑے قدرے تعجب سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''کیا کسی جان پہچان والے کو دیکھا ہے تم نے؟'' ستیش نے پوچھا۔

''ہاں...... نن...... ناہیں۔ بس مجھے شک سا ہوا تھا۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

''کون تھا؟''

''بس...... تھا ایک پرانا دوست لیکن...... وہ یہاں کیسے ہو سکتا ہے؟ وہم ہی ہوا ہے۔''

کچھ دیر بعد میں اس ہنگامے سے نکل کر پھر اپنے کمرے میں تھا۔ جسم میں سنسناہٹ تھی اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو شدت سے چاہا جاتا ہے، وہ جدائی کے بعد بھی ہیولوں کی صورت میں ہمارے اردگرد موجود رہتے ہیں۔ ہمیں چہروں میں ان کی جھلک نظر آتی ہے اور آوازوں پر ان کی آواز کا شبہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے باروندا جیکی کی مثال میرے سامنے تھی۔ میں نے اس کے چہرے میں عمران کی جھلک ڈھونڈ لی تھی...... حالانکہ یہ جھلک کچھ ایسی نمایاں بھی نہیں تھی۔

تو کیا اب مجھے کسی اور چہرے میں اپنے بچھڑے یار کی صورت دکھائی دی تھی؟ میں سوچتا رہا اور سر میں ٹیسیں سی اُٹھنے لگیں۔ نہ جانے میں کب تک اس عجیب ذہنی کیفیت میں رہا۔ ہال کمرے سے دھیما شور اب بھی ابھر رہا تھا۔ میں اس شور کو سنتے سنتے سو گیا۔

O......❖......O

اگلے روز شام تک بے چینی کی کیفیت رہی۔ اس بے چینی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ جھلک جو میں نے کل رات دھواں دھواں ہال کمرے میں دیکھی تھی۔ یہ میرا تصور ہرگز نہیں تھا اور اگر یہ چہروں کی مشابہت تھی تو بھی حیرت انگیز تھی۔ پریشانی کی دوسری وجہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تھے جو میں نے کل شب لٹی پٹی شکیلہ کے ساتھ گزارے تھے۔ اس کھنڈر میں رائفلوں کے سائے تلے اور بارود کے گھیرے میں وہ بے بسی کی تصویر بن چکی تھی۔ اگر میں سلطانہ کے لئے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو پھر ضروری تھا کہ شکیلہ کے لئے بھی ایسا ہی ارادہ رکھوں۔

میری مہمان نوازی کا پورا پورا خیال رکھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ کٹر ہندو ہونے کے باوجود ارجن نے مجھے چپکے چپکے یہ آفر بھی کر دی کہ اگر میں ماس یعنی گوشت کھانا چاہوں تو وہ بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ سہ پہر کے وقت مجھے راہداری میں گرو جی کی پتنی کی ایک جھلک بھی نظر آئی۔ وہ گرو سے خاصی کم عمر تھی اور خوب صورت بھی تھی...... اس کی مانگ میں سیندور تھا اور وہ نہایت چمکیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ دو داسیاں مؤدب انداز میں اس کے اردگرد موجود تھیں۔ تاہم مجھے گرو کی یہ جواں سال دھرم پتنی کچھ بجھی بجھی سی نظر آئی۔

شام کے فوراً بعد ہال کمرے میں ہلچل سی محسوس ہونے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ آج رات یہاں کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ بھجن مسلسل پڑھے جا رہے تھے۔ گاہے بگاہے سنکھ کی

آواز سنائی دیتی تھی اور پھر ایک نقارہ سا پیٹا جانے لگا تھا۔ لگتا تھا کہ ہال کمرے میں ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ میں ایک بار پھر روزن میں سے دیکھنا چاہتا تھا مگر میں نے جو تپائی روزن تک پہنچنے کے لئے استعمال کی تھی، وہ کسی ضرورت کے تحت باہر لے جائی جا چکی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا...... چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ سلطانہ سے عنقریب میری ملاقات ہونے والی ہے اور نہایت سنگین حالات میں ہونے والی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے فضا میں تھوڑی سی حدت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

رات نو بجے کا وقت ہوگا جب شور وغل میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ نقارہ اور زور سے پیٹا جانے لگا اور اس کی آواز سے در و دیوار گونجنے لگے۔ اچانک دروازہ کھلا اور مجھے ستیش کی صورت نظر آئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں چنگاریاں تھیں۔ اندر آتے ساتھ ہی اس نے میرے گلے میں جھولنے والی نیلگوں پتھروں کی مالا کا معائنہ کیا اور مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس کے بعد میرے سر میں وہی عجیب خوشبو والا تیل ڈالا گیا جو حویلی میں ڈالا گیا تھا۔

ستیش اور اس کے ساتھی مجھے لے کر راہداری میں آئے تو ہال کمرے کا شور وغل زیادہ واضح سنائی دینے لگا۔ چند ہی سیکنڈ بعد میں وسیع و عریض ہال میں تھا۔ ہال کے ایک گوشے میں ایک اور چھوٹا ہال نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے میری نظر اس پر نہیں پڑی تھی یا شاید کسی بڑے پردے کے ذریعے سے اس چھوٹے ہال یا چیمبر کو چھپایا گیا تھا۔ اس گول ہال کا فرش بڑے ہال کے فرش سے قدرے نیچا تھا۔ گنبد نما چھت میں ایک بڑا سوراخ چمنی کی طرح موجود تھا۔ میں نے اس گول ہال یا چیمبر کا منظر دیکھا اور خون میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ یہاں ایک بڑی چتا تیار تھی۔ شاید یہ ناگ پھنی کی لکڑی ہی تھی۔ قریب ہی بڑے بڑے دو روغنی مٹکوں میں چتا کا تیل رکھا تھا۔ چتا کے قرب و جوار کو زرد پھولوں اور چمکیلے کاغذوں کی مدد سے سجایا گیا تھا۔ چتا کے اندر لکڑی کے مستطیل تختے پر جو لڑکی بے سدھ پڑی تھی، وہ سلطانہ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ وہ نیم بے ہوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر ایک سرخی مائل چادر تھی جس کے نیچے سے اس کے جسمانی نشیب و فراز دکھائی دیتے تھے۔ اس کے بالوں کو ایک طرف سمیٹ کر کنپٹی کے قریب جُوڑا سا باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ سانس لے رہی ہے۔ اس کی رگوں میں زندگی رواں ہے...... لیکن اس زندگی کو بھڑکتے شعلوں میں بھسم کرنے کی پوری تیاری کی جا چکی تھی۔

وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ملیح چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ یہ نشان ان سختیوں کو ظاہر کر رہے تھے۔ جو پچھلے چند دنوں میں اس نے جھیلی تھیں۔

پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر پہلی بار میرے سینے میں عجیب سی ٹیسیں اُٹھیں۔ میں نے خود کو اس کے بہت قریب محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ وہ میرے جسم کا حصہ ہے۔ میری زندگی کا ایک جز ہے۔ میں نے اس لمحے میں ان سارے احسانات کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کیا جو وہ ایک بیوی کی حیثیت سے مجھ پر کرتی رہی تھی...... اور ان ساری قربانیوں کا بوجھ بھی جو وہ میری بے خبری میں میرے لئے دیتی رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ دیوانہ وار پگوڈا کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھسی تھی اور اپنی جان پر کھیل کر مجھے باہر لائی تھی اور پھر اس کے بعد میری سلامتی کے لئے اس کی جدوجہد کا طویل دور شروع ہوا تھا۔ آج وہ خود شعلوں کی زد میں تھی۔ میں تو پھر بھی پگوڈا میں اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا، وہ تو آج ہوش و خرد سے بیگانہ بالکل لاچار پڑی تھی۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لئے عجیب سی چاہت محسوس کی۔

چتا کے اردگرد برپا شور وغل عروج پر پہنچ گیا۔ بہت سے جوشیلے نوجوانوں کے ہاتھ میں ترشول تھے۔ ان میں سے کچھ نے بھبوت رما رکھا تھا یا اپنے چہروں پر رنگوں سے مختلف نقش و نگار بنائے ہوئے تھے۔ ان کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ایک خاص رسم کی ادائیگی کے لئے بالکل تیار ہیں......

چتا کے بالکل سامنے لکڑی کی ایک اونچی چوکی پر مہا گرو فقط ایک دھوتی پہنے، آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ وہ تیزی سے مالا جپ رہا تھا اور گاہے بگاہے اشلوک بھی پڑھتا تھا۔ ایک بوڑھا پجاری آگے بڑھا اور اس نے میرے ہاتھ میں ایک مشعل نما چیز تھما دی۔ میرے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی...... تو بدترین لمحے پہنچ گئے؟ صاف پتا چل رہا تھا کہ اگلے ایک دو منٹ میں چتا پر تیل انڈیلا جانے والا ہے اور اس منحوس لکڑی کو روشن کیا جانے والا ہے تاکہ میں چتا کو آگ دکھانے کا اعزاز حاصل کر سکوں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ میرے سامنے بس ایک ہی راستہ ہے۔ اپنے اردگرد موجود درجنوں رائفل برداروں میں سے میں کسی ایک کی رائفل چھین لوں اور اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دوں۔ مار دوں...... مر جاؤں یا پھر کسی طرح سلطانہ کی مدد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ کامیابی کا امکان معدوم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ”بہت کچھ“ ختم ہونے والا ہے اور اس ”بہت کچھ“ میں سلطانہ اور میں بھی شامل ہیں۔ ایک نوجوان جس نے چہرے پر بھبوت ملا ہوا تھا، آنکھوں میں رنگ لگایا ہوا تھا اور فقط ایک دھوتی پہن رکھی تھی، ہو میرے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ اس بوتل میں سے اس نے میرے ہاتھ کی مشعل نما لکڑی پر تھوڑا

ساتیل ڈالا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پرنتو! تم تیار ہو؟''

میں خاموش رہا۔

وہ بولا۔ ''مجھ کو لگت ہے کہ تم کچھ کھوئے کھوئے ہو۔ کیا کسی کو ڈھونڈت ہو؟'' شور میں اس کی آواز بہ مشکل میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس لئے وہ زور سے بول رہا تھا۔

میں نے بیزاری سے کہا۔ ''تم کیا کہنا چاہت ہو؟''

جواب میں اس نے رازدارانہ انداز میں جو کچھ کہا، اس نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ وہ بولا۔ ''پرنتو! میں جانت ہوں...... تم اپنے کسی بچھڑے سنگی کو دیکھ رہے ہو۔ تمہارے من میں آتا ہے کہ شاید ان کٹھن گھڑیوں میں وہ تمہیں کہیں آس پاس مل جائے۔''

''تت...... تم...... کس کی بات کرت ہو؟''

''عمران کی۔'' اس نے دوسرا دھماکا کیا۔ میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے زمین و آسمان کے قلابے جیسے ایک دم مل گئے۔ میرا پورا جسم لرزنے لگا تھا۔

''تت...... تم...... اس کو کیسے جانت ہو؟'' میں نے دھندلائی نظروں سے اسے سرتاپا دیکھا۔

وہ مسکرایا۔ مجھے اس کے ہموار دانتوں کی قطار نظر آئی۔ اس کی ٹھوڑی کا گڑھا نظر آیا۔ اس کے ابھرے ہوئے رخسار دکھائی دیئے۔ بھبوت سے لتھڑے ہوئے چہرے میں سے ایک اور چہرہ ابھرا۔ وہ میری زندگی کے سب سے حیرت ناک لمحے تھے۔ مجھے لگا کہ میں چکرا کر گر جاؤں گا۔ وہ اپنی اصل آواز میں بولا۔ ''اتنی جلدی بھول گئے جگر! تمہاری یادداشت میں واقعی کوئی گڑبڑ گوٹالا ہو چکا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو میری والدہ میرے کانوں میں بلکہ جسم کے دیگر سوراخوں میں بھی بادام روغن ڈال دیا کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے میرا حافظہ اب تک بہت اچھا ہے۔ لگتا ہے کہ تمہاری نگہداشت اس طرح سے نہیں ہوئی......''

میں اردگرد سے بیگانہ ہو کر جیسے ہواؤں میں معلق ہو چکا تھا......

○......❖......○

مجھے لگا جیسے میں ایک بہت خوبصورت سپنا دیکھ رہا ہوں...... لیکن یہ سپنا نہیں تھا۔ عمران جیتی جاگتی صورت میں میرے سامنے موجود تھا۔ بھبوت سے لتھڑے ہوئے چہرے کے اندر سے عمران کا جانا پہچانا چہرہ جھانک رہا تھا۔ قریباً تین برس پہلے کی اُس تاریک و پُرآشوب رات کو میں نے نالے کے پُل پر اسے آخری بار دیکھا تھا۔ گاڑیوں کی ہیڈلائٹس میں مجھے وہ ایک تیز رفتار پانی پر ایک پُل صراط جیسے راستے پر کھڑا دکھائی دیا تھا۔ اپنا توازن قائم رکھنے کے لئے اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا رکھے تھے پھر اس کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا۔ وہ ڈگمگایا اور اجل کے پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔

میری تمام تر حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگا کہ حیرت اور خوشی کے سبب میرا دل سینے میں پھٹ جائے گا اور میں یہیں تیورا کر گر جاؤں گا۔

بے پناہ شور کے درمیان میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ ''تم...... زندہ ہو...... عمران؟''

''عجیب بے وقوفی کا سوال ہے۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں۔ سانس لے رہا ہوں، بول رہا ہوں، اس کے باوجود تمہیں شبہ ہو رہا ہے کہ میں بقیدِ حیات نہیں ہوں۔ اگر مُردے ایسے ہوتے ہیں تو پھر زندہ لوگ تو یقیناً قبروں میں آرام کر رہے ہوں گے...... اور دوسری بات یہ ہے جگر کہ اس طرح ہونقوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر مجھے نہ دیکھو، ان لوگوں کو شک ہو جائے گا کہ ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ بالکل سنجیدہ ہو جاؤ۔ تمہارے ہاتھ والی لکڑی میں میں نے تیل ڈال دیا ہے۔ اس کو آگ دکھاؤ اور چتا جلانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

میرا دل چاہا کہ دوڑ کر عمران سے لپٹ جاؤں۔ اس کو اپنے بازوؤں میں کس لوں اور دھاڑیں مار مار کر روتا چلا جاؤں۔ میرا سر بدستور چکرا رہا تھا۔ عمران کا چہرہ میری آنکھوں کے آنسوؤں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ سینے میں ایک دم ہی سیکڑوں سوال مچلنے لگے تھے لیکن ابھی سوال و جواب کا وقت کہاں تھا۔ ابھی تو ہم ایک نہایت سنگین مقام پر کھڑے تھے۔ یہاں ایک جیتی جاگتی زندگی کو ختم کیا جانے والا تھا۔ جنونیوں کا گروہ کسی وحشی قبیلے کے لوگوں کی طرح دیوانہ وار چتا کے گرد ناچ رہا تھا، سنکھ بجا رہا تھا اور نقارے پیٹ رہا تھا۔ جس جیتی جاگتی زندگی کو ختم کیا جانے والا تھا، وہ سلطانہ تھی...... میری بیوی تھی۔

ایک دم مجھے لگا کہ میرے جسم میں توانائی کا ایک نیا سمندر لہریں لینے لگا ہے۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ میرے رگ و پے میں ایک بے نام حرارت اُترتی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ اب کوئی مشکل...... مشکل نہیں رہی۔ اب کوئی دیوار میرا راستہ نہیں روک سکے گی۔ اب میں اکیلا نہیں تھا...... اب کوئی میرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا تھا اور یہ "وہ" تھا جس کے دلیرانہ ساتھ کے لئے میں ایک مدت تک ترسا تھا۔ پُر آشوب گھڑیوں میں، میں نے پل پل جس کی توانا مسکراہٹوں کا انتظار کیا تھا؟ وہ آ گیا تھا...... وہ میرے سامنے کھڑا تھا...... اس کی روشن آنکھیں، اس کا چوڑا سینہ، اس کے توانا بازو سب کچھ وہی کا وہی تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا......

"اوئے باندر! میں پھر کہتا ہوں، ایسے مت گھورو۔ ان لوگوں کو شک ہو گا۔ دائیں طرف جو پہلا دیا جل رہا ہے، اس سے یہ لکڑی روشن کر لو۔" عمران کی آواز میرے کانوں میں ٹکرائی۔

"عمران!" میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ جو چتا میں لیٹی ہے، وہ میری بیوی ہے......"

"تو ایک شوہر کے لئے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔ نہ مقدمہ، نہ عدالت، نہ سزا...... ایسی سچویشن کے انتظار میں تو شوہر لوگ اپنی زندگیاں گزار دیتے ہیں۔"

"عمران...... اسے مذاق مت سمجھو...... یہ میری بیوی ہے۔ میرے بچے کی ماں ہے۔ یہ سخت مصیبت میں ہے۔"

"تو میں اس مصیبت کو کون سا بڑھا رہا ہوں؟ میں اسے آگ لگانے کو تو نہیں کہہ رہا۔ بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ آگ لگانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اسے آگ نہیں لگے گی۔ کم از کم آج تو نہیں لگے گی۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔" میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"تمہاری سمجھ میں پہلے میری کوئی بات آئی تھی جو اب آئے گی؟" اس نے کہا اور محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ہر کوئی اپنے حال میں مست تھا۔ تاڑی کے نشے میں وہ سب لوگ بُری طرح اچھل کود رہے تھے۔ ترشول لہرا رہے تھے اور اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ ہر آنکھ میں اس بے بس لڑکی کے لئے نفرت و انتقام کی چنگاریاں تھیں جو چتا کے اندر بے حس و حرکت لکڑی کے تختے پر لیٹی تھی اور جن آنکھوں میں چنگاریاں نہیں تھیں، ان میں بے حسی تھی۔

عمران نے مالا جپتے ہوئے مہا گرو کی طرف اشارہ کیا۔ سفید دھوتی کے اوپر اس کا پیٹ کسی براؤن غبارے کی طرح پھولا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے کان کے قریب آ کر قدرے بلند آواز میں بولا۔ "چتا کو آگ دکھانے کی آ گیا (اجازت) مہا گرو صاحب کو دینی ہے اور وہ آ گیا تب دیں گے جب شبھ گھڑی آ جائے گی...... اور شبھ گھڑی آج نہیں آئے گی۔"

"تت...... تمہیں کیسے پتا؟"

"مجھے اس لئے پتا ہے کہ مہا گرو میرے قبضے میں ہے۔"

"تمہارے قبضے میں ہے؟ کیا مطلب؟"

"بھئی میں نے اس پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں کوئی زندہ انسان تھوڑی ہوں۔ میں تو ایک روح ہوں جو اس رات اپنے پیکر خاکی سے نکل آئی تھی جس رات مجھے سینے پر گولیاں لگی تھیں۔ اب میں ایک بدروح ہوں یا سلیس لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ ایک چڑیلا ہوں...... یعنی چڑیل کا مذکر...... بڑی فائیو اسٹار شخصیت ہے میری۔"

میں نے یونہی نیچے دیکھا تو وہ فٹ بولا۔ "شاید تم میرے پاؤں ملاحظہ کر رہے ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ پاؤں چڑیل کے الٹے ہوتے ہیں، چڑیلے کے نہیں۔ چڑیل کے جسم کے ایک دو اور پارٹ الٹے ہوتے ہیں جو میں فی الحال تمہیں دکھا نہیں سکتا......" وہ بے پَر کی اڑا رہا تھا۔

اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس کا ہلکا پھلکا انداز دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ آج کوئی نہ کوئی کرشمہ ہو جائے گا۔ شاید یہ المیہ آج ٹل جائے جس کی پوری پوری تیاری کی جا چکی ہے۔

میں حیرت کا بت بنا کھڑا رہا اور عمران کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا سرمہ تھا۔ آنکھوں کے گرد رنگ لگایا گیا تھا۔ سفید دھوتی کے اوپر اس کا شاندار کسرتی جسم چمک رہا تھا۔ مہا گرو آنکھیں بند کر کے مالا جپتا رہا اور آگے پیچھے جھولتا رہا...... عمران کے اشارے پر میں نے اپنے ہاتھ کی مشعل نما لکڑی کو آگ دکھا دی اور ساکت کھڑا ہو گیا۔

مہا گرو کی مراقبہ ٹائپ کیفیت طویل ہوتی جارہی تھی۔ نقارے مسلسل بج رہے تھے۔

قریباً تین چار منٹ مزید اسی تناؤ بھری صورتِ حال میں گزرے پھر اچانک مہا گرو نے اپنا مالا والا ہاتھ اُٹھایا اور آنکھیں کھول دیں۔

نقارے رک گئے۔ بھجن اور اشلوکوں کی آواز بھی تھم گئی۔ سب مہا گرو کی طرف دیکھنے لگے۔ مہا گرو بجھے بجھے انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا۔ ”یوگ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ شبھ گھڑی نا ہیں مل رہی۔ اس رسم کو پوری طرح سے ادا کرنے کے لئے ایک خاص سمے کی ضرورت ہے، جو اب ہمارے پاس نا ہیں ہے۔ اب اس خاص سمے کی آشا تین دن بعد ہی کی جاسکت ہے۔“

وسیع ہال کمرے کے نادر سناٹا سا چھا گیا۔ چند افراد کی ٹولی ایک بار پھر اشلوک پڑھنے لگی لیکن اب ان اشلوکوں میں جوش اور ہیجان کی جگہ ایک طرح کا ٹھہراؤ تھا۔ یہ مذہبی شعر اب طبع میں اچھال پیدا کرنے کے بجائے ہمواری پیدا کر رہے تھے۔

”یہ سب کیا ہے؟“ میں نے عمران سے پوچھا۔

”یہ روح کی کارستانی ہے اور روح تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ اگر تفصیل پوچھنا ہو تو وہ بھی تمہیں بتاؤں گا...... مجھے تمہارے کمرے کا پتا ہے، میں آج آدھی رات کے بعد تمہارے پاس آؤں گی...... میرا مطلب ہے آؤں گا۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ میں چڑیل نہیں بلکہ چڑیلا ہوں...... انسان تھا تو اچھی بھلی یادداشت تھی۔ اب تو ان لوگوں جیسا ہو گیا ہوں جنہوں نے بینکوں سے قرض لے رکھا ہے۔ اچھا، چلتا ہوں۔ لگتا ہے کہ گرو صاحب میری طرف ہی آرہے ہیں۔“ وہ چبوترے سے اُترا اور لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ میری نگاہیں مسلسل اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہ وہ پھر کہیں گم نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ میں بے ساختہ اس کے پیچھے لپک جاتا، ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ستیش میرے پیچھے کھڑا تھا، وہ بولا۔

”یہ وقتی نراشا ہے۔ گرو جی نے کہا ہے کہ دو دن میں سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ دو دن بعد ایک بار پھر یہ محفل سجے گی اور یہ اپرادھن لڑکی اپنے انجام کو پہنچے گی۔“

ستیش نے مشعل نما لکڑی میرے ہاتھ سے لے کر پانی کے برتن میں بجھا دی اور مجھے لے کر چبوترے سے نیچے اُتر آیا۔ سلطانہ اسی طرح بے ہوشی کی حالت میں چتا کی لکڑیوں پر پڑی تھی۔ میں کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میری بیوی تھی لیکن دوسروں کی دسترس میں تھی۔ میں اسے چھونے کا مجاز نہیں تھا۔

رات ایک بجے کا وقت تھا، جب دروازہ کھلا اور عمران میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اب وہ معقول لباس میں نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک عام سی پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ چہرے پر سفید بھبوت بھی نہیں تھا۔ قمیص کے اوپر ایک نیلا سویٹر تھا۔ ہونٹوں پر وہی پیاری مسکراہٹ تھی جو اسے عام لوگوں سے جدا کرتی تھی۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور ہم بھاگ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ آنسو میری آنکھوں سے گرم آبشاروں کی طرح بہہ رہے تھے۔

”تم کہاں چلے گئے تھے یار! تمہیں کیا پتا میں نے یہ وقت تمہارے بغیر کیسے گزارا ہے؟“ میں نے سسک کر کہا۔

کوئی مزاحیہ فقرہ اچھالنے کے بجائے وہ خاموش رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی جذباتی کیفیت میں ہے۔

میں آنسوؤں کے درمیان بولتا چلا گیا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ میں تمہیں دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے کھو چکا ہوں۔ مجھے کسی طرف سے تمہارے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں مل سکی تھی۔ میڈم صفورا بھی یہیں اس اسٹیٹ میں موجود ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ تم اس رات گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے...... میں نے...... میں نے اس رات خود تمہیں گولیاں لگتے دیکھی تھیں پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں اس ڈیک نالے کے کنارے سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھ کچھ معلوم نہیں کہ میرے بعد کیا ہوا تھا۔ کیا تمہیں پانی سے نکال لیا گیا تھا؟ میرا مطلب ہے...... میرا مطلب ہے......“ میں ہکلا کر رہ گیا۔

اس کی شوخی طبع پلٹ آئی۔ وہ میرے گلے سے لگے لگے بولا۔ ”میں پانی میں کہاں گرا تھا یار! میں تو آسمان کی طرف اُٹھ گیا تھا...... سیدھا اوپر بالکل راکٹ کی طرح۔ وہ جب میں قطبی ستارے کے قریب پہنچا تو بہت سی ارواحِ خبیثہ سے میری ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے زبردستی مجھے اپنے گروہ میں شامل کر لیا۔ یہ عقل دشمن ارواحِ خبیثہ آج کل امن اور آشتی کے خلاف ایک زبردست مہم چلا رہی ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے قطبی ستارے کے پاس ہی ایک ٹی وی چینل بھی قائم کر رکھا ہے۔ اس کا نام ہے ”فساد پلس“ اور اس کا سلوگن ہے...... ایک ہی رستہ ایک ہی منزل...... افراتفری افراتفری۔ اس چینل میں ملازمت ملنے کی سب سے پہلی شرط ہی یہ ہے کہ بندے نے جاہلیت میں ڈبل ایم اے کیا ہوا اور کم سے کم دس

جگہ سے دھکے دے کر ملازمت سے نکالا جا چکا ہو۔ سو میرے یار! آج کل میں اسی ''فساد پلس'' کا نمائندہ ہوں اور قریہ قریہ گھوم کر خبریں اکٹھی کر رہا ہوں۔''

میری آنکھوں سے مسلسل آنسو رِس رہے تھے۔ میری کیفیت دیکھ کر اسے بھی کچھ سنجیدہ ہونا پڑا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرے ساتھ بید کی کرسیوں پر آ بیٹھا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری یہ حیرت بجا ہے تابی! سینے پر براہِ راست برسٹ کھا کر زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا لیکن ایک بات شاید تم بھول رہے ہو۔ جب ہم لاہور سے باہر گاڑی بھگا رہے تھے اور سیٹھ سراج اپنے ہرکاروں سمیت ہمارے پیچھے تھا، تم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ میں پہلے سے کچھ صحت مند لگ رہا ہوں۔ میری صحت مندی یعنی موٹے پن کا راز وہ امریکن بلٹ پروف جیکٹ تھی جو میں نے قمیص کے نیچے پہن رکھی تھی۔ یہی جیکٹ میری زندگی کا بہانہ بنی۔''

عمران نے اپنا سویٹر اوپر اُٹھایا اور قمیص و بنیان کے نیچے سے اپنے پیٹ پر گولی کے دو زخم دکھائے۔ ایک گولی تو شاید پہلو کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی، دوسری پیٹ میں لگی تھی۔ وہ بولا۔ ''بس یہی دو گولیاں تھیں جو مجھے لگیں، باقی کی جیکٹ نے بلاک کر لیں۔''

میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرزنے لگے۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ٹھنڈے ٹھار پانی میں گرا۔ پانی کی رفتار بڑی تیز تھی۔ میں غوطے کھاتا ہوا کافی آگے نکل گیا پھر سرکس کی ٹریننگ کام آئی۔ میں نے ہاتھ پاؤں چلائے اور کسی طرح کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں ایک نوجوان زمیندار ریاست علی مجھے اپنی ٹریکٹر ٹرالی میں ڈال کر اسپتال تک لے گیا...... پوری روداد کافی لمبی ہے۔ اگر اس کو مختصر نہیں کروں گا تو باقی رات اسی میں گزر جائے گی...... اور تمہاری بھابی پوچھے گی...... چن کتھاں گزاری آئی رات وے......''

''بھابی...... کیا مطلب؟''

''تو یار کیا تم اکیلے ہی رستم زماں ہو جو آناً فاناً شادی کھڑ کا سکتے ہو؟ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو بڑی بڑی مصیبتوں کو دعوت دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔''

''کیا کسی لڑکی سے شادی کر لی ہے تم نے؟''

''دیکھو، اگر اس فقرے میں تم نے شادی پر زور دیا ہے تو اور بات ہے لیکن اگر لڑکی پر زور دیا ہے تو تمہارا سوال اور بھی مذاقیہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے، شادی لڑکی سے ہی ہو گی لیکن شادی بھی کیا ضروری ہے؟ یہ نیا دور ہے یار! اس میں شادی تو اس وقت کی جاتی ہے جب

بچے کہتے ہیں...... سویٹ پاپا ممی، اب شادی کر لیں اور پھر شادی کے بعد تو ویسے بھی رومانس کو ایک دم فل اسٹاپ لگ جاتا ہے اور ہم تو بھئی رومانس کے بندے ہیں۔ ایک پیارا سا چہرہ مل گیا ہے یہاں بھی۔ ہو سکا تو دو چار روز میں تمہیں ملواؤں گا اس سے۔ بڑی اونچی شے ہے۔ کتھک ناچ ناچتی ہے اور ناچ ناچ کر اس نے جسم ایسا شیشے جیسا کر لیا ہے کہ کیا بتاؤں...... اُف۔''

وہ بے تکان بول رہا تھا۔ حالات کی سنگینی اور میری بے پناہ حیرتوں کا جیسے اسے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! مجھے اب بھی اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ لگتا ہے کہ ابھی دماغ کو ایک جھٹکا سا لگے گا اور سب کچھ ٹوٹ کر بکھر جائے گا...... مجھے بتاؤ عمران! تم یہاں کب اور کیسے پہنچے؟ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟ کیا تمہیں پتا تھا کہ میں یہاں ہوں؟ اور تم نے وہاں ہال کمرے میں بھیس کیوں بدل رکھا تھا؟ کیا تم اس گروہ میں شامل ہو؟ اور......''

''بس بس۔'' وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ''ایک ہی سانس میں تم نے اتنے سوال کر دیئے ہیں کہ تمہارا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں آ سکتا ہے لیکن وہاں بھی تو سفارش اور تعلقات چلتے ہیں۔ دیکھو، میری بات سنو۔ ان سوالوں جوابوں کے لئے ابھی بہت سا وقت پڑا ہے۔ فی الحال ہم صرف وہ باتیں کریں گے جو کرنا بہت ضروری ہیں۔ ابھی تم بس اتنا سمجھ لو کہ میں صرف تمہارے لئے یہاں موجود ہوں۔ اس گروہ کے لوگوں میں مجھے امیت کمار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک میں ایک اسمگلر ہوں اور انڈین ''بی ایس ایف'' سے جان چھڑاتا ہوا اس راجواڑے میں گھس آیا ہوں۔ فی الحال یہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی رہیں گے۔ کسی طرح کی کوئی شناسائی بھی ہم دونوں کے لئے سخت ترین مشکلیں پیدا کر سکتی ہے۔ کچھ کچھ اندازہ تو تمہیں ہو ہی گیا ہو گا۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔''

''مجھے صرف ایک بات بتا دو، کیا سلطانہ بچ جائے گی؟''

''تم بھی مجھے صرف ایک بات بتاؤ۔ کیا یہ واقعی تمہاری بیوی ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

وہ عجیب نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ چہرے کے تاثرات بھی عجیب تھے۔ پھر اس نے ہولے سے پوچھا۔ ''اور وہ، تمہارا جنون...... ثروت؟''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''عمران! جس طرح میرے سوالوں کے جواب بہت لمبے ہیں، اسی طرح تمہارے اس سوال کا جواب بھی

بہت طویل ہے لیکن مجھے ابھی صرف اتنا بتا دو کہ ثروت کہاں ہے؟"

"میری آخری معلومات کے مطابق وہ جرمنی میں تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔"

"اور اس کی شادی؟"

"مجھے اس بارے میں ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ میں یہ جاننے میں ناکام رہا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا نہیں۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے پوچھا۔ "اور عاطف اور میری بہن فرح؟"

دروازے سے باہر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ عمران ایک دم چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ لالٹین کی گول ناب پر رکھ دیا۔ غالباً وہ ارادہ رکھتا تھا کہ اگر خطرہ زیادہ محسوس ہو تو لالٹین بجھا دے۔ بہرطور خیریت گزری۔ قدموں کی چاپیں آگے نکل گئیں۔

عمران بولا۔ "میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلطانہ خطرے سے دور ہے لیکن وقتی طور پر۔ ہم نے یہاں کے مہا گرو کی پتنی رادھا دیوی کو اپنا "مہمان" بنا رکھا ہے۔ اسی "مہمان نوازی" کا دباؤ ہے جس کے سبب گرو کو شبھ گھڑی نہیں مل سکی اور اس نے چتا جلانے کی رسم دو دن کے لئے ملتوی کر دی ہے۔ وہ سب کچھ اس نے مجبوری کے سبب کیا ہے لیکن اپنی پتنی کو مصیبت سے بچانے کے لئے وہ دیر تک اس منحوس رسم کو ملتوی نہیں کر سکتا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے پتلون کی جیب احتیاط سے ٹٹولی اور بولا۔ "جس طرح کچھ جنات کی جان طوطے میں ہوتی ہے، اسی طرح گرو کی دھرم پتنی کی جان بھی ایک طوطے میں ہے اور یہ طوطا میرے قبضے میں ہے۔ میں جب چاہوں، اس طوطے کی گردن شریف موڑ کر گرو کی پتنی کو جہانِ بالا کی سیر کرا سکتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو گرو کی پتنی خود بھی ایک طوطے کی طرح ہے اور گرو کی جان اس دوسرے طوطے میں ہے۔ اگر پتنی جہانِ بالا کو گئی تو ہو سکتا ہے کہ گرو خود بھی اس کے پیچھے نکل جائے۔ اسے ادھیڑ عمری میں اور اتنی معمولی شکل صورت کے ساتھ اتنی جوان اور سندر پتنی ملی ہے، وہ ہزار جان سے اس پر فدا ہے۔ پتنی کو جہانِ بالا کی سیر سے بچانے کے لئے وہ اپنی پوری پوری کوشش کرے گا۔"

"تم میری اُلجھنوں کو اور بڑھا رہے ہو عمران...... تم جنوں اور طوطوں کی باتیں کر رہے

ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟"

اس نے ایک بار پھر پتلون کی جیب ٹٹولی اور اس میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک چھوٹا سا برقی آلہ نکال لیا۔ اس کی صورت چھوٹے موبائل فون جیسی تھی لیکن موبائل فون کے کی بورڈ کی طرح اس پر زیادہ بٹن نہیں تھے۔ صرف تین بٹن نظر آ رہے تھے۔ ایک سرخ اور دو سفید۔ یہ برقی آلہ سبز رنگ کا تھا۔ عمران نے کہا۔ "یہ دیکھو، اس کا رنگ ہرا ہے۔ اسی لئے تو میں اسے طوطا کہتا ہوں۔ گرو کی پتنی کی جان اس میں ہے...... خاص طور سے اس بٹن میں۔" وہ سرخ بٹن پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

ان لمحوں میں اس کے بظاہر معصوم چہرے پر وہی جارحیت نظر آنے لگی جس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ادھر یہ بٹن دبے گا، ادھر رادھا دیوی کی پتلی کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ دھماکے سے اُڑ جائے گی اور محبوب کی کمر چاہے کتنی بھی پتلی ہو لیکن ہونی تو چاہئے نا یار...... اور میرے خیال میں مہا گرو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ کتنی آسانی سے کتنی خوفناک بات کہہ رہا تھا۔ وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ ویسے کا ویسے ہی تھا۔ دھیما، سادہ، ہنس مکھ...... اور کبھی اس کے ساتھ ساتھ بہت بھیانک بھی۔ اب اگر مہا گرو کی پتنی کی کمر کے ساتھ واقعی کوئی بارودی بیلٹ بندھی ہوئی تھی تو سوچنے کی بات تھی کہ یہ بیلٹ عمران کو کہاں سے ملی تھی؟ اس بیلٹ اور بیلٹ کے ریموٹ کنٹرول کی ایکروسی کیا تھی؟ اور یہ بیلٹ کس طرح رادھا کی کمر تک پہنچی تھی؟ میں یہ سب کچھ عمران سے پوچھنا چاہتا تھا مگر مجھے پتا تھا کہ ان میں سے کسی ایک سوال کا معقول جواب بھی مجھے نہیں ملے گا۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا...... اور میں چونک گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا ہے کہ "ہم" نے گرو کی پتنی کو اپنا مہمان بنا رکھا ہے۔ "ہم" سے کیا مطلب ہے؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"پچھلے تین سالوں میں کافی ہوشیار ہو گئے ہو تم اور کافی بدل بھی گئے ہو۔" اس نے مجھے سرتاپا دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں تعریف کی جھلک تھی۔ اس نے میرے سینے پر ہلکا سا مکا مارا پھر دائیں بائیں دیکھ کر رازداری کے انداز میں بولا۔ "تم جانتے ہو کہ اقبال میرا دُم چھلا ہے۔ اور دُم جہاں ہوگی، چھلا بھی وہیں ہوگا۔ وہ مہا گرو کی قیام گاہ پر سیوک کے طور پر موجود ہے، یعنی خادم کے طور پر...... اور گرو کی پتنی کی "سیوا" کر رہا ہے۔ وہ پرسوں سے ذرا بیمار ہے

نا۔'' عمران نے آنکھ دبا کر کہا۔

مجھے یاد آیا کہ کل جب میں نے گرو کی پتنی رادھا کو داسیوں کے ساتھ راہداری سے گزرتے دیکھا تھا تو وہ کچھ گم صم نظر آئی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر عجیب سی زردی تھی۔ اب صورتِ حال کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔ عمران اور اقبال یہاں موجود تھے۔ کیسے موجود تھے، اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ ان دونوں نے یہاں مہا گرو کی پتنی کو آڑے ہاتھوں لیا ہوا تھا۔ وہ غالباً دھماکا خیز مواد کے نشانے پر تھی اور یہ مواد ریموٹ کنٹرول تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی اور سنسنی میرے رگ و پے میں اُترنے لگی اور ایک عجیب سی ترنگ سینے میں جاگ گئی لیکن ابھی تک بہت کچھ اندھیرے میں تھا۔ میں عمران سے درجنوں بلکہ شاید سیکڑوں سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔ جاتے جاتے اس نے مجھے ایک بار پھر تاکید کی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ اس نے یا اقبال نے جب مجھ سے رابطہ کرنا ہوگا تو وہ خود ہی کریں گے۔

جانے سے پہلے وہ تھوڑا سا جذباتی ہوگیا۔ ہم ایک بار پھر پُرجوش انداز میں گلے ملے۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''سب کچھ بتاؤں گا...... سب کچھ۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے شہزادے، تھوڑا سا اور کرلو۔''

اس کے جانے کے بعد میں جیسے ایک طوفان کی زد میں رہا۔ راجواڑے کے اس دور دراز کھنڈر میں عمران یوں میرے سامنے آئے گا اور حالات ایک دم ایسا رخ اختیار کریں گے، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اگلا سارا دن بھی عجیب کشمکش اور سوچ بچار میں گزرا۔ شکیلہ سے بھی دوبارہ ملاقات نہیں ہوسکی۔ پتا نہیں کہ وہ کس حال میں تھی۔ اس کی بے چارگی بار بار میرے تصور کو کچوکے لگاتی تھی۔ اس کے ساتھ یہاں ہر طرح کا ظلم روا رکھا گیا تھا اور اب پچھلے تین چار روز سے اس سے مٹی بھی کھدوائی جا رہی تھی۔ اس مشقت کا مقصد معلوم نہیں تھا...... مجھے شکیلہ کی ستی ہوئی صورت یاد آئی، اس کے ہاتھوں کے چھالے یاد آئے اور دل اس کے لئے درد سے بھر گیا۔

اگلی رات پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس زیرِ زمین کھنڈر میں مکمل سناٹا تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ شاید وہی دو چار افراد جاگ رہے ہوں جو پہرے پر تھے۔ کسی قریبی کمرے میں ارجن اور اس کے بدقماش دوست بھی غالباً شیطانی کھیل کھیلنے کے بعد آرام فرما رہے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے ہولے سے ہلایا......

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

دوسری طرف عمران تھا۔ اس کی مدھم آواز پہچان کر میں نے دروازہ کھول دیا۔

''خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے۔'' اس نے ترت جواب دیا۔ ''تمہیں میرے ساتھ آنا ہوگا، ورنہ سب کچھ الٹ پلٹ ہوجائے گا۔''

''لیکن تم تو کہتے تھے کہ ہمیں ایک دوسرے سے دور رہنا چاہئے۔''

''مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔ کم از کم آج کی رات تو بالکل نہیں۔ اقبال زخمی ہوگیا ہے۔''

''کیسے؟''

''میرے ساتھ آؤ۔ خود ہی دیکھ لینا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جلدی کرو، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے...... میں سیدھا چلتا جاؤں گا تم آٹھ دس قدم چھوڑ کر میرے پیچھے آنا۔ میں جس دروازے میں گھسوں، تم بھی گھس جانا مگر احتیاط کرنا کہ کوئی تمہیں گھستے ہوئے دیکھے نہیں۔''

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ صورتِ حال واقعی سنگین ہے۔ میں نے اس کی بتائی ہوئی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے پیچھے چل دیا۔ اپنے کمرے کی لالٹین میں نے بجھا دی تھی اور دروازہ اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کھنڈراستھان کا یہ زیرِ زمین حصہ عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ راہداریاں خالی تھیں۔ لالٹینوں اور گیس لیمپس کی روشنیاں بھی جیسے غنودگی میں تھیں۔ ہم بڑے ہال کمرے کے قریب سے گزرے۔ وہاں بھی بڑے آتش دان میں کوئلے سلگ رہے تھے۔ ان کوئلوں کے قریب بہت سے افراد چٹائیوں اور نمدوں پر بے سدھ پڑے تھے۔ ہال کمرے سے نکلنے والی ایک راہداری میں سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً یہ یہاں کے پہرے دار تھے۔ میں رات کو اکثر ان لوگوں کی آوازیں سنتا تھا۔ یہ بلند آواز میں قہقہے لگاتے تھے اور خود کو بیدار رکھنے کے لئے ایک دوسرے سے دھول دھپا بھی کرتے رہتے تھے۔ ہم اس راہداری کے سامنے سے گزر گئے لیکن اس میں داخل نہیں ہوئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران کا رخ اسی طرف ہے جس طرف سے ہم یعنی میں اور ستیش وغیرہ چار پانچ دن پہلے یہاں داخل ہوئے تھے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ جلد ہی پانی گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہم اسی آبشار کے سامنے پہنچ گئے جو پتھروں پر گرتا تھا اور پھر ایک بڑے حوض کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اس حوض یا چھوٹی سی جھیل میں پتھر کا ایک بڑا مجسمہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ یہاں ایک طرف حوض کے کنارے کچھ دروازے نظر آئے۔ عمران ان دروازوں کے

سامنے سے گزرتا ہوا اچانک ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ عمران کی ہدایت کے مطابق میں نے اردگرد دیکھا۔ دور فاصلے پر کسی شخص کا متحرک سایہ نظر آ رہا تھا۔ شاید کوئی دھرمی پہرے دار پوجا پاٹ میں مصروف تھا۔ تاہم وہ اتنی دور تھا کہ مجھے اس کی طرف سے دیکھے جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ میں عمران کے پیچھے دروازے میں داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی پتا چل گیا کہ یہ مہا گرو کی رہائش گاہ ہے۔ طاقوں میں جابجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں اور تصویریں تھیں۔ ایک دیوار پر جاپ کرنے کے لئے بہت سی مالائیں جھول رہی تھیں۔

گرو کی رہائش گاہ کے دو حصے تھے۔ ایک کو مردانہ اور دوسرے کو زنانہ کہا جا سکتا تھا۔ ہم مردانے حصے میں داخل ہوئے تھے۔ تاہم گرو صاحب یہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک الماری میں گرو صاحب کے مختلف لباس ٹنگے ہوئے تھے۔ ان کی جوتیاں اور کھڑاؤنیں وغیرہ پڑی تھیں۔ خشک میوے اور بیسن کا بہت سارا حلوہ ایک تھال میں ڈھکا رکھا تھا۔ عمران نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بولا۔ ''میں یہاں گرو کا ذاتی خدمت گار ہوں۔ چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ یہ حاجت خانے میں جاتا ہے تو لوٹا بھی مجھے پکڑنا پڑتا ہے۔ کسی وقت تو خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے طہارت بھی مجھے ہی نہ کرانی پڑے۔''

''اب کہاں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''پانی میں بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔ ہر سنیچر کی رات کو یہ جاپ اسے کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں گھر واپس آ جائے گا۔ آؤ، میں تمہیں اس کی سندر پتنی سے ملواؤں۔''

عمران مجھے لے کر ایک دروازے سے گزرا۔ ہم گھر کے مردانے حصے سے زنانے حصے میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی در و دیوار پر خوب گاڑھا رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ ریشمی پردے لگے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں بہت سے ساز پڑے تھے۔ یہ غالباً بھجن گانے میں استعمال ہوتے تھے۔ کتھک ناچنے والوں کی ایک بڑی تصویر بھی اس کمرے میں آویزاں تھی۔ مجھے ایک دروازے کے عقب سے کچھ دبی دبی سی آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے کوئی عورت کراہ رہی ہے اور اس کی آواز اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

''یہاں کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تیرہ من کی دھوبن، کیونکہ ایک من کے تو یہ زیور ہی پہنتی ہے۔ پچھلے جنم میں یہ یقیناً کوئی بھینس یا ہتھنی وغیرہ رہی ہے۔ اس جنم میں بھگوان نے اسے گرو کی دھرم پتنی کی داسی بنایا

ہے۔ ایک نمبر کی خرانٹ عورت ہے۔ اقبال اسی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔''

عمران نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر مجھے کراہنے والی عورت کی جھلک دکھائی۔ وہ واقعی کسی سومو پہلوان کی طرح صحت مند تھی۔ اس نے چاندی اور پتھر کے بہت سے کڑے پہن رکھے تھے۔ ان کڑوں نے اس کے بازو کہنیوں تک چھپائے ہوئے تھے اور نصف پنڈلیاں بھی اوجھل نظر آ رہی تھیں۔ وہ کسی بھینس ہی کی طرح نائیلون کی رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور وہ غوں غاں کی آوازیں نکال رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر نیل تھے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں وہ سخت سردی محسوس کر رہی تھی اور اس کی بے چینی کا سبب بھی یہی تھا۔ عمران نے ایک طرف پڑا ہوا ایک لحاف اُٹھا کر اس پر ڈال دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد میں نے زخمی اقبال کو بھی دیکھ لیا۔ عمران نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ یہاں اقبال کا نام راج ہے اور میں گرو کی پتنی کے سامنے اقبال سے شناسائی ظاہر نہ کروں۔ آج میں ایک طویل عرصے بعد اقبال کو دیکھ رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ ذرا سا فربہ ضرور ہوا تھا مگر اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جس چیز نے مجھے ششدر کیا، وہ اقبال کی آنکھیں تھیں۔ آنکھیں گہری سرخ تھیں اور اتنی سوج چکی تھیں کہ پپوٹوں کے درمیان بس ایک درز سی باقی رہ گئی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل پانی بھی رِس رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی شدید تکلیف کے باعث مشکل سے ہی دیکھ پا رہا ہے۔ وہ ایک غالیچے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ہی ایک مسہری پر گرو کی سُندر پتنی رادھا کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ اس کے سرہانے ہومیو پیتھک ادویہ کی کئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں رکھی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں وہ ایک دم مرجھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔

اقبال نے مجھے دیکھ لیا تھا اور میں نے اسے...... ہمارے دل چاہ رہے تھے کہ بھاگ کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جائیں مگر عمران کی ہدایات آڑے تھیں۔ ہمارے چہروں نے ہمارے جذبات کی عکاسی کی......

•

عمران نے اقبال یعنی راج سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''راج! یہ ہے گوپال...... سمجھو کہ یہ ہمارا نیا ساتھی ہے اور گوپال! یہ راج ہے۔ اس خبیث موٹی نے راج کی آنکھوں میں سرخ مرچیں پھینکی ہیں اور صرف مرچیں ہی نہیں تھیں ان میں کچھ اور الا بلا بھی تھا۔ پپوٹوں کے نیچے سے تھوڑا تھوڑا خون بھی رِستا ہے۔ اس کی آنکھوں کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے...... اس کی جگہ اب تمہیں چار پانچ گھنٹوں کے لئے رادھا

دیوی کے پاس رہنا ہوگا۔اس کے سوا کوئی چارہ نہیں.....‘‘

’’کیوں؟ تم بھی تو یہیں ہو۔‘‘میں نے کہا۔

’’نہیں، مجھے ابھی تین چار گھنٹوں کے لئے یہاں سے جانا ہے۔تالاب پر جا کر گرو جی کی سیوا کرنی ہے۔صبح پَو پھٹنے سے پہلے میں اور گرو جی اکٹھے ہی واپس آئیں گے...... ہر سنیچر کی رات کو یہی کچھ ہوتا ہے۔‘‘

گرو کی پتنی بالکل ساکت لیٹی تھی۔ ذرا سی جنبش بھی نہیں کر رہی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس نے جسم کو ہلایا تو کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ پھٹ جائے گی۔ اس کے چہرے پر وہی کیفیت تھی جو پھانسی گھاٹ کی طرف چل کر جانے والے مجرم کے چہرے پر ہوتی ہے...... موت کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر بہت گہری تھیں۔

عمران نے مجھے اور اقبال کو اشارہ کیا کہ اگر ہم چاہیں تو ساتھ والے کمرے میں جا کر ایک دوسرے سے مل سکتے اور دو چار منٹ گزار سکتے ہیں۔ پہلے اقبال اُٹھ کر گیا پھر میں بھی اس کے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ہم نے وہ سارے فقرے بولے جو بہت دیر سے بچھڑے ہوئے بے تکلف دوست دوبارہ مل کر بولتے ہیں اور خود کو خوشی کے دریا میں بہتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ میں نے اقبال سے پوچھا کہ اس کی آنکھوں کے ساتھ یہ معاملہ کیونکر ہوا ہے۔اس نے مختصر لفظوں میں جو کچھ بتایا وہ یوں تھا۔

گرو کی پتنی والا چکر پچھلے تین چار روز سے چل رہا تھا۔ اس کی کمر کے ساتھ ایک بارودی بیلٹ موجود تھی جس کا ریموٹ کنٹرول عمران یا پھر اقبال کے پاس موجود رہتا تھا۔ عمران اور اقبال مہا گرو کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ سلطانہ کی جان بچانے میں مدد کرے۔ وہ شکیلہ کی بے بسی کے بارے میں بھی سب کچھ جانتے تھے اور اس کی بھی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مہا گرو ایک کٹر مذہبی شخص تھا اور منہ زور گھوڑے کی طرح تھا۔ اگر اس کی جوان سندر پتنی عمران اور اقبال کے ہتھے نہ چڑھتی اور وہ بارودی بیلٹ کی مدد سے اسے زیر کرنے میں کامیاب نہ ہوتے تو گرو کے منہ میں ہرگز لگام نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ گرو نے اور اس کی پتنی نے اپنے ساتھ ہونے والے اس سنگین معاملے کو ہر کسی سے چھپایا تھا بلکہ انہیں چھپانا پڑا تھا۔ ریموٹ کنٹرول ہر وقت عمران یا اقبال کی تحویل میں رہتا تھا اور وہ کسی بھی وقت گرو کی چہیتی بیوی کو ٹکڑوں اور لوتھڑوں میں تبدیل کر سکتے تھے۔ گھر کے اندر آنے اور ملنے جلنے والوں کو یہی پتا تھا کہ رادھا دیوی کی کمر میں شدید درد ہے اور وہ آج کل زیادہ وقت بستر پر ہی گزار رہی ہے۔

راج یعنی اقبال یہاں رادھا کے معالج کے طور پر موجود تھا۔ اقبال یوں تو عمران ہی کی طرح

یہاں مہا گرو کا سیوک تھا، تاہم اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ہومیو پیتھک دواؤں کے بارے میں بھی کافی کچھ جانتا ہے۔ وہ ہر دو تین گھنٹے بعد رادھا کو کوئی نہ کوئی دوا کھلا رہا تھا اور دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ وہ گرو کی پتنی کی خدمت کا حق ادا کر رہا ہے۔ رادھا کی خاص داسی بھی ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ وہی پہلوان نما عورت تھی جسے ہم نے کچھ دیر پہلے ایک چھوٹے کمرے میں بندھا پایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ داسیاں رادھا کی خدمت کے لئے یہاں آتی جاتی تھیں مگر انہیں اصل صورتِ حال کا کچھ علم نہیں تھا۔ صرف پہلوان نما داسی بھاگ متی جانتی تھی کہ یہاں کیا چکر چل چکا ہے اور مالک و مالکن کتنی بڑی مصیبت میں ہیں۔

آج رات پہلے پہر پہلوان نما بھاگ متی نے نمک حلالی کی ایک زبردست کوشش کی تھی اور اقبال پر اس وقت حملہ کر دیا تھا جب وہ رادھا کی مسہری کے قریب چٹائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ ایک دم اقبال پر جھپٹی تھی اور اس کی آنکھوں میں پسی ہوئی مرچوں اور کسی تیز کیمیکل سے بنایا گیا سفوف ڈال دیا تھا۔ چند سیکنڈ کے لئے تو اقبال جیسے اندھا ہو گیا تھا۔ اس نے بلند آواز سے عمران کو پکارا تھا۔ عمران اس وقت گرو کا حلوہ تیار کر رہا تھا۔ وہ غیر معمولی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے اقبال کو ’’پہلوان داسی‘‘ کے چنگل سے نکالا۔ اسے چند سیکنڈ کی دیر بھی ہوئی ہوتی تو پہلوان داسی بھاگ متی نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دینا تھا۔ وہ ریموٹ کنٹرول اقبال سے چھین چکی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک ٹانگ ابھی تک اقبال کے ہاتھ میں تھی اور وہ بھاگ نہیں پا رہی تھی۔ عمران پہنچ گیا اور اس نے بھاگ متی کو اپنی گرفت میں جکڑا۔ پچھلے دوڈھائی گھنٹے سے اقبال شدید کرب میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے مسلسل خنجر گھونپے جا رہے تھے۔

اقبال نے مجھے اپنی مختصر روداد سنائی اور وہیں بے دم سا ہو کر ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے بتایا کہ آنکھیں بند کر لینے سے اور ان پر ٹھنڈا پانی ڈالنے سے اسے قدرے سکون ملتا ہے۔ میں باہر آیا تو عمران جانے کے لئے تیار تھا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔’’یہ سفید بٹن ایکٹیویشن کا ہے۔ اس وقت یہ آن ہے۔ یہ دوسرا بٹن لاک کا ہے۔ اس کو میں نے کھول دیا ہے۔ اب اس سرخ بٹن پر ذرا سا دباؤ بھی پڑے گا تو رادھا دیوی کا دھاکا ہو جائے گا۔ بھگوان کی کرپا سے دس پندرہ ٹکڑے تو ضرور ہوں گے۔ اس لئے احتیاط سے رہنا اور چوکس بھی...... رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اب بے فکر رہو۔ باہر سے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔‘‘

’’اور اگر آیا تو؟‘‘

"فرض محال آیا تو دروازہ نہیں کھولنا۔ لالٹین کی لَو بالکل نیچی کر دو۔"

میں نے لَو نیچی کر دی۔ کمرا نیم تاریک ہو گیا۔ عمران نے ریموٹ احتیاط سے میرے سامنے ایک تپائی پر رکھ دیا۔ مجھے ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ رادھا بھی لیٹی لیٹی اونگھنے لگی تھی۔ اس کے کالے گھنگریالے بالوں کی ایک لٹ اس کے زرد رخسار پر جھول رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ آج کل کچھ کھا پی نہیں رہی۔ اس کے ہونٹ سوکھ کر سانولے ہو چکے تھے۔ پتا نہیں وہ کیسے اس فربہ اندام ادھیڑ عمر گرو کی بیوی بن گئی تھی۔ شاید اس میں کچھ عمل دخل لالچ کا بھی رہا ہو۔ گرو کی اس رہائش گاہ اور رہن سہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی خوش حال ہے۔ استھان میں جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے اور نذر نیاز پیش کی جاتی تھی، اس کا بڑا حصہ یقیناً اس مہا گرو کے پاس آتا تھا۔ یہاں کے ریشمی پردے، غالیچے، قیمتی ساز و سامان اور خود رادھا کا لباس بھی گواہی دیتے تھے کہ اس جگہ خوش حالی کا دور دورہ ہے۔

کچھ دیر بعد رادھا نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ میری کمر میں بہت زیادہ چبھ رہا ہے، کیا تم اسے تھوڑا سا ڈھیلا کر سکت ہو۔" اس کا اشارہ اپنی کمر کی بارودی بیلٹ کی طرف تھا۔

میں نے کمبل ہٹایا پھر رادھا کی قمیص اوپر اُٹھائی۔ ریشمی قمیص کے نیچے اس کی دبلی پتلی ریشمی کمر تھی اور کمر کے ساتھ براؤن رنگ کی وہ خوفناک بیلٹ ایک انچ چوڑے اسٹریپس کے ذریعے بندھی ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ "اگر تمہیں زیادہ تکلیف ہے تو میں اسے ڈھیلا کر سکتا ہوں لیکن اس میں خطرہ ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانکاری نہیں ہے۔"

خطرے کا لفظ سن کر رادھا کا زرد رنگ کچھ اور زرد ہو گیا۔ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں رہنے دو...... رہنے دو۔"

میں نے کہا۔ "اس کو ڈھیلا کرنے کا کام امیت زیادہ اچھے طریقے کر سکے گا۔"

"لیکن اس کو تو گرو جی کے ساتھ ہی واپس آنا ہے اور ان کے آنے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی ہیں۔" وہ ذرا کراہ کر بولی۔ وہ پتی کو گرو جی ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر ناراض لہجے میں بولی۔ "تم دھرمی ہو کر بھگوان کے سیوک اور اس کی دھرم پتنی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کر رہے ہو۔ تمہیں ذرا خوف نا ہیں کہ تمہارے اس اپرادھ کا انجام کیا ہووے گا؟"

میں نے کہا۔ "یہی تو مشکل ہے دیوی جی! یہاں پاپ اور پُن کا فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔ ایک ناری کو یہاں زندہ جلایا جانے والا ہے، کچھ لوگ اُسے بہت بڑا پُن کہہ رہے ہیں اور بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جن کے نزدیک یہ مہا پاپ ہے۔"

"ایسے فیصلے میں اور تم نا ہیں کر سکتے۔ ایسے فیصلوں کے لئے ہی گرو جی اور ان جیسے دوسرے گیانی دھیانی لوگن ہوتے ہیں۔ ہم جیسے عام منشوں کو ان کے فیصلے ماننا پڑتے ہیں۔ اس لڑکی کے لئے یہ سزا بہت زیادہ نظر آوت ہے مگر اس کا اپرادھ بھی تو چھوٹا نا ہیں ہے۔ اس نے اوتار لڑی کے ایک منش کو بے دردی سے قتل کیا ہے۔ جو سزا اس لڑکی کو مل رہی ہے، وہ اس کا بھی بھلا کرے گی۔ اس کے پاپ ڈھل جاویں گے، اس کا اگلا جنم کسی بہت اچھے روپ میں ہووے گا۔"

وہ دیر تک بولتی رہی۔ میرے اور میرے دونوں ساتھیوں کی غداری کو بدترین انجام سے جوڑتی رہی۔ آخر میں اس نے اپنا لہجہ نرم کیا اور مجھے سمجھانے بجھانے کی کمزور کوششیں کرنے لگی۔ وہ بولی۔ "ایک بات یاد رکھو، گرو جی اپنے دھرم کے خلاف کچھ نا ہیں کریں گے۔ وہ جانت ہیں کہ ایسا کرنے کا انجام کتنا برا ہووے گا۔ نرگ کی اگنی کے سامنے اس سنسار کی ساری سزائیں بالکل معمولی ہیں۔ گرو جی میری ہتھیا قبول کر لیویں گے، اپنی ہتھیا بھی قبول کر لیویں گے...... لیکن سوچو، اس کے بعد کیا ہووے گا؟ کیا یہاں کے لوگن تمہیں زندہ چھوڑیں گے؟ کبھی نا ہیں۔ اس لئے میں اب بھی کہتی ہوں کہ کوئی اور راستہ اختیار کر لو۔ اپنے دوستوں کو سمجھاؤ کہ یہ ضد چھوڑ دیں۔ یہ سب کو بہت مہنگی پڑے گی۔"

"ضد چھوڑنا ہی تو مشکل ہے۔ کیا تمہارا پتی اور اس کے ساتھی اپنی ضد چھوڑ رہے ہیں؟"

"وہ ضد نا ہیں ہے۔ وہ تو دھرم ہے۔ بھگوان کی اکھشا ہے اور اس کے خلاف چلنا مہا پاپ ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں دیوی جی! مہا پاپ اور مہا پُن کا فیصلہ ہی تو ہم سے ہو نہیں رہا۔ ہم اپنے جھوٹے عقیدوں اور واہموں کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔"

اس نے لرز کر اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے اور پھر پوجا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "ایشور تمہیں شما کرے۔ تم اپنی نا سمجھی میں بہت غلط باتیں کہہ رہے ہو۔"

"یہ غلط باتیں نہیں ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ......"

"بس بس، اب چپ ہو جاؤ۔" وہ تیزی سے میری بات کاٹ کر بولی۔ "جن باتوں کی

تمہیں جانکاری ناہیں، ان کے بارے میں بول کر اپنا انجام خراب مت کرو...... بس چپ ہو جاؤ۔"

بات کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے خوف زدہ نظروں سے سبز رنگ کے ریموٹ کنٹرول کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ شاید عمران نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ ریموٹ کنٹرول ایک طوطے کی طرح تھا اور اس میں گرو کی پتنی کی جان تھی۔

اس دوران میں اندرونی کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ غوں غاں کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ پہلوان نما داسی شاید پھر مضطرب ہو رہی تھی۔ جس طرح بندھی ہوئی گائے بھینسیں ذبح ہونے سے پہلے ٹانگیں چلاتی ہیں، وہ بھی ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ جب یہ سلسلہ دراز ہوا تو میں نے جا کر دیکھنا مناسب سمجھا۔ چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک ننھی سی چیز تیزی سے باہر نکل گئی۔ یہ ایک چوہا تھا۔ داسی بھاگ متی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ عورت کتنی بھی دلیر ہو، چوہا، چھپکلی، کاکروچ اور اس نوع کے دیگر جان دار اس کی کمزوری رہے ہیں۔ اگر عمران یہاں موجود ہوتا تو اس سچویشن پر چند دلچسپ فقرے ضرور چست کرتا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور واپس رادھا کے پاس آ گیا۔ اس نے صورتِ حال پوچھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اس کی نوکرانی پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔ رادھا گاہے بگاہے عجیب انداز سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ آخر وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آئی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ "تم نے اتنی سخت ٹھنڈ میں بھی بس یہ قمیص پہن رکھی ہے۔ تمہیں سردی ناہیں لگتی؟"

"نہیں لگتی۔ یا یوں سمجھ لو کہ لگتی ہے لیکن میں محسوس نہیں کرتا۔"

"کیا مطلب؟"

"بس یہ عقیدے عقیدے کی بات ہے۔ مجھے سردی جھیلنے میں مزہ آتا ہے، بالکل جیسے تمہارے پتی دیو کو سنیچر کی رات ٹھنڈے پانی میں جاپ کر کے مزہ آتا ہوگا۔"

"دلل...... لیکن وہ پانی ٹھنڈا تو ناہیں ہوتا۔"

"تم نے ابھی خود بتایا تھا کہ وہ آدھی رات کے بعد ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر جاپ فرماتے ہیں۔ امیت بھی یہی کہہ رہا تھا۔"

"وہ پانی اس لحاظ سے ٹھنڈا ہووت ہے کہ اسے آگ پر گرم ناہیں کیا جاتا۔" وہ لیٹے لیٹے بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"یہ دھرم کی باتیں ہیں۔ میری تمہاری بدھی (عقل) میں ناہیں آسکتیں۔"

"لیکن اتنی بات تو ایک بالک کی سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ پانی کو آگ سے ہی گرم کیا جا سکتا ہے یا پھر دھوپ میں رکھ کر اس کی ٹھار ماری جا سکتی ہے...... مگر آدھی رات کو تمہارے پتی دیو کو دھوپ کہاں ملتی ہوگی؟"

"آگ آگ میں فرق ہووت ہے۔" رادھا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "گرو جی کہوت ہیں کہ سنیچر کی رات والے پانی کو ایسے آدھ بجھے کوئلوں سے گرم کیا جا سکت ہے جن میں اگنی کی لپک نہ ہو۔ وہ تانبے کے جس حوض میں بیٹھ کر جاپ کرت ہیں، اس کے گرداگرد ملازم اُدھ بجھے کوئلے ڈالتا رہتا ہے۔"

رادھا نے اس بارے میں کچھ مزید تفصیل بتائی۔ وہ جیسے خود بھی باتیں کرنا چاہتی تھی تا کہ اس کا دھیان اپنی بیلٹ اور ریموٹ کنٹرول وغیرہ سے ہٹا رہے۔ وہ کسی حد تک سادہ بھی تھی۔ اپنے شوہر یعنی گرو جی کے کمالات کا بہت سارا رعب اس کے دل و دماغ پر موجود تھا۔ میں دل ہی دل میں گرو کی چالاکی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ ایسی سخت سردی میں ٹھنڈے پانی کے اندر بیٹھ کر جاپ کرنے میں کوئی گھپلا ہوگا۔ اب یہ گھپلا سامنے آ گیا تھا۔ گرو جی جیسے لوگوں کے پاس حیلے بہانے اور تاویلیں تو ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ پانی کو گرم کرنے کے لئے اس نے یہ تاویل ڈھونڈ لی تھی کہ پانی کو آگ سے گرم نہیں کیا جا سکتا لیکن آدھ بجھا انگارہ جس میں شعلہ نہ ہو، آگ نہیں کہلائے گا...... واہ! کیا سچائی تھی؟

میں دوسرے کمرے میں جا کر گاہے بگاہے اقبال کی مزاج پُرسی کرتا رہا۔ رادھا سے باتیں بھی کرتا رہا اور عمران کا انتظار بھی۔ رادھا کی گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ جو شخص رات بھر اُدھ بجھے انگارے گرو کے حوض کے لئے مہیا کرتا رہتا ہے، وہ امیت یعنی عمران ہی ہے۔ وہ آدھی شب سے لے کر آخری پہر تک لکڑیوں کے ایک ڈھیر سے نبرد آزما رہتا ہے۔ تین بڑے چولہے جلتے رہتے ہیں اور تانبے کے حوض کو اُدھ بجھے انگاروں کی سپلائی جاری رہتی ہے۔

خدا خدا کر کے انتظار کا وقت کٹا اور دروازے سے باہر گرو اور عمران کی آمد ہوئی۔ یہ دروازہ مردانے حصے کی طرف تھا۔ میں درمیانی دروازے میں سے گزر کر مردانے میں پہنچا اور دروازہ کھولا۔ گرو نے خود کو ایک بھاری کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ عمران مؤدب انداز میں اس کے پیچھے تھا۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے تک اس نے اپنے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا جو ابھی ابھی دھویا گیا تھا۔ ان کے ساتھ دو مزید افراد بھی تھے۔ یہ نوجوان پجاری تھے۔ گرو کی طرح ان

کے بال بھی بھیگے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے گرد کمبل لپیٹ رکھے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ بھی گرو کے ساتھ ہی پانی میں پوجا پاٹ کرتے رہے ہیں۔ ان دونوں افراد کو گرو نے کچھ پرشاد دیا اور تھوڑی سی گفتگو بھی کی۔ اس کے بعد وہ دونوں واپس چلے گئے۔ جب تک وہ موجود رہے، عمران کا رویہ گرو کے ساتھ بہت مؤدب رہا لیکن اس کے فوراً بعد وہ اپنے اصل روپ میں آ گیا۔ اس نے گرو کو زنانے میں چلنے کو کہا۔ انداز حکم دینے والا ہی تھا۔ گرو چارو ناچار اپنی توند مٹکاتا ہوا زنانے میں آ گیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ یہاں رادھا مسہری پر اسی طرح بے حس وحرکت لیٹی تھی۔ میاں بیوی نے بے چارگی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

گرو کو سردی لگ رہی تھی۔ اس نے عمران کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بھاگ متی نے انگیٹھی ناہیں جلائی؟''

عمران نے اطمینان سے نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بھاگ متی نے انگیٹھی تو نہیں جلائی لیکن اس نے تمہارے جانے کے بعد ایک اور طرح کی آگ لگانے کی کوشش فرمائی تھی۔ اس ناکام کوشش کے نتیجے میں اب وہ چھوٹے کمرے میں بندھی پڑی ہے۔''

''کیا کہنا چاہت ہو؟'' گرو بوکھلا گیا۔

''اس نے راج کی آنکھوں میں مرچیں جھونکیں اور اس سے طوطا (کنٹرول) چھیننے کی کوشش فرمائی اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ خاص قسم کی مرچیں بھاگ متی کو تم نے ہی سپلائی کی ہوں گی۔''

گرو کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ''ناہیں...... میں نے ایسا کچھ ناہیں کیا۔ میں بھگوان کی سوگند کھاوت ہوں۔''

گرو کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور بھاگ متی نے جو کچھ کیا ہے، اپنے طور پر کیا ہے...... مگر عمران نے گرو پر دباؤ برقرار رکھا اور اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ کافی غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے گرو کو دوسرے کمرے میں لے جا کر اقبال کی حالت دکھائی اور پھر اسے دھکیلتا ہوا واپس رادھا کے پاس لے آیا۔ اس نے دوٹوک لہجے میں گرو سے کہا۔ ''میں اب تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تم نے جو فیصلہ کرنا ہے، ابھی کرو اور زیادہ سے زیادہ کل تک اس پر عمل ہو جانا چاہئے۔''

گرو نے اپنے موٹے بھدے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بے دم سا ہو کر لکڑی کی چوکی پر بیٹھ گیا۔ اس نے چند لمبی سانسیں لیں اور جیسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''دیکھو امیت! بھگوان کی کتنی بڑی کرپا ہے کہ اس نے تمہیں ایک ہندو گھرانے میں پیدا کیا۔ انسان کے بھیس میں پیدا کیا اور سنسار کی ساری نعمتیں تم کو دیں۔ تم کسی مُسلے یا عیسائی کے گھر میں بھی پیدا ہو سکتے تھے...... تمہاری جون انسان کے بجائے کسی کتے بلی کی بھی ہو سکتی تھی۔ ہم دن رات بھگوان کا شکر ادا کرتے رہیں تو بھی کم ہے۔ ہم شکر ادا ناہیں کر سکتے لیکن کم از کم اس طرح کا مہا پاپ تو نہیں کریں۔ اس ناری کا چتا میں جلنا اس کے لئے ہی ناہیں، ہم سب کے لئے بھی چھٹکارے کا سبب بنے گا۔ اس کے اپرادھ کے مقابلے میں یہ سزا تو کچھ بھی ناہیں اور اگر......''

''تم یہ بکواس بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔'' عمران نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میں یہ سب کچھ بہت دفعہ سن چکا ہوں۔ اب دوٹوک بات کرنی ہوگی۔ ہاں یا نہ......''

''مگر امیت......''

''بس گرو...... ہاں یا نہ۔'' عمران نے بے لچک لہجے میں کہا۔

اس دفعہ رادھا بولی۔ ''اتنی جلدی مت کرو امیت...... چلو، ہمیں دوپہر تک کا سمے اور دے دو۔''

''تا کہ تمہارے کسی چہیتے کو سرخ مرچوں جیسی چالاکی دکھانے کا ایک موقع اور مل جائے۔'' عمران نے ترت جواب دیا۔

''میں تمہیں وچن دیتا ہوں امیت، اب ایسا کچھ ناہیں ہوگا...... اور میرا وشواس کرو، جو کچھ ہوا ہے اس میں بھی میرا یا رادھا کا دوش بالکل ناہیں۔''

''نہیں گرو۔'' عمران کا لہجہ دوٹوک تھا۔ ''تمہیں جو کچھ کرنا ہے کل کرنا ہوگا، ورنہ اپنی اس چہیتی پتنی کے دس پندرہ ٹکڑے اُٹھانا ہوں گے، چتا کے پھول تیار کرنے کے لئے......''

عمران کے انداز نے گرو کا تاریک چہرہ تاریک تر کر دیا...... وہ اپنے تھرتھر کانپتے جسم کو کمبل میں لپیٹتے ہوئے بولا۔ ''رادھا کو مارنے کے بعد تم تینوں بھی تو زندہ ناہیں رہ سکو گے۔ یہ کبھی ہو ناہیں سکتا کہ ستیش اور بڑے گرو تم کو یہاں سے زندہ جانے دیں...... اور سلطانہ کو تو پھر بھی مرنا ہی مرنا ہے۔ جیون بڑی پیاری چیز ہے امیت! یہ بھگوان کا تحفہ ہے...... اسے یوں کھونا بدھی کی بات ناہیں ہے۔''

''تم ہمیں موت سے نہ ڈراؤ گرو...... ہم موت کے آگے نہیں، پیچھے بھاگنے والے لوگ ہیں۔'' عمران نے اطمینان سے کہا۔ اس کے لہجے میں وہی جانی پہچانی سچائی تھی جس نے مجھے دیوانہ بنایا تھا۔ یہ اس شخص کا لہجہ تھا جو واقعی جان ہتھیلی پر لے کر پھرتا تھا۔ موت اس کی محبوبہ تھی

اور وہ اس سے بغلگیر ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار تھا۔

گرو نے ایک بار پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ عمران نے بڑے انداز سے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور لکڑی کے دستے والا ایک چھوٹا ریوالور نکال لیا۔ اس نے ریوالور کا چیمبر کھولا۔ وہ بھرا ہوا تھا۔ عمران نے اس میں سے چار گولیاں نکال لیں۔ پھر چرخی کو دو تین بار گھما کر ریوالور گرو کی گود میں پھینک دیا۔ گرو حیران سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں عمران کے اس پرانے کھیل کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

عمران بولا۔ ''چلو، سب کچھ بھگوان پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ابھی تم پانی کے اندر بڑی لمبی پرارتھنا کر کے نکلے ہو۔ بہت سے آشیرباد تمہارے ساتھ ہوں گے۔ چلو، مجھ پر گولی چلاؤ...... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟''

''کک...... کیا مطلب؟''

''گولی چلانے کا مطلب گولی چلانا ہی ہوتا ہے، پرشاد کھانا نہیں۔ مجھ پر گولی چلاؤ، میری ٹانگ کا نشانہ لو۔ اگر گولی مجھے لگ گئی تو ہم تمہاری پتنی کی کمر سے پٹی اتار لیں گے اور تمہیں بغیر کچھ کہے یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر گولی نہ چلی تو پھر ایسے ہی چرخی گھما کر میں تم پر گولی چلاؤں گا۔ اس طرح دیکھتے ہیں کہ بھگوان کی طرف سے کیا اشارہ ملتا ہے۔''

ریوالور گرو کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی کپکپاہٹ میں اضافہ ہوگیا۔ چند سیکنڈ کے لئے محسوس ہوا کہ شاید وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے...... لیکن پھر جلد ہی اس کے تاثرات نارمل ہو گئے اور وہی خوف آمیز بے بسی اس کے فربہ چہرے کو ڈھانپنے لگی جس کا مشاہدہ میں اب تک کر رہا تھا۔ اس نے ریوالور اُٹھا کر دوبارہ عمران کے پاس رکھ دیا۔ ''تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری کچھ سمجھ ناہیں آ رہی۔'' وہ کراہ کر بولا۔

''لیکن مجھے تمہاری ساری سمجھ آ رہی ہے...... تم صرف سمے ضائع کر رہے ہو اور کسی چمتکار کے انتظار میں ہو لیکن ہم کب تک چمتکار کا انتظار کریں گے؟ کیوں نہ ہم خود ہی چمتکار کے پاس پہنچ جائیں۔''

''کیا مطلب؟'' گرو نے کہا۔

''مہاتما صاحب! یہ چمتکار ہی تو ہے۔'' عمران نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے گولی لگ گئی تو چمتکار...... تمہیں نہ لگی تو بھی چمتکار...... چلو اگر تم میں اتنی شکتی نہیں تو میں خود ہی گھوڑا دبا دیتا ہوں۔ پہلے خود پر ٹرائی کرتا ہوں...... پھر تم پر......'' عمران نے بڑے اعتماد سے ریوالور کی سیاہ نال اپنی دائیں ران پر رکھ لی۔

گرو اور رادھا کے چہرے دیدنی تھے۔ خاص طور سے گرو کا چہرہ تو بالکل تاریک ہوگیا۔ عمران نے شہادت کی انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔ عمران کے اس کھیل میں عمران کا اعتماد ہی سب کچھ تھا اور یہ اعتماد ساون کی منہ زور بارش کی طرح تابڑتوڑ اس کے چہرے پر برس رہا تھا۔ ریوالور کی چرخی میں دو گولیاں موجود تھیں۔

چند ہی سیکنڈ بعد گرو کی ہمت جواب دے گئی۔ ''ٹھہرو۔'' وہ کراہا۔ ''ایسا مت کرو۔ اس طرح کی شرطیں باندھنا دھرم میں پاپ ہے۔ تمہارے دماغ کو خون چڑھا ہوا ہے، تم شاید کوئی بات سوچ ہی ناہیں سکت ہو۔''

''تمہارے دماغ کو تو خون نہیں چڑھا ہوا، پھر تم اس نردوش لڑکی کو زندہ جلانے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟'' عمران پھنکارا۔

''میں یہاں کا کار مختار ناہیں ہوں۔ مجھ سے تو بس رائے مانگی جاوت ہے۔ اصل حکم تو بڑے گرو کا ہی چلتا ہے یا پھر ستیش کا۔''

''لیکن دھرم کے ٹھیکیدار تو تم ہو، بڑا گرو نوے سال کا بڈھا کھوسٹ ہو چکا ہے۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ یہاں کوئی تمہاری رائے کے خلاف نہیں چل سکتا۔''

''جتنا دھرم کو میں جانت ہوں، اتنا وہ بھی جانت ہیں۔ میں کوئی غلط بات کہوں گا تو بھگوان کا دوشی ٹھہروں گا اور ساتھ ساتھ یہاں کے سب لوگ مجھ کو دوشی ٹھہرائیں گے۔''

''لیکن تم گرو اور استاد ہو...... استادی ہوتی ہی یہ ہے کہ کوئی درمیانی راستہ نکالا جائے اور درمیانی راستے تو ہر وقت تمہاری مٹھی میں رہتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تمہارا یہ ٹھیمپر کی رات والا اشنان ہے۔ تم گرم پانی میں بیٹھ کر جاپ کرتے ہو اور کوئی تمہیں پکڑ بھی نہیں سکتا۔ اس کی ایک مثال تمہاری یہ پتنی ہے۔ یہ تم سے دس پندرہ سال تو چھوٹی ضرور ہے اور سندر بھی ہے۔ تمہارے جیسے گرو تو اکثر برہم چاری ہوتے ہیں لیکن تم دونوں مزے لے رہے ہو۔ گرو گھنٹال بھی بنے ہوئے ہو اور اپنا بستر بھی گرما گرم رکھتے ہو۔ یقیناً اپنے لئے یہ رعایت بھی تم نے کسی نہ کسی پوتھی (کتاب) سے ڈھونڈ ہی نکالی ہوگی۔''

گرو کی بولتی بند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ اپنے ساتھی کے زخمی ہونے کے بعد امیت (یعنی عمران) فیصلہ کن موڈ میں ہے۔

اس نے کچھ دیر تک مزید آئیں بائیں شائیں کی پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ عمران سے اجازت لے کر اس نے تھوڑی دیر تک پوجا پاٹ کی اور اپنی آنکھوں کو نم ناک کیا پھر کچھ پرانی پوتھیاں لے کر بیٹھ گیا اور ان کے ورق الٹ پلٹ کرنے لگا۔ جہاں تک میں نے اس کا تجزیہ کیا تھا، وہ

ڈرامے باز گرو نہیں تھا۔ اس کے دل میں دھرم کا خوف اور اپنے عقیدے کا پختہ پن بھی موجود تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی اور اپنی پتنی کی جان بھی پیاری تھی۔

اسی دوران میں عمران نے انگیٹھی دہکا کر گرو کے قریب رکھ دی تا کہ وہ پوری یکسوئی سے اپنے ''مطلب'' کی کوئی تحریر ڈھونڈ سکے۔ اس نے اپنی جیب سے کچھ مونگ پھلی نکال کر مجھے دی اور خود بھی ٹھکور ٹھکور کر کھانے لگا۔ اس کے بعد وہ دوسرے کمرے میں اقبال کی خبر گیری کے لئے چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو گرو پوتھیوں کی ورق گردانی سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر ہلکا ہلکا پسینا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دوسری ہتھیائیں تو کسی نہ کسی طرح شما ہو سکت ہیں لیکن موہن کمار کی ہتھیا ایک ایسا مہا پاپ ہے جس کی چھوٹ کسی طور بھی نا ہیں ہے......''

''تو پھر؟'' عمران نے معنی خیز انداز میں سبز رنگ کی ڈیوائس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بس ایک چیز ایسی ہے جس کے بارے میں وچار کیا جا سکت ہے۔'' اس نے ایک بوسیدہ کتاب میں سے ایک نشانی لگے صفحے کو سامنے کیا اور اس پر لکھے ہوئے سنسکرت کے اشلوک زیرِ لب پڑھنے لگا۔

میری اور عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ گرو توضیح کرتے ہوئے بولا۔ ''کسی بھی مندر، دھرم استھان یا دھرم شالہ میں انسانی خون کا گرایا جانا سخت پاپ ہے۔ اگر اس بات کا وشواس ہو جائے کہ ہمارے کسی کرم کے کارن خون بہے گا تو پھر اس کرم سے رک جانا ضروری ہے......''

''اور تمہیں پورا وشواس کر لینا چاہئے کہ اگر تم ہماری بات نہیں مانو گے تو خون بہے گا اور بہت زیادہ بہے گا۔''

گرو نے چند لمحوں کے لئے مسہری پر دراز اپنی خوب صورت بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کا گورا رنگ، بھرا بھرا جسم، اس کے ریشمی بال...... سب کچھ ان لمحوں میں برق کی طرح اس کی آنکھوں میں لہرا گیا اور اس کے ساتھ ہی زندگی کی وہ ساری چاشنی، حرارت اور رنگا رنگی بھی جس کا تجربہ وہ اس استھان کے ایک کھیا فرد کی حیثیت سے کر رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ دھرم اور استھان کے پالن کی خاطر میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں اس پوتر جگہ کو ہتھیا کے خون سے گندا نا ہیں ہونے دوں گا۔''

عمران کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے مدد کے طریقۂ کار پر کوئی بات نہیں

کی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ طریقۂ کار پر پہلے بات ہو چکی ہے اور اب جو کچھ ہو گا، اس کے مطابق ہو گا۔

عمران نے قریب رکھی پلیٹ میں سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور دوسرا ٹکڑا گرو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اپنا اور اپنی پتنی کا نیا جیون مبارک ہو۔''

گرو نے مجبوراً مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا لیکن اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ مٹھائی نہیں، کونین کی گولی کھا رہا ہے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں صورتِ حال مجھ پر واضح ہو گئی۔ عمران نے گرو سے جس ''مدد'' کی بات کی تھی، اس کا طریقۂ کار پہلے بھی زیرِ بحث آ چکا تھا۔ استھان کی پہرے داری بیس بائیس افراد کے ذمے تھی۔ یہ لوگ رات نو بجے کے بعد اپنی ڈیوٹی پر آتے تھے اور صبح کا اُجالا نمودار ہونے تک رہتے تھے۔ ایک دوسرا جتھا دن کے وقت پہرے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ چند دن کے وقفے سے یہ ڈیوٹی بدلتی رہتی تھی۔ دن کے پہرے دار رات کی شفٹ میں چلے جاتے تھے اور رات والے دن کی شفٹ میں۔ ان بیس بائیس افراد میں سے آٹھ کے قریب تو استھان کے اندر ہی مختلف جگہوں پر ہوتے تھے، باقی نکاسی کے راستوں پر۔ ان کی ساری تفصیل عمران کو معلوم تھی۔ ان کی جسمانی حالت، ان کے ہتھیاروں کی تعداد، ان کی صلاحیت، سب کچھ اس کے علم میں تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مہینوں سے یہاں موجود ہے...... اور یقیناً اقبال بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

رات کے بھوجن کے بعد سب لوگ تاڑی سے شغل کرتے تھے۔ عام لوگ تو دل کھول کر پیتے تھے لیکن پہرے دار بھی اس ''نیک کام'' میں کسی حد تک شریک رہتے تھے۔ یہ خاص قسم کی تاڑی تھی جس میں بھنگ کا نشہ بھی شامل کیا جاتا تھا۔ ایک طرح سے یہ ان لوگوں کا الٰہی مشروب تھا جس کے پینے میں پاپ کے اندیشے کے بجائے ثواب کی توقع رکھی جاتی تھی۔ اس مشروب کے سربمہر مٹکے گرو کی تحویل میں رہتے تھے۔ گرو کے لئے یہ کام بہت آسان تھا کہ وہ اس تاڑی میں کوئی ایسی چیز شامل کر دیتا جس سے پینے والے مکمل طور پر معطل ہو جاتے...... اقبال کی آنکھوں کا کباڑا کرنے والی خاص سرخ مرچوں جیسی کچھ اور بوٹیاں بھی گرو کے پاس موجود تھیں...... اور انہی چیزوں میں دھتورے کا وہ کشتہ بھی تھا جسے تاڑی میں ملائے جانے کا پروگرام تھا۔

عمران نے مجھ سے کہا کہ اب مجھے اپنے ٹھکانے پر واپس جانا چاہئے تا کہ کسی کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ سب اچھا ہونے والا ہے اور وہ موقع دیکھ کر کل کسی

بھی وقت مجھ سے ملاقات کرے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی طرح سلطانہ کی خیر خیریت دریافت کرے اور مجھے بتائے، اس کے علاوہ شکیلہ کے بارے میں بھی باخبر رہے۔ میں نے انگریزی زبان کا سہارا لیتے ہوئے اسے شکیلہ کی حالتِ زار کے بارے میں بتایا۔ وہ اس بارے میں پہلے سے نہیں جانتا تھا، تاہم اسے شک ضرور تھا کہ اس مسلمان لڑکی کو یہاں ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ میں نے تین دن پہلے جو کچھ شکیلہ کے ساتھ ہوتے دیکھا تھا، وہ عمران کے گوش گزار کیا۔ عمران کی آنکھوں کی بے قراری کچھ اور بڑھ گئی۔ گرو اور رادھا کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ ہماری باتیں سمجھ نہیں پا رہے۔

میں عمران سے بہت کچھ...... بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ابھی ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ عمران مجھے گرو کی رہائش گاہ سے لے کر نکلا اور واپس میرے ٹھکانے کی طرف لے کر چل دیا۔ آدھے راستے سے میں نے اسے واپس بھیج دیا کیونکہ میں اب اپنے کمرے تک جا سکتا تھا۔

ابھی میں کمرے سے کچھ دور ہی تھا کہ مجھے رات کے سناٹے میں دھپ دھپ کی مدھم آواز سنائی دی جیسے کوئی بیلچے یا کسّی سے مٹی کھود رہا ہو۔ فوراً میرا دھیان شکیلہ کی طرف چلا گیا۔ اس نے بھی تو کالی ماتا کے بیلچے اور مٹی کھودنے کی بات کی تھی۔ میں محتاط قدموں سے آواز کی سمت بڑھا۔ کمروں کی عقبی دیوار کے ساتھ کچے احاطے میں جہاں بہت سی خشک لکڑیاں پڑی تھیں اور تین بڑے بڑے چولہے بنے ہوئے تھے، مجھے دو تین سائے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی چولہے ہیں جن کا ذکر کچھ دیر پہلے گرو کی سادہ لوح پتنی رادھا نے کیا تھا۔ ان چولہوں میں گرو کے جل جاپ یعنی پانی کی پوجا کے لئے اَدھ بجھے انگارے تیار کئے جاتے تھے۔ یعنی جو پانی 10 کلو لکڑی سے گرم ہو سکتا تھا، اس کے لئے ڈیڑھ دو من لکڑی جلائی جاتی تھی۔ ایک چولہے میں ابھی تک مدھم آگ روشن تھی۔ میں تین سایوں کی حرکت اسی روشنی میں دیکھ سکا تھا۔

ان میں سے ایک یقیناً لڑکی تھی۔ وہ کندھوں تک ایک گڑھے میں تھی، اس کے بازوؤں کی حرکت سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ رات کے اس یخ بستہ سناٹے میں مٹی کھود رہی ہے۔ جانے یہ کیا معما تھا۔ اس رات شکیلہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تلسی کے پودے کے نیچے اس لئے مٹی کھود رہی تھی تا کہ اسے وہاں سے شیوا جی کے نام کی مہر مل سکے، اگر ایسا ہو گیا تو یہ لوگ اسے چھوڑ دیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ ارجن وغیرہ کا ڈھونگ ہی لگا تھا۔

میں شاید کچھ دیر مزید وہاں ٹھہرتا اور کچھ ٹوہ لگانے کی کوشش کرتا مگر اسی دوران میں ایک

آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ ایک تنومند پہرے دار کی آواز تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ چمک رہی تھی۔ ”مہاشے! یہاں کیا کر رہے ہو آپ؟“ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

پھر اس نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پھینکی اور چونکی ہوئی آواز میں بولا۔

”گوپال صاحب! آپ یہاں...... اس وقت...... خیریت تو ہے؟“

”بس ذرا سینے میں جلن ہو رہی تھی اس لئے ٹہل رہا ہوں۔“

”اگر طبیعت خراب ہے تو بتائیے۔ یہاں دوا دارو کا انتظام بھی ہے۔“ اس نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ شکیلہ کی صورت تادیر نگاہوں میں گھومتی رہی۔ اس کا قصور کچھ نہیں تھا، اگر کوئی قصور تھا تو وہ اس کے بھائی کا تھا...... اور وہ بھی بس اتنا کہ وہ ایک برہمن زادی کے دل میں سما گیا تھا۔ اس قصور کی پاداش میں اس کی ایک بہن قتل ہو چکی تھی اور وہ خود زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ اسے اس حال میں چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اسے اس دردناک صورتِ حال سے نکالنے کے لئے آخری حد تک کوشش کروں گا۔ اگر میرے علم میں یہ بات نہ آئی ہوتی تو اور بات تھی، اب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر فراموش کر دینا ممکن نہیں تھا۔

سہ پہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف عمران تھا۔ وہ جلدی سے اندر آ گیا۔ اس کے یہاں آنے کا مطلب یہ تھا کہ اقبال کی حالت اب بہتر ہے اور وہ ریموٹ کنٹرول کے ساتھ رادھا دیوی کے سرہانے موجود ہے۔ میرا یہ خیال درست نکلا۔ عمران نے کہا۔ ”اس کی آنکھوں کی سوجن تو کم نہیں ہوئی لیکن جلن اب ٹھیک ہے۔ وہ اب رادھا دیوی کو سنبھال سکتا ہے۔“

”اسے کسی اچھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“

”لیکن جگر! یہاں سب مریض ہیں...... نفسیاتی مریض، روحانی مریض...... جنونی اور پتا نہیں کیا کیا...... میں ان کو کیا لعن طعن کروں، میں خود ایک چڑیلا ہوں۔“

پھر اچانک عمران کی نظر میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر پڑی۔ ریت کے تھیلے کے ساتھ میں گھنٹوں تک جو طبع آزمائی کرتا تھا، اس نے میری انگلیوں کی گانٹھوں کو سیاہ کر دیا تھا اور یہاں سے جلد سخت چمڑے جیسی ہو گئی تھی۔ میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا، تاہم مجھے یقین تھا کہ میں کسی دروازے کے موٹے سے موٹے تختے کو مکا مار کر توڑ سکتا ہوں۔ میں گاہے بگاہے اپنی ضرب کی سختی کو جانچتا رہتا تھا اور مجھے روز افزوں بہتری کا احساس ہوتا تھا۔ عمران نے

حیرت آمیز انداز میں میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے انگوٹھے سے میرے ہاتھ کی پشت کو سہلایا...... پھر میرے دوسرے ہاتھ کی پشت کو دیکھا۔

"یہ سب کیا ہے تابی؟ میں تم میں بہت زیادہ تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔"

"اچھی یا بُری؟" میں نے پوچھا۔

"اچھی...... بلکہ شاید بہت اچھی...... تم ایک...... بدلے ہوئے شخص ہو اور یہ نشان جو تمہاری جلد پر ہیں، یہ بھی کوئی نئی کہانی سنا رہے ہیں۔ کہیں کوئی فائٹنگ شائننگ کا آرٹ تو نہیں سیکھ رہے ہو تم؟"

"فائٹنگ کا آرٹ تو نہیں...... ہاں تم جینے کا آرٹ کہہ سکتے ہو۔" میں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"کوئی باکمال استاد ہی لگتا ہے بھئی۔" عمران نے آنکھیں نچائیں۔ "کون ذات شریف ہے؟"

"ہے نہیں...... تھا۔"

"کون؟"

میں نے گہری سانس لی اور آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ "وہ بہت انوکھا تھا عمران...... بہت جدا...... جب میں تمہاری کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا اور مجھے ہر چہرے میں تمہارا چہرہ نظر آتا تھا تو ایک روز اچانک وہ میری زندگی میں آ گیا...... تمہارا بدل بن کر...... تمہارے مداوے کی طرح...... وہ مجھے ایک پرانی کشتی میں ملا۔ وہ عشق کے راستے کا تباہ حال مسافر تھا...... ایک کمزور اپاہج اور حقیر سا شخص لیکن وہ جو نظر آتا تھا، وہ نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک بڑا انسان چھپا ہوا تھا۔ ایک بہت طاقتور، دلیر اور دانا شخص۔ وہ مارشل آرٹ کا ایک انٹرنیشنل سپر اسٹار تھا۔ بارونداجیکی کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟"

"ہاں، کچھ کچھ لگ تو رہا ہے۔ شاید اس نے کسی فلم میں بھی کام کیا تھا۔" عمران پُرسوچ لہجے میں بولا۔

"فلم اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ زندہ رہتا تو شاید فلموں کی ضرورت بن جاتا...... وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ساتھ کوئی خدائی تحفہ لے کر دنیا میں آتے ہیں۔"

"تو کیا وہ زندہ نہیں؟"

"ہاں عمران، وہ مر گیا...... لیکن مرنے سے پہلے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھا گیا۔ جو کمی تم نے رہنے دی تھی، وہ اس نے پوری کر دی۔ اس لئے تو کہتا ہوں کہ وہ تمہارا بدل بن کر مجھے ملا

تھا۔"

"کیا ہوا اس کے ساتھ؟"

"وہی جو پیار کرنے والوں اور اس پر قائم رہنے والوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ دنیا نے اسے محبت کی سزا دی اور اس نے ہنستے ہنستے قبول کر لی۔" میری آنکھوں کے کنارے پھر جل اُٹھے۔

"یہ تو کوئی لمبی کہانی لگتی ہے۔" عمران نے کہا۔ "اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کہانی نے تمہیں بہت دکھی کیا ہے۔"

"ہاں، میرے بارے میں تمہارے اکثر اندازے بالکل درست ثابت ہوتے ہیں عمران۔ اس کی جدائی نے مجھے بُری طرح توڑا پھوڑا ہے...... لیکن میں قدرت کی کرشمہ سازی پر حیران ہوں۔ جب میں تمہارا خلا بُری طرح محسوس کر رہا تھا تو اسے پُر کرنے کے لئے بارونداجیکی آ گیا اور جب بارونداجیکی کے بعد مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا...... مجھے پھر سے تم مل گئے۔ میں سچ کہتا ہوں عمران...... مجھے ابھی تک اپنے حواس پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ تم کہاں چھپ گئے تھے؟ اور اب یہاں انڈیا کی اس دور دراز اسٹیٹ میں یہاں انتہا پسندوں کے اس ٹھکانے پر؟ یہ سب کچھ اتنا ڈرامائی ہے کہ بس ایک خیال کی طرح لگتا ہے۔"

"میں نے تمہیں کہا ہے نا کہ تمہیں سب کچھ بتاؤں گا اور پوری تفصیل کے ساتھ۔"

میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔ چند سیکنڈ کے لئے وہ جذباتی نظر آیا مگر پھر اس کی فطری شوخی عود کر آئی۔ وہ وہ میرے ہاتھوں کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "زبردست۔ اب یہ ہاتھ مردوں والے ہاتھ لگتے ہیں۔ اب تو تمہارے باروندا کے بارے میں مزید جاننے کو دل چاہتا ہے۔"

"میں تمہیں اس کے بارے میں کیا بتاؤں گا؟ میں تو خود بھی اسے زیادہ نہیں جان سکا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"اچھا، اس بارے میں پھر بات کریں گے اب تو......" وہ ایک دم کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کی ساری دلکشی، شگفتگی اچانک اندوہ میں ڈھل گئی۔ آنکھوں میں دکھ کے سائے تیر گئے۔

"کیا بات ہے...... تم کچھ کہنے لگے تھے؟"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں کنپٹی کھجائی اور گھمبیر لہجے میں بولا۔ "باقی سب کچھ تو ٹھیک ہے لیکن اب بُری خبر ملی ہے۔"

میں ٹھٹک گیا۔ ’’سلطانہ تو ٹھیک ہے؟‘‘ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

’’سلطانہ تو ٹھیک ہے......لیکن شکیلہ......‘‘

’’کیا ہوا شکیلہ کو؟‘‘

’’وہ......نہیں......رہی۔‘‘

’’نہیں رہی......کیا مطلب؟‘‘

عمران کے لہجے میں عجیب سی آتش بھڑک گئی۔ ’’انہوں نے مار دیا اسے۔ آج صبح سویرے تمہارے یہاں واپس آنے کے کچھ ہی دیر بعد۔‘‘

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج گئیں......نگاہوں کے سامنے وہ منظر آ گیا جو آج سحری کے وقت میں نے دیکھا تھا۔ کمروں کے پچھواڑے کچے احاطے میں لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس کچھ سائے حرکت کر رہے تھے۔

’’اوہ خدایا۔‘‘ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ’’کیا تمہیں یقین ہے عمران کہ ایسا ہو گیا ہے؟‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’ہاں، آج صبح سویرے اس کے سر پر چوٹ لگا کر اسے مارا گیا......پھر اس کی اپنی کھودی ہوئی قبر میں ہی دفن کر دیا گیا۔‘‘

’’اپنی کھودی ہوئی قبر؟‘‘

’’یہ درندگی کی ایک اور یادگار مثال ہے۔ وہ بے چاری پچھلے چار پانچ روز سے خود ہی تھوڑی تھوڑی کر کے اپنی قبر کھود رہی تھی۔ یہ بھی یہاں کی منحوس رسموں میں سے ایک رسم ہے۔ دھرم دشمنی کے جرم میں قتل کیا جانے والا کوئی شخص اگر اپنی قبر خود کھودتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کے خون کا بوجھ، خون کرنے والوں پر کم سے کم ہو جائے گا۔ گرو سوبھاش صاحب فرما رہے تھے کہ کوئی ایک ہزار سال پہلے یہ استھان ایک رانی گلاب کماری صاحبہ نے بنوایا تھا۔ وہ بہت اونچے درجے کی پجارن تھیں۔ انہوں نے جیون بھر کنوارہ رہنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا......لیکن پھر ایک رات وہی کچھ ہوا......جو آج کل کی فلموں میں ہوتا ہے۔ ایک طوفانی رات میں ایک مسافر اس استھان میں آ کر ٹھہرا۔ انسانی تقاضوں کے ریلے کے سامنے صبر و تحمل کی ساری ریتلی دیواریں بہ گئیں۔ یہ بات چھپی نہ رہ سکی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ رانی صاحبہ نے خود کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا......اور یہ سزا موت تھی۔ کوئی انہیں موت کی سزا دینے کو تیار نہیں تھا۔ رانی صاحبہ کا رتبہ اور مرتبہ ہر کسی کو ڈرا رہا تھا۔ تب رانی صاحبہ نے خود اپنے لئے ایک گڑھا کھدوا اور اپنے ایک وفادار سیوک کے ذریعے خود کو اس میں زندہ دفن کر لیا۔ تاہم کچھ روایتوں میں کہا جا رہا ہے کہ رانی گلاب کماری کا یہ بلیدان ان کی

موت کے بغیر ہی قبول ہو گیا اور اگلے روز جب لوگوں نے مٹی ہٹائی تو رانی صاحبہ کا شریر وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ زندہ حالت میں بنارس پہنچ چکی تھیں۔‘‘

عمران کے ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ جلالی روپ پیش کر رہا تھا۔ اس کا یہی روپ تھا جو اس کی خوش مزاجی اور کھلنڈرے پن سے بالکل علیحدہ تھا......اور جو دیکھنے والے کو مسمرائز کر ڈالتا تھا۔

اس نے مجھ سے زیادہ بات چیت نہیں کی اور آج رات کے لئے تیار رہنے کی ہدایت دی۔ اس کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب مزید انتظار بالکل کرنا نہیں چاہتا۔ شاید میری طرح اس کے دل میں بھی یہ اندیشہ آن موجود ہوا تھا کہ شکیلہ کی طرح کہیں سلطانہ کے معاملے میں بھی تاخیر نہ ہو جائے۔ یہ بے حد خطرناک لوگ تھے۔ جنون کی حد تک کٹر اور انتہا پسند۔ وہ کسی لمحے کچھ بھی کر سکتے تھے۔

عمران نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ’’تم سب کچھ روزانہ کے مطابق ہی کرنا۔ رات کا کھانا کھا کر لیٹ جانا اور لالٹین بجھا دینا۔ ہو سکتا ہے کہ میں اقبال کو بھیجوں، وہ آ کر تمہیں لے جائے گا۔‘‘

اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے ایک چھوٹا پسٹل نکالا۔ اسے رومال میں لپیٹا گیا تھا۔

’’یہ رکھ لو......لوڈڈ ہے۔ کل تمہیں اس کے مزید راؤنڈز دوں گا۔‘‘ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ’’یہ بڑی فائیو اسٹار چیز ہے۔‘‘

میں نے پسٹل لے کر بستر کے نیچے چھپا دیا۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں عمران سے ثروت......عاطف اور فرح کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔

عمران کے جانے کے بعد میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ شکیلہ نام کی اس لاچار لڑکی سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات یاد آ رہی تھی۔ وہ مرنے کے لئے بالکل تیار تھی اور وہ مر گئی تھی۔ ایک سفاک انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ عجیب سے پچھتاوے نے مجھے گھیر لیا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب چند گھنٹے پہلے میں نے تاریکی میں پچھواڑے کے احاطے میں متحرک سائے دیکھے تھے۔ یقیناً یہ وہی وقت تھا جب شکیلہ کو قتل کیا جا رہا تھا۔ ایک ہانپی اور تھکی ہوئی زرد رُو لڑکی کی تصور میں آئی۔ وہ بے خبری میں اپنی قبر خود کھود رہی تھی اور مشقت سے کراہ رہی تھی۔ پتا نہیں اسے کس طرح مارا گیا تھا؟ وہ جلدی مر گئی تھی یا تکلیف سے؟ آہ......انسان کسی وقت جانوروں اور درندوں سے کتنی سبقت لے جاتا ہے۔

نل پانی کی شکیلہ لاچاری کی ایک ایسی ناقابلِ فراموش تصویر بن کر میرے ذہن سے چپک گئی جسے اب مدت تک خیالوں سے محو نہیں ہونا تھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس پہرے دار کو کوسنے لگا جو سحری کے وقت وہاں آ گیا تھا اور جس کی وجہ سے میں جلد کمرے میں جانے پر مجبور ہوا تھا۔ اگر میں کچھ دیر وہاں اور کھڑا رہتا تو شاید یہ بات میری سمجھ میں آ جاتی کہ شکیلہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور اگر ایسا ہو جاتا تو شاید میں اسے بچانے کے لئے کچھ کر سکتا۔ یہ ''شاید'' کا لفظ بھی بہت عجیب ہے۔ کوئی غیب داں کوئی پیشین گو یا بڑے سے بڑا عالم بھی اس لفظ کا معما حل نہیں کر سکا۔ باروندا جیکی نے ایک دن اس لفظ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ میرے دماغ میں گھومنے لگا۔

......جوں جوں رات قریب آ رہی تھی، میرے جسم میں سنسنی کی لہریں ابھرتی اور پھیلتی جا رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ دھیرے دھیرے ایک ہنگامے کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اس قسم کی تناؤ والی صورتِ حال مجھے تین چار سال قبل توڑ پھوڑ دیا کرتی تھی۔ میں اتنا اعصاب زدہ ہو جایا کرتا تھا کہ اپنے آپ پر ترس آنے لگتا تھا......لیکن اب موسم بدل چکے تھے۔ میں وہ نہیں رہا تھا جو کبھی تھا اور اب تو میں اور بھی طاقتور ہو چکا تھا کیونکہ عمران میرے آس پاس موجود تھا۔

قدیم استھان کے اس زیرِ زمین حصے میں روزمرہ کے معمولات جاری تھے۔ کہیں پاس ہی کسی جگہ پر پٹاخے سے چھوٹ رہے تھے۔ یہ دراصل رائفل شوٹنگ کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اس مقصد کے لئے مصنوعی ٹارگٹ اور ربڑ کی گولیاں استعمال ہوتی تھیں۔ گاہے بگاہے سنکھ بجنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں یا پھر پوجا کی گھنٹیاں در و دیوار میں گونجنے لگتی تھیں۔ مذہب کے نام پر ان لوگوں نے اپنا ہی ناٹک رچا رکھا تھا۔ سفاکی اور منتقم المزاجی اس ناٹک کے اہم ترین عناصر تھے۔ عمران نے جو کچھ مجھے بتایا تھا، اس سے پتا چلا تھا کہ یہ استھان گھنے جنگل میں واقع ہے...... اس کے اوپر ایک بہت بڑی پھلواری ہے۔ اس پھلواری کو بالکل صاف پانی سے سینچا جاتا ہے اور اس کے پھول نل پانی کے سارے مندروں اور استھانوں وغیرہ کو بھیجے جاتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس پھلواری کے نیچے پرانے استھان میں انتہا پسندوں کا اڈا قائم ہے اور پھلواری میں کام کرنے والے بیسیوں مزدور درحقیقت خطرناک دہشت گرد ہیں۔

مجھے یہاں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر لایا گیا تھا تاہم خوشبو کی وہ تیز لہریں میں نے ضرور محسوس کی تھیں جو یقیناً پھلواری کے اندر سے اُٹھ رہی تھیں۔ یعنی اوپر خوشبو تھی اور نیچے بدبو و بدصورتی۔

رات کے دس بجے تک آوازیں دھیرے دھیرے معدوم ہو گئیں اور استھان خاموشی اور تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اب بس کہیں کہیں لالٹینوں یا مٹی کے تیل والے چراغوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ لکڑی کے قدیم دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ستیش تھا۔ اس کے ماتھے کا سفید قشقہ اور آنکھوں کا سرخی مائل رنگ لالٹین کی روشنی میں نمایاں تھا۔ ''کہو گوپال! خیریت سے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں......کوئی تکلیف ناہیں......لیکن انتظار کچھ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔''

''میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔ پرنتو کٹھن سمے گزر گیا ہے۔ گرو جی کا کہنا ہے کہ ستاروں کی چال اچھی ہے۔ کل دوپہر تک سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ وہ شام کو شبھ گھڑی نکالیں گے اور رات آٹھ نو بجے تک تمہارا کام مکمل ہو جاوے گا۔''

''یہ آپ نے اچھی جانکاری دی ہے۔'' میں نے مؤدب انداز میں کہا۔

''ماتا جی نے تمہیں پیار بھیجا ہے......اور اب تک جو تکلیف تمہیں اُٹھانا پڑی ہے، اس کے لئے پتا جی نے شکریہ ادا کیا ہے۔''

''ستیش جی! آپ کیسی بات کرت ہیں۔ شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہئے۔ آپ کے پریوار کی وجہ سے مجھے یہ موقع ملا کہ میں ایک ادھرم ناری کو اپنے ہاتھ سے انجام تک پہنچاؤں۔ یہ میرے لئے بڑے اعزاز کا کام ہے۔''

''مجھے وشواس ہے، ایشور تمہیں اس کا بدل دے گا......''

جس وقت میں برہمن زادے ستیش سے باتیں کر رہا تھا، میں نے اقبال کو دیکھا۔ وہ میری طرف آ رہا تھا۔ مجھے اور ستیش کو ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ یقیناً وہ ستیش کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ ستیش کے جانے کے بعد چار پانچ منٹ کے اندر دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ یہ اقبال ہی ہے۔ میرا خیال درست نکلا۔ اقبال نے ایک گرم چادر لپیٹ رکھی تھی، اس کی آنکھیں متورم اور سرخ تھیں۔ ہاں، کل کے مقابلے میں افاقہ نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں تو پہلے ہی تیار تھا۔ ستیش کی فراہم کردہ کپڑے کی جیکٹ پہن چکا تھا۔ یہاں میں نے کسی کے پاس چمڑے کی جیکٹ یا جوتی نہیں دیکھی تھی۔ غالباً اپنے کٹر پن کی وجہ سے وہ چمڑے کا استعمال پاپ سمجھتے تھے۔

عمران نے کل رات مجھے جو پسٹل دیا تھا، وہ بھی میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اقبال اور میں آگے پیچھے چلتے ہوئے گرو کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم نے

اپنے درمیان پندرہ بیس قدم کا فاصلہ رکھا تھا۔ یہ قدیم استھان حسبِ سابق شب کے سناٹے میں اونگھ رہا تھا۔ کچھ لوگ سو رہے تھے، کچھ سونے کی تیاری میں تھے۔ آبشار گرنے کی آواز سنائی دینے لگی اور جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، یہ آواز نمایاں ہوتی گئی۔ پانی کے قدرتی تالاب کے اندر اوندھا پڑا مجسمہ دکھاء دیا اور پھر گرو کی رہائش گاہ کے دروازے کی جھلک نظر آئی۔ اس اوندھے پڑے مجسمے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ یہ ایک علامت ہے، فرسودہ عقیدوں اور کہنہ رسموں کے زوال کی۔ یہ ٹوٹا ہوا مجسمہ شاید سوچنے والوں کو دعوتِ فکر دے رہا تھا۔ انہیں وقت کے جدید تقاضوں کی طرف بلا رہا تھا۔

ہم گرو کے گھر میں داخل ہوئے۔ زنانے میں اس کی جوان پتنی ایک تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ کل ہی کی طرح ہلدی تھا۔ اس کے قریب عمران فرشتۂ اجل کی صورت موجود تھا۔ ''ہرا طوطا'' اس کے ہاتھ میں تھا۔ گرو بھی ایک طرف گم صم بیٹھا تھا۔ جو نئی چیز نظر آئی، وہ بھاگ متی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھی ہولے ہولے پان چبا رہی تھی۔ اس کا ایک رخسار ابھی تک گہرا نیلا تھا۔ فضا کا تناؤ بتا رہا تھا کہ نازک ترین گھڑیاں آن پہنچی ہیں۔

عمران نے سوالیہ نظروں سے اقبال کو دیکھا۔ اقبال بولا۔ ''ہال کمرے میں تو خاموشی ہے۔ شاید ایک آدھ بندہ ہی جاگ رہا ہو۔ درمیانی ہال کی طرف سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں مگر زیادہ روشنی وہاں بھی نہیں تھی۔''

عمران بولا۔ ''مجھے زیادہ خطرہ بس اس کیدو کی طرف سے ہے۔ وہ خانہ خراب پانی کی طرح پیتا ہے۔ ایک دو پیالوں سے تو اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے۔ ہمیں اس کی طرف سے تسلی کرنا ہوگی۔ آج اس کی ڈیوٹی کس طرف ہے؟''

''میرے حساب سے تو یہ سیڑھیوں والے دروازے پر ہوگا۔ ارون، پٹیل اور گاڑی بان بھولا ناتھ وغیرہ بھی وہیں پر ہیں۔''

عمران اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک چکر ادھر کا لگا آؤں۔ خاص طور سے اس کیدو کو دیکھ لوں۔'' کیدو سے اس کی مراد ارجن تھی۔

''پانچ دس منٹ اور ٹھہر جاؤ۔'' اقبال نے رائے دی۔

ان باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ گرو سوبھاش نے اپنا کام کر دیا ہے۔ بھنگ اور دھتورا ملی ہوئی تاڑی پہرے داروں کو پلائی جا چکی ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عمران اور اقبال پوری طرح تیار ہیں۔ عمران کے قریب ہی ایک سیون ایم ایم رائفل رکھی تھی۔ عمران کی جیکٹ کی جیبیں پھولی ہوئی تھیں۔ یقیناً ان میں بھی

رائفل کے فالتو راؤنڈز اور میگزین موجود تھے۔ اقبال کی جیکٹ بھی اسی طرح بھاری بھرکم نظر آ رہی تھی۔ اس کے پاس بھی رائفل تھی۔ انہوں نے اپنے اپنے ہتھیار چیک کئے اور مجھے مختصر الفاظ میں بتایا کہ ہمیں کیا اور کس طرح کرنا ہے۔

گرو کی پُر زور درخواست اور گارنٹی پر پہلوان نما ملازمہ کو کل رات ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ بھاگ متی نے ہی آج کسی طرح سلطانہ سے ملاقات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ تیار رہے، آج رات اسے اور اس کے بھتیجے کو یہاں سے نکال لیا جائے گا۔

جو کارروائی یہاں ہونے والی تھی، اس کے بارے میں ضروری ہدایات بھی بھاگ متی نے ہی سلطانہ تک پہنچائی تھیں۔ سلطانہ بڑے گرو کی ذاتی تحویل میں تھی اور اسے ایک ایسی کال کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا جس میں لوہے کا بس ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔

اس سے پہلے کہ عمران گھر سے باہر نکلتا، کچھ فاصلے سے چلانے کی آوازیں آئیں۔ کوئی شخص آہ و بکا کرتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ عمران اور اقبال نے اپنی رائفلیں فوراً چھپا دیں۔ اقبال نے مردانے میں جا کر باہر جھانکا اور پھر پریشان آواز میں بولا۔ ''یہ تو وہی لنگڑا ارجن ہے۔''

''اوہ گاڈ۔'' عمران نے بے ساختہ کہا۔

چند سیکنڈ بعد دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ارجن کی پھٹی پھٹی آواز سنائی دی۔ ''گرو جی...... دروازہ کھولیں...... گرو جی۔''

گرو کے چہرے پر کچھ مزید ہوائیاں اڑنے لگیں۔ عمران نے گرو کو اشارہ کیا کہ وہ خود دروازہ کھولے۔

گرو نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ ارجن لڑکھڑاتا اور ڈگمگاتا ہوا اندر آیا۔ گرو نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سنبھالا۔ وہ بدمست آواز میں بولا۔ ''گرو جی! غضب ہو گیا ہے۔ کسی نے تاڑی میں کچھ ملا دیا ہے۔ سب بے ہوش ہو گئے ہیں۔ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے...... کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔'' ارجن خود بھی جھوم رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی بھی وقت زمین بوس ہو جائے گا۔

عمران کے اشارے پر گرو اسے جلدی سے زنان خانے میں لے آیا۔ ارجن پھر اپنی بیٹھی ہوئی بھدی آواز میں بولا۔ ''جلدی سے کچھ کریں گرو جی! مجھے تو لگتا ہے کہ شاید حکم جی کے لوگن یہاں گھس آئے ہیں۔''

گرو نے تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپکا۔ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ارجن ایک

ایسے شخص کے پاس فریاد لے کر پہنچا تھا جو خود ساری صورتِ حال کا ذمے دار تھا۔ عمران کے اشارے پر گروسو بھاش، ارجن کو اس چھوٹے کمرے میں لے گیا جہاں دو دن پہلے تک فربہ اندام داسی بھاگ متی بند تھی۔ عمران نے ارجن کو زور سے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ وہ اس اچانک افتاد پر دہشت زدہ نظر آنے لگا۔ اس کے حواس جواب دیتے جا رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بس ایک آدھ منٹ میں وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح انٹا غفیل ہو جائے گا۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا کر عمران نے چادر کی بکل ماری اور رائفل اُٹھالی۔ یہ چھوٹے بیرل والی اسمارٹ سی رائفل تھی۔ باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ عمران مسلح ہے، کچھ یہی حال اقبال کا بھی تھا۔ عمران نے مجھے ایک مفلر نما گرم کپڑا دیا اور کہا کہ میں اس سے اپنا چہرہ ڈھانپ لوں۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم بعد میں اپنی بیوی سے منہ دکھائی وصول کر سکو گے۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی مرضی تھی کہ سلطانہ مجھے گرو اور رادھا وغیرہ کے سامنے نہ پہچانے۔

''چلو گرو جی۔'' عمران نے تحکم سے کہا۔ ''اور تم بھی شریمتی جی۔'' عمران نے رادھا کی طرف اشارہ کیا۔

رادھا کسی معمول کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بوٹے سے قد کی متناسب جسم والی لڑکی تھی لیکن کمر میں بندھی ہوئی بیلٹ کی وجہ سے اس کا پیٹ بھاری نظر آ رہا تھا۔ بادی النظر میں وہ حاملہ لگتی تھی۔ گرو پہلے سے کھڑا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے عمران سے سوال کیا۔ ''سلطانہ تمہارے حوالے ہو جاوے گی تو پھر تم رادھا کی کمر سے پٹی اُتار لو گے اور ہمیں واپس آنے دو گے؟''

''میرے خیال میں یہ بات میں تم سے دس پندرہ دفعہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں...... اور شاید اتنی ہی دفعہ راج (اقبال) نے بھی کہی ہے۔ اب صرف اسٹامپ پیپر پر انگوٹھا لگانے کی کسر رہ گئی ہے۔''

گروسو بھاش ایک دم خجل نظر آنے لگا۔ ہم آگے پیچھے گرو کی رہائش گاہ سے نکلے۔ گرو کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گڑوی تھی اور لکڑی کے موٹے دانوں کی مالا بھی۔ ایسی ہی مالا رادھا کے ہاتھ میں بھی تھی۔ اس کے صراحی دار گلے میں رات کی رانی کے پھولوں کا ہار بھی تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ وہ دونوں کسی خاص پوجا کے لئے بڑے ہال کمرے کی طرف جا رہے

ہیں۔ آبشار کے پاس سے گزر کر ہم استھان کے اندرونی حصے میں پہنچے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ایک طویل راہداری سے گزر کر ہم بڑے گرو کی قیام گاہ کی طرف آ گئے۔ یہاں دیواروں پر مذہبی انتہا پسندی سے متعلق نعرے درج تھے اور دیوی دیوتاؤں کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ایک پتھریلی دیوار کے قریب کم از کم پانچ افراد بے سدھ پڑے تھے۔ ان کی رائفلیں بھی ان کے پاس ہی تھیں۔ چار افراد ایک جگہ تھے، پانچواں کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے منہ سے خون رِس رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے وہ گرا ہے جس کی وجہ سے اسے چوٹ لگی ہے لیکن بعدازاں یہ قیافہ غلط ثابت ہوا۔ منہ سے خون رِسنے کی وجہ کچھ اور تھی۔

گروسو بھاش نے اس زخمی پہرے دار کی جیبیں ٹٹولیں اور پیتل کی دو لمبی چابیاں نکال لیں۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا آہنی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ یہ موٹی دیواروں والی وہی کال کوٹھڑی تھی جہاں سلطانہ کو رکھا گیا تھا۔ گرو نے کانپتے ہاتھوں سے دروازے کے ہضمی قفل میں چابی گھمائی۔ وزنی دروازہ مدھم آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اندر لالٹین کی زرد روشنی میں مجھے سلطانہ اور پندرہ سولہ سالہ طلال نظر آئے۔ وہ دونوں دروازہ کھلنے کے انتظار میں ہی تھے۔ دونوں خستہ حال اور مدقوق دکھائی دیتے تھے۔ سلطانہ کی طرح طلال کے چہرے پر بھی چوٹوں کے نئے پرانے نشان تھے۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ سلطانہ کو کسی جانور کی طرح ایک زنجیر سے باندھا گیا تھا۔ یہ زنگ آلود زنجیر اس کے دونوں پاؤں کو جکڑے ہوئے تھی۔ طلال زنجیر کے بغیر تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سلطانہ ان لوگوں کے نزدیک زیادہ خطرناک قیدی ہے یا پھر ہو سکتا تھا کہ اس نے قید کی حالت میں بھی مزاحمت جاری رکھی ہو۔ دوسری چابی سے گرو نے سلطانہ کی زنجیر کا قفل کھولا اور اس کے زخمی پاؤں آزاد کئے۔ سلطانہ نے مجھے دیکھا لیکن دیکھ کر بھی نہ دیکھ سکی۔ اس نے اپنے گرد ایک پھول دار گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ طلال ایک بوسیدہ سے کوٹ میں تھا۔

ہم ان دونوں کو لے کر واپس ہوئے۔ یہی وقت تھا جب ساتھ والے حجرہ نما کمرے کا دروازہ کھلا اور بالکل سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والا ایک نہایت بوڑھا شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور وہ لاٹھی کے سہارے بہ مشکل کھڑا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے باہر کا سارا منظر دیکھا۔ اس کا رعشہ زدہ سر کانپتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے پوپلے منہ کے ساتھ گروسو بھاش سے کچھ کہا۔

گروسو بھاش نے آگے جا کر اپنا منہ بوڑھے گرو کے کان کے ساتھ لگایا اور قدرے

بلند آواز میں کہا۔ ”مہاراج...... اپنے بستر پر واپس جاؤ، سب ٹھیک ہے۔“

جواب میں بوڑھے گرو نے کچھ کہنا چاہا لیکن گروسو بھاش نے اسے تقریباً دھکیل کر واپس کمرے میں پہنچا دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

گروسو بھاش کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑا گرواب بس نام کا ہی گرو رہ گیا ہے، ورنہ اب یہاں اس کی کوئی سنتا نہیں ہے۔

ہم سلطانہ اور طلال کو لے کر واپس چل دیئے مگر یہی وقت تھا جب ہم پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ارجن کسی طرح اس کمرے کا دروازہ کھولنے میں کامیاب رہا ہے جہاں ہم اسے بند کر آئے تھے۔ وہ آفت کا پرکالا گرو کے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آبشار کی طرف آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سینے کی پوری قوت سے چلا رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا۔

ہم سے اس کا فاصلہ بس چالیس پچاس قدم ہی ہوگا۔ دو افراد بھاگتے ہوئے اس کی طرف آئے اور اسے سنبھالا۔ ان میں سے ایک طلال کی عمر کا ایک بالکل نوجوان لڑکا تھا۔ وہ بھی اس استھان میں رضا کارانہ خدمت انجام دیتا تھا۔ میں نے اسے مختلف کمروں میں پھول سجاتے اور کھانا لاتے دیکھا تھا۔ دوسرا پکی عمر کا شخص تھا۔ ارجن نے ان دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا اور چنگھاڑ کر بولا۔ ”گروجی ان لوگن کے ساتھ مل گئے ہیں۔ انہوں نے پہرے والوں کو زہریلی تاڑی پلا دی ہے...... کچھ کرو، جلدی کچھ کرو......“

میں نے دیکھا کہ عمران کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ہے۔ ”کتے کا بچہ۔“ وہ پھنکارا۔ اس کی یہ گالی یقیناً ارجن کے لئے تھی۔ اس نے اپنی چادر اتار پھینکی۔ چھوٹی نال والی رائفل سیدھی کی۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ قریباً 40 میٹر کی دوری پر گولی ارجن کے پیٹ میں کہیں لگی مگر اس گولی نے اتنا ہی نقصان کیا جتنا سر پر لگنے والی گولی کرتی۔ ارجن پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا، گولی کھا کر سیدھا تالاب کی گہرائی میں گیا۔ میں نے دیکھا، اس کا سر پانی میں اوندھے پڑے پتھریلے مجسمے کے دیوہیکل کندھے سے ٹکرایا اور یقیناً کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

عمران کا دوسرا نشانہ ارجن کے قریب کھڑا دراز قد پہرے دار تھا۔ یہ گولی سر میں لگی اور بھیجا پھاڑ کر نکل گئی۔ نوعمر رضا کار لڑکا اندھا دھند بڑے ہال کی طرف بھاگا۔ عمران نے اس کی طرف رائفل سیدھی کی۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں آیا کہ عمران اسے نشانہ نہ بنائے مگر میری سوچ کے مکمل ہونے تک وہ نشانہ بن چکا تھا۔ اسے پشت پر دو گولیاں لگیں اور وہ بھاگتے بھاگتے دو تین قلابازیاں کھا گیا۔

یہ سب کچھ بس دو یا تین سیکنڈ کے اندر رہا۔ استھان میں ایک دم کہرام سا مچ گیا۔ لوگ ہڑبڑا کر اُٹھے اور دھماکوں کے ماخذ کی طرف بڑھے۔ کچھ رائفلیں بھی لہراتی ہوئی نظر آئیں۔

ہم سلطانہ، طلال اور گرو وغیرہ سمیت الٹے قدموں سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ یہ سیڑھیاں ہمیں بالائی منزل کی اس راہداری کی طرف لے جاسکتی تھیں جو نکاسی کے راستے کی طرف جاتی تھی۔

یکا یک ایک کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”رک جاؤ...... یہیں رک جاؤ۔ میں گولی چلا دوں گا۔“

میں نے دیکھا، ایک دیوار کی اوٹ میں نیم سرخ آنکھوں والا ستیش موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید رائفل تھی۔

ستیش کی اس للکار نے اردگرد موجود ہر شخص کو چوکس کر دیا۔ کئی رائفلیں نظر آئیں اور رائفل بردار ہماری سمت بڑھے۔ اب فائر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عمران کی طرح اقبال نے بھی چادر اتار پھینکی اور رائفل سیدھی کر لی۔ میں پہلے ہی کولٹ پسٹل جیب سے برآمد کر چکا تھا۔

عمران کے اشارے پر میں نے پسٹل کی نال گروسو بھاش کی کنپٹی سے لگا دی۔ عمران اور اقبال نے اپنی رائفلیں مخالفین پر تان رکھی تھیں اور اپنی انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لی تھیں۔ کسی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ دونوں طرف سے کوئی ایک گولی بھی چل جاتی تو پھر خون ریزی کو روکنا ممکن نہیں تھا۔

عمران نے ستیش کا نشانہ لے رکھا تھا اور ستیش نے شاید عمران کا۔ عمران کی جانی پہچانی گرج میرے کانوں تک پہنچی۔ ”ستیش! ہمیں روکنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے گرو کی لاش گرے گی...... پھر اس کی پتنی پندرہ بیس ٹکڑوں میں تبدیل ہوگی۔ ہم نے اس کی کمر سے ٹی این ٹی باندھ رکھا ہے۔ بس...... یہ ایک بٹن دبانے کی ضرورت ہے۔“ عمران نے گرین رنگ کا ریموٹ کنٹرول ہوا میں لہرایا۔

عمران کی طراری اب سمجھ میں آرہی تھی۔ اس کی سوچ ہمیشہ سے بڑی تیز رفتار رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اس نے ارجن سمیت تین افراد کو گولی سے اُڑایا تھا تو اس عمل میں تھوڑی سی سفا کی نظر آئی تھی، خاص طور سے نوعمر لڑکے کے قتل میں...... لیکن اس کا یہ اقدام بلا وجہ نہیں تھا۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی بچتا تو گروسو بھاش کی وہ حیثیت نہ رہتی جو اب تھی۔

اب وہ استھان کا غدار نہیں تھا۔ زہریلی تاڑی سے اس کا تعلق صیغۂ راز میں تھا۔ اب اس کی

جان کی پروا کی جا سکتی تھی...... اور ستیش اور اس کے رائفل برداروں کی باڈی لینگوئج بتا رہی تھی کہ وہ پروا کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

عمران نے اشارہ کیا۔ ہم سب الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔ جوں جوں ہم پیچھے ہٹتے گئے، ستیش اور اس کے ساتھی آگے بڑھتے گئے۔ ان میں گاڑی بان بھولا ناتھ بھی تھا۔ اس کی اونچی ناک کے دونوں طرف اس کی عقابی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہمارے پیچھے ہٹنے والے ہر قدم کے بدلے ستیش اور اس کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھا رہے تھے لیکن گولی چلانے کی ہمت ابھی تک کسی کو نہیں ہوئی تھی۔

ہم سیڑھیوں پر پہنچے تو ستیش نے ایک بار پھر خونی لہجے میں دھمکی دی۔ ''ہم تم لوگن کو اس طرح یہاں سے نکلنے ناہیں دیں گے۔ ہمیں گولی چلانا پڑے گی۔''

گروسو بھاش گڑگڑایا۔ ''ستیش! انہوں نے رادھا کی کمر سے بارودی پیٹی باندھ رکھی ہے، یہ بٹن دبا دیں گے۔''

گرو کی آواز میں دل دوز فریاد چھپی تھی۔ وہ ستیش سے اپنی اور اپنی پتنی کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ دوسری طرف ستیش اور پٹیل وغیرہ کو شرمناک شکست نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی جس مجرمہ کو جان ہتھیلی پر رکھ کر حکم جی کے ہرکاروں سے چھین کر لائے تھے، وہ ان کے ہاتھوں سے بھی چھن رہی تھی۔ اپنی قرار واقعی سزا کے قریب پہنچ کر وہ صاف بچ رہی تھی۔

ستیش نے پھر کہا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اتنا بڑا پاپ نہ کرو۔ یہ تم کو ہضم ناہیں ہووے گا اور نہ ہم ہونے دیں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، چلاؤ گولی اور دیکھو تماشا۔'' اقبال نے بے پناہ اعتماد سے کہا۔ عمران اور اقبال کا یہی اعتماد تھا جو حریفوں کو لرزہ براندام کر دیتا تھا۔

ہم قدم قدم پیچھے ہٹتے گئے...... ستیش اور اس کے ساتھی قدم قدم آگے بڑھتے گئے۔

اب ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے تھے اور اس طویل راہداری میں تھے جس کی دونوں جانب ہوا کی آمدورفت کے لئے روزن سے بنے ہوئے تھے۔ سب سے آگے عمران اور اقبال تھے۔ دونوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ ان کے عقب میں گرو، رادھا اور میں تھے۔ میں نے پسٹل کی نال گرو کے گنجے سر سے لگائی ہوئی تھی۔ آخر میں سلطانہ اور طلال تھے۔ درحقیقت اس استھان کے اصل رکھوالے تو وہی بیس بائیس پہرے دار ہی تھے جو تاڑی کی وجہ سے مدہوش پڑے تھے۔ یہ جو دوسرے لوگ تھے، ان میں ستیش اور اس کے ایک دو ساتھیوں کے علاوہ کسی میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ پورے جی جان سے ہمارے مقابل آ سکتا۔

یکایک ستیش کے چہرے پر شدید اضطراب کے آثار نظر آئے، شاید اس نے کچھ بھانپ لیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کر پاتا، عمران اور اقبال جیسے کسی طے شدہ پروگرام کے مطابق تیزی سے دائیں بائیں ہٹے اور انہوں نے راہداری کا ایک آہنی دروازہ بڑی پھرتی سے بند کر دیا۔ تڑتڑ کی خوفناک آواز سے تین چار گولیاں چلیں لیکن انہوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ایک گولی اقبال کے سر کے اوپر سے گزر گئی، دو دروازے کے آہنی تختوں سے ٹکرائیں۔ عمران اور اقبال نے تیزی سے دروازے کا آہنی کھٹکا چڑھا دیا۔

''بھاگو۔'' عمران نے پکار کر کہا۔

ہم سب پلٹ کر دوڑے۔ دوسری طرف دروازے کو اندھا دھند دھکے دیئے جا رہے تھے لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی ٹینک کو پستول کی گولی سے توڑنے کی کوشش کی جاتی۔ یہ بہت وزنی دروازہ تھا۔ گروسو بھاش کو ہمارے ساتھ بھاگنا پڑ رہا تھا لیکن یہ کام اس کے لئے جتنا مشکل تھا، اتنا ہی مضحکہ خیز بھی تھا۔ اس کی توند بُری طرح ہل رہی تھی اور لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اپنی توند کے بوجھ کی وجہ سے اوندھے منہ گر جائے گا۔ ہم نے ڈیڑھ دو سو میٹر کا فاصلہ تیزی سے طے کیا اور جھاڑ جھنکاڑ سے بند راستے کو کھول کر کھلی جگہ پر آ گئے۔ یہاں دو گھوڑا گاڑیاں موجود تھیں۔ گاڑی بان اندر ہی کمبل لپیٹے سو رہے تھے۔

عمران نے ایک گاڑی میں گھس کر گاڑی بان کو رائفل کے ٹھوکے سے جگایا۔ وہ سکھ تھا۔ وہ ششدر نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گروسو بھاش کو پہچان لیا۔

عمران نے کہا۔ ''سردار! گرو جی کے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ ان کو محفوظ جگہ پر پہنچانا ہے۔ گاڑی ہانکو اور جتنی رفتار سے چل سکتے ہو چل پڑو۔''

سکھ گاڑی بان نے کہا۔ ''گرو جی کے لئے تو جان بھی حاضر ہے جی...... پر وہ ہے کون جو گرو جی کا دشمن ہو رہا ہے......؟''

''اس کا تو ابھی ٹھیک سے ہم کو بھی پتا نہیں۔'' اقبال نے کہا۔

اس دوران میں عمران نے دوسری گھوڑا گاڑی کے دونوں گھوڑے کھول دیئے اور انہیں چھڑیاں مار کر بھگا دیا۔ اب کوئی اس دوسری گاڑی پر ہمارا پیچھا نہیں کر سکتا تھا۔ ہم سب سلطانہ اور طلال سمیت گاڑی پر سوار ہو گئے۔ گرو ابھی تک تذبذب میں کھڑا تھا۔ عمران نے تحکم سے کہا تو وہ اور اس کی پتنی بھی سوار ہو گئے۔ عمران کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ابھی میاں بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ گرو اور رادھا کے سوار ہوتے ہی گاڑی تیزی سے روانہ ہو گئی۔ ہم کچھ دیر تک ایک ڈھلوان راستے پر اُترتے رہے۔ خوشبو کی زبردست لپٹیں ہمارے نتھنوں تک

پہنچیں۔ میں نے نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ہم واقعی ایک بہت بڑی پھلواری سے گزر رہے تھے۔ تاروں کی روشنی میں دور تک پھول دار پودوں کے سلسلے نظر آتے تھے۔ دن کے وقت یہ منظر واقعی قابلِ دید ہوگا۔ ہم استھان سے دور آ گئے تھے مگر ابھی تک خطرے سے دور نہیں تھے۔ عمران اور اقبال پوری طرح چوکس تھے۔ ان کی نگاہیں عقب میں دور تک دیکھ رہی تھیں۔ میری نگاہوں میں بار بار وہ منظر گھوم رہا تھا۔ جب تاڑی کے کڑک نشے میں ڈگمگاتا ہوا ارجن پیٹ میں گولی کھا کر تالاب نما پانی میں گرا تھا اور اس کا سر بت کے شانے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوا تھا۔ شکیلہ کا کم از کم ایک قاتل تو میری نگاہوں کے سامنے اپنے انجام کو پہنچا تھا۔

O......❖......O

جب دن کا اُجالا پھیلا، ہم اس قدیم استھان کی مہلک تاریکی سے قریباً تیس میل دور آ چکے تھے۔ یہ کٹا پھٹا جنگلی علاقہ تھا۔ کہیں کہیں راستہ مسدود ہو جاتا اور ہمیں چکر کاٹ کر آگے بڑھنا پڑتا۔ راستے میں دو تین جگہ گھوڑوں کو آرام بھی دینا پڑا۔ اب ہم جنتر کے درختوں سے ڈھکے ہوئے ایک نشیبی علاقے میں تھے اور خود کو کافی محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ گھوڑے بُری طرح تھک گئے تھے۔ ہمارے انجر پنجر بھی ہل گئے تھے۔ عمران نے گاڑی ایک ایسی ہموار جگہ پر رکوائی جہاں درخت جھنڈ کی صورت میں موجود تھے اور پانی بھی تھا۔

گھوڑے پانی پر لپک پڑے۔ ہم بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے نیچے اُتر آئے۔ عمران کے چہرے سے خشونت رخصت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک بار پھر شگفتگی کا ڈیرا تھا۔ ہم نے راستے میں بہت کم بات کی تھی اور میں تو تقریباً خاموش ہی رہا تھا۔ وہ مفلر نما گرم کپڑا بھی میں نے چہرے پر لپیٹ رکھا تھا جو عمران نے استھان میں مجھے دیا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ نیم تاریکی میں ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ دوسروں کے برعکس میں صرف ایک ہلکی پھلکی قمیص میں تھا۔ سردی گرمی کو برداشت کرنا مجھے اچھا لگتا تھا اور اب میرا جسم اس کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ میری جیکٹ گاڑی میں موجود تھی لیکن میں اسے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

عمران نے گرو کو گاڑی سے باہر بلایا اور کہا۔ ”جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس شکیلہ نام کی لڑکی کی موت کے بدلے تم دونوں کو یہاں کسی کیچڑ والے گڑھے میں زندہ دفن کر دیا جائے تا کہ تم قیامت تک سردی سے ٹھٹھرتے رہو۔ اس بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟“

گرو نے پرنام کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں تمہیں بتا چکا ہوں امیت...... میں استھان کا کارِمختار ناہیں ہوں۔ مجھ سے صرف رائے لی جاوت ہے جو میں

پوتھیوں (کتابوں) کے مطابق دے دیوت ہوں۔ میں کسی کو بچا سکتا ہوں نہ مار سکتا ہوں۔“

”تو پھر تمہاری کیا مرضی ہے؟ کیا تم استھان میں واپس جانا چاہتے ہو؟“ اقبال نے پوچھا۔

گرو کا جواب غیر متوقع تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب میرے لئے وہاں بھی بہت خطرہ ہووے گا۔ مجھے اب وشواس ناہیں کہ تاڑی میں دھتورا ملانے والی بات زیادہ سے چھپی رہ سکے گی۔ لوگن یہی کہیں گے کہ میں نے اپنی اور پتنی کی جان بچانے کے لئے اپنے ہی ساتھیوں کی جان لی ہے۔“

”تم نے کس کی جان لی ہے؟ تمہارا دوش تو صرف اتنا ہے کہ تم نے پہرے داروں کو دھتورے والی تاڑی پلائی ہے۔“

”میرے وچار میں بات اس سے بڑھ کر ہے۔ تاڑی نے پہرے داروں کو صرف بے ہوش ناہیں کیا۔“

”کیا مطلب؟“

”ان میں سے کئی مر گئے ہیں۔“ گرو نے دل فگار لہجے میں کہا۔ ”میں نے جب پہرے دار کی جیب سے چابیاں نکالی تھیں، اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا...... اس کی سانس بند ہو چکی تھی۔ ایک دوسرے پہرے دار کو بھی میں نے اسی حالت میں دیکھا ہے۔“

ہم سناٹے میں رہ گئے۔ پتھریلی دیوار کے پاس پہرے دار جس طرح گرے پڑے تھے، وہ منظر واقعی تشویش ناک تھا...... مگر ان میں سے کچھ یکسر ختم ہو چکے تھے، یہ بات اب گرو سے پتا چل رہی تھی...... گرو کراہتے ہوئے بولا۔ ”اس کے علاوہ جو تین لوگن تمہاری گولیوں سے مرے ہیں، ان کی موت کا کارن بھی تو میں ہی ٹھہرتا ہوں...... مجھے ناہیں لگتا کہ اب میں اور رادھا واپس استھان جا سکت ہیں۔“

”تو پھر کیا چاہتے ہو؟“ عمران نے پوچھا۔

”کچھ سمجھ میں ناہیں آتا۔ مم...... میں برباد ہو کر رہ گیا ہوں۔“ گرو بے دم سا ہو کر ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گیا۔ عمران کی فطری شوخی عود کر آئی۔ وہ گرو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اتنی ٹھنڈی ٹھار زمین پر دھرنا دو گے تو تمہاری تشریف سن ہو جائے گی۔ دماغ تو تمہارا پہلے ہی سن ہو چکا ہے، اوپر نیچے سے مفلوج ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے۔ تمہارے لئے میرا ایک مشورہ ہے۔ تمہارے جیسے برباد حال اور بے ٹھکانا لوگوں کے لئے ایک بڑی اچھی جگہ ہے میرے پاس۔ نیوز چینل ”فساد پلس“ میں وہاں تمہیں ملازمت دلا سکتا ہوں۔ دماغ تو تمہارا آل

ریڈی سن ہے، تم بڑی آسانی سے اینکر پرسن بن سکو گے۔ اینکر پرسن سمجھتے ہو نا تم؟ وہی شخص جو تین چار افراد کو سامنے بٹھا کر سوال پوچھتا ہے اور کسی کو جواب نہیں دینے دیتا اور جب کوئی جواب دینے لگتا ہے تو بریک لے لیتا ہے۔"

"اور اس کی بیوی کا کیا بنے گا؟" اقبال نے پوچھا۔

"گرو صاحب کی توند دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ وہ بڑے اچھے کھانے پکا لیتی ہوگی۔ اس لئے اسے آسانی سے کسی کھیلوں کے پروگرام کی میزبان بنایا جا سکتا ہے۔" عمران نے کہا۔

"کھیلوں کی میزبان؟" اقبال نے حیرت ظاہر کی۔ "اگر وہ اچھے کھانے پکاتی ہے تو پھر اسے کسی کوکنگ پروگرام کی میزبان ہونا چاہئے۔"

"اوئے باندر! کوکنگ پروگرام کی میزبان تو بنے گی کوئی کھلاڑی۔ ان ٹی وی چینلز میں کوئی کام ڈھنگ سے ہو جائے تو پھر یہ انتظامیہ کی بہت بڑی نالائقی سمجھی جاتی ہے۔ منتظم افراد کو دقیانوس اور نامعقول گردانا جاتا ہے۔ وہ شرم سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ گرو جی! آپ فرمائیں کیا پروگرام ہے؟"

گرو نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ ناہیں آ رہا۔ جو کچھ ہم دونوں کے ساتھ ہونے والا ہے...... اس سے تو بہتر ہے کہ تم ہمیں گولی ہی مار دو۔"

عمران نے سوالیہ نظروں سے اقبال کی طرف دیکھا۔ وہ جھٹ بولا۔ "نیکی اور پوچھ پوچھ۔" وہ جلدی سے گھوڑا گاڑی میں گیا اور رادھا کو لے کر باہر نکل آیا۔ وہ ساڑھی میں تھی۔ اوپر سے اس نے ایک گرم شال لے رکھی تھی۔ وہ سکڑی سمٹی ہوئی باہر آئی۔ استھان میں چلنے والی گولیوں اور ان سے ہلاک ہونے والے تین افراد کی موت کا منظر جیسے اب تک اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ عمران کے کندھے سے لٹکی ہوئی رائفل کو بے حد ہراساں نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "یہ کیا کرنے لگے ہو اقبال؟" عمران نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"گرو جی کو قتل کرنے لگا ہوں۔"

"لیکن یہ تو گرو کی پتنی ہے؟" عمران نے کہا۔

"اسی میں تو گرو کی جان ہے یار! اسے ماروں گا تو گرو خود بخود عالم بالا کی سیر کو نکل جائے گا۔"

عمران نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ گرو اور رادھا دونوں کے رنگ ہلدی کی طرح نظر آنے لگے۔ ہونٹ سیاہ پڑ گئے۔ عمران نے رادھا کو کچھ فاصلے پر اس طرح بٹھا دیا کہ اس کی

ٹیک ایک درخت کے ساتھ لگ گئی۔ اقبال نے سبز ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے لیا۔ رادھا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن آواز اس کے گلے میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ وہ جوان تھی، خوب صورت تھی۔ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک بڈھے، بے ڈھنگے شوہر کی وجہ سے اسے بھی موت کا مزہ چکھنا پڑ رہا تھا۔ اس نے گھگیائی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ غالباً بھگوان کا واسطہ دیا کہ اس کی جان بخش دی جائے...... عمران اور اقبال نے بالکل کان نہیں دھرے۔

عمران نے کہا۔ "میرے خیال میں سلطانہ کو بھی یہ منظر دکھانا چاہئے۔ وہ کہاں ہے؟"

اقبال نے آگے جا کر گاڑی میں جھانکا اور بتایا کہ وہ سو رہی ہے۔

وہ راستے میں بھی اونگھتی رہی تھی اور اب گاڑی کے اندر ہی سوئی ہوئی تھی۔ اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ واقعی سوئی ہوئی ہے یا اردگرد سے ناتا توڑنے کے لئے ایسا ظاہر کر رہی ہے۔ راستے میں طلال نے عمران کو چپکے سے بتایا تھا کہ اس کی خالہ کو وہاں استھان میں کوئی ایسی شے کھلائی جاتی رہی ہے جس وہ زیادہ تر اونگھتی رہی ہیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کال کوٹھڑی میں بھی اپنی مزاحمت جاری رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں زنجیر پہنائی گئی اور اسے کوئی نشہ آور دوا بھی دی جاتی رہی......

سکھ گاڑی بان نے عمران کی ہدایت پر خشک لکڑیاں جمع کر کے الاؤ بھڑکا دیا تھا اور اب عمران بڑے سکون سے اس الاؤ کے پاس آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور جیکٹ کی جیب سے چنے نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس شخص نے ابھی چند گھنٹے پہلے تین افراد کو جان سے مارا ہے۔ وہ گرو کو سرتاپا دیکھتے ہوئے بولا۔ "یار اقبال! مجھے نہیں لگتا کہ یہ اپنی پتنی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد یہ خود بخود مر جائے گا۔"

"نہیں مرے گا تو کیا ہوگا۔ ایک گولی ہی اور ضائع کرنا پڑے گی۔"

عمران نے پہلی بار اقبال کو اس کے اصل نام سے مخاطب کیا تھا۔ یہ نام سن کر گرو سوبھاش کو پتا چل گیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس کے مردہ چہرے پر ذرا سی زندگی جھلکی۔ وہ آخری کوشش کے طور پر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں ایک بار پھر کہتا ہوں، میں بالکل نردوش ہوں۔ وہاں استھان میں مجھ سے صرف رائے لی جاتی تھی جو میں پوتھیوں میں سے پڑھ کر دے دیتا تھا۔ میں اور کچھ ناہیں کرتا تھا۔"

"تم سب کچھ کرتے تھے اور کر سکتے تھے۔" عمران نے ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔ "جب تم میاں بیوی کو اپنی جان کا خطرہ پڑا تو تم نے دھرم کو موم کی ناک بنا لیا۔ جو شبھ گھڑی تم نے پانچ منٹ میں ڈھونڈ لینی تھی، وہ تمہیں دو گھنٹے بعد بھی نہیں ملی۔ پھر تم نے پوتھیوں کے اندر سے ہی

یہ مسئلہ بھی ڈھونڈ لیا کہ اگر استھان میں خون ریزی کا خطرہ ہو تو...... جناب عالی...... تاڑی میں دھتورے والی بھنگ ملائی جاسکتی ہے اور یہ تو بس ایک دو چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں، ایسی پتا نہیں کتنی قلابازیاں تم اپنی مرضی سے لگاتے رہتے ہو اور اسے مقدس پوتھیوں کے سر تھوپتے رہتے ہو۔"

گرو لاجواب ہو گیا مگر اس نے اپنی داد فریاد جاری رکھی۔ وہ پھر گھگیایا۔ "دیکھو پرنتو! تم لوگن اس وقت غصے میں ہو اور غصہ بدھی کو کھا جاتا ہے۔ میں سچ کہوت ہوں، میرا ادھکار وہاں زیادہ ناہیں تھا۔ تم شبھ گھڑی کی بات کر رہے ہو، اگر میں وہاں دوسری بار بھی شبھ گھڑی نہ نکالتا تو پھر مجھے کیول ایک موقع اور دیا جاتا۔ اس میں بھی شبھ گھڑی نہ نکلتی تو ستیش وغیرہ بڑے گرو کی طرف سے خود ہی شبھ گھڑی نکال لیتے اور لڑکی کو جلا دیتے۔ میں سچ کہوت ہوں۔" گرو کی آواز زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اس نے اشک بار آنکھوں سے اپنی جوان پتنی کی طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو، جوانی اور خوب صورتی میں طاقت ہوتی ہے۔ تم بھی جان بچانے کے لئے کچھ کہو، شاید ان لوگوں کے دل پسیج جائیں۔

لڑکی سسک کر بولی۔ "تم لوگن مسلمان ہو اور میں نے سنا تھا کہ مسلمان اپنے قیدی سے اچھا برتاؤ کرت ہیں۔ بے شک ہم دونوں تمہارے اپرادھی ہیں مگر اپنے کرموں پر تم سے شرمندہ ہیں۔ ہاتھ جوڑ کر تم سے جیون کی بھیک مانگت ہیں۔" وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ "قیدی تو وہ بدنصیب شکیلہ بھی تھی۔ وہ بھی رو رو کر زندگی کی بھیک مانگتی رہی ہو گی۔"

گرو بلک کر بولا۔ "میں بڑی سے بڑی سوگند کھانے کو تیار ہوں۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے ستیش، پٹیل اور ارجن وغیرہ کرتے ہیں۔ خاص طور سے ستیش کی بات چلتی ہے اور ستیش وہی کچھ کرت ہے جو اس کی ماتا کہوت ہے۔ وہ بڑھیا بڑی کٹھور عورت ہے۔"

عمران بولا۔ "تم موت کو سامنے دیکھ کر خود کو اس کٹھور پن سے علیحدہ کر رہے ہو...... ورنہ تم بھی اس بے رحمی کا اٹوٹ انگ ہو۔ تمہاری منت سماجت پر تمہاری سزا تو معاف نہیں ہو سکتی۔ ہم بس اتنا کر سکتے ہیں کہ تمہیں زیادہ تکلیف نہ پہنچائیں اور جلدی سے تمہارے پرانوں کو تمہارے شریر (جسم) سے مکتی دلا دیں۔" عمران نے ریموٹ کنٹرول اقبال کے ہاتھ سے لے لیا۔

گرو جیسے مرنے سے پہلے ہی مر گیا۔ وہ فریادی انداز میں زمین پر گر پڑا اور دہائی دینے لگا۔ "میرا جیون بخش دو۔ میں سوگند کھاوت ہوں، جیون بھر تمہارا داس بن کر رہوں گا۔ تمہاری

غلامی کروں گا۔" وہ جانتا تھا کہ اگر عمران کہہ رہا ہے تو مار بھی دے گا۔ وہ استھان میں عمران کے ہاتھوں تین افراد کو خون میں نہاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

عمران اور اقبال لطف لے رہے تھے۔ عمران نے گرو کو حکم دیا کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھے۔

وہ اپنی توند سے مٹی جھاڑتا ہوا بیٹھ گیا۔ استھان میں سانڈ کی طرح دندنانے والا گرو یہاں اس ویرانے میں کیچوے سے زیادہ حقیر نظر آ رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ "میں نیوز چینل فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ میں نے اپنی فیلڈ میں بڑے بڑے مطلبی لوگ دیکھے ہیں لیکن تم تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔ ابھی تم نے فرمایا ہے کہ...... میرا جیون بخش دو...... یعنی اب تم اپنی داد فریاد میں سے اپنی پتنی کو بھی خارج کر دیا ہے۔ صرف خود کو بچانا چاہتے ہو۔ تمہارا یہ فقرہ سنہری حرفوں میں لکھا جانے کے قابل ہے...... بھئی واہ۔"

"ناہیں...... ناہیں...... وہ تو بے دھیانی میں کہہ دیا...... ہم دونوں تم سے جیون کی بھکشا مانگت ہیں۔" گرو کراہا۔

رادھا ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اقبال نے آگ کے پاس بیٹھتے ہوئے، رائفل گود میں رکھی اور بولا۔ "تم نے لوگوں کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ دھرم کو جدھر چاہو اپنی مرضی سے موڑ لیتے ہو۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تمہارا ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر جاپ کرنا ہے۔ بتاؤ، اس معاملے میں تم لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو یا نہیں؟"

گرو کا سارا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس لرزش کی وجہ سے اس کی گرد آلود توند میں بھی ارتعاش تھا۔ اس نے اپنی ناک سے بہنے والا رقیق مادہ، اپنی چادر کے پلو سے صاف کیا اور پھر نہایت ندامت سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیوں کرتے تھے ایسا؟" اقبال نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ اقبال نے زیادہ کرخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو وہ کراہا۔ "میری عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ شریر میں اتنی شکتی ناہیں اس لئے...... ایسا کرنا پڑا......" اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"تمہاری عمر زیادہ ہو گئی ہے، شریر میں طاقت نہیں اس کے باوجود تم نے ایک نوعمر لڑکی کو پتنی بنایا ہوا ہے...... اس کا مطلب ہے جب تم اور زیادہ بوڑھے ہو جاؤ گے تو تین چار پتنیوں کے بغیر تو تمہارا گزارا ہی نہیں ہو گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ تمہیں زیادہ بوڑھا ہونے ہی نہ دیا جائے۔ کیا خیال ہے عمران؟"

"بالکل بجا ارشاد فرماتے ہو تم۔" عمران نے تائید کی اور ریموٹ کنٹرول کو 'ایکٹی ویٹ' کر دیا۔ ایک ننھا سا سرخ بلب جل اُٹھا۔ گرو کی گھگی بندھ گئی۔ رادھا کا رہا سہا لہو بھی نچڑ گیا۔

بالکل آخری کوشش کے طور پر گرد نے ایک بار پھر وہی انداز اختیار کیا اور ٹھنڈی جگہ پر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کے ہاتھ عمران کے پاؤں کو چھو رہے تھے۔ وہ زندگی کے لئے گڑگڑایا۔ ''ہمیں شما کر دو۔ میں تمہیں وچن دیوت ہوں، ہم دونوں جیون بھر تمہارے ادنیٰ سیوک بن کر رہیں گے۔ جو تم کہو گے وہ کریں گے۔ اپنی غلطیوں کا پرائشچت کریں گے۔ بس ہمیں ایک موقع دے دو......''

رادھا نے بھی اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا تھا اور گٹھڑی سی بن کر روتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ عمران ان دونوں کو چھوڑے گا یا نہیں لیکن کم از کم رادھا کے لئے میرے دل میں ایک نرم گوشہ ضرور موجود تھا۔ عمران نے میری طرف دیکھا، پھر اقبال کی طرف۔ کچھ دیر تک لرزاں و ترساں میاں بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ تب گہری سانس لے کر بولا۔ ''تم دونوں کو کچھ شرطیں ماننا ہوں گی......''

وہ دونوں جیسے بلک پڑے۔ یقیناً انہیں ایسے ہی محسوس ہوا تھا جیسے تختۂ دار پر عین آخری وقت میں زندگی کی نوید مل گئی ہو۔ گرد سو بھاش گھگیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہمیں ہر شرط منظور ہے۔ بغیر سنے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ ہم جیون بھر تمہاری غلامی کریں گے۔''

عمران نے ریموٹ کنٹرول کو ڈی ایکٹی ویٹ کر دیا۔ اس نے اقبال کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے رادھا کو کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ وہ معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس نے اسے کمر عریاں کرنے کو کہا۔ رادھا نے پہلے شال اتاری پھر ساڑھی کا پلو گرا کر کمر عریاں کر دی۔ اب مختصر چولی سے ساڑھی کی بیلٹ تک اس کا تراشا ہوا جسم دن کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ اقبال نے عمران کو آنکھ ماری پھر بڑی احتیاط سے بیلٹ کے اسٹریپس کھولنے شروع کئے۔ وہ کافی کس کر باندھی گئی تھی۔ کھولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ رادھا سی سی کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بالکل ساکت تھی۔ اس اندیشے سے شاید سانس بھی نہیں لے رہی تھی کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

یہ لمحے بڑے نازک محسوس ہو رہے تھے۔ گرد نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اقبال نے ذرا زور لگایا تو ایک اسٹریپ جھٹکے سے ٹوٹ گیا...... رادھا بے ساختہ چلا اُٹھی۔ ساتھ ساتھ وہ زیر لب اشلوک بھی پڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں اقبال رادھا کی کمر سے بیلٹ علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ ایک سنسنی خیز صورتِ حال کا اچھا دی اینڈ تھا۔ الاؤ کی آگ اب کافی بھڑک اُٹھی تھی اور ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو راحت پہنچا رہی تھی۔ دن کی روشنی میں قرب و جوار واضح دکھائی

دے رہے تھے۔ یہ علاقہ جنتر اور کیکر کے خودرَو درختوں سے اٹا پڑا تھا۔ پتوں پر اوس چمک رہی تھی اور یہ اتنی زیادہ تھی کہ زمین بھی نم نظر آتی تھی۔ ہلکی دھند سردی کے احساس میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب عمران نے گھوم کر کچھ دیکھا اور پکارا۔ ''پکڑو۔''

اقبال گھوڑا گاڑی کے قریب تھا۔ وہ عمران کی آواز سن کر پلٹا اور دوڑا۔ تب مجھے پتا چلا کہ اقبال کس کے پیچھے دوڑا ہے۔ بھاگنے والے سلطانہ اور طلال تھے۔ وہ نہ جانے کس وقت گاڑی سے نکلے تھے...... وہ اندھا دھند گھنے درختوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ سکھ گاڑی بان ہوشیار سنگھ لکڑیاں اکٹھی کر کے مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو سلطانہ اور طلال کو روکنے کے لئے ان کے راستے میں آیا۔ یہ کوشش اسے مہنگی پڑی۔ سلطانہ نے بھاگتے بھاگتے پوری قوت سے ہاتھ گھمایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ کلہاڑی ہوشیار سنگھ کی تھی اور اس نے گاڑی کی اگلی نشستوں کے نیچے چھپا رکھی تھی، سلطانہ نے وہاں سے نکال لی تھی۔ الٹی کلہاڑی کا وار ہوشیار سنگھ کی گردن پر لگا۔ وہ پیچھے کی طرف گرا اور خشک لکڑیاں اس کے ہاتھوں سے نکل کر چاروں طرف بکھر گئیں۔

میں اور عمران بھی ایک ساتھ الاؤ کے پاس سے اُٹھے اور اقبال کے پیچھے لپکے......

''رک جاؤ...... گولی مار دوں گا۔'' اقبال بھاگتے بھاگتے دھاڑا۔

وہ دونوں نہیں رکے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ بیس تیس قدم آگے جا کر طلال بُری طرح پھسلا اور ایک آٹھ دس فٹ گہرے بارشی گڑھے میں جا گرا۔ اس گڑھے کی تہ میں دو تین فٹ تک کیچڑ کھڑا تھا۔ کچھ آگے جا کر اقبال نے سلطانہ کو چھاپ لیا۔ سلطانہ نے گھوم کر بے دریغ سیدھی کلہاڑی کا وار کیا لیکن مقابل بھی کوئی معمولی نہیں تھا۔ اقبال نے تیزی سے جھک کر یہ وار بچایا۔ سلطانہ نے چلا کر دوسری مرتبہ کلہاڑی گھمائی۔ تاہم اس بار اقبال نے شروع میں ہی اس کی کلائی جکڑ لی۔ سلطانہ کے جسم میں وحشیانہ طاقت تھی۔ اس نے زور مارا اور اقبال جیسا شخص بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ وہ دونوں اوپر نیچے جنگلی گھاس میں گرے۔ سلطانہ اوپر تھی اور کسی صورت کلہاڑی چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ دیوانہ وار زور لگا رہی تھی۔ اسی دوران میں اقبال کی انگلی بے ساختہ رائفل کے ٹریگر پر دب گئی۔ دھماکے سے گولی چلی اور گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا بُری طرح اچھل کود کرنے لگا۔

میں سلطانہ کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی تندی تیزی اور بے خوفی کے

بارے میں جو کچھ سنا تھا، وہ آج میرے سامنے تھا۔ وہ ایک جنگجو راجپوت نظر آتی تھی۔ چند سیکنڈ کے لئے تو یہی لگا کہ شاید وہ اقبال کو بُری طرح گھائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

میں دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ میں نے اپنا صافہ نما کپڑا چہرے سے پھینکا تھا۔

''سلطانہ......سلطانہ۔'' میں نے پکار کر کہا اور اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ اس کے لمبے بالوں نے بکھر کر اس کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ چند لمحوں کے لئے تو یوں لگا کہ اس نے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا لیکن پھر یکا یک وہ بُری طرح ٹھٹکی۔ اقبال نے ایک جھٹکے سے کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔ ''سلطانہ! ہوش کرو، میں ہوں......''

چند سیکنڈ میں اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جیسے اس حیران کن صورتِ حال کا تجزیہ کر رہی تھی۔ تب اس کے چہرے پر ایک بار پھر خشونت نظر آئی۔ اس نے اپنا جسم چرایا اور کراہ کر بولی۔ ''مجھے چھوڑ دو...... مجھے جانے دو...... میں کسی کی ناہیں...... میرا کوئی ناہیں...... مجھے جانے دو۔ مجھے مر جانے دو۔''

''ہوش کرو سلطانہ...... میں مہروز ہوں...... تمہارا شوہر۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔'' میں نے اس کے شانوں پر اپنی گرفت سخت کر دی۔

''میرا کوئی ناہیں...... مجھے چھوڑ دو......'' اس نے ایک دم اپنے شانے چھڑائے اور اُٹھنا چاہا۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا پھر الٹے ہاتھ کا دوسرا تھپڑ۔ اس کے ریشمی بال اچھل کر رہ گئے۔ اس نے چند سیکنڈ کے لئے ششدر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے تھپڑوں نے اس کی ہسٹریائی کیفیت کو ایک دم کنٹرول کیا۔ اس کے جذبات کی شدت نے دفعتاً رخ بدلا۔ اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں گھاس میں اس کے قریب ہی بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا بازو اس کے شانوں پر رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ دل دوز آواز میں روتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ روتے روتے سسکنے لگی۔ ''میں اس کتے کو جندہ ناہیں چھوڑوں گی۔ میں اسے مار دوں گی...... یا خود مر جاؤں گی۔''

میں جانتا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ وہ اسی شخص کی بات کر رہی تھی جو میرے

دل کا بھی داغ تھا۔ وہ شیطان صفت جارج گورا کی بات کر رہی تھی۔

○......❖......○

میں نے ایک بار سلطانہ کو اپنے ساتھ لگایا تو پھر خود سے جدا نہیں کیا۔ اسی طرح اپنے ساتھ لگائے لگائے اسے میں گھوڑا گاڑی کی نیم گرم فضا میں لے آیا۔ اس کا آنسوؤں سے تر بتر چہرہ میرے سینے سے پیوست تھا۔ طلال کو کیچڑ آلود گڑھے سے نکالا جا چکا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ پر معمولی چوٹ آئی تھی۔ اقبال اور سلطانہ کی دھینگا مشتی میں جو ایک گولی اتفاقاً چل گئی تھی، اس نے ہوشیار سنگھ کے ایک گھوڑے کو زخمی کر دیا تھا۔ تاہم یہ زخم بھی سنگین نوعیت کا نہیں تھا۔ گولی، چتکبرے گھوڑے کی گردن کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ہوشیار سنگھ اس کی مرہم پٹی میں مصروف تھا۔ گرو سوبھاش اور رادھا اسی طرح الاؤ کے گرد سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔ سلطانہ کی کیفیت عجیب تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے زخموں سے چُور جسم میں جتنا بھی پانی ہے، وہ آج آنکھوں کے رستے بہا دے گی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والی گرم دھاریں میری گردن سے ہو کر میرے سینے تک جا رہی تھیں۔ وہ دل گیر آواز میں بولی۔ ''میں اپنا بدلہ لوں گی مہروز...... میں اس سفید سور کو یونہی ناہیں چھوڑوں گی۔'' اس کا لہجہ غیر معمولی تھا اور اس کا جذبہ بھی۔

میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میں زندہ ہوں۔ ابھی تم ایسی بات نہ کرو۔ اس شیطان کو میں اس کے انجام تک پہنچاؤں گا...... اگر میں نہ رہا تو پھر تمہارا جو جی چاہے کرنا۔''

اس نے میرے سینے سے سر اُٹھایا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان میں حیرت، خوشی، بے یقینی، بہت کچھ یکجا ہو گیا تھا۔ شاید اسے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے جو الفاظ سنے ہیں، وہ میں نے کہے ہیں۔

میں نے اس کا سر دوبارہ اپنے ساتھ لگا لیا۔ پچھلے چند مہینوں میں سلطانہ نے مجھے بتدریج بدلتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ مجھے بہت زیادہ مختلف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہولے سے کہا۔ ''سلطانہ ڈیڑھ دو سال پہلے تم نے جس شخص سے شادی کی تھی وہ کوئی اور تھا۔ اب جو شخص تمہارے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھا ہے یہ اور ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، بہت کچھ بدل چکا ہے۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ تم دیکھنا، قدرت کی مدد شاملِ حال ہو گی۔ اس شخص کا انجام تمہاری توقع سے زیادہ برا ہو گا۔''

''میں تمہارے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی...... یہ میرے بس میں ہی ناہیں ہے۔'' وہ کراہی۔

"تو تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے لئے خطرہ مول لے لوں؟"

"میری بات چھوڑو مہروج...... میں اب مجرمہ بن چکی ہوں۔ میں نے چار بندوں کو قتل کیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔ اب یہ لوگن مجھے جندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور پھر جب میں نے مرنا اچ ہوئیں گا تو پھر کیوں نہ میں اس کتے کو مار کر مروں۔"

میں نے پُرعزم انداز میں اس کا شانہ دبایا۔ "کوئی تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا سلطانہ۔ تم نے جو دکھ سہنے تھے، وہ سہہ چکی ہو۔ اب کوئی آنچ نہیں آئے گی تم پر۔ میں تمہاری طرف بڑھنے والا ہر ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گا۔"

اس نے ایک بار پھر میرے سینے سے سر اُٹھایا اور حیرت آمیز انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی ناک بالکل سرخ ہو رہی تھی۔ گھنے بال نصف چہرے کو ڈھانپ رہے تھے اور نصف کو نمایاں کر رہے تھے۔ وہ دھوپ چھاؤں کا عجیب امتزاج تھی۔ کہیں آگ تھی، کہیں شبنم، کہیں ریشم تھی، کہیں فولاد...... میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہاں گھوڑا گاڑی کی اس نیم گرم فضا میں میرے اور سلطانہ کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ ننھے بالو کا ذکر بھی بار بار آیا۔ سلطانہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اس منحوس استھان میں کب اور کس طرح پہنچا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے یہ روداد بتائی۔ وہ یہ جان کر حیران ہوئی کہ میں ایک ہندو گوپال کی حیثیت سے اس استھان میں موجود رہا ہوں۔ سلطانہ نے طلال کو بھی اندر بلا لیا تھا۔ طلال کی پنڈلی پر چوٹ آئی تھی جہاں اقبال نے پٹی وغیرہ باندھ دی تھی۔ وہ خاموش آنکھوں والا ایک ناراض اور بہت گہرا لڑکا تھا۔ بہت کم بات کرتا تھا لیکن جتنی کرتا تھا، وہ بہت وزنی ہوتی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اس دبلے پتلے لڑکے نے اپنی خالہ کے ساتھ مل کر زرگاں میں چار باحیثیت افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے مگر جب اس کی خاموش آنکھوں میں کوندتی ہوئی نفرت میں جھانکا جاتا تو یقین آنے لگتا تھا۔ اس کی مسیں ابھی پوری طرح بھیگی نہیں تھیں لیکن چھاتی چوڑی اور قویٰ اسٹیل کی طرح سخت تھے۔ اسے اس بات کا سخت افسوس تھا کہ حکم کے بندوں نے ریسٹ ہاؤس سے ان دونوں کو پکڑنے کے بعد اس کی خالہ کو بُری طرح مارا پیٹا تھا اور وہ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا تھا۔ وہاں اسے خود جو چوٹیں لگی تھیں ان کی پرواہ اسے نہیں تھی۔

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ہم کھانا کھانے سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ یہ کھانا ہم کو چاچا عبدالغنی نے دیا تھا۔ ہم کو جرا بھی شک ناہیں تھا کہ اس میں کچھ ملا

ہوئیں گا۔ اگر ہم ہوش میں ہوتے تو حکم کے لوگن ہمیں ہاتھ بھی نہ لگا سکتے۔"

اس نے یہ بھی بتایا کہ استھان میں حراست کے دوران میں کچھ لوگ اسے ترغیب دیتے رہے ہیں کہ اگر وہ اپنا مذہب تبدیل کر لے تو وہ اس کی جان بخشی کر دیں گے۔

اسی دوران میں کہیں پاس سے فائر کی آواز آئی۔ یہ گن فائر تھا۔ میں بُری طرح چونک گیا۔ میں نے گھوڑا گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھا، فائر کی آواز یقیناً عمران نے بھی سنی تھی لیکن وہ مطمئن بیٹھا تھا۔

"یہ کیسی آواز تھی؟" میں نے کھڑکی سے سر نکال کر عمران سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ اقبال نے کوئی شیر وغیرہ مارا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، بہت دن ہو گئے ہیں شیر کے کباب کھائے ہوئے۔"

اقبال اردگرد موجود نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ فائر اس نے کیا ہوگا۔ جلد ہی صورتِ حال سمجھ میں آ گئی۔ اقبال اور سردار ہوشیار سنگھ ایک مادہ ہرن کو اُٹھائے ہوئے جھاڑیوں سے نمودار ہوئے۔ اس میں سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ عمران ایک دم خوش نظر آنے لگا۔ وہ پکار کر بولا۔ "تابی! باہر آ جاؤ...... مجھے لگتا ہے کہ ابھی تک تمہارا ولیمہ نہیں ہوا ہے۔ یہ بڑا اچھا موقع ہے اس فرض سے سبکدوش ہونے کا۔"

میں نے سنی اَن سنی کر دی۔ وہ گھوڑا گاڑی میں آ کر خود مجھے اور سلطانہ کو باہر لے گیا۔ اس کی نگاہوں میں سلطانہ کے لئے محبت تھی۔ اس نے اسے آگ کے قریب بٹھایا اور اس کے شانوں پر گرم چادر رکھی۔ پھر چہکا۔ "بھابی! اب میں آ گیا ہوں۔ اب تمہیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے اس نامعقول بندے کو میں تیر کی طرح سیدھا کر دوں گا۔ تمہارے اشاروں پر چلے گا۔ سمجھو کٹھ پتلی بن جائے گا، جس طرح چاہو نچا لینا...... لیکن اس کے لئے تمہیں بھی میری ایک بات ماننا پڑے گی۔ یہ دیکھو...... میں تمہارے پاؤں پکڑ لیتا ہوں۔ انکار نہ کرنا......"

اس نے واقعی شتابی سے سلطانہ کے پاؤں تھام لئے۔ سلطانہ نے گھبرا کر چھڑانا چاہا تو اس نے اقبال کو بھی اشارہ کر دیا۔ اس نے بھی جھٹ سلطانہ کے پاؤں تھام لئے...... اقبال ارا سا مسکرا رہا تھا۔ عمران نے بائیں ہاتھ سے اس کے سر پر جھانپڑ رسید کیا اور بولا۔ "کھوتے کے پتر! رونی صورت بناؤ۔ آنکھوں میں تھوڑی سی نمی لاؤ۔ بھابی کو منانا ہے، کوئی گوڈا پکڑائی وصول نہیں کرنی ہے۔"

اقبال نے فٹ رونی صورت بنا لی۔ عمران کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی تھی۔ "خدا

کے لئے بھابی! بس ایک بات ماننی ہے۔ پچھلی ساری باتوں کو بھول جانا ہے۔ جو کچھ ہوا، جیسا ہوا، سمجھو وہ بس ایک برا خیال تھا۔ گزر گیا، فنا ہو گیا۔ اگر اسے یاد رکھنا ہے تو ہم رکھیں گے۔ ہم تیرے بھائی...... تیرے نامعقول شوہر کے معقول یار...... ہاں، ہم وہ سب کچھ یاد رکھیں گے اور یاد رکھنے کا حق بھی ادا کریں گے۔ تیرا کلیجا ایسے ٹھنڈا کریں گے بھابی کہ انڈیا کا بچہ بچہ مدتوں تک یاد رکھے گا...... لیکن تمہیں ہماری بات ماننی ہے اور سب کچھ بھول جانا ہے......''

سلطانہ حیرت سے گنگ تھی۔ کبھی میری طرف دیکھتی، کبھی عمران اور اقبال کی طرف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا پالا کیسے لوگوں سے پڑا ہے۔ میں اسے کیا بتاتا۔ مجھے خود آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔

''میرے پاؤں چھوڑیں۔'' سلطانہ نے کراہ کر کہا۔

''چھوڑ دیتے ہیں بھابی! لیکن پہلے تمہیں وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر فوری طور پر وعدہ نہیں کر سکتی ہو تو کم از کم ہمیں امید ضرور دلانا پڑے گی۔'' عمران نے کہا۔

''اور امید دلانے کا طریقہ یہ ہے کہ تمہیں ایک بار...... مسکرا کر دکھانا ہوگا۔'' اقبال نے لقمہ دیا۔

وہ روہانسی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں پھر نمی جاگ گئی۔ ''میں ناہیں مسکرا سکتی۔'' وہ دل دوز انداز میں بولی۔

''بالکل...... بالکل غلط۔ بلکہ یہ فقرہ ہی غلط ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''خاص طور سے ایک مسلمان تو ایسا فقرہ ادا کر ہی نہیں سکتا۔ تم آج نہیں مسکرا سکتی ہو لیکن کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تم کل یا پرسوں بھی نہیں مسکرا سکو گی؟ اگلی جمعرات یا اگلے مہینے کی پندرہ بیس تاریخ تک بھی نہیں مسکرا سکو گی؟ یہ تو غیب دانی کا دعویٰ ہے اور ایسے دعوے اس گرو سوبھاش جیسے لوگ تو کر سکتے ہیں، ہم نہیں۔''

''تم نے بالکل غلط فقرہ کہا ہے بھابی! اب تو ہم تمہارے پاؤں بالکل نہیں چھوڑیں گے۔'' اقبال نے کہا۔

''اور مجھے رو کر نہ دکھانا۔'' عمران نے لقمہ دیا۔ ''میں تم سے زیادہ رو سکتا ہوں اور اگر میں ایک بار رو پڑوں تو پھر مجھے چپ کرانا آٹھ دس بندوں کا کام نہیں ہوتا۔ ہاتھوں سے نکل نکل جاتا ہوں...... پچھاڑیں کھاتا ہوں۔ محلوں کے محلے اکٹھے کر لیتا ہوں...... اور کئی بار تو روتے روتے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دیتا ہوں۔''

سلطانہ نے ایک بار پھر۔ بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

''اس نامعقول کی طرف نہ دیکھو بھابی!'' عمران نے اس کا چہرہ پھیر دیا۔ ''جو کچھ کرنا ہے، ہمیں کرنا ہے۔ تمہارے پاؤں چھوڑنے نہ چھوڑنے اور رو رو کر خود کو ہلکان کرنے جیسی ساری اتھارٹی ہمارے پاس ہے۔ تمہیں مسکرانا پڑے گا۔ اگر نقد و نقد نہیں...... مسکرا سکتی ہو تو ارادہ ظاہر کرنا پڑے گا۔ ارادے میں بڑی طاقت ہوتی ہے بھابی! آدھا ثواب تو ارادے سے ہی مل جاتا ہے۔ ہمیں بس تاریخ دے دو کہ کس دن مسکراؤ گی؟ ہم اسی سے مطمئن ہو جائیں گے۔''

سلطانہ کچھ بھی کہہ نہ پا رہی تھی۔ اقبال نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بھابی! چلو اتنا بتا دو کہ آج کی تاریخ میں مسکراؤ گی یا پھر کسی دن؟''

سلطانہ کی آنکھیں مسلسل رستی رہیں اور وہ کچھ بھی نہیں بولی۔ عمران نے کہا۔ ''میں اس کو تھوڑا سا اور آسان کر دیتا ہوں۔ آخر باڈی لینگوئیج بھی کوئی چیز ہوتی ہے بھابی! اگر تم...... اگر تم اپنا بایاں پاؤں ہلاؤ گی تو اس کا مطلب ہوگا کہ آج ہی کسی وقت ہمیں اپنی مسکراہٹ سے نوازو گی۔ اگر دایاں پاؤں ہلاؤ گی تو مطلب ہوگا کہ کسی اور دن۔ یعنی ٹوٹل انکار نہیں، ٹھیک ہے؟''

چند سیکنڈ بعد شاید سلطانہ کا پاؤں بے ساختہ ہی ہل گیا تھا۔ عمران چہکا۔ ''زبردست...... زبردست...... یور آر گریٹ بھابی! تم نے ہمارا مان رکھ لیا۔ چلو دایاں پاؤں ہلایا لیکن ہلایا تو سہی۔ کوئی بات نہیں۔ ہم تمہاری مسکراہٹ دیکھنے کے لئے دو چار دن اور انتظار کر لیں گے۔ شکریہ، تھینکس، دھنیواد۔ اب تم کہو گی کہ شکریہ کس بات کا؟ نہیں بھابی! یہ سب تکلف کی باتیں ہیں۔ اتنے بڑے حالات میں بھی تم نے مسکرانے کا وعدہ کیا، یہ کوئی معمولی بات نہیں...... سچ، میرا جی چاہتا ہے کہ خوشی سے الٹی قلابازیاں لگاؤں اور میں صرف محاورتاً نہیں کہہ رہا۔ میں لگا بھی سکتا ہوں، یہ تو میرا پروفیشن ہے۔ اگر تم کہو بھابی تو میں لگا کے بھی دکھا سکتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ سلطانہ کوئی ردِعمل ظاہر کرتی، وہ طلال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''خاموشی کا مطلب ہے نیم رضامندی...... یہ دیکھو۔''

وہ بیٹھے بیٹھے کسی طاقت اسپرنگ کی طرح اچھلا اور ہوا میں دو الٹی سمرسالٹ لگا کر عین اسی جگہ لینڈ کر گیا جہاں سے فضا میں بلند ہوا تھا۔ اس کی مہارت قابلِ دید تھی۔ میرے اور اقبال کے سوا سبھی دنگ رہ گئے۔ گرو کا چہرہ حیرت کی تصویر نظر آنے لگا۔ ہوشیار سنگھ جو اپنی سوجی ہوئی گردن پر ٹکور کر رہا تھا، آنکھیں پھاڑ کر عمران کو دیکھتا چلا گیا۔ ''واہ...... واہ۔ ایسا کام تو روسی سرکس والے کرتے ہیں یہاں انڈیا کے وڈے وڈے شہروں میں۔ یا پھر جمناسٹک

والے کھلاڑی ہوتے ہیں۔"

"میں تمہیں کیا لگتا ہوں...... کھلاڑی یا سرکس والا؟"

وہ مسکرایا۔"میری مت نہیں ماری ہوئی کہ آپ کو سرکس والا کہہ کر آپ سے جھانپڑ کھاؤں۔ میرے خیال میں تو آپ کھلاڑی ہی ہیں۔"

"اور مجھے لگتا ہے کہ تم پکے سردار ہی نہیں ہو کیونکہ میں نے سنا تھا کہ سردار چغد ہوتے ہیں۔"

ہوشیار سنگھ بولا۔"شاید تھوڑا بہت نام کا اثر ہے جی۔ ورنہ کام تو میرے بھی اکثر بڑے ہائی کلاس ہوتے ہیں۔" اس نے خاموش بیٹھی سلطانہ کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔"اب یہی دیکھ لیں۔ بی بی کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی لیکن مجھے دور سے یہ لگا کہ یہ ہانڈی میں پھیرنے والی ڈوئی ہے۔ یہ تو بھلا ہو میری بھین کا کہ انہوں نے الٹی ڈوئی...... میرا مطلب ہے کلہاڑی ماری ورنہ میرا تو جھٹکا ہو جانا تھا کھڑے کھڑے۔"

"حیرت ہے، تمہیں ڈوئی اور کلہاڑی کے فرق کا پتا نہیں چلا۔ حالانکہ وہ ٹائم بھی کوئی ایسا ویسا نہیں تھا۔" اقبال نے کہا۔

"میں سمجھ گیا جی! آپ بارہ بجے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن اب وہ بات پرانی ہو گئی ہے۔ اب ساری دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، گلوبل ولیج اور اس ولیج میں کہیں نہ کہیں تو بارہ بجے ہی رہتے ہیں...... ہو ہو ہو۔" وہ خود ہی منہ کھول کر ہنس دیا۔

اقبال نے جیب سے شکاری چاقو برآمد کیا اور تیزی سے ہرن کی کھال اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ ہوشیار سنگھ عارضی انگیٹھی بنانے کے لئے دو تین پتھر اُٹھا لایا۔

"مسئلہ نمک مرچ کا ہو گا۔" میں نے کہا۔

عمران فٹ بولا۔"تو میں یہاں کس لئے ہوں، فساد پلس کا نمائندہ میرا تو کام ہی نمک مرچ لگانا ہے۔ میں تو چودہ دن کے باسی آلو مٹر کو ایسا تڑکا لگا سکتا ہوں کہ وہ تر و تازہ تندوری چرغا بن جائے۔ یہ تو پھر ہرن ہے یار۔"

"تو پھر کرو اس کو نمکین؟" اقبال نے کہا۔

"تم اس کی کھال تو اتارو۔ تمہیں پتا ہی ہے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

"تم بھی کچھ مدد فرماؤ نا۔ کھال ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اقبال بولا۔

"مجھے بار بار یاد دلانا پڑتا ہے کہ میں چینل کا نمائندہ ہوں۔ چھوٹے موٹے کاموں سے میری توہین نہ کرو یار! کسی بال کی کھال اتارنی ہو یا کوئی اس سے بھی باریک شے ہو تو میرا

احسان لینا۔ میں تمہارے لئے نمک کا انتظام کرتا ہوں۔"

وہ اُٹھ کر گھوڑا گاڑی میں گیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک کاغذ میں، مناسب مقدار میں نمک لے کر آ گیا۔ میری طرح ہوشیار سنگھ بھی حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ نمک کہاں سے برآمد ہو گیا ہے۔ ہاں، اقبال کو حیرانی نہیں ہوئی۔

الاؤ اب خوب اچھی طرح بھڑک رہا تھا۔ ہوشیار سنگھ نے گوشت بھوننے کے لئے کافی سارے کوئلے بنا لئے تھے۔ میں نے سرگوشی میں عمران سے پوچھا۔"یہ نمک کہاں سے آ گیا؟"

"یار! جادو برحق ہے۔"

"مذاق نہیں۔ یہ کیا کیا ہے تم نے؟"

وہ مسکرایا۔"سچ بتاؤں؟"

"جی تو چاہتا ہے کہ کبھی یہ انہونی ہو جائے۔" میں نے کہا۔

اس کی آنکھوں میں بھید بھری چمک ابھری۔ وہ سرگوشی میں بولا۔"بارودی بیلٹ میں سے نکالا۔"

"بارودی بیلٹ؟ جو رھادا کی کمر سے اتاری ہے؟"

"ہاں۔"

"بارودی بیلٹ میں نمک بھی رکھا ہوا تھا؟"

"یار...... بس نمک ہی تو رکھا ہوا تھا۔" وہ ایک آنکھ میچ کر بولا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"یار! خود ہی تو سچ بولنے کو کہتے ہو پھر کچے پکے ہو جاتے ہو۔ اب یہ اپنا بھاڑ جیسا منہ بند کرو۔ مکھی گھس جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ گرو کو بھی شک ہو جائے۔ اگر اس کو پتا چل گیا کہ بیلٹ میں بارود اتنا بھی نہیں تھا، جتنا ہمارے سیاست دانوں میں خوفِ خدا ہوتا ہے تو پھر اس کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے، اسے لگے گا کہ اس کا تمام رونا دھونا بیکار گیا ہے...... ہمیں اس طرح کسی کی دل شکنی نہیں کرنی چاہئے۔"

"اور وہ ریموٹ کنٹرول؟" میں نے پوچھا۔

"یار! تم نے اس ہرے طوطے کو غور سے نہیں دیکھا۔ وہ تو "اڈاپٹر" ہے ایک واکی ٹاکی...... یونہی اقبال کو کہیں سے مل گیا تھا۔" وہ سرگوشی میں بولا۔

"مطلب کہ یہ سارا دھوکا تھا؟"

"دھوکا نہیں، تم اسے ڈراوا کہہ سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ استھان میں ہماری بے تو نہیں

بیٹھی ہوئی تھی، ہمارے لئے بارودی بیلٹس اور ریموٹ کنٹرول لے کر۔ جو کچھ آس پاس سے ملا، ہم نے اس سے کام چلایا۔"

میں بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا۔ "عمران! تم کب سے ہو یہاں؟"

"ایک بار پھر سچ بتاؤں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ "مجھے اور اقبال کو یہاں تقریباً ایک برس ہو چکا ہے۔ زبردست روداد ہے۔ سفرنامہ "نکلے تیری تلاش میں" اور اس طرح کی دوسری کارگزاریاں تو کوئی شے ہی نہیں ہیں۔ بہت جگہ کی خاک چھانی ہے تمہارے لئے جگر! آج رات کو ساری تفصیل بتاؤں گا۔"

اگلے دو تین گھنٹے ہم کافی مصروف رہے۔ بغیر مناسب ساز و سامان کے شکار شدہ ہرن کو کوئلوں پر بھوننا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے سات آٹھ بڑے بڑے پارچے بنائے گئے۔ ان میں کٹ وغیرہ دے کر نمک لگایا گیا اور پھر بڑی احتیاط سے بھونا گیا۔ یہ ایک مزے دار کھانا ثابت ہوا۔ عمران اسے چپکے چپکے میرے ولیمے کا نام دے رہا تھا اور اس حوالے سے معنی خیز باتیں کر رہا تھا۔ گرو سوبھاش اور رادھا نے گوشت نہیں کھایا اور بس بیٹھے تھوک نگلتے رہے۔ میری اور عمران کی کوشش کے باوجود سلطانہ نے بھی ایک دو لقموں سے زیادہ نہیں لئے۔ وہ بدستور گھمبیر کیفیت میں تھی۔ اس نے مجھ سے بس اتنا کہا۔ "کوچبان سے کہیں مجھے معاف کر دے۔ میں نے اسے کلہاڑی مار کر زخمی کر دیا ہے۔"

میں نے اس حوالے سے اسے تسلی دی۔ کھانے کے بعد سردار ہوشیار سنگھ پھر درختوں کی طرف نکل گیا۔ اس مرتبہ وہ خشک لکڑیوں کے ساتھ ساتھ خوبانی کی طرح کا ایک جنگلی پھل بھی لے کر آیا۔ یہ پھل ایک دفعہ میں نے بھی دیکھا تھا مگر بھوک کے باوجود کھانے کا رسک نہیں لیا تھا۔ یہ نیم میٹھا اور کسیلا پھل گرو اور رادھا کی پیٹ پوجا کے کام آ سکتا تھا لیکن ابھی تک وہ صدمے میں تھے اس لئے کھانے سے انکار کر دیا۔

سب موجودہ صورتِ حال سے مطمئن تھے۔ ہوشیار سنگھ کا بھی یہ خیال تھا کہ ہم استھان اور پھلواری سے کافی دور آ چکے ہیں اور گھنے درختوں سے گھری ہوئی اس ٹاپو نما جگہ پر بالکل محفوظ ہیں لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی کسی طرف سے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں گی اور زرگاں کے ان گنت گھڑسوار ہمیں گھیر لیں گے۔ یہاں میرے خوف کی وجہ میرے سوا اور کون جان سکتا تھا؟ ایک منحوس الیکٹرانک چپ میرے جسم میں موجود تھی اور ہر جگہ میرے دشمنوں کو میری لوکیشن کا سراغ دے رہی تھی۔ وہ جلد یا بدیر مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔

میں عمران کو جلد از جلد اس صورتِ حال کے بارے میں بتا دینا چاہتا تھا لیکن اس سے اکیلے میں اطمینان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ سردیوں کا چھوٹا سا دن جلد ہی مغربی افق کے پیچھے اوجھل ہو گیا اور اس ویران جگہ کو کہر آلود اندھیرے نے ڈھانپنا شروع کر دیا۔ ویرانے میں رات بسر کرنے کے حوالے سے ہوشیار سنگھ کافی ہوشیار اور تجربہ کار لگتا تھا۔ اس نے گھوڑا گاڑی کے چاروں طرف درختوں سے تین چار مشعلیں باندھ دیں اور دو تین الاؤ بھی دہکا دیئے۔ یوں گھوڑا گاڑی کی اندرونی فضا زیادہ گرم ہو گئی اور جنگلی جانوروں کی مداخلت کا خطرہ بھی کم سے کم ہو گیا۔ ہوشیار سنگھ ساری صورتِ حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم گرو سوبھاش کو کسی سے بچانے کے لئے استھان سے نہیں بھاگے تھے بلکہ گرو کو لے کر بھاگے تھے اور اس لئے لے کر بھاگے تھے کہ گرو کا "بیش بہا علم" ایک بے قصور لڑکی کو واجب القتل ٹھہرانے والا تھا۔ مکمل صورتِ حال جاننے کے بعد اب ہوشیار سنگھ کی ساری ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہو گئی تھیں اور وہ ایک ساتھی ہی کی طرح ہمارے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ وہ خاصا زندہ دل شخص تھا۔

عمران مسلسل اس کوشش میں تھا کہ سلطانہ اور طلال اپنی افسردہ کیفیت میں سے نکل آئیں۔ اس نے اقبال کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت بھیانک آواز میں گا سکتا ہے۔ اگر یہ گانا شروع کر دے تو رات بھر کوئی جنگلی جانور ہمارے قریب نہیں پھٹکے گا۔"

پھر وہ ایک واقعہ سنانے بیٹھ گیا۔ "ایک بار ہم ضلع شیخوپورہ میں سور کے شکار پر تھے۔ ہمارے سرکس کے مالک چودھری اشفاق، اسسٹنٹ منیجر عباس گوجرانوالہ کے ڈی پی او اور کچھ دیگر لوگ بھی ساتھ تھے۔ ہم اپنا شوق پورا کرنے کے لئے گھوڑوں پر سوار تھے۔ رات کو ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ جنگلی سوروں کے حملے کا ڈر تھا۔ رات کو اقبال کی ڈیوٹی لگی۔ یہ ایک خالی ٹین بجاتا اور ساتھ ساتھ اپنی کرخت آواز میں گاتا رہا۔ اس کی آواز کے سبب جانور تو دور ہی رہے، ہمارے اپنے گھوڑوں میں سے بھی تین ڈر کر بھاگ گئے۔"

عمران اور اقبال کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھونک شروع ہو گئی۔ طلال ان پُرمزاح باتوں میں تھوڑی تھوڑی دلچسپی لینے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد باقی لوگ سونے کے لئے گھوڑا گاڑی میں چلے گئے۔ میں، اقبال اور عمران آگ کے گرد بیٹھے رہے۔ میں نے الاؤ کے شعلوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ "عمران! میں تم دونوں کو ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔"

"لیکن تم کچھ خاص باتیں سننا بھی تو چاہتے ہو۔" عمران نے کہا۔ "اب فیصلہ کر لو، پہلے خاص باتیں سناؤ گے یا سنو گے؟"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، پہلے تم سنالو پھر میں بتاتا ہوں۔''

عمران نے کسی کہانی گو کی طرح ایک درخت سے ٹیک لگائی۔ شعلوں کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا۔ سرد ہوا میں اُڑتی ہوئی چنگاریاں ماحول کو گرما رہی تھیں۔ ثروت، عاطف اور فرح کے بارے میں تفصیل جاننے کے لئے میری بے تابی پھر بڑھتی چلی گئی۔

عمران نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ''وہ بڑے دردناک دن تھے تابی! جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کے درد سے بھرے ہوئے۔ میں اسپتال میں تھا۔ وہیں پر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیفنس والی کوٹھی میں تمہاری والدہ کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ انہیں قتل کیا گیا ہے اور یہ قتل سیٹھ سراج اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے۔ تمہارا بھائی اور بہن فرح دونوں اوجھل تھے۔ ان کے بارے میں امید تھی کہ وہ نکل جانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ میں سب سے پہلے انہیں تلاش کر کے کسی محفوظ جگہ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف چھوٹی میڈم نادیہ اسپتال میں دم توڑ چکی تھی اور میڈم صفورا کا غم وغصہ پورے عروج پر تھا۔ میں زخمی حالت میں ہی اسپتال سے نکل آیا تھا۔ تین چار دن کی سرتوڑ کوشش کے بعد میں اور اقبال عاطف کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ گوجرانوالہ میں تھا۔ میں نے عاطف اور فرح کو فوراً راولپنڈی پہنچادیا۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈھونڈنے اور سیٹھ سراج سے حساب برابر کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ میرے ایک خاص بندے نے مجھے اطلاع دی کہ سیٹھ سراج اور شیرا زیرزمین جا چکے ہیں اور اب چند مہینوں تک سامنے نہیں آئیں گے۔ میڈم صفورا کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ اپنی رہائش گاہ سے غائب تھی۔ اس کے بااعتماد ملازم بھی کچھ بتا نہیں پا رہے تھے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ کچھ پُراسرار لوگ میڈم صفورا کے اردگرد دیکھے گئے ہیں...... اور ان لوگوں کا تعلق بدھا کے اس مجسمے سے ہے جو پہلے ابرار صدیقی کے پاس تھا اور اب میڈم صفورا کے پاس آیا ہے۔ پھر یہ انکشاف ہوا کہ میڈم صفورا ہی نہیں، وہ خاص بدھا بھی غائب ہے جسے میڈم نے بڑی کوشش سے میرے ذریعے حاصل کیا تھا۔ کچھ ایسی شہادتیں ملیں جن سے اندازہ ہوا کہ بدھا کے ساتھ ساتھ میڈم صفورا اور مولانا ابرار صدیقی کو بھی انڈیا پہنچایا جا چکا ہے۔ یہ کچھ عجیب سی بات لگ رہی تھی......''

ہماری گفتگو جاری تھی۔ اچانک میں بری طرح چونک پڑا۔ اگر میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے تو میں نے انجن کی مدھم آواز سنی تھی۔ یہ آواز ہوا کے کسی آوارہ جھونکے پر تیر کر آئی تھی اور یقیناً عمران کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ میں نے عمران کو بھی چونکتے دیکھا...... عمران نے اپنا ہاتھ رائفل کی طرف بڑھادیا۔ اقبال نے بھی اس کی تقلید کی اور چوکنا نظر آنے

لگا اور یہی وقت تھا جب آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس مرتبہ وہ کافی واضح تھی۔ یہ کوئی جیپ نما گاڑی تھی جو ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔

''اس ویرانے میں یہ کون ہوسکتا ہے؟'' اقبال نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

میرے ذہن میں موجود تمام تر اندیشے ابھر کر سامنے آگئے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔ ''تم سے کہا تھا نا کہ پہلے میری خاص بات سن لو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ وہی ہے جو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔''

''اب یہ سب کچھ بتانے کا وقت نہیں۔ اب پہلے یہ دیکھو کہ یہ آنے والے کون ہیں؟''

اس دوران میں درختوں کے درمیان سے ہیڈ لائٹس کی مدھم سی جھلک نظر آئی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ جھلک اوجھل ہوگئی۔ انجن کی آواز بدستور آرہی تھی اور اب مزید قریب آگئی تھی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ گاڑی والوں نے ہیڈ لائٹس بجھادی ہیں۔'' عمران نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ دال میں کافی زیادہ کالا موجود ہے۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

''ہوسکتا ہے کہ کوئی بھٹکے ہوئے مسافر ہوں...... یا پھر شکاری......؟'' عمران نے جیسے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ اتفاقاً یہاں پہنچے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں لیکن اگر یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں تو پھر ان کی تعداد زیادہ ہونی چاہئے تھی، کم از کم بیس تیس لوگ ہوتے...... پانچ چھ گاڑیاں ہوتیں۔''

''ہوسکتا ہے کہ باقی لوگ پیچھے ہوں۔'' میں نے اختلاف کیا۔

اندازہ ہورہا تھا کہ گاڑی اب تاریکی میں رک گئی ہے۔ ہیڈ لائٹس بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ گاڑی والوں کا یہ انداز انہیں اور زیادہ مشکوک بنا رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''عمران! ہمیں انہیں دیکھنا ہوگا۔''

عمران میرے ساتھ ہی کھڑا ہوگیا اور اقبال سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''تم یہیں رکو گھوڑا گاڑی کے پاس، ہم دونوں جاتے ہیں۔''

''یس باس۔'' اقبال نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

میں اور عمران جھاڑیوں کے درمیان احتیاط سے چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ عمران کے ہاتھ میں رائفل اور میرے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ رگوں میں خون لہریں لے رہا تھا۔ کچھ کرنے اور اپنا حوصلہ آزمانے کو دل چاہ رہا تھا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم گاڑی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں جھاڑیوں کے درمیان ایک سیاہ ہیولا سا نظر آیا۔ یقیناً یہ ایک بند جیپ تھی۔ اس کی چھت پر کچھ لدا ہوا تھا۔ شاید یہ چھولداری تھی۔ اچانک میرا پاؤں ایک گڑھے میں گیا اور میں سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا گر پڑا۔ میرے گرنے سے دھپ کی آواز پیدا ہوئی اور پسٹل کھٹاک سے کسی تنے کے ساتھ ٹکرایا۔

"کون......کون ہے؟" کہیں پاس سے ایک ٹھٹکی ہوئی بھاری آواز سنائی دی۔

ہماری موجودگی راز نہیں رہی تھی۔ یکا یک بھاگتے قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ قدم ہماری طرف آنے کے بجائے مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ پھر دو سائے تیزی سے جیپ میں داخل ہوئے......اور جیپ آناً فاناً اسٹارٹ ہو کر حرکت میں آ گئی۔ وہ جو بھی تھے، بھاگ رہے تھے۔

"ان کو پکڑو۔" میں نے زمین سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

میں اور عمران ایک ساتھ جیپ کی طرف دوڑے۔ وہ گھوم چکی تھی اور اب ہمیں اس کی سرچ ٹیل لائٹس دکھائی دے رہی تھی۔ "رک جاؤ۔" عمران دھاڑا۔

اس کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ "رک جاؤ۔" عمران نے پھر کہا اور بھاگتے بھاگتے سیون ایم ایم رائفل سے دو فائر کئے۔ ایک گولی جیپ کے پچھلے ٹائر میں لگی اور اسے برسٹ کر گئی۔ جیپ کنٹرول سے باہر ہو کر لہرائی اور پھر سائیڈ کی طرف سے بری طرح ایک درخت سے ٹکرائی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ جیپ کا دایاں اگلا پہیا ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر چڑھ گیا۔ جیپ میں سے دو سائے نکل کر بھاگے۔ ایک کا رخ دائیں طرف اور ایک کا بائیں طرف تھا۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ ان میں کوئی ایک تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ ایک کے پیچھے میں بھاگا، دوسرے کے پیچھے عمران لپکا۔ میرے والا کچھ زیادہ پھرتیلا تھا اور وہ غیر مسلح بھی نہیں تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کے قریب پہنچ رہا ہوں، اس نے ایک دم پلٹ کر مجھ پر فائر کیا۔ دھماکے سے ایک شعلہ نکلا اور گولی میرے کندھے کے پاس سے گزری۔ یہ پستول کا فائر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص دوسرا فائر کرتا یا میں جوابی گولی چلاتا، اسے بری طرح ٹھوکر لگی اور وہ دور تک رپٹتا چلا گیا۔

میں نے اسے چھاپ لیا لیکن وہ آسان مدِمقابل نہیں تھا۔ اس نے بالکل غیر متوقع طور پر لیٹے لیٹے اپنے سر کے عقبی حصے سے میرے چہرے پر ضرب لگا دی۔ میری آنکھوں میں ستارے ناچے اور وہ میری گرفت سے نکل گیا۔ اس نے مجھ پر ٹانگ چلائی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور پھر اس کی دوسری ٹانگ کھینچ کر اسے اپنے برابر کر لیا۔ اس کا پستول اس کے

ہاتھ سے نکل چکا تھا مگر میرا ابھی میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس پر گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پستول کی ضرب اس کے بھاری بھرکم تھوبڑے پر لگائی تو وہ کراہ کر رہ گیا۔ لمبی جنگلی گھاس پر ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ تیس چالیس سیکنڈ کے اندر میں نے اس کا سارا دم خم نکال دیا۔ وہ دہائی دینے لگا۔ "ہم کو مت مارو، ہمرے پاس زیادہ کچھ ناہیں ہے۔ جو کچھ ہے، وہ تم لے لو......"

میں نے عمران کو آوازیں دیں۔ میری تیسری چوتھی آواز پر وہ بھی ایک شخص کو آگے لگائے ہوئے نمودار ہوا۔ تاروں کی روشنی میں غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ مقامی لوگ ہی ہیں۔ انہوں نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی اور کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوان لگتے تھے۔ ایک کے گلے میں امپورٹڈ دوربین لٹک رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" عمران نے ایک کو سر کے بالوں سے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"شکار کے لئے نکلے ہیں بھائی، ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا ناہیں۔ نہ ہی کسی سے کوئی دشمنی ہے۔ میرا نام راہول ہے، یہ میرا چچازاد بھائی دلیپ ہے۔ ہم اکثر ہفتے کی رات کو نکلتے ہیں۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"بوہرا سے۔ ہمارا وہاں ڈیری فارم ہے۔"

"تم ہمیں دیکھ کر بھاگے کیوں تھے؟"

"سچی بات یہ ہے کہ......ہمیں خطرہ محسوس ہوا تھا کہ آپ ہم سے ہمارا سامان وغیرہ چھین لیویں گے۔ پچھلے دو تین مہینے میں کئی شکاریوں کے ساتھ اس طرح کی درگھٹنا ہوئی ہے۔"

"تم نے ہماری جلائی ہوئی آگ دیکھی اور پھر دور ہی گاڑی بند کر کے کھڑے ہو گئے؟" عمران نے پوچھا۔

"ہم شش و پنج میں تھے۔ جاننا چاہ رہے تھے کہ آپ کون لوگن ہیں۔ بغیر تصدیق کے کے ہم آپ لوگن کے پاس جانا ناہیں چاہت تھے۔"

میں نے ہٹے کٹے شخص کا گریبان پکڑتے ہوئے عمران کو بتایا۔ "اس نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے کندھے کے پاس سے گزری ہے۔"

"میں بہت بہت شما چاہت ہوں۔ مجھے پتا ناہیں تھا کہ آپ کون لوگن ہیں۔ مجھے لگا تھا کہ اگر میں نے آپ پر گولی نہ چلائی تو آپ مجھ پر گولی چلا دیویں گے۔" وہ لجاجت سے بولا۔

"کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟" عمران نے ہٹے کٹے شخص سے پوچھا۔

"ناہیں۔ ہم دونوں ہی ہیں۔ ہمارے دو اور دوستوں نے آج دوپہر ہمارے ساتھ

شامل ہونا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ آنا ہیں سکے۔ ہم بہت تھک چکے تھے، یہاں کہیں چھولداری لگانے کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈ رہے تھے کہ آپ لوگن کی جلائی ہوئی اگنی پر نظر پڑ گئی......" ہٹے کٹے دلیپ نے جواب دیا۔

اندھیرے میں سے بہ مشکل دلیپ کا گرا ہوا پستول ڈھونڈا گیا۔ پستول میں نے اپنے پاس ہی رکھا۔ ہم ان دونوں کے ساتھ جیپ کی طرف واپس آئے۔ اس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ لائٹس بھی آن تھیں۔ ایک طرف کی کھڑکیوں کو کچھ نقصان پہنچا تھا۔ جیپ کی اندرونی روشنی میں ہم نے دیکھا۔ یہ دونوں کزن تجربہ کار شکاری لگتے تھے۔ جیپ کی نشستوں کے پیچھے ہموار جگہ پر کوئی دو درجن شکار کئے ہوئے چھوٹے بڑے پرندے موجود تھے۔ اس کے علاوہ کئی جنگلی خرگوش اور ایک بڑے سائز کا چیتل بھی تھا۔

دونوں افراد سے گفتگو کے بعد ہم کسی حد تک مطمئن ہو چکے تھے۔ ہم نے مل کر جیپ کے اگلے پہئے کو لکڑی کے تنے پر سے اتارا اور پھر برسٹ ٹائر کے ساتھ ہی جیپ میں بیٹھ کر پڑاؤ میں واپس آ گئے۔ گولی چلنے کی آواز اقبال نے بھی سن لی تھی اور وہ پریشان نظر آتا تھا۔ بہرحال ہمیں بہ خیریت دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ ہم نے اقبال کو بھی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ گفتگو کے دوران میں ہی ہم نے مل کر گاڑی کا ٹائر بھی تبدیل کر دیا۔

یہ دونوں افراد خوش حال گھرانے سے لگتے تھے اور پڑھے لکھے بھی تھے۔ اپنی گفتگو میں گاہے بگاہے انگریزی کے الفاظ بھی بولتے تھے۔ ان کی لینڈ روور جیپ بھی تقریباً نئی ہی تھی۔ ایک اسٹائلش واکی ٹاکی اور مہنگے سگریٹوں کے پیکٹ ڈیش بورڈ پر رکھے تھے۔

عمران نے راہول سے پوچھا۔ "اس واکی ٹاکی سے پرندوں کو کال کرتے ہو؟"

وہ مسکرایا۔ "ناہیں جی...... آپ کو دوسری پارٹی کا بتایا ہے نا۔ انہوں نے ہمیں جوائن کرنا تھا۔ ان سے رابطے کے لئے ساتھ لے لیا تھا۔ ویسے بھی شکاری مہم کے دوران میں ایسی چیزوں کا فائدہ ہوتا ہے۔"

پھر راہول نے ذرا جھجکتے ہوئے ہم سے ہمارے بارے میں پوچھا۔ عمران نے انہیں بتایا کہ شادی کی ایک تقریب میں شریک ہونے کے لئے زرگاں جا رہے ہیں۔

اسی دوران میں ہوشیار سنگھ بھی آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ وہ ذرا تعجب سے ان دو نئے مہمانوں کو دیکھ رہا تھا اور ان کی گاڑی کو بھی۔ وہ اپنی گردن کی چوٹ کی وجہ سے ذرا تکلیف میں نظر آتا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی گردن دیکھ کر دلیپ نے پوچھا۔ "اس سردار کو کیا ہوا ہے؟"

عمران بولا۔ "وہی ہوا ہے جس کا تم دونوں کو ڈر پڑ گیا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"یہاں سفر کرنے والوں کو ڈاکوؤں کا ڈر تو اکثر رہتا ہے۔ ہمیں بھی ڈر تھا۔ ہمارا ڈر صحیح نکلا۔ پیچھے بوہراندی کے پاس تین چار گھڑسواروں نے ہمارا راستہ روکا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نہتے ہیں۔ تھوڑی سی مارا ماری ہوئی پھر جب ہم نے رائفلیں نکالیں تو وہ تیر ہو گئے۔"

دلیپ ہنسا۔ "یعنی جن کو ہم ڈاکو سمجھے تھے وہ خود ڈاکوؤں کے ڈسے ہوئے ہیں۔"

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

راہول نے کہا۔ "ویسے یہ علاقہ آج کل پہلے سے زیادہ خطرناک بنا ہوا ہے۔ شاید تمہیں پتا ہو، ایک مسلمان راجپوت لڑکی کے لئے بڑی کشمکش چل رہی ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر زرگاں میں کئی بندوں کی ہتھیا کی ہے۔ اب اسے کسی اور گروہ نے اغوا کر لیا ہے۔ زرگاں والے اسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ بڑی مارا ماری چل رہی ہے۔"

"چھوڑو یار!" اقبال نے کہا۔ "یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک لڑکی اتنا کچھ کر سکتی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ وہ اکیلی ہی سب کچھ کرتی رہی ہے۔ بس پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا اس کے ساتھ ہے۔"

"ہاں، یہ بات بھی کہی جادت ہے۔" راہول نے تسلیم کیا۔ "وہ کوئی معمولی لڑکی ناہیں ہے۔ اس کی ماں نے حکم جی کی جان بچائی تھی اور اس کے بدلے میں حکم کے پتا رائے پرتاپ بہادر نے اس راجپوت پریوار کو بہت کچھ دیا تھا لیکن سچ کہوت ہیں، اچھوں سے برے اور بروں سے اچھے جنم لیوت ہیں۔ یہ لڑکی نڈر اور دلیر تو بہت ہے لیکن غلط رستے پر چل نکلی ہے۔ اس نے پہلے ایک دم شادی کی اور راج بھون کی پری بننے سے انکار کیا، اب موہن جی جیسے بندے کی ہتھیا کر کے اس نے سب کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔"

دلیپ نے کہا۔ "پچھلے دنوں میں زرگاں گیا تھا۔ وہاں لوگ بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ کچھ تو یہ سمجھت ہیں کہ اس میں کوئی بُری آتما گھسی ہوئی ہے۔ ورنہ ایک کمزور لڑکی اس طرح زرگاں میں دندنا سکت ہے؟ اور خون خرابا کر سکت ہے؟ بڑے پنڈت مہاراج کا وچار تو یہ ہے کہ ایسی اپرادھن ناری کو زندہ جلا دینا چاہئے تا کہ اس کی نحوست سے راجواڑے کو چھٹکارا مل جائے۔ مگر......"

"مگر کیا؟" اقبال نے پوچھا۔

"لگت ہے کہ جارج گورا صاحب، اسٹیل صاحب اور اس جیسے دوسرے لوگن اسے

زندہ گرفتار کرنا چاہت ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو کچھ کیا جائے قانون کے مطابق ہو۔ اس پر زرگاں میں چوہرے قتل کا مقدمہ چلے۔"

"اچھا یار! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تمہیں کچھ کھانا پینا ہے تو بتاؤ۔"

دلیپ نے کہا۔ "بھوک تو بے شک لگی ہے لیکن ہم آپ لوگن کو تکلیف ناہیں دیں گے۔ جو کچھ کریں گے خود ہی کریں گے۔ ہمارے پاس روسٹ کرنے کا پورا سامان موجود ہے۔ بس آگ کی کمی تھی، وہ آپ لوگن نے جلائی ہوئی ہے...... بلکہ آپ بتائیں آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟"

عمران چہکا۔ "میں نے کچھ چیزیں زندگی میں کبھی نہیں کھائیں یا اگر کھائی ہیں تو مجھے پتا نہیں چلا۔ مثلاً مچھلی تو بہت کھائی ہے لیکن کبھی مچھلا نہیں کھایا۔ بڑا مزے دار خرگوش اور کبوتر کھایا ہے لیکن بڑی مزے دار خرگوشنی یا کبوتری کبھی نہیں کھائی...... تم لوگوں نے جل مرغ تو شکار کر رکھا ہے۔ اگر کوئی جل مرغی بھی ہے تو میں ضرور کھانا پسند کروں گا۔"

دلیپ مسکرایا۔ "آپ دلچسپ بندے ہیں۔ اس پہلو سے تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ ویسے یہ کافی تحقیق طلب اور مشکل کام ہے۔"

"پرندے یا جانور کی دُم اُٹھانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بس ہم نے طے کر رکھا ہے کہ ہر مچھلی مؤنث اور ہر خرگوش مذکر ہوتا ہے۔" ایک قہقہہ پڑا۔

دلیپ اُٹھ کر اپنی جیپ کی طرف گیا اور جیپ کی اندرونی لائٹ جلا کر شکار شدہ پرندوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کا انداز ماہرانہ تھا۔ وہ روسٹ کرنے کے لئے شکار منتخب کر رہا تھا۔ میں بھی یونہی ٹہلتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ خون آلود پرندوں اور خرگوشوں کے نیچے اچانک میری نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑی جس نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ اپنے جسم کا سارا خون مجھے اپنے سر کی طرف دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ جو چمکتی ہوئی شے میں نے دیکھی، وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔

میں دلیپ سے پوچھے بغیر آگے بڑھا۔ میں نے خون آلود پرندوں اور خرگوشوں کو دائیں بائیں ہٹایا اور اس چمکیلی شے کو وضاحت سے دیکھا۔ میں نے پوری طرح پہچان لیا۔ میری نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی انٹینا تھا جو میں اس سے پہلے رنجیت پانڈے کے لوگوں کے پاس دیکھ چکا تھا۔ ٹیلے کے قریب جب ہمارے اور پانڈے کے درمیان گھمسان کا رن پڑا تھا اور پانڈے کو بھاگنا پڑا تھا تو یہ منحوس انٹینا ہمیں دیگر سامان کے ساتھ پڑا ملا تھا۔ یہ وہی سگنل وصول کرنے والی ڈیوائس تھی جس کے ذریعے پانڈے اپنے خوں خوار ساتھیوں کے

ساتھ میرے اور جیکی تک پہنچا تھا۔

دلیپ نے بھی دیکھ لیا کہ میں نے کیا کیا ہے اور کیا دیکھا ہے۔ اس کے چہرے نے ایک دم رنگ بدلا۔ وہ پلٹا اور تیزی سے بھاگا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی ٹانگوں میں جتنی طاقت ہے، وہ ساری استعمال کر کے نکل جانا چاہتا ہے۔ میں نے پستول نکالا اور اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اس پر دو فائر کیے۔ میرا ایک فائر اس کے سر میں عین گردن کے بالائی حصے پر لگا۔ وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا ایک درخت سے ٹکرایا اور ساکت ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا دوسرا ساتھی بھی جو اپنا نام راہول بتا رہا تھا، اُٹھ کر اندھا دھند دوڑا۔ اس کی جانب درخت قریب ہی تھے۔ وہ ان میں گھس گیا۔ عمران تو لپکتا ہوا میری طرف آ رہا تھا، اس دوسرے شخص کا پیچھا ہوشیار سنگھ نے کیا۔ ہوشیار سنگھ اس پر ہاتھ ڈالنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ اسے سنبھال نہیں سکا۔ اس کی قمیص کا ایک ٹکڑا پھٹ کر ہوشیار سنگھ کے ہاتھ میں رہ گیا اور وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا تاریک درختوں میں اوجھل ہو گیا۔

یہ سارا واقعہ بس دس پندرہ سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہو گیا۔ شور و غل اور فائرنگ کی آوازوں نے گھوڑا گاڑی میں موجود افراد کو بھی جگا دیا۔ طلال، گروسو بھاش اور سلطانہ وغیرہ بھونچکے سے باہر نکل آئے۔

"یہ کیا ہوا ہے تابی؟" عمران نے مجھ سے پوچھا۔

"ہم سب خطرے میں ہیں عمران! ہمیں کسی بھی وقت گھیرا جا سکتا ہے۔ ہمیں فوراً یہ جگہ چھوڑنی ہوگی۔ ابھی...... اسی وقت......"

"لیکن پتا تو چلے۔"

"میں ابھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکا اور بتاؤں گا بھی تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بس یہ سمجھو کہ یہ دونوں حرامزادے، حکم کے ہرکارے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ واکی ٹاکی کے ذریعے حکم کے گارڈز کو ہمارے بارے میں اطلاع دے چکے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں؟"

اسی دوران میں اقبال شکار شدہ پرندوں کے نیچے سے وہ چمکیلا انٹینا نکال چکا تھا......

"یہ کیا ہے تابش؟" اس نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں بھی بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا چاہئے۔"

میرے لب و لہجے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے عمران نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی اُٹھا

کر بڑے الاؤ پر ڈال دی۔ پھر ایک ایک کر کے مشعلیں بھی بجھا دیں۔ کچھ ہی دیر میں وہاں صرف تاروں کی روشنی باقی رہ گئی۔ اس روشنی میں حکم کے جواں سال ہرکارے کی لاش اوندھے منہ گھوڑا گاڑی کے پہیئے کے پاس پڑی تھی۔ شکاریوں کے بھیس میں یہ لوگ حکم کے کھوجی تھے اور وہ کھوج لگاتے ہوئے ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ اب یہ بات عین ممکن تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں مثلاً رنجیت پانڈے...... یا بلرام رائے وغیرہ کو اپنی کامیابی کی اطلاع دے چکے ہوں۔ مرنے والے کے سر کے عقبی حصے سے بہنے والا خون زمین پر ایک سیاہ نقشہ سا بنا رہا تھا۔ صرف دو منٹ پہلے یہ خون اس شخص کی رگوں میں تھا اور یہ ایک پُرلطف ڈنر کا انتظار کر رہا تھا۔

ہم نے پوری سرعت سے اپنا سامان سمیٹا اور گھوڑا گاڑی میں رکھ دیا۔ عمران نے جیپ کی تلاشی لی۔ اس کے اندر سے ایک برانڈی کی بوتل، ایک شاٹ گن، ایک واکی ٹاکی اور کچھ دیگر اشیاء ملیں۔ جیپ کے اندر کافی مقدار میں فیول موجود تھا۔

عمران نے کہا۔ ''ہم جیپ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آگے جا کر فیصلہ کر لیں گے کہ اسے چھوڑنا ہے یا گھوڑا گاڑی کو۔''

میں نے اور اقبال نے اس رائے کی تائید کی۔ تاہم میں نے یہ کہا کہ ہم جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا کر رکھیں گے۔

زخمی گھوڑے کو بھی گاڑی میں جوت دیا گیا۔ مردہ شخص کی لاش کو جوں کا توں چھوڑ کر ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں عمران کے ساتھ جیپ میں تھا۔ جیپ عمران ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ پوری طرح ایکشن میں تھا اور کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار۔

''یار! کچھ اشارہ تو دو۔'' وہ گھوڑا گاڑی کے پیچھے پیچھے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

''اشارہ یہ ہے کہ حکم کے کتے ہر جگہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں کہیں بھی جاؤں، وہ میرے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''یہ جدید دور ہے۔ اس میں سب کچھ ممکن ہے۔''

''تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو تابی!'' عمران کے لہجے میں بے چینی تھی۔ جیپ کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سے سرد ہوا فراٹے بھرتی اندر آ رہی تھی اور عمران کے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے۔ میں نے اس کا بایاں ہاتھ تھاما اور اُٹھا کر اپنے سر کے پچھلے حصے پر رکھا۔ میں نے اس کی انگلیوں کی دو پوروں کو اس خاص جگہ سے ٹچ کیا

جہاں میں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس کی پوروں کو تھوڑی سی حرکت دی۔ ''کچھ محسوس کیا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس، ایک ابھار سا ہے۔''

''یہی ابھار ہے جس نے میرے لئے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ جہاں پہنچتا ہوں، میری مصیبتیں میرے ساتھ وہاں پہنچ جاتی ہیں...... اور اسی کی وجہ سے پچھلے تین سال سے میں بے شمار کوششوں کے باوجود اس منحوس اسٹیٹ کی حدوں سے نکل نہیں پایا۔''

''یہ...... ہے کیا؟''

''ایک الیکٹرانک چپ...... جو میرے اسپائنل کینال کے اوپری سرے کے ساتھ پلانٹ کی گئی ہے۔ یہ سگنل نشر کرتی ہے۔ یہ وہی تکنیک ہے جو ریسرچ، جانوروں پر استعمال کرتے ہیں۔ انہیں چپ یا کالر لگا کر آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن وہ آزاد نہیں ہوتے۔ وہ جہاں بھی ہوں، انہیں ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔''

''اوہ گاڈ'' عمران نے ہونٹ سکیڑے۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر وہ بولا۔ ''کچھ عرصے پہلے میں نے ایک خاص بندے سے اس سے ملتی جلتی بات سنی تو تھی۔ اس نے کہا تھا کہ حکم جی اور جارج گورا اپنے خاص قیدیوں کو کہیں بھاگنے نہیں دیتے۔ سادہ لوح لوگوں کا خیال ہے کہ حکم جی اپنی روحانی شکتی سے ہر وقت ان پر نظر رکھتا ہے مگر پڑھے لکھے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کسی جدید طریقے سے اپنی نگرانی میں رکھا جاتا ہے۔''

''بس یہی ہے وہ نگرانی...... اور اس نگرانی کا انچارج جارج گورا کا بہنوئی ڈاکٹر اسٹیل ہے۔ وہی یہ خاص چپ باڈی میں پلانٹ کرتا ہے۔ یہ پیچھے جو انٹینا پڑا ہے، اس کا تعلق اسی چپ سے ہے۔''

''کیا تمہارے ذہن میں کبھی اسے نکلوانے کا خیال آیا؟'' عمران نے سنسناتی آواز میں پوچھا۔

''یہ تو ان لوگوں کی اصل خباثت ہے عمران! تم نے ٹل پانی کے جاپانی سرجن ڈاکٹر لی وان کا نام سنا ہے؟'' عمران نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''وہ بڑا قابل بندہ ہے۔ میرا ایک ڈاکٹر دوست مجھے اس تک لے کر گیا تھا۔ اس نے چند ٹیسٹ کرنے کے بعد بتایا تھا کہ یہ چپ نکالنے کے لئے زیادہ سہولتیں درکار ہیں اور یہ یہاں اسٹیٹ میں نہیں ہیں۔ چپ نکالتے ہوئے اسپائنل میرو کو نقصان پہنچ سکتا ہے جو زندگی کے لئے خطرناک ہے۔''

گھوڑا گاڑی ہمارے آگے جارہی تھی۔ اس میں سلطانہ اور طلال کے علاوہ گروسو بھاش اور اس کی سندر پتنی رادھا بھی موجود تھی۔ ان کی حفاظت ونگرانی کے لئے اقبال سیون ایم ایم رائفل کے ساتھ گھوڑا گاڑی کے اندر تھا۔ تاروں کی روشنی میں اونچے نیچے راستوں پر گھوڑا گاڑی درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جیپ اس کے پیچھے تھی۔

''کچھ پتا ہے ہم کس طرف جارہے ہیں؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمارا رخ کچے کی طرف ہے اگر ہم......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کی نگاہیں جیپ کے عقب نما آئینے پر تھیں۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحے تک آئینے میں دیکھتا رہا، پھر اس نے آئینے کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ میں نے دھیان سے دیکھا اور جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ جنتر، کیکر اور جنگلی بیریوں کی گھنی قطاروں کے عقب میں کچھ روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ ساکت نہیں متحرک روشنیاں تھیں۔ ان کی تعداد کا اندازہ لگانا فی الحال مشکل تھا۔ ''کون ہو سکتے ہیں یہ؟'' عمران نے متحکم لہجے میں پوچھا۔

''نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ حکم جی کے بندے۔''

عمران خاموش رہا۔ میں بھی خاموش رہا۔ ہم اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔ یہ بڑی سنگین سچوایشن تھی۔ مجھے لگا کہ میرے سینے میں دھڑکن کسی نقارے کی طرح گونج رہی ہے...... کسی جنگی نقارے کی طرح۔ یہ جان کر مجھے دلی راحت ہوئی کہ میرے اندر خوف نہیں ہے اور اگر تھوڑا بہت ہے بھی تو وہ ایک میٹھے میٹھے جوش کی لہروں میں دبا ہوا ہے۔ یہ تو شاید میرے سپنوں کی رات تھی...... ایک گھنا جنگل...... ایک سرد اندھیری رات۔ اس رات میں سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے خطرات کے سائے...... ہر پیڑ کے عقب میں موت کی گھات، ہر موڑ پر آسیبی پرچھائیاں...... اور میرے ساتھ عمران جیسا دوست، میرے کندھے سے کندھا ملائے ہوئے۔ وہی عمران جو سنگین ترین اندیشوں کو سینے سے لگانے کا فن جانتا تھا۔ جو جان لیوا خطرات کو قہقہوں میں اڑاتا تھا اور جس کا کفن ہر وقت ایک چمکیلی دستار کی طرح اس کے سر سے بندھا رہتا تھا۔ ہاں، یہ میرے پسندیدہ ترین تصورات کی رات تھی۔

اس سے پہلے لاہور کے گلی کوچوں میں بھی کچھ مواقع ایسے آئے تھے جب میں اور عمران ایک ساتھ کسی خطرے میں گھرے تھے مگر تب کی بات اور تھی۔ تب میں ایک اپاہج کی طرح عمران کے ساتھ گھسٹتا تھا...... یا شاید وہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتا تھا۔ آج میں اپنے پاؤں

پر کھڑا تھا۔ عمران کا ساتھ دینے کا حق ادا کرسکتا تھا۔

عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ واقعی حکم جی کے لوگ ہیں اور الیکٹرانک چپ کے بارے میں جو کچھ تم نے کہا ہے، وہ بھی صحیح ہے تو پھر ایک بات طے ہے۔ ہم جس طرف بھی جائیں گے، یہ لوگ ہمارے پیچھے آئیں گے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے...... لیکن ایک بات ہے...... اس سے پہلے میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک زمین دوز سرنگ میں تھا۔ وہاں اس چپ نے کام نہیں کیا تھا۔''

''لیکن ایسی سرنگ اب کہاں ڈھونڈیں گے؟ یا پھر ایک اور طریقہ ہے۔''

''وہ کیا؟''

سنگین صورتِ حال کے باوجود عمران کا کھلنڈرا پن لوٹ آیا تھا۔ وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا۔ ''سرنگ بنا لیتے ہیں...... اوس کی وجہ سے زمین نرم ہورہی ہے۔ گھوڑا گاڑی میں ایک بیلچہ بھی میں نے دیکھا ہے۔ دو تین چاقو بھی ہیں ہمارے پاس۔''

میں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے ہمیں یہ تصدیق کرنی چاہئے کہ یہ حکم کے لوگ ہی ہیں اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم اگلے آدھ پون گھنٹے میں ایک دو بار اپنا رخ بدلیں۔''

''تم اب چھینا جھپٹی بھی کرنے لگے ہو۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔''

سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ مدھم آوازیں ہم تک پہنچیں۔ یقیناً یہ بوگیر کتوں کی آوازیں تھیں۔ یہ جنگلی کتوں کی آوازوں سے بالکل مختلف تھیں۔ میں اب انہیں پہچاننے لگا تھا۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ جیسے کوئی زبردست چال اس کے ذہن میں آرہی ہو۔

○......❖......○

اس نے جیپ کی رفتار تھوڑی سی بڑھائی اور اسے گھوڑا گاڑی کے برابر لے آیا۔ ہوشیار سنگھ بڑی چابک دستی سے دونوں گھوڑوں کو ہانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رنگین چابک تھا۔ وہ تن کر اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''ہوشیار سنگھ! اب تم ہمارے پیچھے آؤ۔ ہم اپنا راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔''

''کیا کہا جی؟ رستا تبدیل کر رہے ہیں؟'' وہ ہماری طرف جھک کر بلند آواز میں بولا۔

''نہیں یار! راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔ میں اب تمہارے آگے چلتا ہوں۔ اس کو پنجابی میں کہیں گے...... ہن میں تیرے اگے اگے چلاں گا۔''

ہوشیار سنگھ نے بتیسی نکالی اور اثبات میں سر ہلایا۔ عمران نے لینڈ روور کو گھوڑا گاڑی کے آگے لگا دیا۔ ہم بائیں رخ پر مڑ گئے۔ کہیں دور گھنے جنگل میں تیندوے کی مخصوص آواز ابھری اور سنسناہٹ بن کر دور تک پھیل گئی۔ ابھی ہم اس آواز کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے کہ ایک اور آواز نے بری طرح چونکا دیا۔ یہ کسی دہشت زدہ شخص کے چلانے کی آواز تھی اور یہ آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ کوئی جنتر کے درختوں میں ہمارے نزدیک موجود تھا...... اور کرب کے عالم میں آہ و بکا کر رہا تھا۔ مجھے یہ آواز جانی پہچانی سی لگی......

عمران نے بھی تاریکی سے ابھرنے والی یہ روتی چلاتی آواز سن لی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر عمران نے اپنی رائفل کا سیفٹی لاک ہٹایا اور جیپ کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر گیا۔

جیپ کو یوں رکتے دیکھ کر گاڑی بان ہوشیار سنگھ نے بھی گاڑی روک لی۔ عمران کے پیچھے پیچھے میں بھی جیپ سے باہر آ گیا۔ تاریک جنگل میں کھلی جگہ پر ہونے کا احساس بھی بڑا

عجیب ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آپ ہر طرف سے اندیشوں کے گھیرے میں ہیں۔ کسی وقت، کسی بھی طرف سے کوئی جان دار شے آپ پر جھپٹ پڑے گی یا پھر کوئی زہریلا کیڑا مکوڑا آپ کو مصیبت میں ڈال دے گا۔ موجودہ صورتِ حال تو مزید تشویش ناک تھی کیونکہ چند لمحے قبل ہم نے تاریک درختوں میں کسی شخص کی کرب ناک آواز سنی تھی۔ ایک سیکنڈ کے لئے میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ ہمیں روکنے کے لئے کوئی چال تو نہیں مگر پھر فوراً ہی مجھے اپنے اس خیال کو رد کرنا پڑا۔ آواز دوبارہ ابھری، اس کی دردناکی گواہی دے رہی تھی کہ کوئی شخص سخت مصیبت میں ہے۔ اس بار ہم آواز کے رخ کا صحیح تعین کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ ہماری دائیں جانب جنتر کے کوتاہ قد درخت پھیلے ہوئے تھے۔ یہ اتنے گھنے تھے کہ ان میں سے بس پیدل شخص ہی گزر سکتا تھا۔ ان درختوں کے عقب میں زمین کا ایک گہرا کٹاؤ تھا۔ ہم نے پچھلے آٹھ دس منٹ میں اس کٹاؤ کے ساتھ ساتھ ہی سفر کیا تھا۔ اس سطح مرتفع جیسے علاقے میں ایسے کٹاؤ کافی موجود تھے۔ ہموار زمین پر چلتے چلتے بندے کو ایک دم پتا چلتا ہے کہ وہ ایک گہری کھائی کے کنارے کھڑا ہے۔ یہ کھائی نہیں ہوتی، دراصل ایک اور سطح زمین ہوتی ہے جو گہرائی میں واقع ہوتی ہے۔

جو کرب ناک آوازیں ہم سن رہے تھے، وہ جنتر کے درختوں اور گہرائی کے درمیان سے ابھر رہی تھیں۔ ہم ٹارچ روشن کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اس لئے تاریکی میں ہی راستہ بناتے آواز کی سمت بڑھے۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں کوئی جانور ہے۔'' میں نے مدھم آوازوں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہم گولی نہیں چلا سکتے۔'' عمران نے تاکیدی انداز اختیار کیا۔

ایک دم انسانی آواز معدوم ہو گئی۔ جانور کی پھنکاریں سنائی دیتی رہیں۔ ہم نے چند قدم مزید اُٹھائے تو ایک سنسنی خیز منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک تنومند جانور کسی شخص کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ یہ ایک سرخی مائل ریچھ تھا۔ اس علاقے میں سرخی مائل ریچھ پائے جاتے تھے اور میں نے ان کے بارے میں کافی کچھ سنا تھا۔ آج میں ایک ایسے ہی جانور کو اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک لرزا دینے والا تجربہ تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کر لی، تاہم عمران کی ہدایت بھی مجھے یاد تھی کہ گولی نہیں چلانی۔ ایک لمحے میں ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ زمین پر پڑا شخص مر چکا ہے یا بے ہوش ہو گیا ہے۔

میں نے ایک اور تحیر خیز منظر دیکھا۔ ایسا کام عمران ہی کر سکتا تھا۔ اس نے رائفل کو

بیرل کی طرف سے پکڑا اور اسے لاٹھی کی طرح استعمال کرتا ہوا جانور پر جھپٹا۔ اس نے اس کی کمر پر ایک زوردار ضرب لگائی اور ساتھ ہی "ہو ہو" کی بلند آواز نکالی۔

نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ مشتعل جانور نے اپنے نامعلوم شکار کو چھوڑا اور غضب ناک آواز کے ساتھ عمران کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی آنکھیں دو گول بٹنوں کی طرح تھیں اور چمک رہی تھیں۔ میں بے ساختہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور رائفل پر گرفت مضبوط کر لی۔

گھوڑا گاڑی پر سے ہوشیار سنگھ نے ڈری ہوئی آواز میں پکارا۔ "بھائی جی! یہ حملہ کرے گا۔ گولی مار دو۔"

عمران کا انداز بالکل مختلف تھا۔ مجھے اس کی بے پناہ اعصابی توانائی کا اندازہ ہوا۔ یوں محسوس ہوا کہ وہ کھلے جنگل میں ایک خطرناک درندے کے سامنے نہیں بلکہ سرکس کے پنڈال میں ہے اور کوئی سنسنی خیز کرتب دکھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان لمحوں میں وہ اس حقیقت سے بھی بالکل بے پروا ہو گیا کہ کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں اور ان کی طرف سے ہمیں شدید خطرہ ہے۔

ریچھ کا انداز جارحانہ تھا۔ وہ عمران کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور عمران رائفل کے ڈراوے سے اسے خود سے دور رکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک رائفل کو لاٹھی کے انداز میں ہی پکڑا ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ منہ سے "ہو...... ہا" کی آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ جانور اس صورتِ حال سے ڈر کر پسپائی اختیار کر جائے گا مگر ایسا ہو نہیں پا رہا تھا۔

پھر میں نے اس کی آواز سنی۔ وہ التجا آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا "مان جا...... بڑے بھائی مان جا...... تجھے اپنی پیاری ریچھنی کا واسطہ...... اپنے بزرگوں کا واسطہ......"

ریچھ نے ایک بار پھر جھپٹنے کا انداز اختیار کیا اور غضب ناک آواز نکالی۔

"غصہ حرام ہوتا ہے یار...... کیوں اپنی عاقبت خراب کر رہے ہو۔ جاؤ شاباش۔ اچھے ریچھ بنو...... شاباش...... شاباش۔"

اس شاباشی کا الٹا اثر ہوا۔ ریچھ ایک بار پھر خطرناک انداز میں جھپٹا......

گھوڑا گاڑی کے اندر سے چلانے کی آواز آئی۔ یہ گرو کی سندر دھرم پتنی رادھا تھی۔

عمران پوری طرح تماشا دکھانے کے موڈ میں تھا۔ وہ جیسے رنگ میں تھا اور ایک رنگ ماسٹر کی طرح خطرناک درندے سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ اس کی خطرات پسندی کبھی کبھی حد سے تجاوز کرنے لگتی تھی۔ یکا یک صورتِ حال سنگین تر ہو گئی۔ ریچھ نے ایک زوردار جھپٹا مارا اور مجھے اندازہ ہوا کہ رائفل عمران کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔

عمران ایک دم پلٹ کر دوڑا۔ جانور بھی شاید اسی انتظار میں تھا۔ وہ پورے طیش سے عمران کے پیچھے لپکا۔ میں نے ان دونوں کو آگے پیچھے درختوں میں گھستے دیکھا...... ان لمحوں میں مجھے محسوس ہوا کہ عمران مہم جوئی کے شوق میں ایک سنگین غلطی کر چکا ہے۔ شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا...... ہوشیار سنگھ اور اقبال بھی افراتفری کے عالم میں گھوڑا گاڑی سے اُتر آئے۔ ہم عمران کو آوازیں دیتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑے۔

اب کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ عمران کی آواز نہ جانور کی چنگھاڑیں۔ بس درختوں پر پھڑپھڑاتے ہوئے پرندے تھے جنہیں ہمارے شور و غل نے نیند سے بیدار کر دیا تھا...... رسک کے باوجود اقبال نے ٹارچ روشن کر لی۔ وہ چلا کر بولا۔ "عمران! کہاں ہو...... کہاں ہو؟"

"اس کو گانے والے انداز میں کہو تو اچھا لگے گا۔ کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں یہ بہاریں یہ سماں۔" عمران کی آواز نے ہمیں ہلا دیا۔ یہ چہکتی ہوئی جاں فزا آواز ہمارے سروں کے اوپر سے آئی تھی۔

اقبال نے ٹارچ کا روشن دائرہ گھمایا۔ وہ ایک کیکر کی شاخ سے بندر کی طرح جھول رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے جسم کو دو تین ہلکورے دیئے اور گھوم کر شاخ کے اوپر بیٹھ گیا۔ یہ بالکل وہی انداز تھا جو وہ سرکس میں کرتب کے جھولوں پر اختیار کرتا تھا۔ وہ جس درخت پر چڑھا بیٹھا تھا، وہ اس کھائی کے بالکل کنارے پر تھا جو ہمیں تاروں کی روشنی میں دور تک دکھائی دے رہی تھی۔

وہ جست لگا کر درخت سے اُترا اور اپنے کپڑوں کی گرد جھاڑتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اب مجھے اپنے یاروں کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں نے وہی کچھ کیا ہے جو انڈیانا جونز اور اس جیسی دوسری ایکشن فلموں میں اکثر ہیرو لوگ کرتے ہیں۔ "ٹریمر" میں تو ایک بالکل اس سے ملتا جلتا سین موجود تھا۔ ہیرو صاحب نے چکمہ دے کر ایک موذی جانور کو گہری کھائی میں گرا دیا تھا۔"

"تت...... تمہارا مطلب ہے......" اقبال ہکلایا۔ وہ گہرائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بالکل یہی مطلب ہے لیکن سب کچھ ویسا ہی نہیں ہوا جیسا تم سوچ رہے ہو۔"

"مگر......"

"اگر مگر بعد میں۔ پہلے اس بے چارے کو تو دیکھو کہ زندہ ہے یا گزر گیا۔"

ہم لپکتے ہوئے واپس اس جگہ پہنچے جہاں ہم نے مشتعل ریچھ کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ خشک

پتوں سے اٹی ہوئی نم زمین پر وہ زخمی شخص بالکل ساکت پڑا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا کندھا اُدھڑا ہوا نظر آیا۔ کندھے پر سے لباس کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔ عمران اور اقبال نے اسے الٹ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ سامنے آیا تو ہم بھونچکے رہ گئے۔ مجھے اس کی آواز یونہی جانی پہچانی نہیں لگی تھی۔ یہ وہ دوسرا شخص تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے لینڈ روور جیپ سے نکل کر راہِ فرار اختیار کر گیا تھا۔ اس نے اپنا نام راہول بتایا تھا۔ اس کے ساتھی نے خود کو دلیپ کے نام سے متعارف کرایا تھا اور وہ بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے پستول کی گولی سے ہلاک ہوا تھا۔ اس کی لاش ابھی تک وہیں کہیں درختوں میں پڑی تھی۔ ہمیں ہرگز امید نہیں تھی کہ ہم اس کے دوسرے مفرور ساتھی کو اتنی جلدی دوبارہ دیکھیں گے اور وہ بھی ایسی حالت میں۔

ہم نے اس زخمی کو فوراً اُٹھا کر گھوڑا گاڑی میں پہنچایا۔ اقبال اس کے کندھے کا خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس راہول نامی شخص کو حیرت انگیز طور پر کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ کندھے کے بڑے زخم کے سوا اس کے جسم پر کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ بس چند چھوٹی بڑی خراشیں تھیں۔ اس شخص کے بے ہوش ہونے میں شاید چوٹ سے زیادہ ذہنی صدمے کو دخل تھا۔

اس راہول نامی شخص کی طرف سے مطمئن ہو کر میں، عمران اور ہوشیار سنگھ پھر اس جگہ پر آئے جہاں عمران سرکس کے تماشے کی طرح درخت کی شاخ سے جھولتا نظر آیا تھا۔ عمران نے ٹارچ کا روشن دائرہ نیچے گہرائی میں پھینکا اور بولا۔ ''یہ ریچھ بھائی بڑے خوش قسمت نکلے ہیں۔ لگتا ہے کہ ریچھنی بھابی نے ان کے بازو پر امام ضامن باندھ کر شکار کے لئے بھیجا تھا۔''

''پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو تم؟'' میں نے بیزار لہجے میں کہا۔

اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ ایک بار پھر گہرائی میں پھینکا اور مجھے کچھ دکھانے کی کوشش کی۔ یہ گہرائی کی عمودی ڈھلوان پر اُگی ہوئی دو جڑواں جھاڑیاں تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ نیم اُفقی رخ پر اُگی ہوئی ہیں۔ ان جھاڑیوں پر کچھ ایسے نشانات دکھائی دیئے جنہیں خون کے نشانات کہا جا سکتا تھا۔ بہرحال تیس چالیس فٹ کی گہرائی میں ٹھیک سے دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔

عمران نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بھائی ریچھ صاحب بچ گئے ہیں۔ وہ کسی میزائل کی طرح اندھا دھند میرے پیچھے لپکے تھے۔ میں تو کنارے پر پہنچ کر شاخ سے جھول گیا اور وہ نیچے تشریف لے گئے لیکن قسمت اچھی تھی جو تحت الثریٰ میں جانے کے بجائے ان جھاڑیوں

میں گرے اور پھر یہاں سے سنبھل سنبھل کر نیچے اُتر گئے۔ میرے خیال میں اگر ہمارے پاس سرچ لائٹ ہوتی تو ہم انہیں نیچے کہیں حرکت کرتے دیکھ سکتے تھے۔ اس طرح سے......'' عمران نے لنگڑاہٹ کے ساتھ تھوڑا سا چل کر دکھایا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ ''پھر ہمیں اتنی تسلی سے یہاں کھڑا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ بھائیا ریچھ صاحب دائیں بائیں سے چکر کاٹ کر پھر ہمارے پاس پہنچ جائیں۔''

عمران مجھ سے مخاطب ہو کر چہکا۔ ''جگر! اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ نہ دیکھو کہ کس نے بات کہی ہے، یہ دیکھو کہ کیا بات کہی ہے۔ سردار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب ہمیں یہاں سے کھسکنا چاہئے۔ ویسے بھی ہمارے سسرالی اب قریب آتے جا رہے ہیں۔'' عمران نے دور نیچے درختوں میں حرکت کرتی روشنیوں کو دیکھ کر کہا۔

یہ ریچھ اور راہول والا سارے کا سارا واقعہ بہ مشکل چھ سات منٹ میں مکمل ہو گیا تھا...... یا زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگے ہوں گے۔ اس دوران میں ہمارا تعاقب کرنے والی روشنیاں زیادہ واضح دکھائی دینے لگی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ روشنیاں بتدریج ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔

ہمارے واپس آنے تک گھوڑا گاڑی کے اندر اقبال نے راہول کے کندھے سے بہنے والا خون بند کر کے وہاں پٹی باندھ دی تھی۔ تاہم وہ ابھی تک شدید صدمے اور نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کے لباس اور چہرے پر ریچھ کے سرخی مائل بال چمٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ راہول کو دیکھنے کے بعد میں جیپ میں واپس آ گیا۔ ہم پھر روانہ ہو گئے۔ اب جیپ آگے تھی اور گھوڑا گاڑی اس کی راہنمائی میں چل رہی تھی۔ ہم اپنے عقب سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ اچانک ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے گھوم کر اس انٹینا کو دیکھا جو شکار شدہ پرندوں کے ساتھ ہی جیپ کی عقبی نشست پر پڑا تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! کہیں ہمارا یہ اندازہ غلط تو نہیں کہ ہمارے پیچھے حکم جی کے لوگ ہیں؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''جو انٹینا سگنل وصول کرتا ہے، وہ ہمارے پاس ہے۔ اگر ان لوگوں کے پاس کوئی دوسرا انٹینا نہیں ہے تو وہ ہمارے پیچھے کیسے آ سکتے ہیں؟''

''ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس دوسرا انٹینا ہو۔''

''یہ تو ایک قیاس ہی ہے نا۔''

''چلو ابھی تھوڑی دیر میں پتا چل جاتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

میرا تجربہ ہے کہ بندہ بعض اوقات ایک چیز کے بارے میں قیاس کرتا ہے پھر اس کا قیاس پختہ ہوتا چلا جاتا ہے اور حالات کے سارے اشارے قیاس کو مضبوط کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ آخر میں وہ قیاس بالکل غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اب ہم سوچ رہے تھے کہ ہمارے پیچھے حکم جی کے لوگ آ رہے ہیں۔ راہول اور دلیپ کے انٹینا سمیت پکڑے جانے کی وجہ سے ہمارے اندر ایک اندیشہ پیدا ہوا تھا اور اب یہ مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ حالانکہ یہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ ستیش اور اس کے ساتھی ہوں جو استھان سے ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہوں یا پھر ڈکیتوں کا کوئی گروہ ہو، جیسا کہ دلیپ اور راہول نے بتایا تھا کہ یہاں ایسے جتھے گھومتے رہتے ہیں...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بالکل ہی غیر متعلق لوگ ہوں جو بس اپنے کام سے کام رکھتے ہوں اور اپنی راہ پر چلے جا رہے ہوں۔

ہم آگے بڑھتے رہے، روشنیاں ہمارے پیچھے رہیں۔ گھنے درختوں کے درمیان سے ہمیں گاہے بگاہے ان کی جھلک دکھائی دیتی تھی، تاہم ہم مکمل اندھیرے میں سفر کر رہے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہماری رفتار بھی کم تھی۔ عقبی روشنیاں ہمارے قریب آتی جا رہی تھیں مگر پھر ایک موقع ایسا آیا جب ہمیں اندازہ ہونے لگا کہ یہ حکم جی کے لوگ نہیں ہیں...... ہمارے پیچھے آنے والی روشنیاں واضح طور پر دو حصوں میں بٹ گئیں۔ کچھ روشنیاں تو ہماری سیدھ میں سفر کرتی رہیں اور کچھ ایک نیم دائرے کی شکل میں بائیں رخ پر نکل گئیں۔ یہ لوگ جیسے دو مختلف اطراف میں سفر کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ انداز بتاتا تھا کہ وہ کسی کی تلاش میں ہیں لیکن جسے تلاش کر رہے ہیں، اس کی سمت کا ٹھیک پتا انہیں بھی نہیں ہے۔

''اب کیا خیال ہے تمہارا؟'' عمران نے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''شاید یہ حکم جی کے لوگ نہیں ہیں۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''یہ بات تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ یہ لوگ سیدھے ہمارے پیچھے نہیں آ رہے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ حکم کے ہرکارے ہی ہوں مگر ان کے پاس سگنل وصول کرنے والا انٹینا نہ ہو...... ابھی تم نے یہی بات کہی ہے نا؟''

''تمہاری بات درست ہے۔'' میں نے تائید کی۔ ''لیکن ایک اور بات بھی سوچنے کی ہے۔ اگر یہ حکم کے لوگ ہی ہیں اور دلیپ وغیرہ نے واکی ٹاکی پر انہیں ہمارے بارے میں اطلاع دی ہے تو پھر ابھی تک یہ واکی ٹاکی خاموش کیوں ہے؟''

''اب تمہاری عقل، کچھ کچھ کام کرنا شروع ہو گئی ہے۔'' عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

واکی ٹاکی ابھی تک چالو حالت میں تھا اور ڈیش بورڈ پر رکھا تھا۔ اس کی رینج اتنی تو ضرور رہی ہوگی کہ چار پانچ میل کے دائرے میں کام کر سکے اور اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اس پر کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ تو ہونی ہی چاہئے تھی۔

ہم نے سفر جاری رکھا۔ جو ٹولی ہماری سیدھ میں آ رہی تھی، اس کا فاصلہ اب ہم سے قریباً نصف کلومیٹر رہ گیا تھا۔ یہ لوگ یقیناً گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ شاید دو چار ٹارچیں بھی ہوں۔ مشعلوں کی سرخ روشنی ٹارچوں کی روشنی سے بالکل مختلف دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جو ٹولی ہمارے پیچھے آ رہی ہے، اس کے پاس کتے نہیں ہیں۔ کتوں کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہماری کوئی نیکی ہمارے کام آنے والی ہے۔'' عمران نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، لگ تو مجھے بھی رہا ہے۔''

''اور واقعی صورت حال میں اچھی تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ ہمارے پیچھے آنے والی ٹولی ہمارے پیچھے آنے کے بجائے تھوڑا سا بھٹکی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

درختوں کا ایک گھنا جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''کیوں نہ ہم کچھ دیر کے لئے ان درختوں کے پیچھے رک جائیں؟''

''دیکھ لو، ان معاملوں میں تمہارا تجربہ کہیں زیادہ ہے۔''

''صرف ان معاملوں کی بات نہیں، میرا تجربہ ویسے بھی زیادہ ہے۔'' اس نے کہا اور گاڑی روک دی۔

ہمارے عقب میں گھوڑا گاڑی بھی رک گئی۔ گھوڑوں کے نتھنوں سے بھاپ خارج ہو رہی تھی۔ ان کے پاؤں کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ عمران جیپ کو آہستہ روی سے چلا کر جھنڈ کے پیچھے لے گیا۔ ہوشیار سنگھ بھی گاڑی وہیں لے آیا۔ ''کیوں جی، رک کیوں گئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

عمران بولا۔ ''اسے رکنا نہیں، بریک لینا کہتے ہیں اور یہ بریک ایسی چیز ہے جس کے بغیر آج کل کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ٹی وی چینل تو چلتے ہی بریک لینے کے لئے ہیں۔ بس بریکوں کے درمیان کہیں کہیں پروگراموں کی جھلک نظر آتی ہے اور غور کرو، کتنی برکت ہے ان بریکوں میں۔ اب ہر طرف چینل ہی چینل اور بریکیں ہی بریکیں نظر آتی ہیں۔''

''تو آپ بھی بریک کے لئے رکے ہیں؟'' ہوشیار سنگھ نے پوچھا۔

"بے شک، کبھی کبھی حرکت نہ کرنے میں بھی برکت ہوتی ہے۔" عمران نے کہا اور عقب میں متحرک روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

یوں لگ رہا تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والے ہماری دائیں جانب کوئی دو تین سو میٹر کے فاصلے سے گزر جائیں گے۔ ہم اپنی جگہ دم سادھے بیٹھے رہے اور ان کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ روشنیاں قریب آتی گئیں۔ قریب آنے کے بعد ان کا رخ ایک بار پھر تبدیل ہونے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ سیدھا اس جھنڈ کی طرف ہی آ جائیں گے۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ ہمارے ذہنوں میں موجود تمام تر اندیشے ایک بار پھر جاگ گئے۔ کہیں واقعی ہمیں کسی ذریعے سے ٹریس تو نہیں کیا جا رہا تھا؟

اگر ایسا تھا تو پھر ہمارا یہاں رکنا واقعی بہت بڑی غلطی تھی۔ یہ جگہ ایسی نہیں تھی کہ مناسب طریقے سے مورچابندی کی جا سکتی۔ بہرطور ہم نے اپنی رائفلیں وغیرہ تیار کر لیں اور ہر طرح کی صورتِ حال کے لئے الرٹ ہو گئے۔

متحرک روشنیاں ہمارے سامنے سے صرف ساٹھ ستر میٹر کی دوری سے گزر گئیں۔ یہ قریباً پچاس کے قریب گھڑسوار تھے۔ ان کی مشعلوں کی روشنی تاریک جنگل میں عجیب منظر پیش کر رہی تھی۔ وہ آپس میں بلند آواز میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ پھر ان میں سے کسی نے بجرنگ بلی کا زوردار نعرہ لگایا اور جواب میں جے جے کار سنائی دی۔ انہیں دیکھنے اور سننے کے بعد ہمیں اس بات میں ذرا سا شائبہ بھی نہیں رہا کہ یہ حکم جی کے لوگ نہیں ہیں۔ دراصل یہ لوگ استھان سے ہمارے پیچھے آئے تھے۔ یقیناً ان میں ستیش، مہندر، بھولا ناتھ اور ان کے بہت سے جنونی ساتھی بھی شامل تھے۔ یہ لوگ غصے میں بپھرے ہوئے تھے۔ ہم نے استھان میں ان کے کم از کم تین بندوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یہی نہیں، ہم مہا گرو اور اس کی پتنی کو یرغمال بنانے کے قصوروار بھی تھے...... اور اس کے علاوہ ہمارا ایک بڑا پاپ یہ تھا کہ ہم نے سلطانہ جیسی "اپرادھن" کو قرار واقعی سزا سے بچایا تھا اور اسے استھان میں سے لے کر صاف نکل آئے تھے۔

یہ غضب ناک ٹولہ ہمارے قریب سے گزرتا رہا ہم جھنڈ کے پیچھے ساکت و جامد موجود رہے۔ اس موقع پر ہمارے گھوڑوں میں سے کوئی ہنہنانا یا پھنکارنا شروع کر دیتا تو بھی ہمارے لئے مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ بہرطور یہ وقت بہ خیریت گزر گیا۔ روشنیاں ہم سے دور ہوتی چلی گئیں اور پھر دھیرے دھیرے تاریک درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئیں۔ اب بس کبھی کبھی ان کی جھلک سی دکھائی دیتی تھی۔ ہم ایک نہایت نازک صورتِ حال سے بہ خیریت گزر

گئے تھے اور ایسا صرف صبر و تحمل اور عمران کے مضبوط اعصاب کی وجہ سے ہو سکا تھا۔ اقبال، ہوشیار سنگھ اور طلال وغیرہ بھی گھوڑا گاڑی سے اُتر آئے تھے۔

ہوشیار سنگھ عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں جی۔ کبھی کبھی واقعی حرکت نہ کرنے میں بھی برکت ہوتی ہے۔"

ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہوا لیکن اس مرتبہ رخ تھوڑا سا مختلف تھا۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ "ہم کہیں جا رہے ہیں یا بس یونہی سفر کرتے چلے جا رہے ہیں؟"

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "ہم سب کے سب کہیں جا رہے ہیں۔ راستے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے۔ ایک دن ہم سب نے ایک تاریک اندھیرے میں گم ہو جانا ہے۔"

"وہ تو ہو ہی جانا ہے لیکن میں اب کی بات کر رہا ہوں۔"

"اب ہم ایک ڈراما کرنے جا رہے ہیں۔" عمران روانی سے بولا۔

"مجھے بھی ڈرامے میں کام کرنے کا بڑا شوق ہے جی۔" ہوشیار سنگھ نے کہا۔ "اِدھر ہم انڈین پنجاب میں پاکستانی ڈرامے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ خاص طور سے اسٹیج ڈرامے۔ ہنس ہنس کر ہماری تو پسلیاں پیڑ کرنے لگتی ہیں۔"

"لیکن یہ اور طرح کا ڈراما ہے۔ یہ ہم جن کے لئے کر رہے ہیں، ان کو ہنسی نہیں آئے گی۔ رونا آ جائے تو اور بات ہے۔"

ہوشیار سنگھ نے عمران کو تھوڑا سا کریدنا چاہا مگر جب وہ مجھے بتا کر نہیں دے رہا تھا تو ہوشیار سنگھ کو کیسے بتا دیتا؟ اِدھر اُدھر کی ہانک کر اس نے ہوشیار سنگھ کو خاموش کر دیا۔

ہم نے مناسب رفتار سے تقریباً پانچ کلو میٹر تک سفر کیا۔ یہاں تک کہ ایک پتھریلی ڈھلوان کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ وسیع ڈھلوان نیچے بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی...... خاکستری پتھروں والی یہ "ڈھلوان سطح" دراصل اسی کھائی کا ایک حصہ تھی جہاں ہم کچھ دیر پہلے رکے تھے اور جہاں عمران نے بڑے ڈرامائی انداز سے ایک خطرناک جنگلی ریچھ سے پیچھا چھڑایا تھا۔ مناظر ابھی تک ہم سب کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔

ڈھلوان کے عین کنارے پہنچ کر ہمارا مختصر سا قافلہ رک گیا۔ ایسا عمران کی ہدایت پر ہی کیا گیا تھا۔ عمران تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ بظاہر لگتا تھا کہ وہ آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہا ہے لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ سب کچھ اس کے ذہن میں پہلے سے طے ہے۔

ذرا دیر بعد اس نے اسٹیئرنگ وہیل گھمایا اور جیپ کو ڈھلوان میں اتارنے کے بجائے

دائیں رخ پر موڑ دیا۔ گھوڑا گاڑی بھی ہمارے پیچھے آئی۔ صرف سوڈیڑھ سو میٹر چلنے کے بعد ہم پھر رک گئے۔ اس مرتبہ ہمارے سامنے ایک آبی گزرگاہ تھی جو شیشم، جنتر اور یوکلپٹس کے گھنے درختوں میں آہستہ روی سے بہتی ہوئی جنوب کی سمت جارہی تھی۔ یہاں کناروں پر جنگلی گھاس تھی اور نیم تاریکی میں پانی کی مدھم قلقل سنائی دیتی تھی۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس جھاڑو پھیرنا ہے اور تھوڑی سی جھاڑ پونچھ کرنی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں اجلاس ہونا ہے درختوں کے نیچے۔ دراصل امریکی ریاست ہونولولو میں ہمارے نیوز چینل فساد پلس کے فوٹوگرافر کا کیمرا توڑا گیا ہے اور لیڈی رپورٹر کے بال کھینچے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر احتجاج کا پروگرام ہے۔ بہت سی چڑیلیں اور چڑیلے یہاں جمع ہونے والے ہیں......''

مجھے یقین تھا کہ عمران جھاڑو دینے والی بات مذاق میں کر رہا ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی جب دس پندرہ منٹ بعد عمران اور اقبال واقعی صفائی پر کمربستہ نظر آئے...... انہوں نے چھوٹے دستے والی کلہاڑی کی مدد سے درختوں سے کئی ایک شاخیں توڑیں۔ ان شاخوں کے ساتھ پتے بھی موجود تھے اور وہ دیکھنے میں جھاڑوؤں کی طرح لگتی تھیں۔ عمران نے میرے علاوہ ہوشیار سنگھ، طلال اور گرو سوبھاش وغیرہ کو بھی یہ جاڑو نما شاخیں تھما دیں۔

اگلے پندرہ بیس منٹ تک ہم کافی مصروف رہے۔ پختہ ڈھلوان سے واپس مڑ کر ہم نے قریباً ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس کچے راستے پر جیپ اور گھوڑا گاڑی کے پہیوں نے جو بھی ہلکے پھلکے نشانات بنائے تھے، وہ ہم نے شاخوں کی مدد سے یکسر ناپید کر دیئے۔ یہاں خشک پتوں کی بہتات تھی۔ نشانات ختم کرنے میں ان پتوں نے بھی کافی مدد کی۔ عمران وراقبال نے پہلی بار ٹارچیں جلائیں اور مختلف جگہوں سے جائزہ لے کر اس بات کا اطمینان کیا کہ نشانات واقعی اوجھل ہو چکے ہیں۔

اب ہم ایک بار پھر گاڑیوں میں آ بیٹھے۔ عمران نے بلاتردد جیپ آبی گزرگاہ میں اتار دی۔ یہاں پانی اتھلا تھا کئی جگہوں پر تو گہرائی ڈیڑھ دو فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ جہاں زیادہ تھی، وہاں بھی تین فٹ سے زیادہ نہ ہو گی۔ ہم بہاؤ کے رخ پر جیپ چلاتے آگے بڑھتے رہے۔ گھوڑا گاڑی کے گھوڑے پھنکارتے اور ہانپتے ہوئے ہمارے عقب میں رہے۔ اب میرے لئے یہ جاننا دشوار نہیں تھا کہ عمران نے اپنے سفر کے نقوش مٹانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر کچھ لوگ ہماری گاڑیوں کے پہیوں کے نشانات کے ذریعے ہمارا پیچھا

کرتے تو سو فیصد بھٹک جاتے۔ وہ پتھریلی ڈھلوان تک پہنچتے اور یہی سمجھتے کہ ہم ڈھلوان پر اُتر گئے ہیں...... کیونکہ اس کے بعد انہیں اردگرد کہیں بھی ہمارے سفر کے نقوش نظر نہیں آتے۔

ہم نے پایاب پانی میں بہاؤ کے رخ پر قریباً آٹھ کلومیٹر تک سفر کیا۔ اس سفر کی رفتار تو سُست رہی لیکن ہمیں کہیں بھی کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ صرف ایک دو جگہ ایسا ہوا کہ گھوڑا گاڑی کے پہیے پانی کے اندر کسی کھڈے میں اٹکے اور ہمیں اپنی پتلونیں اور پاجامے اڑس کر یخ پانی میں اُتر کر اسے دھکا لگانا پڑا۔

بالآخر آبار یک سنگریزوں کے اوپر پانی کا یہ سفر ختم ہوا اور ہم اس آبی گزرگاہ سے باہر نکل آئے۔ اس سفر کے دوران میں عمران کی دلچسپ گفتگو جاری رہی تھی۔ اس نے کہا کہ آج جس طرح اس نے آٹھ نو کلومیٹر تک ندی میں جیپ چلائی ہے، اسی طرح وہ عنقریب سڑک پر کشتی چلا کر دکھائے گا اور ملک وملت کا نام روشن کرے گا۔ اس بات پر ہوشیار سنگھ خوب ہنسا تھا۔

سفر میں لگنے والے مسلسل ہچکولوں کے سبب گھوڑا گاڑی میں زخمی راہول کو تکلیف ہوتی رہی تھی اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ہی کراہتا رہا تھا۔ اس کی کراہیں بار بار ہمارے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں۔ ان کراہوں کی تکلیف کے ساتھ ساتھ دہشت کا عنصر بھی شامل تھا۔ دہشت کی وجہ یقیناً وہ لرزہ خیز واقعہ ہی تھا جو اس شخص کے ساتھ تاریک درختوں میں پیش آیا تھا۔ جنگلی ریچھ کی وحشت، اس کا راہول کو چھوڑ کر عمران پر حملہ آور ہونا اور پھر خطرناک انداز میں اچھلنا اور جھپٹنا...... سب کچھ میری نگاہوں میں آیا اور سنسنی جگا گیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ اس وقت عمران کی جگہ میں ہوتا، ریچھ اس کے بجائے میرا پیچھا کرتا اور عمران کے بجائے میں اس سے نمٹتا۔

ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ میں نے عمران سے کہا۔ ''کچھ بتاؤ بھی کہ ہمیں جانا کہاں ہے؟''

''یار! بتایا تو ہے کہ وہاں جانا ہے جہاں سب جاتے ہیں...... اور کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ زندگی سفر اور منزل موت...... یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ شیلے نے کہا تھا......''

''شیلے گیا بھاڑ میں۔ اب ہم کہاں جارہے ہیں؟'' میں واقعی تپ گیا۔

''اچھا...... اچھا...... اب ہم فتح پور جارہے ہیں...... واقعی فتح پور جارہے ہیں۔ یہ کچے کے پاس ہی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ یہاں سے گھومتی ندی کی ایک بڑی شاخ گزرتی ہے۔ بہت ساری مچھلی پائی جاتی ہے اس پانی میں۔ یہاں کے لوگ مچھلی پکڑتے ہیں اور مزے

کرتے ہیں۔ان میں سے زیادہ تر لوگ میرے رشتے دار ہیں۔"

"رشتے دار ہیں؟"

"ہاں، میں نے یہاں کئی ایک شادیاں کر لی ہیں۔آٹھ دس تو میرے سسرالی گھر ہیں۔ آگے ان کی رشتے داریاں ہیں۔لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔"

"کیا ہانک رہے ہو؟"

"مذاق نہیں کر رہا جگر! یہاں آ کر میں نے جلال الدین اکبر اعظم کی یاد تازہ کر دی ہے۔اس شخص کو بھی باہمی رواداری اور امن محبت قائم رکھنے کا ایک بڑا اچھا گر ہاتھ آیا ہوا تھا۔ اس نے ہر مذہب، فرقے اور ذات کی نیک بیبیوں سے شادیاں کر لی تھیں۔انجوائے منٹ کی انجوائے منٹ اور امن کا امن۔ جہاں کہیں بغاوت پھوٹنے کا اندیشہ ہوتا تھا، مغل اعظم صاحب دولہا بن کر پہنچ جاتے تھے اور مستقبل کے باغی ان کے قریبی رشتے دار بن کر ان کی عنایتوں سے فائدہ اُٹھانا شروع کر دیتے تھے۔اسی طرح بغاوتیں کچل کچل کر جناب چالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کر گئے۔ میں نے بھی فتح پور میں اس طریقۂ حکومت کو چھوٹے پیمانے پر آزمانے کی کوشش کی ہے۔"

"اکبر اعظم نے تو اپنا دین بھی بنا لیا تھا۔تم نے کون سا شوشا چھوڑا ہے؟" میں نے اس کی گپ میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"اب تم آ گئے ہو تو شوشا چھوڑنے میں کون سی دشواری ہے۔مل بیٹھ کر کچھ کر لیں گے۔"

وہ اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا لیکن اس بات کا صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ ایک طے شدہ راستے پر جا رہا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہمارے اردگرد درختوں کی بہتات دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ پھر سرکنڈے اور جھاڑیاں نظر آنی شروع ہوئیں۔یہ مناظر اس بات کی علامت تھے کہ ہم کسی جھیل یا ندی کے قریب ہیں۔جلد ہی ہمیں ایک چھوٹی سی بستی کے آثار نظر آئے۔ کسی کسی گھر میں لالٹین کی مدھم روشنی موجود تھی۔بستی کے بیچوں بیچ ایک پرانے مندر کی مخروطی چھت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مسجد کا مینار بھی تھا۔ رات کا اندھیرا اب دھیرے دھیرے صبح کے اجالے میں مدغم ہو رہا تھا۔نیم تاریک آسمان پر صبح کا تارا بہت روشن نظر آتا تھا۔یہ چھوٹی سی بستی رات بھر کی نیند کے بعد جیسے ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ ہمارے بستی تک پہنچتے پہنچتے کافی روشنی ہو گئی۔بستی کی کچی زمین اوس سے نم تھی، دھند

کے ریلے گلی کوچوں میں گشت کر رہے تھے۔جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لئے لوگوں نے گھروں کے اردگرد باڑیں بنا رکھی تھیں۔بستی میں داخل ہونے سے پہلے ہی عمران نے جیپ ایک جگہ گھنے سرکنڈوں کے اندر کھڑی کر دی۔شکار کا گوشت اور انٹینا وغیرہ جیپ سے نکال لیا گیا۔اس انٹینا کو راستے میں ہی عمران نے ناکارہ کر دیا تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ دوبارہ کسی کے ہتھے چڑھے اور ہمارے لئے مصیبت کا باعث بنے۔ہم پیدل ہی آگے بڑھے۔گھوڑا گاڑی ہمارے ساتھ ساتھ بستی میں داخل ہوئی۔دو نوجوان مویشیوں کو ہانکتے ہوئے کھیتوں کی طرف لے جا رہے تھے۔انہوں نے گھوڑا گاڑی کو اور اس کے سکھ کوچبان کو ذرا تعجب سے دیکھا۔پھر ان کی نگاہ میرے پہلو میں چلتے عمران پر پڑی اور ان کے چہروں سے تردد دور ہو گیا۔ایک نوجوان نے دور ہی سے ہاتھ اُٹھا کر ہانک لگائی۔"سلام عمران بھیا۔" دوسرے نے کہا۔"نمستے عمران بھائی۔"

عمران نے دونوں کے سلام کا جواب خوش دلی سے دیا۔

کچھ آگے گئے تو ایک بڑھیا نے عمران کی بلائیں لیں۔لگتا تھا کہ وہ ہر جگہ کی طرح اس بستی میں بھی کافی مقبول ہے۔ چھوٹے بڑے اس سے بے تکلف دکھائی دے رہے تھے۔ عمران کو دیکھ کر ان کے چہروں پر عجیب سی خوشی چمک جاتی تھی۔

ہم مختلف گلیوں سے گزرنے کے بعد مندر کے پچھواڑے واقع ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچے۔عمران نے لکڑی کے بند دروازے پر دستک دی۔دوسری دستک پر اندر سے کسی بڑی عمر کے شخص نے ڈری ڈری آواز میں پوچھا۔"کون ہے؟"

"میں ہوں تایا۔" عمران نے جواب دیا۔

اندر والے کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔عمران نے بھی جواب دہرایا۔مزید تصدیق کے لئے کسی نے دروازے کی جھری میں سے جھانکا......اور آخر کنڈی ہٹا کر دروازہ کھول دیا۔سامنے پچاس پچپن سال کا ایک کمزور شخص کھڑا تھا۔اس کے ہاتھ میں مضبوط لاٹھی تھی۔

عمران نے اسے "سلام تاؤ" کہا۔

وہ بھی گھوڑا گاڑی کو دیکھ کر حیران ہوا۔"اس میں کون ہے؟" اس شخص نے پھر ڈرے ڈرے انداز میں پوچھا۔

"اپنے ہی لوگ ہیں تاؤ۔ ڈرنے کی بات نہیں۔ بڑی دور سے آئے ہیں۔ کچھ کھانے دانے کا انتظام بھی کرنا ہو گا۔"

اسی دوران میں مہا گرو سوباش، اس کی پتنی رادھا، طلال، سلطانہ اور اقبال وغیرہ بھی گاڑی سے اُتر آئے۔ راہول ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کے اردگرد تین رائفلیں موجود تھیں اور وہ جانتا تھا کہ بھاگنے کا کوئی چانس نہیں ہے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ گھر کا مالک اقبال اور عمران کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا۔ ہم سب عمران اور اقبال کے ساتھ اندر آ گئے۔ گھر کا صحن کشادہ تھا۔ ایک برآمدہ اور اس کے عقب میں تین چار نیم پختہ کمرے تھے۔ ایک طرف سرکنڈوں کے چھپر کے نیچے دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ کچے صحن میں مرغیاں بھاگتی پھرتی تھیں۔ گھر کی حالت سے گھر والوں کی کمزور مالی حالت کا اندازہ ہوتا تھا۔

ایک کمرے کی کھڑکی کے پیچھے تھوڑی سی ہلچل نظر آئی جس سے اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی پردہ دار عورت یا عورتیں موجود ہیں۔

عمران نے ادھیڑ عمر شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ تاؤ افضل ہیں...... یہ یہاں کے پرانے چوکیدار ہیں۔ کچھ دن پہلے ان کی بیوی فوت ہوئی ہے۔ تب سے یہ چوکیداری چھوڑ چکے ہیں اور گھر میں ہی رہتے ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں بھی ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کھڑکی کے بوسیدہ پردے کے پیچھے جو ہلچل نظر آئی تھی، وہ ان کی بیٹیوں کی ہوگی۔

تاؤ افضل اتنے سارے مہمانوں کو دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ عمران نے زخمی راہول کو اقبال کی نگرانی میں دے دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہے۔ راستے میں راہول نے یہ بتا دیا تھا کہ وہ حکم جی کے لئے ہی کام کرتا ہے اور اپنے ساتھی دلیپ کے ساتھ مجھے ٹریس کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ تاہم اس نے اصرار کے ساتھ کہا کہ میری یہاں موجودگی کا علم ابھی اس کے کسی ساتھی کو نہیں ہوا۔ اس کے تقریباً دو درجن مسلح ساتھی سات آٹھ میل کی دوری پر ایک زرعی گودام میں موجود تھے۔ یہ لوگ رنجیت پانڈے کی کمان میں تھے۔ میرے ٹریس ہو جانے کے بعد دلیپ اور راہول اپنے کمان دار رنجیت پانڈے سے رابطہ کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ واکی ٹاکی پر کوشش کر رہے تھے لیکن اسی دوران میں وہ سگنل وصول کرتے ہوئے ہمارے زیادہ قریب چلے آئے اور ہمارے ساتھ ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔

عمران نے سلطانہ اور رادھا کو تاؤ افضل کی بیٹیوں کے پاس کمرے میں بھیج دیا اور ہمیں لے کر ایک دوسرے کشادہ کمرے میں آ گیا۔ جب سلطانہ اور رادھا کمرے میں جا رہی تھیں،

میں نے دیکھا کہ افضل کی نظر سلطانہ پر پڑی ہے اور وہ کچھ چونکا ہے۔ اس کے بعد اس کے چہرے کی پریشانی میں ایک طرح کا تجسس شامل ہو گیا۔ وہ بار بار سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہا ہو۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ عمران کو کندھے سے پکڑ کر برآمدے کی طرف لے گیا۔

عمران کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں گھر کے اندر سے تلے ہوئے انڈوں اور حلوے وغیرہ کی دھیمی خوشبو آنے لگی تھی۔ حلوے کی خوشبو محسوس کرنے کے بعد مہا گرو کی بجھی ہوئی آنکھوں میں تھوڑی سی چمک نمودار ہوئی۔

سرد موسم میں بھوک زیادہ لگتی ہے جبکہ گرو اور رادھا نے قریباً چھتیس گھنٹے سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

کسی قریبی کمرے سے برتنوں کی کھن کھن اور چوڑیوں کی چھن چھن سنائی دیتی رہی اور پھر کھانا ہمارے سامنے آ گیا۔ دو بڑے چنگیروں میں پیٹ بھرنے کے مناسب لوازمات موجود تھے۔

کھانے کے دوران میں، میں نے اقبال سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''لگتا ہے کہ تم اس گھر میں رہتے رہے ہو؟''

''رہتے رہے ہو...... سے کیا مطلب...... ہم یہاں اسٹیٹ میں آنے کے بعد زیادہ دیر رہے ہی یہاں پر ہیں۔'' اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

''یہ تاؤ افضل کچھ ڈرا ہوا سا بندہ لگتا ہے۔''

''بس حالات نے اسے ڈرایا ہوا ہے، ورنہ یہ دلیر شخص تھا۔ جو بندہ کالی راتوں میں جاگ کر بستی کا پہرا دیتا ہو اور یہاں رہنے والوں کی حفاظت کرتا ہو، وہ ڈرپوک تو نہیں ہوتا۔''

''حالات سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مدھم آواز میں پوچھا۔

اقبال نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''بے چارہ دوسروں کی چوکیداری کرتا رہا اور اس کے اپنے گھر میں چوری ہو گئی بلکہ ڈاکا پڑ گیا۔''

''کون لوگ تھے؟''

''وہی جن کے جان مال کی زیادہ حفاظت کرتا تھا تاؤ افضل۔ بستی کے مکھیا رشید احمد کا بیٹا سلمان اور اس کے یار دوست۔ وہ رات کو افضل کے گھر میں گھس آئے۔ اس کی جوان بیٹیوں سے زیادتی کرنا چاہی۔ نشے میں دھت ہو کر ان کے کپڑے پھاڑ دیئے۔ ان کے جسم نوچ

لئے۔ ان کی والدہ آڑے نہ آتی تو وہ سب کچھ کر گزرتے۔ کمزور عورت نے اپنی جان دے کر بیٹیوں کی عزت بچائی۔"

"اوہ...... تمہارا مطلب ہے افضل کی بیوی؟"

اقبال نے اثبات میں سر ہلایا۔ "افضل کو بیوی سے بڑا پیار تھا۔ اس کی موت کا غم اسے لے بیٹھا۔ کبھی کبھی تو خود سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ تین تین دن فاقے سے گزار دیتا ہے۔ رات کو باہر والے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا ہے اور بیٹیوں کا پہرا دیتا ہے۔ خبطیوں کی طرح ان کی نگرانی کرتا ہے۔ ابھی تم نے دیکھا ہی ہوگا، جب ہم آئے تب بھی وہ لٹھ لئے دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور اقبال کچے صحن میں بچھی چارپائی پر آ بیٹھے۔ یہاں دھوپ تھی جو ہمارے رات بھر کے ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو سکون دے رہی تھی۔ دیہات کی مخصوص خوشبو جس میں کچی مٹی، گوبر اور نباتات کی باس ہوتی ہے، اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ اقبال نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "افضل اور اس کی بیٹیوں کی کہانی کچھ مختلف نہیں ہے۔ ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا ہے جو طاقتوروں کی طرف سے کمزوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر عمران یہاں آ کر افضل اور اس کی بیٹیوں کا سہارا نہ بنتا تو اب تک یہ دونوں لڑکیاں مکھیا کے اوباش بیٹوں کے ہتھے چڑھ چکی ہوتیں۔"

میں نے کہا۔ "عمران تو ڈھنگ سے کچھ بتا نہیں رہا۔ تم ہی بتاؤ کب سے ہو یہاں اور کیا کرتے رہے ہو؟"

"بس تمہیں ڈھونڈتے رہے ہیں اور کیا؟"

"لیکن تم یہاں پہنچے کیسے؟"

"میرے خیال میں یہ ساری تفصیل عمران ہی بتائے تو زیادہ اچھا ہے۔"

"اچھا اتنا بتا دو کہ یہاں تم کب سے ہو؟ میرا مطلب ہے فتح پور میں؟"

"پچھلے قریباً سات مہینوں سے۔ اب تو یہ ہمیں اپنی ہی بستی لگنے لگی ہے۔ عمران کا تو تمہیں پتا ہی ہے، جہاں جاتا ہے اپنے چاہنے والے پیدا کر لیتا ہے۔ لوگ بہت پیار کرنے لگتے ہیں اس سے اور اس نے واقعی لوگوں کی مدد بھی کی ہے۔ سب سے بڑی مدد تو یہی ہے کہ اس نے رشید اور اس کے بیٹوں کو لگام ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنی من مانیوں سے بستی والوں کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے بستی والوں کے لئے کئی چھوٹے بڑے کام کئے ہیں۔ اب ہم پانچ چھ ہفتے بعد بستی واپس آئے ہیں۔ تم دیکھ لینا، تھوڑی دیر میں بہت سے لوگ

یہاں ہماری خیر خیریت پوچھنے کے لئے جمع ہو جائیں گے۔"

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ تاؤ افضل اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا میری طرف آ گیا۔ میرے قریب بیٹھ کر غور سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔ "میری نظر کمزور ہو گئی ہے لیکن اتنی نہیں کہ میں تمہیں پہچان ہی نہ سکوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"سمجھا تو میں بھی نہیں کہ تم انجان کیوں بن رہے ہو۔ میں تاؤ افضل ہوں...... زرگاں میں تمہارے پڑوسی لوہار عبدالمجید کا بھائی۔ میں نے تمہاری بیوی سلطانہ کو بھی پہچان لیا ہے۔"

ایک دم ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے لگا کہ جیسے میں نے واقعی لمبی ٹھوڑی والے اس ادھیڑ عمر شخص کو کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں اور کب؟ میں ٹھیک سے تعین نہ کر سکا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پھر وہی یادداشت والا معاملہ آ گیا ہے۔ کئی دوسرے لوگوں کی طرح یہ شخص بھی مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا لیکن میرے لئے یہ اجنبی تھا۔

میں نے یونہی کہا۔ "مجھے تھوڑا تھوڑا یاد تو آ رہا ہے۔"

"مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ تمہیں تھوڑا تھوڑا یاد آ رہا ہے۔ مجھے تو ان دنوں کی ایک ایک بات یاد ہے۔ کہیں تم جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کر رہے؟"

"نہیں، جان بوجھ کر تو نہیں کر رہا۔"

"میں پورے پانچ مہینے وہاں تمہارے پڑوس میں رہا تھا۔ عبدالمجید بیمار تھا۔ میں اس کی دیکھ بھال کے لئے وہاں رکا تھا۔ یاد آ رہا ہے؟"

"ہاں ہاں...... میں سمجھ گیا۔" میں نے ایک بار پھر یونہی بات بنائی۔

افضل کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔ "تمہاری ہچکی کا کیا بنا پھر؟" اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"ہچکی...... وہ...... تو...... کون سی ہچکی؟"

"یار! تم تو واقعی بڑے بھلکڑ ہو۔ ان دنوں کھانا کھاتے ہی تمہیں ہچکی شروع ہو جاوت تھی۔ تین تین گھنٹے رکتی ناہیں تھی۔ کتنے کمزور ہو گئے تھے تم۔ بخار تو ٹوٹتا ہی ناہیں تھا تمہارا۔"

"ہاں، اس بخار نے تو واقعی بڑا پریشان کیا تھا۔" میں نے گول مول بات کی۔

"تم اسے پریشانی کہوت ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تمہارے بچنے کی کوئی آشا ہی ناہیں تھی۔ یہ تو تمہاری بیوی کی ہمت اور کوشش ہے جس کی وجہ سے اوپر والے کو بھی ترس آ گیا۔ وید جی نہ آتے تو پتا ناہیں کیا ہو جاتا۔"

"ہاں...... وید واقعی قابل بندہ تھا۔"

"مگر جتنا قابل تھا، اتنا ہی مہنگا بھی تھا...... بلکہ شاید یہ کہنا چاہئے کہ اتنا ہی لالچی بھی تھا۔ میں اندر خانے کی ساری بات جانت ہوں۔ اس نے تمہیں ٹھیک تو بے شک کر دیا لیکن اس کے بدلے تمہاری بیوی کا ایک ایک گہنا اُتروا لیا۔ میں نے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ویسے بھی سلطانہ بیٹی مجھ سے کچھ چھپاتی نا ہیں تھی۔"

مجھے اس معاملے میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے ایک بار پھر گول مول بات کرتے ہوئے کہا۔ "زیور تو اس نے واقعی کوئی نہیں چھوڑا تھا۔"

"اور وہ رقم بھول گئے جو نقد لی تھی اس نے؟"

"ہاں...... رقم بھی تو تھی۔" میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بھولا بسرا دھندلا سا منظر نگاہوں میں چمک گیا۔ جیسے کوئی فربہ ہاتھوں والا شخص کرنسی نوٹ گن رہا ہو اور سلطانہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ میرے قریب کھڑی ہو۔

تاؤ افضل کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "بہت بڑا دل ہے سلطانہ کا۔ ایک ایک پائی جوڑ رکھی تھی اس نے بھائی کے علاج کے لئے۔"

"بھائی کے علاج کے لئے؟"

تاؤ افضل کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی۔ "ارے...... تمہیں نا ہیں پتا وہ رقم کس لئے تھی؟"

"نن...... نہیں...... میں تو یہ بات...... آج آپ کے منہ سے سن رہا ہوں۔"

تاؤ افضل کے چہرے پر نظر آنے والی حیرت بڑھ گئی۔ وہ غیر یقینی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔ "شاید تم مذاق کر رہے ہو۔"

"نہیں تاؤ...... میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔"

تاؤ افضل چند لمحے تک مجھے بغور دیکھنے کے بعد بولا۔ "اب پتا ناہیں کہ مجھے یہ بات تمہیں بتانی چاہئے یا ناہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ سلطانہ نے وید جی کو زیوروں کے علاوہ جو پندرہ ہزار روپے نقد دیئے تھے، وہ اس نے اپنے اپاہج بھائی کے علاج کے لئے جمع کئے تھے، سچ مچ ایک ایک پائی جوڑ کر۔ وہ ساری رقم اس نے تمہارے علاج کے لئے وید جی کو دے دی۔"

میں خاموشی سے تاؤ افضل کو دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ تاؤ کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "ایک اچھی بیوی

اللہ کی سب سے خاص نعمت ہے۔ جس کو یہ نعمت ملے، وہ خوش بخت ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم خوش بخت ہو۔" اس نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ "سلطانہ کے بھائی کا اب کیا حال ہے؟"

"ابھی تو ویسا ہی ہے۔" میں نے کہا اور یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے مجھے سچ مچ بے پناہ افسردگی محسوس ہوئی۔

میں نے چند دن پہلے سلطانہ کے بیمار اور اپاہج بھائی نبیل کو نل پانی کے دیوان میں دیکھا تھا۔ وہ کمر کی تکلیف کی وجہ سے لاچاری کی تصویر تھا۔ جو کچھ مجھے آج یہ تاؤ افضل نامی شخص بتا رہا تھا، وہ واقعی درست تھا تو پھر نبیل راجپوت کی حالتِ زار کی ذمے داری مجھ پر بھی عائد ہوتی تھی۔ تاؤ افضل کی باتوں نے میرے ذہن میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ اپنے لئے سلطانہ کی قربانیوں کے بارے میں، میں پہلے بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ آج ایک اور قربانی میرے سامنے آ رہی تھی۔

میں نے وہیں دھوپ میں بچھی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے، تاؤ افضل سے اس بارے میں کچھ مزید باتیں پوچھیں۔ اس مختصر گفتگو سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا، وہ کچھ اس طرح تھا...... آج سے قریباً ایک سال پہلے میں شدید بیمار ہو گیا تھا۔ میرا بخار اُترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں بستر سے یوں لگا تھا کہ صحت مند ہونے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ رہی سہی کسر نہ رکنے والی ہچکی نے پوری کر دی تھی۔ یہ ہچکی کئی کئی گھنٹے میرے کمزور جسم کو ہچکولے دیتی رہتی تھی۔ میرے سر کے بال جھڑ گئے تھے اور ہونٹ سوکھ کر سیاہ ہو گئے تھے۔

زرگاں کے دو بڑے معالج مجھے لاعلاج قرار دے چکے تھے مگر انہی دنوں ایک خاص وید زرگاں آیا اور اس نے مجھے صحت یاب کرنے کی ضمانت دے کر گراں قدر رقم کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ علاج کے شروع میں تیسرا حصہ معاوضہ وصول کرے گا۔ ڈیڑھ ماہ بعد پھر تیسرا حصہ اور ڈیڑھ ماہ بعد آخری تیسرا حصہ۔ سلطانہ نے اپنی ساری جمع پونجی تین چار قسطوں میں وید کے حوالے کر دی اور واقعی میں ٹھیک ہو گیا۔ وہ میری جان بچانے میں کامیاب رہی۔ سلطانہ کی جمع پونجی میں وہ پندرہ ہزار روپے بھی شامل تھے جو وہ نبیل کے علاج کے لئے جمع کرتی رہی تھی۔

یہ ساری معلومات میرے لئے بہت حیران کن تھیں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ سلطانہ زیور نہیں پہنتی۔ میں یہ سمجھتا رہا تھا کہ شاید ایسا اس کے مزاج کی وجہ سے ہے لیکن آج کچھ اور بات سامنے آ رہی تھی۔ وہ اپنے تمام زیورات ایک جان لیوا بیماری کی نذر کر چکی تھی اور یہ

میری بیماری تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے نبیل کا پیارا جسم گھوم گیا۔ بہن کے لئے بھائی کی اہمیت کیا ہوتی ہے، میں اچھی طرح جانتا تھا اور نبیل تو پھر اکلوتا بھائی تھا۔

میں سوچتا رہا اور ناقابلِ فہم سلطانہ کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ پتا نہیں کیا کیا کرتی رہی تھی میرے لئے۔ کچھ باتوں کا وہ خود تو کچھ بھی بتاتی نہیں تھی۔ وہ وفا کی پتلی، ایثار کی پیکر...... بڑی خاموشی سے ایک شمع کی طرح جلتی رہی اور میرے لئے روشنی فراہم کرتی رہی تھی۔ اب وہ پگھل کر کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی ٹمٹما رہی تھی۔ اس کے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اَن گنت دشمن اس کے پیچھے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں اس ٹمٹماتی شمع کے گرد اپنے ہاتھوں کا ہالہ بنا دوں۔ اپنے تن من سے اس طرح اسے ڈھانپوں کہ زمانے کی ساری سرد گرم ہوائیں اس تک پہنچنے میں ناکام ہو جائیں۔ میرا دل بے ساختہ اس کی طرف کھنچنے لگا۔

میں اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دن پہلے تک وہ مجھے اپنے جسم کو چھونے نہیں دیتی تھی...... لیکن کل والے واقعے کے بعد کم از کم اتنی تبدیلی تو آئی تھی کہ وہ میرے سینے پر سر رکھ کر روئی تھی۔ اس نے میری باہوں میں اپنا چہرہ چھپایا تھا۔

تاؤ افضل کے ساتھ میری گفتگو کے دوران میں ہی عمران اور اقبال بھی وہاں موجود رہے تھے۔ انہیں بھی میری بیماری کے بارے میں معلوم ہوا تھا اور یہ پتا بھی چلا تھا کہ مجھے صحت یاب کرنے کے لئے سلطانہ نے کس طرح تگ و دو کی تھی۔

رات کو مجھے سلطانہ سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ موقع بھی عمران نے ہی فراہم کیا۔ وہ چائے کا پیالہ لئے ہوئے میرے پاس آیا۔ آنکھوں میں حسبِ معمول ایک خوبصورت سی شوخی تھی۔ چائے کا لمبا گھونٹ لے کر بولا۔ ''تم نے کہاں سونا ہے؟''

''جہاں تم نے سونا ہے۔''

''جگر! ہم کنوارے ہیں۔ تم شادی شدہ ہو۔ تم اوپر والے کمرے میں سو جانا۔''

میں نے اس کی بات پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تم نے تو اطلاع دی تھی کہ تم اکبرِ اعظم کے نقشِ قدم پر چل کر یہاں فتح پور میں کئی شادیاں رچا چکے ہو۔''

''لیکن یار! میں نے یہ کب کہا تھا کہ میں نے یہ شادیاں لڑکیوں یا عورتوں سے کی ہیں۔''

''تو پھر کس سے کی ہیں؟''

''ان لوگوں کے مسائل سے کی ہیں، ان کی مشکلوں سے، ان کی پریشانیوں سے۔ شادی کا مطلب مصیبتوں کو گلے لگانا ہوتا ہے، سو میں نے لگایا ہے۔ بہرحال، اس بارے میں تمہیں پھر تفصیل سے بتاؤں گا۔ فی الحال میں تم سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ تم اوپر والے کمرے میں سو جانا۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''بہت فرق پڑے گا۔ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ یعنی دو میاں بیوی اور نو بچے۔ تاہم اس کے لئے تنہائی اور یکسوئی وغیرہ ضروری ہے۔''

''تم فضول باتیں کر رہے ہو۔ سلطانہ کی حالت ابھی ایسی نہیں کہ وہ میرے ساتھ ایک کمرے میں سکون سے رہ سکے۔ اگر تم نے اسے ٹھیک کرنا ہے تو بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہوگا۔''

''تو یار میں کب کہہ رہا ہوں کہ ایک ہی رات میں نو بچے پیدا کر لو لیکن تھوڑا بہت قدم بڑھاؤ گے تو سفر طے ہوگا نا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے...... وہ میرے کمرے میں چلی آئے گی؟''

''کیوں نہیں آئے گی بھائی! سر کے بل آئے گی۔ جس دیور سے اس کا پالا پڑا ہے، وہ کوئی معمولی شے نہیں ہے۔''

''کیا کہا ہے تم نے اس سے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں۔ بس یہی بتایا ہے کہ تمہیں کل سے ہلکا بخار ہے اور...... کبھی کبھی ہچکی بھی آتی ہے۔ وہ فوراً تمہیں دیکھنا چاہ رہی ہے...... بلکہ شام کو ہی تمہارے پاس آنا چاہ رہی تھی۔''

''تم نے اسے کیوں پریشان کیا ہے...... کیا پہلے کم پریشانیاں ہیں؟'' میں نے بیزار لہجے میں کہا۔

''یار! تم خود ہی تو باروندا جیکی کا سنہری قول دہراتے ہو۔ پریشانیوں کے اندر سے ہی خوشی اور سکون کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم اوپر کمرے میں چلو۔ ابھی تھوڑی دیر میں سرکار کچے دھاگے سے بندھی تمہارے پاس چلی آئیں گی...... لیکن......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اس نے میرا گھٹنا دباتے ہوئے کہا۔ ''یار! میرا بھرم رکھ لینا۔ دو چار بار ہچکی لے کر دکھا دینا اسے۔''

''سوری، میں تمہاری بونگیوں میں شامل نہیں ہوسکتا۔''

''اچھا چلو، ایسا کرتے ہیں، میں تمہارے کمرے میں تمہارے پلنگ کے نیچے گھس جاتا ہوں۔ تم بس منہ پر ہاتھ رکھنا، پلنگ کے نیچے سے ہچکی کی آواز میں نکال دوں گا۔''

میں برا سا منہ بنا کر خاموش ہوگیا۔

وہ شرارت سے بولا۔ ''میں سمجھ گیا، یہ اسکیم زیادہ قابلِ عمل نہیں ہے۔ تم کافی دنوں بعد سلطانہ بھابی سے ملو گے۔ میں پلنگ کے نیچے رہوں گا تو پھر کیا خاک ملاقات ہوگی۔''

''تم فضول باتیں کر رہے ہو۔ اتنی جلدی کچھ نہیں ہوسکتا...... وہ آہستہ آہستہ ہی اپنے صدمے سے نکلے گی۔''

''خیر یہ سب کچھ اتنی جلدی بھی نہیں ہے جگر! رخصتی وغیرہ تو رہی ایک طرف...... کل ایک ہرن اپنی جان پر کھیل کر تمہارے ولیمے کا سامان بھی کر چکا ہے۔ اچھے بچے شادی شدہ ہونے کے بعد اس طرح کچھوے کی رفتار سے نہیں چلتے۔''

وہ اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہا پھر اس نے مجھے اوپر کمرے میں بھیج دیا۔ یہ زیادہ بڑا کمرا نہیں تھا۔ دو پلنگ نما چارپائیاں تھیں۔ ایک طرف لکڑی کی الماری تھی۔ الماری کے اوپر لالٹین رکھی تھی۔ دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں۔ نیم پختہ فرش پر ایک بوسیدہ نمدہ بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں مٹی کی انگیٹھی تھی جس میں انگارے سلگ رہے تھے۔ میں پلنگ نما چارپائی پر دراز ہوگیا۔

چہرے کی بڑھی ہوئی شیو کو کھجانے لگا...... 60 گھنٹے پہلے کے واقعات کسی فلم کی طرح میری نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ارجن کا زخمی ہو کر تالاب کی گہرائی میں گرنا اور پتھریلے مجسمے سے ٹکرا کر اس کا سر پاش پاش ہونا۔ دو اندھا دھند بھاگتے ہوئے پجاریوں کو گولیاں لگنا اور ان کا سنگی فرش پر لڑھکنیاں کھانا...... پھر ستیش اور اس کے ساتھیوں کا ہم پر اسلحہ تاننا اور ہمارا قدم قدم پیچھے ہٹتے چلے جانا۔ تناؤ کی وہ شدید ترین کیفیت جس میں کسی بھی وقت فائرنگ شروع ہوسکتی تھی اور لاشیں گر سکتی تھیں۔ وہ سب کچھ میرے تصور میں آیا اور میں نے اپنے جسم میں سنسنی کی لہریں محسوس کیں۔

مجھے پلنگ پر دراز ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ قدموں کی چاپ نے میرا دل دھڑکایا، پھر دروازہ کھلا اور سلطانہ اندر آگئی۔ اس کے گندمی چہرے پر پریشانی کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ میں اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ''لیٹے رہو...... لیٹے رہو۔''

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''تم ٹھیک ناہیں ہو۔'' اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔ ''تمہارا دوست کہہ رہا تھا کہ تمہیں ہچکی بھی لگ رہی ہے۔ کیا تمہیں ہچکی آرہی ہے؟''

''نہیں۔''

''تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ مجھے تسلی دینا چاہتے ہو۔ کیا تمہیں بخار بھی ہے؟'' اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

''تم خود ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔''

وہ ذرا سا جھجکی پھر اس نے میرے بازو کو چھوا۔ ''بخار تو ناہیں ہے لیکن...... ہچکی تو آرہی ہے نا...... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے...... کہیں تم پھر بیمار تو نہیں ہو رہے۔ اللہ رحم کرے۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو۔'' وہ سرتاپا لرز سی گئی۔

اس کے چہرے اور ہاتھوں پر چوٹوں کے نشان اس بات کے گواہ تھے کہ وہ پچھلے چند دنوں میں بڑے سخت حالات سے گزری ہے لیکن اس وقت وہ اپنی ساری سختیاں بھول کر میرے لئے پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا لباس بھی بدلا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! تم خواہ مخواہ ہی خود کو فکرمند نہ کرو۔ میرے دوست نے ایسے ہی مذاق کیا ہے۔''

''اس طرح کا مذاق میری جان لے سکتا ہے۔'' وہ آبدیدہ ہوگئی۔

''کیوں...... ہچکی آجانا کوئی بات خطرناک بات ہے؟''

''ہاں مہروج! تمہارے لئے خطرناک ہے...... پتا ناہیں کہ تمہیں یاد ہے یا ناہیں۔ تم بہت جیادہ بیمار ہوگئے تھے۔ اتنے جیادہ کہ بس کیا بتاؤں۔ تمہیں جب کبھی بخار ہوتا ہے، میرے دماغ میں وہی باتیں آجاتی ہیں۔''

''لگتا ہے کہ تم بہت واہمی ہو۔''

''ہاں...... تمہارے بارے میں شاید واہمی اِچ ہوں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

میں دھیان سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ پچھلے ایک دو ہفتے میں نہایت کٹھن صورتِ حال سے گزری تھی۔ اس کے شفاف رخساروں پر ابھی تک چوٹوں کے مدھم نشان موجود تھے۔ مجموعی طور پر اس کے چہرے میں ایک خاص طرح کی سادگی اور کشش تھی۔ خاص طور

سے اس کے چوڑے رخساروں کی قدرے ابھری ہوئی ہڈیاں اور اس کی چوڑی پیشانی، نگاہ کو جذب کرتی تھیں۔ اس کے شانے کشادہ اور جسم چھریرا تھا۔ وہ بولی۔ ''دیکھو، کتنی عجیب بات ہے مہروج! آج یہاں کتنے عرصے بعد تاؤ انجل سے ہماری ملاخات (ملاقات) ہوگئی۔ تم نے تاؤ کو پہچان لیا ہے نا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں یا غلط۔

میں نے کہا۔ ''ایک بات تو بتاؤ سلطانہ! یہاں کی تقریباً تمام عورتیں ہلکے پھلکے زیور پہنتی ہیں لیکن میں نے کبھی تمہیں زیور پہنے نہیں دیکھا؟''

''بس شروع سے ہی ایسا ہے۔ مجھے شوق نا ہیں۔''

میں نے اپنی دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا اور اس کا چہرہ اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں شوق نہیں یا تمہارے پاس زیور ہی نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ذرا چونکی۔

''کچھ نہیں، بس یونہی کہہ رہا تھا۔''

''بالو کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا اور اس کے ملیح چہرے پر ممتا کا گہرا دکھ جھلکنے لگا۔

''وہ بالکل خیریت سے ہے۔ دیوان میں صفیہ اور ہاشو اس کی بڑی اچھی دیکھ بھال کر رہے ہیں لیکن تمہاری کمی وہ بہت زیادہ شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ صبح اُٹھتے ہی رو رو کر ہلکان ہو جاتا ہے۔'' میں نے اس کی دُکھتی رگ کو چھیڑا۔

''تم اس کا بہت خیال رکھو مہروج!'' وہ آزردہ لہجے میں بولی۔

''یہی بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ دنیا کے جرموں کی سزا اپنے بچے کو مت دو۔ وہ تمہارے بغیر بہت دکھ اُٹھا رہا ہے۔''

''میں کیا کروں؟'' وہ عاجز نظر آ رہی تھی۔

''تم کچھ نہ کرو۔ تم بس ایک ماں بن جاؤ...... اور ایک بیوی بن جاؤ۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اب وہ پہلے والا مہروز نہیں ہوں سلطانہ...... میں تمہاری حفاظت کر سکتا ہوں اور تمہارے بدلے بھی چکا سکتا ہوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

اس نے سسک کر اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ اس کے گھنے بالوں کی عجیب سی دہقانی خوشبو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اس نے میرا دایاں ہاتھ تھاما، اسے موڑا اور ہتھیلی کا رخ اپنے ہونٹوں کی طرف کر کے ہتھیلی کو چوم لیا۔ اس کے گرم ہونٹوں کے ریشمی لمس نے

میرے پورے بازو اور جسم میں پھریری سی دوڑا دی۔

''یہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بس نفی میں سر ہلا دیا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

میں نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر اس کا چہرہ پھر اوپر اُٹھایا۔ ''بتاتی کیوں نہیں ہو...... کیوں چوما میرا ہاتھ؟''

اس نے پلکیں اُٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا۔ مجھے اس کی بھیگی آنکھوں میں پہلی بار ایک ہلکی سی چمک یا مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ اپنے بائیں رخسار پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس لئے۔''

''کیا مطلب؟''

لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، میں نے غور سے اس کے رخسار کو دیکھا۔ وہاں ابھی تک اس طمانچے کا مدھم نشان موجود تھا جو میں نے پرسوں اس کے رخسار پر مارا تھا۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''تو تم اس لئے میری ہتھیلی چوم رہی ہو کہ میں نے تمہیں طمانچے مارے؟''

''کوئی اپنا سمجھ کر ہی ڈانٹتا اور مارتا ہے نا۔'' وہ میرے سینے میں منہ چھپا کر بولی۔

''اگر تم بھی مجھے اپنا سمجھتی ہو تو پھر...... مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ جو کچھ ہوا، سب کچھ بھول جاؤ گی۔ اپنے دل و دماغ کی ٹھنڈا رکھو گو......''

''میں جانتی ہوں مہروج! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو لیکن...... مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت دو۔ ابھی میرا دل ٹھکانے پر نا ہیں ہے۔ اس میں تھوڑا وقت لگیں گا۔''

''جتنا مرضی وقت لے لو۔ مگر سلطانہ! اتنا وعدہ تو کرو کہ مجھ سے مشورہ کئے بغیر اب کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اُٹھاؤ گی۔ تمہارے، دیوان سے اچانک گم ہو جانے کا جتنا صدمہ مجھے ہوا تھا، میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں، چوہان اور انور خاں تمہیں دیوانوں کی طرح نل پانی کی گلیوں میں ڈھونڈتے رہے ہیں۔''

''مجھے بہت دکھ ہے کہ میں نے ایسا کیا لیکن کیا کروں مہروج! کچھ بھی میرے بس میں نا ہیں ہے۔ مجھے جب وہ سب کچھ یاد آتا ہے تو میرا دل جندہ رہنے کو نا ہیں چاہتا۔''

''تمہیں اپنے بالو کے لئے زندہ رہنا ہوگا اور میرے لئے رہنا ہی ہوگا۔'' میں نے اسے ایک بار پھر اپنے ساتھ لگا لیا۔ بالوں سے اُٹھنے والی دہقانی خوشبو فزوں تر ہوگئی۔ میں نے اس سیدھی سادی عام سی لڑکی کے لئے اپنے دل میں بے پناہ محبت محسوس کی۔ مجھے لگا کہ

اگر میں اس لڑکی سے دور رہوں گا، اسے ایک شوہر کی محبت نہ دے سکوں گا تو بہت بڑا جرم کروں گا۔ ایک ایسا جرم جس کے لئے قدرت مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میں نے اپنی انگلیاں بہت آہستہ سے اس کے بالوں میں چلائیں۔ اس کے شفاف رخسار کو چھونے کے لئے اپنے ہونٹوں کو آگے بڑھایا لیکن...... عین اس وقت جیسے ایک روشنی سی سلطانہ کے اندر بجھ گئی۔ وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹی اور اس کے پورے سراپا کو ایک نامعلوم گریز نے ڈھانپ لیا۔

''کیا ہوا سلطانہ؟''

''کچھ ناہیں۔'' اس نے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا۔ اس کی سانس قدرے تیزی سے چل رہی تھی۔ میں ٹھیک سے نہیں جان سکا کہ سانسوں کی یہ تیزی جذبات کے سبب ہے یا گریز کے سبب۔

تاہم مجھے ان سانسوں کی خوشبو کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ جیسے یہ سانسیں کسی وقت میرے بہت قریب رہی ہیں۔ میرے کانوں میں سرسراتی رہی ہیں اور میرے رخساروں سے لپٹتی رہی ہیں۔ کب ہوا تھا ایسے؟ اور کب تک ہوتا رہا تھا؟ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ ایک دُھندلا سا پردہ تھا جس کے پیچھے سب کچھ چھپا ہوا تھا۔ یہ پردہ پہلے سے کچھ ہلکا ضرور گیا تھا لیکن اب بھی مجھے اس کے پار دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ ''سلطانہ! ایسا کیوں کرتی ہو؟ میں تمہارا شوہر ہوں، تمہارے بچے کا باپ ہوں۔''

اس کا سر جھکا رہا۔ دو موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے گر کر اس کی جھولی میں جذب ہو گئے۔ اس کے جسم میں وہی ہلکی سی لرزش نمودار ہو چکی تھی جو میں اس سے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ دیوان میں جب میں نے بالو کو زبردستی اس کی گود میں دیا تھا اور پھر اسے دودھ پلانے کے لئے کہا تھا تو وہ اسی طرح سرتاپا کانپنے لگی تھی۔

''سلطانہ! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' میں نے اس کے بازو کو ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے معاف کردو مہروج! بس مجھے معاف کردو۔'' اس نے تیزی سے کہا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ کمرا خالی ہو گیا تھا۔

میں اپنی جگہ حیران بیٹھا رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح کا ردِعمل ظاہر کرے گی لیکن وہ ریشم کی طرح نرم تھی تو کہیں فولاد کی طرح سخت بھی۔ میں اس کے بارے میں جتنا سوچتا تھا، اتنا ہی الجھ جاتا تھا۔

وہ رات عجیب سی بے چینی میں گزری۔ بس پچھلے پہر تھوڑی دیر کے لئے آنکھ لگی۔ میں اُٹھا تو ایک حیران کن منظر دیکھنے کو ملا۔ مہا گرو سوبھاش میرے لئے ایک ٹرے میں چائے لے کر آ رہا تھا۔ ساتھ میں گھر کے بنے ہوئے بسکٹ اور رس وغیرہ تھے۔ کچھ مٹھائی اور دودھ بھی تھا۔ چلتے ہوئے مہا گرو کی توند ہولے ہولے ہل رہی تھی۔ وہ سفید دھوتی کرتے میں تھا۔ بالائی جسم پر ایک ڈبی دار کمبل لپٹا ہوا تھا۔ گرو کے عقب میں گھاگھرے اور چولی والی ایک تیز تیکھی عورت تھی۔ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔ عمر کوئی پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ اس نے ایک ہاتھ میں بالٹی اور دوسرے میں ایک بڑا سا لوٹا پکڑ رکھا تھا۔

میں نے مہا گرو کو دیکھ کر کہا۔ ''یہ سب کیا ہے گرو جی؟''

''تمہارا ناشتا ہے۔''

''لیکن یہ آپ کیوں لے کر آئے ہیں؟''

گھاگھرے چولی والی کھنک دار آواز میں بولی۔ ''یہ آپ کا سیوک ہے جی۔ آپ کی خاطر داری کرے گا۔ اس نے یہ کام اپنی مرضی سے چنا ہے۔ اس کی پتنی ادھر دوسری طرف عورتوں کی خاطر داری کرے گی۔''

''یہ تو زیادتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''زیادتی تو تب ہوتی جب یہ کام کرنے میں ان کی اپنی مرضی ناہیں ہوتی۔'' گھاگھرے چولی والی نے کمر لچکا کر کہا۔

میں نے گرو کو دیکھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ٹرے نما چنگیر لے لی اور اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

''ناہیں، میں کھڑا ہی ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا۔

وہ بے بسی کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ عمران اور اقبال نے اسے یہاں یہ رول ادا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ پرسوں صبح سویرے گرو اور رادھا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ زندہ رہنے کے لئے بلکتے رہے تھے...... گرو اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا تھا اور عمران کے قدموں پر سر رکھ کر کہا تھا کہ اگر اس کا جیون بخش دیا جائے تو وہ عمر بھر غلام بن کر رہے گا۔

اور آج وہ واقعی غلام دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے میرے دل میں گرو کے لئے ترس کا جذبہ ابھرا...... لیکن پھر فوراً ہی ایک چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا اور یہ جذبہ معدوم

ہو گی۔ یہ شکیلہ کا اجڑا بجڑا چہرہ تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی، آنکھوں میں کھنڈروں کی ویرانی...... جسم پامال۔ وہ اسی گرو کے استھان میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتی رہی تھی اور پھر خود اپنی قبر کھود کر اس میں دفن ہو گئی تھی۔ یہ نام نہاد گرو کتنا بھی انکار کرتا لیکن وہ خود کو اس انسانیت سوز جرم سے علیحدہ نہیں کر سکتا تھا۔

تیز طرار لڑکی نے گرو کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ''کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے موٹے! چل منہ ہاتھ دُھلا بابو جی کا۔'' لڑکی نے کھلے منہ والی بالٹی چارپائی کے سامنے رکھ دی اور گرم پانی والا لوٹا گرو کے ہاتھ میں تھما دیا۔

گرو لوٹا لے کر میری طرف جھک گیا۔ میرے دل میں عجیب سی بیزاری پیدا ہوئی۔ میں نے لوٹا گرو کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''تم جاؤ یہاں سے۔ تمہاری صورت دیکھتا ہوں تو تمہارا ظلم یاد آتا ہے۔''

لڑکی نے چہک کر کہا۔ ''اوئی ماں...... بابو جی! تم تو بڑا اچھا ڈائیلاگ بولتا ہے۔ بالکل امیتابھ بچن کی طرح۔''

''تم کون ہو؟'' میرے لہجے میں بدستور بیزاری تھی۔

''میرا نام نوری ہے جی۔ میں عمران بابو کی نوکرانی ہوں...... بلکہ آپ مجھ کو ان کی لونڈی بھی کہہ سکت ہیں۔''

''لونڈی؟ یہ کیا بات ہوئی؟''

''ہاں جی، عمران بابو نے مجھے پیسے دے کر خریدا ہے۔ مکھیا کے بڑے بیٹے سلمان سے...... لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ عمران بابو بڑے نیک بندے ہیں۔ بالکل فرشتہ ہیں فرشتہ۔ کبھی میلی نظر سے ناہیں دیکھا مجھے اور نہ کسی دوسرے کو دیکھنے دیوت ہیں۔ کہتے ہیں کوئی اچھا سا بر دیکھ کر تیرا بیاہ کروں گا۔ وہ ہر کسی کا بھلا سوچت ہیں۔ میرے جیسی نیچ کمینی کے لئے بھی ان کی سوچ ایسی ہی ہے۔'' وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

''اچھا ابھی تم جاؤ۔ میں ناشتا کر لوں گا تو برتن لے جانا۔''

''آپ اکیلے ہی ناشتا کریں گے؟''

''تو کیا تجھے ساتھ بٹھا کر کروں گا؟'' میں نے تپ کر کہا۔

''اوئی ماں! آپ تو غصے بھی ہوتے ہیں۔ میرا مطلب تھا کہ اتنا سارا ناشتا آپ اکیلے کیسے کریں گے؟''

میں نے غور کیا، واقعی ناشتا زیادہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ عمران اور اقبال بھی آنے والے

''اس لئے کہ آپ نئے آئے ہیں۔''

عمران جھٹ بولا۔ ''اور تم نے وہ گانا تو سنا ہی ہو گا۔ بمبئی سے آیا میرا دوست...... دوستو سلام کرو۔''

''لیکن میں بمبئی سے نہیں آیا اور نہ مجھے فضول بکواس پسند ہے۔

''یار! دیکھو تم نے پھر ایک لفظ ضائع کر دیا۔'' عمران نے اعتراض کیا۔ '' بکواس تو ہوتی ہی فضول ہے...... اس کے ساتھ فضول لگانے سے مطلب؟''

حلوہ میرے سامنے رکھتے ہوئے نوری گھٹنوں کے بل جھک گئی تھی۔ گردن سے نیچے اس کا چمکیلا جسم خطرناک حد تک دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے نگاہ پھیر لی۔

''چلو، جاؤ تم۔'' اقبال نے نوری سے تحکمانہ انداز میں کہا۔

وہ اُٹھی اور ''اوئی ماں'' کہتی ہوئی ایک دم لڑکھڑا گئی۔ سہارے کے لئے اس کا ہاتھ بے ساختہ میرے کندھے پر آیا۔ اس کے بال لہرا کر میرے چہرے سے ٹکرائے۔ ان میں چنبیلی کے تیل کی خوشبو تھی۔

''مم...... ماف کر دیں جی...... پھسل گئی تھی۔''

''تمہارا پھلسنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب جاؤ۔'' اقبال نے پھر تحکم سے کہا۔

وہ مجھ پر ترچھی نظر ڈالتی ہوئی باہر چلی گئی۔

عمران نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا۔ ''یہاں کا مکھیا رشید احمد بڑا جابر قسم کا شخص ہے۔ اس کے دو بیٹے ہیں سلمان اور مستان عرف مانی۔ یہ دونوں بھی اوّل درجے کے تلنگے اور بدمعاش ہیں۔ یہ لڑکی نوری دراصل سلمان کی رکھیل تھی۔ اس نے خانہ بدوشوں کو پیسے دے کر اسے خریدا تھا۔ یہ وہاں رشید کی حویلی میں گناہ کی زندگی گزار رہی تھی لیکن اس کے دل میں ہر عورت کی طرح یہ خواہش موجود تھی کہ یہ اپنا گھر بسائے۔ یہ خواہش صرف اس صورت میں پوری ہو سکتی تھی جب یہ سلمان کی غلامی سے نکلتی۔ میں نے کوشش کی اور بیس ہزار روپے نقد دے کر اسے سلمان سے حاصل کر لیا۔''

''لیکن رابن ہڈ صاحب! یہ بیس ہزار روپے تمہیں ملے کہاں سے؟''

''یہ تم نے بہت بونگا سوال پوچھا ہے۔ تمہیں پتا ہونا چاہئے کہ جہاں عمران موجود ہو، وہاں پیسا خود بخود پہنچ جاتا ہے۔ یعنی دولت مابدولت کے لئے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہی۔'' وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

اقبال نے شوخی سے کہا۔ ''مزے کی بات یہ ہے کہ عمران نے مکھیا کے بیٹے سے لڑکی کو

ہیں۔ اسی دوران میں وہ دونوں دروازے پر نمودار ہو گئے۔ نوری ذرا شوخی سے بولی۔ ''لو جی، ناشتے میں آپ کے ساجھے دار آ گئے۔ اب میں جاوت ہوں۔'' وہ کمر لچکاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''کیسے ہو جگر؟'' عمران نے میرے سر کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''یہ بلا کون تھی؟'' میں نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

''اچھی بھلی خوب صورت لڑکی کو بلا کہہ رہے ہو۔ کیا تم نے خدا کو جان نہیں دینی؟'' عمران بولا۔

''میں نے تو خدا کو جان دینی ہے لیکن تم نے کس کو دینی ہے جو یہاں فتح پور میں لڑکیاں خریدتے پھرتے ہو۔''

''میں فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ مجھ سے ایسی بات مت کرو۔ ہر خبر کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر خبر بے مطلب ہوتی ہے۔ تمہیں یہ تو پتا چل گیا ہے کہ میں نے اس کو خریدا ہے لیکن کیسے خریدا ہے اور کیوں؟ اس بات کا پتا چلے گا تو تمہاری رائے بدل جائے گی۔''

خیر، یہ تو مجھے پتا ہے کہ تم رابن ہڈ کی نسل سے ہو لیکن رابن ہڈ بھی تو انسان ہی تھا اور انسان سے غلطی ہو سکتی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ایسی خطرۂ ایمان لڑکی کو خریدو گے اور وہ داسی بن کر تمہارے آس پاس رہے گی تو پھر کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

ایک دم اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ اپنے خوب صورت دانتوں کی نمائش کر کے بولا۔ ''ہمارے ساتھ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے جگر! اب اور کچھ نہیں ہوگا اور اگر ہوگا تو بس مذاق ہوگا۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایک بار پھر دل نے گواہی دی کہ عمران اپنے اندر کوئی سربستہ راز چھپائے پھرتا ہے۔ کوئی درد بھری کہانی۔ کوئی انوکھی کتھا، کوئی المیہ یا حادثہ......!

اسی دوران میں نوری نامی وہ لڑکی پھر کمر لچکاتی وہاں پہنچ گئی۔ وہ کچھ تازہ بہ تازہ پراٹھے اور انڈوں کا حلوہ لائی تھی۔ وہ انڈوں کا حلوہ میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ''تابش بابو! یہ خاص آپ کے لئے ہے۔''

''خاص میرے لئے کیوں؟'' میں نے بھویں اچکائیں۔

چھڑانے کے لئے کھیا سے ہی پیسے دلوائے ہیں۔ یعنی وہ بیس ہزار روپیا کھیا کی گرہ سے ہی نکلا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''جیسے اس طرح کے بہت سے دوسرے کام ہمارے ہیرو صاحب نے کئے ہیں۔ آخر اسے یونہی تو ہیرو نہیں کہا جاتا۔''

پھر اس نے تفصیل بتائی۔ پتا چلا کہ یہاں اس بستی میں تماشا دکھانے والے کچھ بازی گر آئے تھے جنہیں یہاں نٹ کہا جاتا ہے۔ وہ تنے ہوئے رسّے پر چل کر دو چار کرتب دکھاتے تھے...... کھیا اور اس کے یار دوست ایک بازی گر کے کرتب دیکھ کر واہ واہ کر رہے تھے۔ عمران نے کہا کہ وہ بھی ایسا کر کے دکھا سکتا ہے۔ کھیا نہ مانا۔ تکرار ہوئی اور شرط لگ گئی۔ کھیا کو پتا نہ تھا کہ عمران پیشہ ور جمناسٹر ہے اور اس سے کہیں بڑھ کر مہارت دکھا سکتا ہے۔ عمران نے رسّے پر چل کر دکھایا اور سیکڑوں لوگوں کے سامنے پچیس ہزار روپے کی شرط جیت لی۔ بعد میں اس نے جیتی ہوئی رقم میں سے بیس ہزار روپے دے کر لڑکی کو آزاد کرایا۔

سارا دن مجھے سلطانہ کی جھلک دکھائی نہیں دی۔ پتا نہیں وہ کہاں چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ ڈر تھا کہ وہ اپنی جذباتی کیفیت میں پھر کوئی الٹی پلٹی حرکت نہ کر بیٹھے۔ عمران مجھ سے رات کی ملاقات کا احوال پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے مختصر لفظوں میں بتایا کہ کیا ہوا تھا۔ اس نے میرے لتے لینے شروع کر دیئے۔ مجھے نکما، گاؤدی، ہونق اور پتا نہیں کیا کیا قرار دیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے سلطانہ کے سامنے خود کو بیمار ظاہر نہ کر کے غلطی کی ہے۔ اگر میں اس کی ہدایت کے مطابق سلطانہ کو ہچکیاں وغیرہ لے کر دکھاتا تو سلطانہ کا ردِعمل یکسر مختلف ہوتا تھا۔

میری اور عمران کی گفتگو کے دوران میں ہی ہمیں طلال اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے شکن شکن پاجامہ کرتہ پہن رکھا تھا، اوپر سویٹر تھا اور کمبل کی بکل مار رکھی تھی...... اسے دیکھ کر بالکل نہیں لگتا تھا کہ یہ لڑکا سلطانہ کے ساتھ مل کر زرگاں میں چار اہم افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ طلال کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ وہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے طلال؟'' میں نے محبت سے پوچھا۔

''خالہ صبح سے رو رہی ہے۔ اس نے کھانا بھی ناہیں کھایا۔''

''کیا کہتی ہے؟''

''کچھ بھی ناہیں۔'' طلال سادگی سے بولا۔

''چلو آؤ میرے ساتھ۔'' میں نے کہا اور طلال کو لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

تاؤ افضل بیرونی دروازے کے پاس لکڑی کی ایک چوکی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں لٹھ تھی۔ میں اور طلال ایک اندرونی کمرے میں پہنچے۔ سلطانہ کے ساتھ تاؤ افضل کی دونوں بیٹیاں بھی موجود تھیں۔ وہ پردہ کرتی تھیں۔ میری آمد کا جان کر وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔ طلال بھی کمرے سے باہر ہی رک گیا۔ سلطانہ کروٹ لئے چارپائی پر لیٹی تھی۔ مجھے اندر آتے دیکھا تو اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے دونوں ٹخنے زخمی تھے اور ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ پٹیاں استھان میں ہونے والے ظلم کی ایک نشانی تھیں۔ استھان میں سلطانہ کی حیثیت ایک خطرناک قیدی کی تھی۔ اسے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر رکھا گیا تھا۔ زنجیروں کی رگڑ نے اس کے ٹخنوں کو چھیل ڈالا تھا۔

''تم کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو؟'' میں نے گہرے سنجیدہ لہجے میں سوال پوچھا۔

''وہ..... بس..... دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔''

''تم خود کو تماشا بنا رہی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی۔'' میرے لہجے میں غصہ در آیا۔

وہ کانپ گئی۔ ''ایسا نہ کہو سروج! اللہ نہ کرے میری وجہ سے آپ تماشا بنیں۔ آپ کی محبت کے لئے تو میں جان دے سکتی ہوں۔''

''طلال!'' میں نے آواز دی۔

''جی خالو۔'' اس نے مجھے نئے خطاب سے نوازا اور جلدی سے اندر آ گیا۔

''کھانا منگواؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ ''جی اچھا'' کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ سلطانہ اپنی جگہ بیٹھی انگلیاں مروڑتی رہی۔ اس کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک راجپوت تھی۔ اس کے خانوادے کی رگوں میں ایک جوشیلا خون تھا اور اس خون میں ایک خاص قسم کی آن بان تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، وہ کسی طور بھی اس کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر پا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد نوری اپنی چوڑیاں چھنکاتی اور کمر لچکاتی اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی چنگیر نما ٹرے تھی۔ میرے اشارے پر اس نے کھانا سلطانہ کے سامنے رکھا اور بولی۔ ''لو جی، اپنے ہاتھ سے بنایا ہے اور نوری جو کچھ کرت ہے، جی جان سے کرت ہے۔''

میں نے تحکمانہ انداز میں سلطانہ کو کھانے کا کہا تو وہ لقمہ توڑنے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے بھی اس کا تھوڑا سا ساتھ دیا۔ اسی دوران میں نوری پھر وارد ہو گئی۔ وہ پانی لے کر آئی تھی۔

بڑے انداز سے میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''بابو جی! یہ سالن بھی ذرا چکھ کر دیکھو۔ میں نے خود بنایا ہے۔ یہ ڈولا مچھلی ہے۔ مچھلی تو بہت ساری ہووت ہیں لیکن ڈولے کی تو بات ہی اور ہووت ہے جی۔ اس کو کاٹ ڈالو، تب بھی اس کی بوٹیاں پھڑکتی رہتی ہیں۔ وہ کہاوت تو آپ نے سنی ہی ہووے گی۔ ڈولا جب مچھیرے کے جال میں آ جاوت ہے تو اپنی ماں سے کہوت ہے کہ ہانڈی میں پکنے تک میرے واپس آنے کی امید رکھنا۔''

''اچھا، اب تم جاؤ۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''لیکن آپ ایک نوالہ میرے سامنے لے لو جی۔ مجھے پتا چل جاوے گا کہ میں نے کیسا پکایا ہے۔''

میں نے نوالہ لیا اور کہا۔ ''بہت اچھا ہے۔''

وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''بھوک کے ساتھ تو سب ہی کھا لیوت ہیں لیکن اگر عورت کے ہاتھ میں کرامات ہو تو پھر مرد بھوک کے بغیر بھی کھاوت ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ عورت اپنی ہوشیاری سے اسے بھوک لگا دیوت ہے۔'' وہ پتا نہیں کس بھوک کی بات کر رہی تھی۔

''اچھا، اب تم جاؤ۔'' میں نے طیش بھرے انداز میں کہا۔

''اوئی ماں! آپ تو بڑی جلدی غصہ ہو جاوت ہیں۔''

''میں بڑی جلدی ہاتھ بھی اُٹھا لیتا ہوں۔''

''اُف ماں! آپ تو واقعی بڑے کڑک ہیں۔'' اس نے پھر معنی خیز انداز اختیار کیا اور مجھ پر ترچھی نظر ڈال کر باہر چلی گئی۔ سلطانہ ذرا چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

کچھ دیر بعد میں واپس جانے کے لئے برآمدے سے گزرا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ گرو کی سندر چیلی رادھا ایک کمرے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ اسے اور گرو کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ جس بارودی بیلٹ کے ڈراوے میں آ کر وہ اور گرو دربدر ہوئے ہیں اور ایک بڑی آفت میں پھنسے ہیں، اس بیلٹ میں پسے ہوئے نمک کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں عمران اور اقبال کے پاس پہنچا تو وہ کمرے میں انگیٹھی دہکائے بیٹھے تھے۔ پرسوں راستے میں جیپ سے پکڑا جانے والا راہول بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے کندھے پر ایک بڑی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ وہ کراہ کر بات کر رہا تھا۔ وہ طاقتور واکی ٹاکی بھی اس کے قریب رکھا تھا جو ہمیں جیپ میں سے ملا تھا۔ واکی ٹاکی آن تھا لیکن پرسوں رات کی طرح آج بھی اس سے کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ عمران اور اقبال کل بھی کوشش کرتے رہے تھے مگر اس واکی ٹاکی کے ذریعے کسی سے رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔

عمران نے راہول سے کہا۔ ''دیکھو، سچ بولو گے تو تمہاری نسل آگے چلے گی، ورنہ آج اسی جگہ وہ سارے بچے اور ان کے بچے بھی ختم ہو جائیں گے جنہوں نے تمہاری وجہ سے پیدا ہونا ہے...... ہنستا کھیلتا ہے اور زندگی کے مزے لینے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی عمران نے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے ہوئے ریوالور کی تھوڑی سی جھلک راہول کو دکھائی اور اسے یہ بھی باور کرایا کہ اس نے انگلی ٹریگر پر رکھی ہوئی ہے۔

راہول نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''میں سچ کہوت ہوں، پانڈے صاحب اور دوسرے لوگن کے پاس دوسرا انٹینا ناہیں ہے۔ بس ایک یہی انٹینا تھا جو ہم نے جیپ میں رکھا ہوا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ لوگن ابھی تک یہاں ناہیں پہنچے۔ اگر وہ سگنل ریسیو کر رہے ہوتے تو کب کے آپ سب کو گھیر چکے ہوتے۔''

''اچھا، یہ واکی ٹاکی اب تک خاموش کیوں ہے؟'' اقبال نے راہول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس کی دو وجہ ہوسکت ہیں۔ یا تو پانڈے صاحب اور دوجے لوگن ہم سے پندرہ بیس کلومیٹر سے زیادہ کی دوری پر ہیں یا پھر ان کے واکی ٹاکی کی بیٹری ختم ہو چکی ہے۔''

''اگر تمہارے والے سیٹ کی بیٹری ابھی ختم نہیں ہوئی تو اس کی کیسے ہو سکتی ہے؟'' اقبال نے سوال اُٹھایا۔

''اس سیٹ کی بیٹری میں پہلے بھی مسئلہ تھا۔'' راہول نے کہا۔

''اگر واقعی بیٹری ختم ہو چکی ہے تو کیا پانڈے وغیرہ اسے دوبارہ چارج کر سکتے ہیں؟''

''ہاں...... میرا اوچار ہے کہ وہ کوشش کر رہے ہوں گے۔ پانڈے صاحب کے ساتھیوں میں کشور نام کا ایک الیکٹریشن بھی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے گاڑی کے چارجر کے ساتھ کچھ تار لگا کر واکی ٹاکی چارج کر لیا تھا۔''

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک کرشمہ ہو گیا۔ اچانک لونگ رینج کے اس واکی ٹاکی پر ایک سرخ بلب روشن ہوا اور اس کے اسپیکر میں کھٹ پٹ کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ پہلے تیز شائیں شائیں سنائی دیتی رہی پھر اقبال نے ایک ناب کو دائیں بائیں گھمایا تو واضح انسانی آواز ابھر کر ہمارے کانوں تک پہنچی۔ ''ہیلو...... ہیلو...... کہاں ہو تم لوگ...... ہیلو۔''

میں اس آواز کو بہ آسانی پہچان گیا۔ یہ منحوس لب و لہجہ پانڈے کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔

آواز پھر ابھری۔ ''ہیلو راہول...... ہیلو دلیپ...... ہیلو، میں پانڈے بول رہا ہوں۔ تم

میری آواج سن رہے ہونا؟''

مجھے دوسرا شاک لگا جب راہول کے بجائے اقبال نے پانڈے کے سوال کا جواب دیا لیکن یہ آواز ہو بہو راہول کی تھی۔ اقبال نے کہا۔ ''ہاں پانڈے صاحب! میں راہول بات کر رہا ہوں۔''

''یار! کہاں مر گئے تھے تم۔ ہم تمہارے انتجار میں سوکھ کر لکڑی ہو گئے ہیں۔ ماں قسم اتنا انتجار فلمسٹار جی نت امان کا کیا ہوتا تو وہ بھی اپنے بستر میں گھس آتی۔ پورے چھتیس گھنٹے ہو گئے ہیں تمہاری جان کو روتے ہوئے۔''

''بس ملاقات ہوتی ہے تو ساری ڈیٹیل آپ کو بتاتے ہیں۔ یہاں بڑا لپڑا ہو گیا ہے۔''

''کیا چھوٹے سرکار اجیت صاحب کی بہن نے بکری کا بچہ جن دیا ہے جنگل میں؟''

''بس ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔'' اقبال نے ہو بہو راہول کی آواز کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

یہ تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اقبال مختلف آوازوں کی شاندار نقل کرتا ہے۔ اس نے لاہور میں بھی سیٹھ سراج کی آواز کی زبردست نقل کی تھی اور جب ہم عمران کے گھر میں تھے تو اقبال نے سیٹھ سراج کی آواز میں مولانا ابرار کو فون کر کے اس سے اہم معلومات حاصل کی تھیں لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح واکی ٹاکی کے اچانک جاگنے پر وہ فوراً ہی راہول کی آواز میں گفتگو شروع کر دے گا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران اور اقبال نے اس کے لئے پہلے سے تیاری اور ریہرسل وغیرہ کر رکھی تھی۔ راہول کی آواز سن کر اس کی کاپی کرنے میں اقبال کو دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔

''یار! کچھ منہ سے پھوٹو گے یا پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے؟'' پانڈے نے ذرا کرخت آواز میں کہا۔

''پہلے آپ یہ بتائیں کہ کس جگہ پر ہیں؟'' اقبال نے راہول کی آواز میں پوچھا۔

پانڈے نے کہا۔ ''ہم نے لکڑی کی چھوٹی پلیا پر سے ندی پار کر لی ہے۔ سامنے جو دو بڑے ٹیلے نجر آ رہے تھے، ان کے بالکل پاس ہیں۔ کل رات بھی اسی جگہ پر گزاری ہے، تم دونوں کے نام کی مالا جپتے جپتے...... اب تم بتاؤ کچھ کھوج کھرا ملا اس پاکستانی پوکا؟''

''لگتا ہے کہ پوکی قسمت اچھی ہے پانڈے صاحب...... بس شکنجے میں آتے آتے نکل گیا ہے۔ کل صبح تک ہم کو بڑے اچھے سگنل مل رہے تھے۔ وہ کچے کی طرف جا رہا تھا۔ شام کے وقت سگنل بالکل کمزور پڑے اور پھر بند ہو گئے۔ رات پچھلے پہر پھر ایک آدھ گھنٹے کے لئے سگنل ملے، اب پھر کوئی پتا ناہیں چل رہا۔ اب جیپ کا ڈیزل بھی ختم ہونے کو ہے۔ میرا

خیال ہے، ہم اور آگے ناہیں جا سکیں گے۔''

''کوئی اچھی جانکاری نہ دینے کی تو شاید تم نے سوگند کھا رکھی ہے۔'' پانڈے کی آواز میں بیزاری تھی۔ پھر وہ کچھ بڑبڑایا۔ شاید اس نے موجودہ صورتِ حال کو کوئی غلیظ گالی دی تھی۔ میں جان گیا تھا کہ یہ گفتگو میرے بارے میں ہو رہی ہے۔ وہ میرے لئے بڑی حقارت سے پپو کا لفظ استعمال کرتا تھا۔ حالانکہ یہ پپوا سے دیوان میں ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔

پانڈے نے اپنے کسی ساتھی سے بات کی۔ الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکے۔ تب وہ راہول سے مخاطب ہو کر مائیک میں بولا۔ ''راہولے! اس پپو نے ہم کو چیلنج مارا ہے۔ جب تک اسے ننگا کر کے الٹا نہ لٹکاؤں گا، مجھے بھوجن ہضم ناہیں ہووے گا اور نہ ہی حاجت ہووے گی۔ جیسے بھی ہو، ہم نے اس کتے کو پکڑنا ہے اور اس کے جسم کے کسی نازک حصے کو دبوچ کر اسے کھینچتے ہوئے یہاں لانا ہے۔''

''لیکن اس کے لئے ہم کو تھوڑا سا دھیرج کرنا پڑے گا پانڈے صاحب! معاملہ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''پہلے آپ ذرا جلدی سے مجھے یہ بتائیں کہ آپ سے رابطہ کیوں ناہیں ہو پا رہا تھا؟'' اقبال نے راہول کی آواز میں پوچھا۔

''وہی بھوتنی کی بیٹری ٹھس ہو گئی تھی۔ پہلے ہر ایک گھنٹے بعد پاؤں بھاری ہو جاتا تھا پھر بالکل لمبی ہی لیٹ گئی۔ بڑی کوشش سے ٹھیک کیا ہے کشور نے...... اب پتا ناہیں پھر کب حاملہ ہو جائے۔'' پانڈے نے بیٹری پر غصہ نکالتے ہوئے کہا۔

اقبال نے راہول کی آواز میں کہا۔ ''پانڈے صاحب! ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے نل پانی کے دو مُسلے سپاہی پکڑے ہیں۔ پہلے تو وہ کچھ بتاوت ناہیں تھے۔ اب دس پندرہ منٹ پیٹھ پر جوتوں کی ٹکور کرانے کے بعد انہوں نے زبان کا تالا کھولا ہے۔ آپ اس وقت سخت خطرے میں ہو جی۔ ہمارا وچار ہے کہ آپ جتنی جلدی یہاں سے نکل جاویں، اتنا ہی اچھا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہاں سے روانہ ہونے کے لئے آپ کے پاس آدھ گھنٹے سے زیادہ کا وقت ناہیں ہے۔''

''یار! کیا بک رہے ہو؟''

''میں تفصیل آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ کو جانکاری مل گئی ہے کہ آپ چھوٹی پلیا کے آس پاس موجود ہیں۔ آپ کو گھیرے میں لینے کے لئے ایک بڑا جتھا

آپ کی طرف آ رہا ہے۔ پکڑے جانے والے دونوں لڑکوں نے بتایا ہے کہ یہ کم از کم ڈیڑھ سو گھڑ سوار ہیں۔ تین چار جیپیں بھی ان کے ساتھ ہیں۔ چھوٹے سرکار یہ سمجھتا ہے کہ مختار راجپوت کی لونڈیا اب بھی ہمارے پاس ہے۔ وہ اسے ہم سے چھڑانا چاہت ہے۔''

''تم...... تم اس سمے ہو کہاں؟'' پانڈے کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''میں اس سمے اپنی لوکیشن کے بارے میں ٹھیک سے کچھ کہہ ناہیں سکتا۔ بس چاروں طرف درخت ہی درخت ہیں۔'' اقبال بڑے اعتماد سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔

''یعنی تم اس سمے بالکل کھلی جگہ پر ہو؟''

''جی ہاں۔''

''کوئی آبادی کوئی مکان وغیرہ دکھائی ناہیں دیتا؟''

''ناہیں...... اور میں آپ کو پھر کہہ رہا ہوں، آپ باتوں میں سمے ضائع نہیں کریں۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے، زرگاں کی طرف رخ کر لیں۔''

''اور تم دونوں؟''

''ہماری زیادہ چنتا ناہیں کریں۔ ہم بھی کسی نہ کسی طرح نکل ہی جاویں گے۔''

''جو دونوں لڑکے تم نے پکڑے ہیں، کیا ان سے ایک منٹ میری بات کرا سکت ہو؟''

''ٹھیک ہے میں کرا دیتا ہوں لیکن آپ کے پاس ٹائم......'' اس کے ساتھ ہی اقبال نے بٹن دبا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلسلہ چونکہ فقرے کے درمیان منقطع ہوا تھا، دوسری طرف یقیناً یہی سمجھا گیا ہوگا کہ کسی وجہ سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔

اقبال نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور داد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران نے اس کے سینے پر ہلکا سا گھونسا جما کر اسے داد دی۔ یقیناً وہ تعریف کے قابل تھا۔ خود راہول بھی اس کی کامیاب نقالی پر حیران نظر آ رہا تھا۔ آواز کا اتار چڑھاؤ، فقروں کی بناوٹ، لفظوں کا چناؤ...... سب کچھ پرفیکٹ تھا۔

راہول کو باہر بھیج دیا گیا۔ عمران کافی حد تک مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''چلو، اس دوسری بلا سے بھی جان چھوٹی۔''

''وقتی طور پر۔'' اقبال نے فقرہ مکمل کیا۔

''اور پہلی بلا سے کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! اتنی جلدی بھول گئے۔ استھان کے وہ سارے جنونی بلاؤں سے کم تو نہیں تھے۔

اگر پرسوں رات جنگل میں ان سے ٹاکرا ہو جاتا تو پانی پت کی تیسری لڑائی ہو جاتی تھی۔"

"لیکن وہ جنونی ابھی ہمارے آس پاس ہی موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن ہم تک پہنچیں گے نہیں۔" عمران نے وثوق سے کہا۔ "ابھی تم دو چار دن آرام فرماؤ۔ ہماری بھابی کے ہاتھ کی گرم گرم روٹیاں کھاؤ اور ہمیں بھی کھلاؤ۔" آخر میں اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

رنجیت پانڈے کی منحوس آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی...... عمران نے میرے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا۔ "یار! یہ پانڈے کیا شے ہے؟ بڑا چرچا سنا ہے اس کا۔ کہتے ہیں کہ حکم جی کی مونچھ کا بال کہلاتا ہے۔"

"اقبال بولا۔ "ظاہر ہے بھائی! جو شخص میڈم صفورا اور مولانا ابرار جیسے بندوں کو مرغیوں کی طرح دبوچ کر پاکستان سے انڈیا لا سکتا ہے، وہ معمولی چیز تو نہیں ہو گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تابی نے اتنی محبت کیوں ہے اسے۔ بڑی شفقت سے اس کا نام لے رہا تھا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ ماضی قریب میں کہیں تابی نے اس کی دُم پر پاؤں رکھا ہے یا شاید دُم اکھاڑنے کی کوشش ہی کی ہو۔"

عمران اور اقبال سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگے۔

میں نے انہیں مختصر الفاظ میں اس زوردار جھڑپ کے بارے میں بتایا جو نل پانی کے دیوان میں میرے اور پانڈے کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جھڑپ میں تو پانڈے کو کامیابی نہیں ملی تھی لیکن وہ جاتے جاتے ایک بڑا نقصان پہنچا گیا تھا۔ اس کے رکھے ہوئے بم نے پھٹ کر دیوان میں کئی افراد کی جان لے لی تھی۔

عمران اور اقبال نے بڑی دلچسپی اور حیرت سے یہ روداد سنی۔ عمران نے میرے بازوؤں کے مسل تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اقبال! میں تجھ سے کہتا تھا نا، اپنے تابی کی جون بدل چکی ہے۔ اب یہ ہم سے دو ہاتھ آگے ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہمیں اس کی شاگردی اختیار کرنی پڑے گی۔ پہلوانی کے سارے داؤ پیچ اس سے سیکھنے پڑیں گے پھر جب کہیں کوئی دنگل ہو گا تو پوسٹرز پر میرا اور تمہارا نام اس طرح لکھا جائے گا۔ اقبال پٹھا عمران، پٹھا تابش، پٹھا باروندا جیکی نیپال والا، پٹھا فلاں فلاں۔"

اقبال مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "مذاق تو رہا ایک طرف، ویسے یار تابش! تم بہت

تبدیل ہوئے ہو۔ میں سچ مچ حیران ہوتا ہوں...... اب بھی تم نے سخت سردی میں صرف یہ ایک قمیص پہن رکھی ہے۔ آج صبح تم نے ٹھنڈے پانی سے ہی نہانا شروع کر دیا تھا۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ جس تابش سے ہم لاہور میں ملے تھے، وہ کوئی اور تھا...... اب جو تابش ہمارے سامنے ہے، وہ کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر بھٹکنے والا کوئی درویش ہے جو دن رات چلہ کشی کی تکلیفیں اُٹھانے میں سکون محسوس کر رہا ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اب تکلیف میں راحت ملنا شروع ہو گئی ہے۔ میں بڑ نہیں مار رہا ہوں۔ مجھے اب سردی محسوس ہی کم ہوتی ہے۔"

اقبال نے میرے ہاتھ تھامے اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میرے ہاتھوں کی رنگت گندمی ہو چکی تھی۔ ہاتھوں کی گانٹھوں پر چنڈیاں سی پڑ گئی تھیں۔ ہاتھ پاؤں کی کھال بتدریج سخت اور موٹی ہو گئی تھی۔ سینڈ بیگ پر میں نے اتنی زیادہ مشق کی تھی کہ اب ٹھوس دیوار پر بھی مکا چلا سکتا تھا۔

اقبال بولا۔ "جو کچھ بھی ہے، میں تمہارے اس فلسفے سے کچھ زیادہ اتفاق نہیں کر پا رہا۔ اگر قدرت نے ہمیں کچھ آسانیاں دی ہوئی ہیں تو ہمیں ان سے فائدہ اُٹھانا چاہئے...... زندگی جینے کے لئے ہے، خود کو مسلسل تکلیف میں ڈالے رکھنے کے لئے نہیں۔"

"لیکن یہ بات تو ہے نا کہ کچھ بھی مسلسل نہیں رہتا...... تکلیف نہ خوشی۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ مسئلہ تو صرف یہ ہے کہ ہم کتنی خوشی پانے کے لئے کتنی تکلیف اُٹھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم کچھ زیادہ ہی کتابی باتیں نہیں کرنے لگے ہو۔" اقبال نے جواب دیا۔

"یار اقبال! یہ اپنا جگر بڑی گہری بات کر رہا ہے۔" عمران نے مداخلت کی۔ "کسی وقت دھوپ میں بیٹھ کر، سگریٹ سلگا کر اور سامنے کڑک چائے رکھ کر اس کی بات پر غور کریں گے۔"

اسی دوران میں ایک قریبی کمرے میں رونے کی آواز آئی۔ یہ مردانہ آواز تھی۔ "میرا خیال ہے کہ یہ گرو ہے۔" عمران نے کہا۔

ہم اُٹھ کر گرو کے پاس پہنچے۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں منہ دیئے کھڑا تھا اور ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ ہر ہچکی کے ساتھ اس کی توند ہلتی تھی اور توند کے ساتھ پورا جسم بھی دہل جاتا تھا۔ اس کی پتنی رادھا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ اپنے آنسو پونچھنے کے ساتھ ساتھ اپنے پتی کو دلاسا دینے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ نوری بھی وہیں موجود تھی۔

"کیا ہوا ہے تمہارے گرو کو؟" عمران نے رادھا سے پوچھا۔

وہ بس منہ میں منمنا کر رہ گئی۔ اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

نوری بولی۔ "میں بتاتی ہوں جی...... اس موٹے کو رلانے کا کارنامہ میں نے انجام دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" عمران نے پوچھا۔

"دراصل جی، ٹھیک سے تو مجھے بھی پتا نا ہیں تھا کہ یہ خبر اس طرح ٹھاہ کر کے اس موٹے کی چھاتی پر لگے گی اور یہ یوں بھوں بھوں رونا شروع کر دیوے گا۔ خبر یہ ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بستی میں اطلاع پھیلی ہے کہ نل پانی کی بڑی پھلواری کے پاس کسی پرانے استھان میں دُرگھٹنا ہو گئی ہے۔ مندر کے بارہ سیوکوں کو کسی نے زہر دے کر مار دیا ہے اور کچھ لوگن کو اغوا بھی کر لیا ہے۔"

میں، عمران اور اقبال چونک گئے۔ عمران نے پوچھا۔ "یہ خبر پہنچائی کس نے ہے؟"

"ٹھیک سے تو پتا نا ہیں عمران بابو کسی مسافر نے ہی پہنچائی ہو گی۔ بس اتنی جانکاری ہوئی ہے کہ قاتلوں کو ڈھونڈنے کے لئے استھان کے بہت سے لوگن جنگل میں گھوم رہے ہیں اور کچے کے آس پاس والی بستیوں کی تلاشی لے رہے ہیں۔"

عمران اشک بار گرو کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا اور اس کی توند کو ٹہوکا دے کر بولا۔ "یہ کیا تماشا لگا رہے ہو؟ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب تمہارے رونے دھونے سے کیا فائدہ ہو گا؟"

گرو آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ بولا۔ "تم لوگن نے مجھے برباد کر دیا۔ میرے ہاتھوں سے بارہ ہتھیائیں ہو گئیں۔ بھگوان کے اتنے سارے سیوک مارے گئے۔ اب میرا کیا ہووے گا۔ یہ لوگن مجھے جینے دیں گے نہ مرنے۔"

عمران نے گرو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ تم نے خود ہی تو اس دن اشلوک پڑھا تھا کہ بندے کے ہر کام کو اس کی نیت سے جانچا جاتا ہے۔ تمہاری نیت کسی کو مارنے کی نہیں تھی۔ تم ان لوگوں کو صرف بے ہوش کرنا چاہتے تھے...... اور وہ بھی صرف اس لئے کہ ایک بے گناہ لڑکی کو زندہ جلنے سے بچایا جا سکے۔ ان لوگوں کا جیون پورا ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ اپنے کرموں کا حساب دینے کے لئے بھگوان کے پاس پہنچ گئے اور جس طرح کے ان کے کرم تھے، ان کا حساب جلدی ہی ہونا چاہئے تھا۔ اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں۔"

گرو بولا۔ "دوش ہے یا نہیں لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ اگر ستیش اور اس کے ساتھی کسی طرح اس گاؤں میں پہنچ گئے تو مجھے اور رادھا کو زندہ نا ہیں چھوڑیں گے۔ وہ اب تک بات کی تہ تک پہنچ چکے ہوں گے۔ بڑے گرو نے انہیں میرے خلاف اور بھڑکا دیا ہووے گا۔"

"اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ اس بستی تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ان کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ ہم اس مچھیرا بستی میں ہیں۔ ان کی ساری بھاگ دوڑ کچے کے آس پاس رہے گی۔" عمران نے پورے وثوق سے کہا۔

"پرنتو، ہونے کو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کل کی جانکاری تو ایشور کے سوا اور کسی کو نا ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر تمہارے پیٹ میں مروڑ کیوں اُٹھ رہے ہیں؟ خواہ مخواہ خود کو ہلکان مت کرو۔ دیکھو، تمہاری پتنی جوان ہے۔ اسے زندگی کی زیادہ ضرورت ہے لیکن یہ پھر بھی حوصلے میں ہے۔ تم تو سارے مزے لوٹ چکے ہو۔ پتا نہیں کتنی داسیوں کے ساتھ خفیہ اور اعلانیہ بیاہ رچا چکے ہو۔ ہزاروں من حلوہ تو تمہارے پیٹ میں اُتر ہی چکا ہو گا...... اس کے علاوہ دیسی گھی کے پراٹھے، باداموں والی بھنگ کے بڑے بڑے کنستر اور پتا نا ہیں کیا کچھ جا چکا ہے تمہارے اندر۔"

رادھا لجاجت سے بولی۔ "لیکن یہ گرو ہیں۔ ان کو کچھ ہو گیا تو یہ ہم سب کے لئے مہا پاپ ہووے گا۔ میں ان کی جیون رکھشا کے لئے آپ کی بنتی کرت ہوں۔"

"دیکھ لے موٹے۔" اقبال نے کہا۔ "یہ سیدھی سادی لڑکی اب بھی تیرے بارے میں سوچ رہی ہے جبکہ تُو صرف اپنے بارے میں فکر مند ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ گرو ہونے کے باوجود اپنے دھرم پر تیرا وشواس اس لڑکی سے کم ہے۔"

رادھا لرز گئی۔ "نا ہیں جی! ایسا مت کہیں۔ مجھ کو پاپ لگے گا۔ ہم سب کو پاپ لگے گا۔" اس نے جلدی سے نیچے بیٹھ کر گرو کے قدموں کو انگلیوں سے چھوا اور پھر یہی انگلیاں اپنی مانگ میں پھیریں۔

اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ دھرم کی خاطر اپنا تن من پورے یقین سے گرو کے سپرد کر چکی ہے اور ادھیڑ عمر گرو اس کی خود سپردگی اور سادگی سے "خاطر خواہ" فائدہ اُٹھاتا ہے۔

عمران نے رادھا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اپنے اس گرو پتی کو میری طرف سے پوری تسلی دے۔ یہ اگر ہمارا سیوک بن گیا ہے تو پھر یہ ہماری حفاظت میں آ گیا ہے۔ اوپر والے نے چاہا تو اس کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا لیکن اسے سیوا پوری کرنی پڑے گی، تب ہی اس کے اور تمہارے گناہ دھل سکیں گے۔"

رادھا نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

نوری سارا دن میرے آگے پیچھے ہی رہی۔ اس کا جسم مچلتے پارے کی طرح تھا۔ وہ اس پارے کے اشکارے دکھاتی پھرتی تھی۔ عمران اور اقبال نے اسے کھیا کے حوالے سے مظلوم بتایا تھا مگر فی الحال مجھے تو اس میں مظلومیت کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ چوڑیاں چھنکاتی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے کبھی کوئی معنی خیز فقرہ اچھال دیتی، کبھی مسکراہٹ کی چمک دکھاتی، کبھی چائے یا قہوے کی بے وقت پیشکش کرتی۔ شام کو جب میں کمرے سے نکل رہا تھا، وہ دفعتاً اپنے پورے جسمانی گداز کے ساتھ مجھ سے آٹکرائی۔ اس کے ہاتھوں سے پیتل کی تھالی نکل کر دور جا گری۔ وہ خود بھی لڑکھڑا گئی۔ ''اوئی ماں!'' وہ اپنے کندھے کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''بابو جی! آپ تو ایک دم لوہا ہو۔ مجھے غریبنی کی چولیں ہلا ڈالیں۔''

''زیادہ تو نہیں لگی؟'' میں نے رسماً پوچھا۔

وہ تو شاید کسی ایسے ہی سوال کی تلاش میں تھی۔ سسکاری لے کر بولی۔ ''لگی تو زیادہ ہی ہے جی۔ پر کوئی بات نہیں۔ آپ نے ہی لگائی ہے نا۔''

''تم کیا شے ہو؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

''یہی سوال اگر آپ سے کروں تو؟ میرا مطبل ہے جی، آپ کی کچھ سمجھ ناہیں آوت ہے۔ نہ آپ کو سردی لگت ہے نہ گرمی، آپ ٹھنڈے پانی سے نہا لیوت ہیں۔ آپ کا پنڈا لوہے کی مافق سخت ہے۔ لگتا ہے کہ آپ پہلوانی کرت ہیں۔ لیکن پہلوان تو بہت موٹے موٹے ہوت ہیں گرو کی طرح۔ آپ تو دبلے پتلے ہیں۔'' اس نے پھر دُزدیدہ نظروں سے میرا سراپا دیکھا۔

''تم باتیں بہت کرتی ہو اور جتنی بھی کرتی ہو، وہ فضول ہوتی ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھو۔'' میں نے سخت خشک لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اس وقت مجھے سامنے کھڑکی کے پیچھے ہلچل سی نظر آئی، جیسے کوئی ہمیں وہاں سے دیکھ رہا ہو اور پھر پردہ برابر کرکے چلا گیا ہو۔ یہ تاؤ افضل کی بیٹیاں ہو سکتی تھیں...... اور سلطانہ تھی۔ اگر یہ سلطانہ تھی تو پھر میرے لئے تشویش کی بات تھی۔ وہ نوری سے میری بات چیت کا کوئی غلط مطلب بھی لے سکتی تھی۔

مجھے شک تھا کہ نوری جان بوجھ کر مجھ سے ٹکرائی ہے۔ تاہم یہ اتفاق بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے واقعی حیرانی ہو رہی تھی کہ عمران نے یہ کیا شے پالی ہوئی ہے۔

میں سارا دن سلطانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اپنی تمام تر سادگی، خاموشی اور وفاکشی کے ساتھ میرے حواس پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے گریز کر رہی تھی اور اس کا گریز مجھے اس کی طرف کشش کر رہا تھا۔ میں اس کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ جارج گورا کے ہاتھوں اس کا جسم ہی نہیں، اس کی روح بھی زخمی ہوئی تھی۔ وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھ رہی تھی کہ میری بیوی اور بالو کی ماں کہلاتی۔ میرے نزدیک اس کی یہ سوچ یکسر غلط تھی۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ سمجھتا تھا کہ وہ آج بھی ویسی ہے جیسی اس بے مہر رات سے پہلے تھی۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ وہ میرے نزدیک پہلے سے زیادہ عزیز اور محترم تھی۔ اس کے جذبہ قربانی اور ایثار نے میری نظروں میں اسے گرانے کے بجائے اور ابھارا تھا۔

رات کو میں اوپر کمرے میں بستر پر لیٹا اسی تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ نوری کچے کوئلوں کی انگیٹھی دہکا کر کمرے میں لے آئی۔ وہ حسبِ معمول بے باک لباس میں تھی کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنی چنری شاید جان بوجھ کر سرکا دی تھی۔ اب وہ گلابی چنری ایک بے مصرف شے کی طرح اس کے کندھے پر پڑی تھی۔ انگیٹھی کی لَو سے اس کا چہرہ بھی دہکا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

وہ انگیٹھی میرے بستر کے بالکل قریب رکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو سردی ناہیں لگتی لیکن مہمان نوازی تو ہمارا فرض ہے نا جی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ نیچے دری پر اکڑوں بیٹھ گئی۔

''چلو فرض پورا ہو گیا ہے۔ اب جاؤ۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔

''تابش بابو! آپ تو بہت روکھے ہو جی۔''

''روکھا ہی نہیں ہوں...... مار پیٹ بھی کر لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ ڈرے بغیر بولی۔ ''یہ تو میں نے آج دوپہر دیکھ ہی لیا ہے۔ اتنی زور سے مارا ہے کہ...... اُف...... ہاتھ بھی نہیں لگتا۔''

''کیا مطلب؟''

اس نے اپنا کندھا دوسرے ہاتھ سے دبایا اور سسکاری لے کر ''اوئی اللہ'' کہا پھر بے تکلفی سے بولی۔ ''اتنی زور سے ٹکر ماری ہے جی کہ مجھ غریبنی کے کندھے پر نیل پڑ گیا ہے۔''

''اچھا، اب تم یہاں سے جاؤ۔ تمہیں مزید نیل پڑ سکتے ہیں۔''

''زہے قسمت۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ پھر میرے تیور دیکھ کر ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا جی، میں جاوت ہوں۔'' اس نے کہا۔

وہ دروازے کی طرف مڑی مگر دو قدم چل کر رک گئی۔ تب پلٹی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر گویا ہوئی۔ ''غصہ نہ کرنا جی...... ایک بات کہوں آپ سے...... آپ ہی کے فائدے کی ہے۔''

''کہو۔'' میرے تیور بدستور خراب تھے۔

''آپ کی گھر والی شاید آپ سے ناراض ہیں۔ اگر آپ نے انہیں منانے کے لئے کوئی پیغام شیغام دینا ہے تو مجھے بتائیں۔ میں ان تک پہنچا دوں گی۔''

میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ادا سے مسکرائی۔ آنکھوں میں شوخی تھی۔

''کیا تم اس سے بات کر لیتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نا ہیں جی۔ بات بھی کر لیوت ہوں اور ہنسی مذاق بھی۔ آپ فرمائیں، آپ نے کہنا کیا ہے؟'' وہ بے تکلفی سے مسہری کے بازو پر بیٹھ گئی۔

''یہ کیا حرکت ہے...... کھڑی ہو جاؤ۔'' میں کہا۔

وہ ایک دم کھڑی ہوئی اور جز بز نظر آنے لگی۔ ''چلو ادھر بیٹھو انگیٹھی کے پاس۔'' میں نے نیچے اشارہ کیا۔

وہ دو زانو ہو کر دری پر انگیٹھی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ''آپ بڑے سخت ہو جی۔'' اس نے کہا۔

''کیا سختی کی ہے میں نے؟''

''یہ دوپہر والی سختی کیا کم ہے؟'' وہ بولی۔

پھر اس نے اپنا کندھا عریاں کر کے مجھے دکھایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے انتہائی بے باکی سے اپنی چولی کندھے سے نیچے تک کھسکا دی۔ اس کا شفاف کندھا اور سامنے سے جسم نیم عریاں ہو گیا۔ اس کے کندھے پر ہلکا سا نیل نظر آ رہا تھا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' میں سچ مچ تپ گیا۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''یہ بے ہودگی نا ہیں جی...... چوٹ ہے...... اور ایسی ہی چوٹ میرے دل پر بھی آئی ہے۔ آپ حکم دیویں تو یہ دوسری چوٹ بھی دکھاؤں۔'' اس نے دلیری سے چولی کے دوسرے مونڈھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔

وہ حد پار کر رہی تھی۔ ''چولی اوپر کرو۔'' میں گرجا۔

مجھے تعجب ہوا جب وہ ڈری نہیں۔ بس اتنا ہوا کہ اس نے چولی کو بائیں جانب سے نہیں اتارا۔ وہ لجاجت سے بولی۔ ''آپ بڑے ظالم ہو جی۔ مارتے بھی ہو اور چوٹ بھی نہیں دکھانے دیتے۔''

''تم بکواس بند کرو اور نکلو یہاں سے۔ نہیں تو میں اُٹھا کر پھینک دوں گا۔''

''چلو حضور، کسی بہانے اس داسی کو اُٹھائیں گے تو سہی۔'' وہ بولی اور میرے مزید غصے سے بچنے کے لئے عریاں کندھا ڈھانپ لیا۔

''میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں۔ شرافت سے نکل جاؤ...... نہیں تو۔''

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور سلطانہ اندر داخل ہوئی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے بالکل نظر انداز کرتے ہوئے نوری کی طرف دیکھا اور اس کی طرف بڑھی۔ نوری گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی چنری سر پر رکھ لی۔ سلطانہ نے بے دریغ اسے چوٹی سے پکڑا اور جھٹکا دے کر کمرے کے وسط میں پہنچا دیا۔ وہ انگیٹھی کے اوپر گرتے گرتے بچی۔ ''حرامجادی، کلموہی...... تجھے اتنی آگ لگی ہے تو بتا اپنے مالک کو۔ وہ کسی سے تیرے دو بول پڑھا دے۔''

''میں تو...... میں تو جی۔'' نوری ہکلا کر رہ گئی۔

سلطانہ نے اسے پھر چوٹی سے دبوچا۔ میں ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ نوری کے گال پر پڑنے والا طمانچہ میں نے اپنے ہاتھ پر روکا۔ سلطانہ پھنکاری۔ ''مجھے چھوڑو۔ میں اس کی جان لے لوں گی۔ یہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔''

میں نے بہ مشکل سلطانہ کو سنبھالا اور نوری کو دھکیل کر کمرے سے باہر نکال دیا۔ اس کشمکش میں نوری کی کئی چوڑیاں ٹوٹیں۔ سلطانہ کو نوری کے پیچھے جانے سے روکنے کے لئے میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ وہ طیش سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس کا سینہ پھول پچک رہا تھا۔ گھنے بالوں کی لٹیں چہرے پر تھیں۔ میں نے اس کے کندھے تھامے۔ ''چھوڑو سلطانہ! ایسی دو ٹکے کی عورت کے لئے خود کو کیوں طیش میں لا رہی ہو؟ اسے اس کی بے شرمی کا بڑا اچھا جواب مل گیا ہے۔''

''اس کی نجر اِچ خراب ہے۔ مجھے کل اِچ اندا جا ہو گیا تھا۔ اس حرامجادی کمینی کی اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ تمہارے کمرے میں آئی۔ میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔''

میرے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مدھم مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میرے دونوں ہاتھ سلطانہ کے کندھوں پر تھے۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ! اگر تم برا نہ مانو تو تمہاری بات کا جواب دوں؟''

''کس بات کا مہروچ؟''

''یہی کہ اس کمینی کو جرأت کیسے ہوئی کہ میرے کمرے میں آئی؟''

وہ اپنی بھیگی ہوئی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اسے یہ جرأت اس لئے ہوئی کہ تم یہاں میرے پاس نہیں تھیں۔''

وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔ پھر اس نے اپنا جسم چرایا اور اپنے کندھے میرے ہاتھوں کی گرفت سے نکال لئے۔ میری پلنگ نما چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی اور اپنی اوڑھنی سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اس کی غم زدہ سادگی میں ایک خاص طرح کی کشش تھی۔ نوری اور نوری جیسی دوسری گوری چٹی چم چم کرتی تیز تیکھی لڑکیوں میں ایسی کشش کم ہی ہوتی ہے۔ میں ناقدانہ نظروں سے سلطانہ کو دیکھنے لگا۔ اس کے شانے چوڑے تھے اور شانوں کے مقابلے میں کمر نہایت دبلی پتلی اور چست تھی۔ غالباً اس کے جسم کی زیادہ تر کشش اس کی کمر کی وجہ سے ہی تھی۔ یہ کمر اب کسی کمان کی طرح مڑی ہوئی تھی اور سلطانہ اپنی اوڑھنی آنکھوں پر رکھے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ اشک بار آواز میں بولی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے مہروج! میں اِچ بدحسمت (بدقسمت) ہوں۔ تمہارے خریب ہوتے ہوئے بھی خریب ناہیں ہوں۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ کچھ بھی میرے بس میں ناہیں۔ بس خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ وہ میرے دل کو سکون دے دے یا پھر موت دے دے۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر اس کے کندھے پر بازو رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے اندر جیسے ایک زبردست کشمکش تھی۔ کشمکش کے اس آشوب میں اس کا لرزاں جسم کسی کشتی کی طرح ڈولتا تھا۔ پھر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ کمرے کی طرح میرا دل بھی ایک دم خالی ہو گیا...... میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ بستی کے گلی کوچوں میں سرد ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی...... میرے سینے میں انگارے سلگ رہے تھے۔ جارج گورا کی صورت بار بار نگاہوں کے سامنے آتی تھی۔ یہ وہی تھا جس نے پہاڑی جھرنوں جیسی صاف شفاف چمکیلی سلطانہ کو اپنی ہوس سے داغ دار کیا تھا اور اسے زندگی اور زندگی کی ساری رعنائیوں سے بہت دور کر دیا تھا۔ دوسری طرف جارج گورا بھی اپنی قرار واقعی سزا سے بہت دور تھا۔ اپنے حفاظتی حصار میں معمول کی زندگی جی رہا تھا۔ سلطانہ نے اپنے طور پر اس سخت حصار کو توڑنے کی کوشش تو کی تھی مگر ناکام رہی تھی۔

میرے دل نے گواہی دی کہ میں جب تک سلطانہ کے ادھورے کام کو مکمل نہ کروں گا، وہ کبھی نارمل زندگی کی طرف نہیں آسکے گی۔ اس پر عملاً ظلم ہوا تھا۔ اسے عملی دادرسی کی ضرورت تھی۔ زبانی باتوں سے اس کے زخم مندمل ہونے والے نہیں تھے۔

رات کو انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر الائچی والا قہوہ پیتے ہوئے عمران اور اقبال کے درمیان اہم گفتگو ہوئی۔ عمران کی رائے تھی کہ ہم اگلے کم از کم پندرہ بیس دن بڑی خاموشی کے ساتھ گزاریں اور حالات کا جائزہ لیں۔ اس نے کہا۔ ''اس وقت یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہے۔ ہم دوطرفہ مصیبت میں ہیں۔ حکم جی کے ہرکارے اور استھان کا جنونی ٹولہ دونوں ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب ہوا تیز ہو تو لچک دار شاخیں جھک جاتی ہیں اور ٹوٹنے سے بچ جاتی ہیں۔''

''لیکن یہ مثال ہم پر صادق نہیں آتی۔'' میں نے کہا۔ ''اور ویسے بھی کبھی کبھی خاموشی گناہ بن جاتی ہے۔ جارج گورا اور حکم جی وغیرہ جو کچھ ہمارے ساتھ کر چکے ہیں، اس کے بعد ہماری خاموشی بزدلی اور نامردی کہلائے گی۔''

''میں عارضی خاموشی کی بات کر رہا ہوں جگر! بڑے بڑے بہادر جنگجو بھی میدانِ جنگ میں حکمتِ عملی کے تحت پسپا ہوتے ہیں۔''

''تم چاہتے ہو کہ ہم کچھ دن کے لئے چپ سادھ لیں۔ مگر تم ایک بات بھول رہے ہو، ہم چپ بھی نہیں سادھ سکتے۔ کم از کم میری موجودگی میں تو تم دونوں ایسا نہیں کر سکتے۔''

''کیا مطلب؟'' اقبال نے پوچھا۔

''میں اس کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔'' عمران بولا۔ ''یہ چپ کی بات کر رہا ہے...... چپ اس کے اندر موجود ہے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ ہماری نشاندہی بھی کر سکتی ہے۔ کیوں، یہی بات ہے نا؟'' اس نے آخری جملہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تو کیا یہ غلط ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''درست ہے لیکن اس کا انتظام بھی کر چکا ہوں۔ بلکہ یہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں اس کے بارے میں سوچ چکا ہوں۔ وہ مندر دیکھ رہے ہو؟'' عمران نے کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تاؤ افضل کے گھر کے بالکل عقب میں مندر کی مخروطی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ ''مندر میں کیا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''مندر میں نہیں ہے، مندر کے نیچے ہے۔'' عمران بولا۔ ''اس مندر کے نیچے تین منزلہ تہ خانہ ہے۔ یعنی تہ خانہ پھر اس کا تہ خانہ پھر اس کا تہ خانہ۔ کچھ نہیں تو پچاس فٹ گہرائی تو ہو گی۔ ہم کل تک اس مندر کے سب سے نچلے تہ خانے میں شفٹ ہو جائیں گے اور اگلے کم از کم تین ہفتے وہیں گزاریں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اتنی گہرائی میں تمہاری مخبر چپ کسی طرح کے سگنل چھوڑ سکے گی۔''

"یہ تہ خانوں والی بات تم مذاق سے کہہ رہے ہو یا واقعی ایسا ہے؟"

"مذاق کی بات پر ہنسی آتی ہے۔ کیا اس تہ خانوں والی بات پر تمہاری ہنسی چھوٹی ہے؟" عمران نے الٹا سوال جڑ دیا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "واقعی اس مندر کے نیچے ایک سہ منزلہ تہ خانہ موجود ہے۔ یہ تہ خانہ اور مندر قریباً چھ سو سال پرانے ہیں...... تہ خانہ مندر کا حصہ تو نہیں مگر اس کے ساتھ اٹیچ ہے۔ پرانے دور میں بیرونی حملہ آوروں سے بچنے کے لئے فتح پور کے خاص خاص باشندے اپنے بال بچوں سمیت ان تہ خانوں میں اُتر جایا کرتے تھے۔ اب یہ تہ خانے مدت سے بند پڑے ہیں مگر یہاں کے ایک خاص بندے کو ان میں اُترنے کا راستہ معلوم ہے اور راستے کی چابی بھی اس کے پاس ہے۔"

"کہیں کسی چوہے دان میں نہ پھنسا دینا۔" میں نے کہا۔

"گھبراؤ مت۔ جب تم سرے سے چوہے ہی نہیں ہو تو چوہے دان میں کیسے پھنسو گے۔ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ توقع رکھتا ہے۔"

عمران اور اقبال دیر تک انگیٹھی کے سامنے بیٹھنا چاہتے تھے اور گپ شپ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن میرا دھیان اوپر کمرے کی طرف تھا۔ دل میں یہ آس سی موجود تھی کہ شاید آج سلطانہ کے خیالات میں کچھ تبدیلی واقع ہو جائے اور وہ کمرے کا رخ کر لے۔ وہ شدید تذبذب میں نظر آتی تھی۔ شاید اس تذبذب کا نتیجہ مثبت نکل آتا۔

میں نو بجے کے قریب کمرے میں چلا گیا اور اس کے قدموں کی آہٹ کا انتظار کرنے لگا۔ نوری کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ سلطانہ کے طیش کا شکار ہونے کے بعد وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکی تھی۔ میں سلطانہ کا انتظار کرتا رہا۔ میں حکم دیتا تو وہ فوراً آ جاتی لیکن میں اپنا اختیار استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے آئے۔ بستی کے نیم گرم مکانوں سے باہر ایک دھند آمیز سرد رات آہستہ خرامی سے گلی کوچوں میں سرسراتی رہی۔ دور جنگل سے رات کو گشت لگانے والے جنگلی جانوروں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں، کمرے کی ادھ بجھی انگیٹھی میں انگارے سلگتے رہے اور دھیرے دھیرے راکھ میں تبدیل ہوتے رہے۔ میری نظر گاہے بگاہے دروازے کی طرف اُٹھتی رہی اور ناکام لوٹتی رہی۔

نصف شب گزر گئی تو ایک عجیب سی تپش میرے رگ و پے کو جھلسانے لگی۔ میں اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر خاموشی سے دروازہ کھول کر چھت پر چلا گیا۔ سرد یخ ہوا میری ہلکی پھلکی قمیص سے گزر کر میرے جسم سے ٹکرائی، میری ہڈیوں میں اُتری، درد کی ٹیسیں اُٹھیں اور

میرے بدن میں پھیل گئیں۔ باروندا جیکی مجھے جینے کے کئی ڈھنگ سکھا گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا...... جب دل کا درد یعنی اندر کا درد حد سے گزر جائے اور بہت بے چین کر دے تو اسے جسمانی درد میں تبدیل کر دو...... خود کو کسی بڑی مشقت میں غرق کر دو......

وہاں چھت پر ایک چارپائی کی ٹوٹی ہوئی ادوائن پڑی تھی۔ میں نے ادوائن کو ایک رسّے کی طرح استعمال کیا اور رسا پھلانگنے لگا۔ میں پنجوں کے بل بے آواز اچھلتا رہا اور رسا میرے پاؤں کے نیچے سے گزرتا رہا۔ رسا پھلانگنا دوڑ لگانے ہی کی طرح پُر مشقت تھا۔ پانچ دس منٹ کے اندر ہی میرے جسم کا ہر مسام پسینا اگلنے لگا۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ یہ کیفیت انتہا کو پہنچ گئی تو لگا کہ سینہ پھٹ جائے گا اور دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بس یہی کیفیت مجھے درکار ہوتی تھی۔ میں اسی کو جھیلنے اور بڑھاوا دینے کی عادت ڈال رہا تھا۔

جب ٹانگیں جواب دینے لگیں اور مجھے لگا کہ میں بے دم ہو کر گر جاؤں گا تو میں نے رسا ایک طرف پھینک دیا اور ٹھنڈی یخ چھت پر چت لیٹ کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔ مجھے سینڈ بیگ کی ضرورت تھی جس پر میں اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلا سکتا...... اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کو خون اگلنے پر مجبور کر سکتا...... یا پھر میرا کوئی مدِمقابل رُوبرو ہوتا۔ میں پوری بیدردی سے اسے مارتا اور وہ مجھے مارتا...... اور اگر یہ مدِمقابل جارج گورا ہوتا تو پھر کیا ہی بات تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ میرے سامنے آ جائے تو میں ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر دیوانہ وار اس سے ٹکرا جاؤں۔ اس وقت تک اس سے لڑتا رہوں جب تک وہ مجھے مار دے یا میں اسے مار ڈالوں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی چھت کے اندھیرے میں میرے پاس موجود ہے۔ سلطانہ......؟ میرے ذہن میں یہ جاں افزا سوال برق کی طرح لہرایا۔

"کون؟" میں نے سیڑھیوں کے قریب ایک ہیولے کو دیکھ کر کہا۔

میرے سوال کے جواب میں ہیولے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ اقبال تھا۔ "تم نے تو ڈرا ہی دیا۔" وہ میرے قریب آ کر بولا۔ "مجھے کھانسی ہو رہی تھی۔ اس لئے جاگ رہا تھا۔ اوپر سے دھم دھم کی مسلسل آوازیں آئیں تو دیکھنے کے لئے چلا آیا۔ یہ کیا کر رہے ہو یار تم؟"

"تم دیکھ تو رہے ہو۔"

"یار! برا نہ منانا۔ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے کوئی ٹین ایجر لڑکا مارشل آرٹ کی کسی جاپانی فلم سے متاثر ہو گیا ہے اور بروس لی بننے کی کوشش میں اونگی بونگی حرکتیں کر رہا ہے۔"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ’’تم جو بھی سمجھو لیکن میں کسی کو دکھانے کے لئے کچھ نہیں کر رہا۔ یہ میری اپنی Feelings ہیں۔ غلط ہیں یا صحیح، میں اس پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔‘‘

’’مجھے تو ڈر ہے کہ تم خود کو بیمار کر بیٹھو گے۔ تم اپنے رہن سہن کو جس تیزی سے تبدیل کر رہے ہو، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہاری سوچ یہ ہے کہ تم اس طرح خود کو بہت سخت جان بنا لو گے یا مارشل آرٹ کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیت حاصل کر لو گے تو یہ جذباتی سوچ ہی ہو سکتی ہے۔ ایسے کاموں اور تبدیلیوں کے لئے ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے یار...... مستقل مزاجی سے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہوتا ہے۔‘‘

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ’’اقبال! مستقل مزاجی تو ہے یہاں...... لیکن میں آہستہ آہستہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ جب کہیں آگ لگی ہو تو اسے بجھانے کے لئے آہستہ آہستہ پانی نہیں لایا جاتا۔ سب کچھ تیز رفتاری سے کرنا پڑتا ہے۔‘‘ میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ اپنا لہجہ خود مجھے بھی عجیب محسوس ہو رہا تھا۔

’’تم کس آگ کی بات کر رہے ہو؟‘‘ وہ میرے قریب ایک چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

’’وہی آگ جو سیٹھ سراج اور جارج گورا جیسے لوگوں نے میرے اندر لگائی ہے۔ میں اس آگ کو اب اور برداشت نہیں کر سکتا۔ میری ماں کی موت جن حالات میں ہوئی فرح، ثروت اور عاطف کو جس طرح مجھ سے چھینا گیا، وہ سب کچھ تم لوگوں کو معلوم ہی ہے...... اور اب یہاں صرف میری کم ہمتی اور کمزوری کی وجہ سے جو کچھ سلطانہ کے ساتھ ہوا ہے، وہ بھولے جانے کے قابل نہیں ہے۔ میں چاہوں بھی تو اسے نہیں بھول سکتا۔ اب میں آہستہ آہستہ نہیں چل سکتا اقبال...... مجھے کچھ کرنا ہے یا پھر مرنا ہے۔‘‘

’’تُو ایسی باتیں کرتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ تُو ہمیں اپنا دوست ہی نہیں سمجھتا۔ تُو اکیلا نہیں ہے تابی...... جو کچھ گزری ہے، ہم سب پر گزری ہے۔ جو مری ہے، وہ ہم تینوں کی ماں تھی...... جو بچھڑے ہیں، وہ ہم تینوں کے بہن بھائی تھے اور یہاں جو واقعہ سلطانہ کے ساتھ ہوا ہے، اس کا زخم ہم تینوں کے سینوں پر لگا ہے اور اس کا بدلہ بھی ہم تینوں چکائیں گے۔‘‘

’’تم اس طرح بات کرتے ہو تو میرا حوصلہ پہاڑ ہو جاتا ہے لیکن یار! مجھے ایک سچی بات کہنے دو۔ میں نے آج تک تم دونوں سے لیا ہی لیا ہے، دیا کچھ نہیں۔ میں اپنی ساری کمزوریوں سمیت تم دونوں پر بوجھ ہی بنا رہا ہوں۔ تمہارے لئے مصیبتیں ہی کھڑی کرتا رہا ہوں۔ میں اب مزید بوجھ بننا نہیں چاہتا۔ تمہاری دوستی سے بڑھ کر قیمتی شے میرے لئے اور کوئی نہیں لیکن میں اس دوستی کو اپنی بیساکھی بنانا نہیں چاہتا۔ میں تمہارے کندھے سے کندھا

ملا کر چلنا چاہتا ہوں بلکہ شاید مصیبت کی گھڑی میں تم سے دو قدم آگے رہنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’اور دو قدم آگے رہنے کے لئے تم اس وقت اس ٹھنڈی ٹھار چھت پر چت لیٹے ہوئے ہو؟‘‘

’’میں اپنے طریقے سے جو کچھ کر رہا ہوں، مجھے کرنے دو۔ یہ طریقہ جیسا بھی ہے لیکن مجھے اس میں حوصلہ اور جوش مل رہا ہے...... اور اس کے ساتھ ساتھ سکون بھی۔ اگر میں اس میں ناکام بھی ہوا تو یہ میری ناکامی ہوگی۔ کسی دوسرے پر اس کا الزام نہیں آئے گا۔‘‘

’’نہیں یار! یہ بات نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آہستہ آہستہ تم، ہم سے بھی دور ہوتے جا رہے ہو۔ اپنی الگ دنیا بسا رہے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔ یا کسی طرح ہمیں قائل کر لو یا خود قائل ہو جاؤ۔‘‘

’’یہ قائل کرنے یا ہونے کی بات نہیں ہے اقبال۔‘‘ میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ ’’یہ تو دیوانہ پن ہے...... اور ہر شخص کا اپنا اپنا دیوانہ پن ہوتا ہے۔‘‘

’’تم قائل کرنے کی کوشش تو کرو۔ مجھے سمجھاؤ تو سہی کہ سخت سردی برداشت کر کے، کھردرے فرش پر سو کر، گھنٹوں تلک اندھا دھند بھاگ کر اور خود کو تکلیف دہ زخم دے کر میں کیا معراج پا سکتا ہوں۔‘‘

میں مسکرایا۔ ’’میں تمہیں کیسے قائل کروں...... تم اس عجیب الخلقت شخص سے ملے ہی نہیں جسے باروندا جیکی کہا جاتا تھا۔ تم نے اس کے ساتھ کسی کھوہ میں سردیوں کی سخت ترین راتیں نہیں گزاریں...... اس کی باتیں نہیں سنیں...... اس کے ہنر نہیں دیکھے اور نہ اس آگ کو محسوس کیا ہے جو اس کے انجر پنجر کے اندر دہکتی تھی۔‘‘ میں نے چند لمحے توقف کیا اور پھر طویل سانس لے کر کہا۔ ’’اقبال! وہ انوکھا شخص تھا۔ اسے اچانک عشق کا روگ نہ لگ جاتا اور وہ چند برس اور زندہ سلامت رہتا تو وہ بہت اوپر تک جاتا۔ ہم نے فائٹنگ آرٹ میں انوکی، بروس لی، محمد علی اور سونی لسٹن وغیرہ کے نام سنے ہیں۔ وہ ان سے کم پائے کا شخص نہیں تھا۔ اور کیا پتا کہ وہ ان سے بھی کچھ آگے جاتا کیونکہ وہ صرف ایک فائٹر ہی نہیں تھا، ایک روحانی شخص بھی تھا۔ اس کا فن اس شگوفے کی طرح ہے جو پوری طرح کھلنے سے پہلے مرجھا جاتا ہے۔ میں خود پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس شخص کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔‘‘

اقبال ہار ماننے والے انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا اور قدرے مزاحیہ انداز میں بولا۔ ’’اچھا جی باروندا ثانی صاحب! اپنے گرو کی ساری تعلیمات پر آج ہی عمل کرنے کے بجائے ایک دو اسباق کل کے لئے بھی چھوڑ دیں۔ آج ٹھنڈ بھی کچھ زیادہ ہے۔ چلیں، نیچے تشریف لے

چلیں۔''

اگلے روز صبح سویرے نوری نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ میں اُٹھا تو وہ بولی۔ ''بابو جی! آپ کو تازہ خبر ملی ہے؟''

''کیا ہوا؟''

''وہ مشٹنڈا...... موٹا گرو بھاگ گیا۔ رات کسی وقت چپکے سے کہیں نکل گیا۔ وہ بستی میں اور آس پاس کہیں بھی نا ہیں ہے۔ اس کی پتنی رو رو کر بے حال ہو رہی ہے۔''

میں چپل پہن کر اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر عمران اور اقبال کے کے پاس پہنچا۔ عمران ابھی ابھی کہیں سے واپس آیا تھا۔ اقبال ادھیڑ عمر تاؤ افضل کے سر کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ سر سے بہنے والا خون تاؤ کی نیم سفید داڑھی تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے، ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔

میرے پوچھنے پر عمران نے بتایا۔ ''لگتا ہے کہ وہ خبیث کہیں دور نکل گیا ہے۔ تاؤ نے بھی یہی بتایا ہے کہ اسے نکلے تین چار گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔''

''تاؤ کو کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تاؤ رات کو باہر والے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا ہے۔ رات کو بھی یہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس موٹے نے نمک مرچ پیسنے والے ڈنڈے سے تاؤ کے سر پر چوٹ لگائی ہے۔ تاؤ بالکل بے ہوش ہو گیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔''

اندر سے رونے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ سلطانہ کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ گرو کی اشک بار پتنی کو دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی کمرے میں چلا گیا۔ رادھا سوگوار انداز میں چٹائی پر بیٹھی تھی۔ سلطانہ نے اسے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ رادھا سسکی۔ ''مجھ کو بہت بڑا پاپ لگے گا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اگر ناراض نہ ہوتے تو مجھے بھی اپنے سنگ لے کر جاتے۔''

اتنے میں اقبال اندر داخل ہوا اور طنز سے بولا۔ ''وہ بھگوڑا تجھ سے ناراض نہیں ہوا، وہ اس لئے تجھے ساتھ نہیں لے جا سکا کہ اسے صرف اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ تُو اس کمرے میں باقی عورتوں کے ساتھ سو رہی تھی۔ تجھے جگانے کے لئے وہ یہاں آتا تو اس کا ''فراری پروگرام'' گڑبڑ ہو جاتا۔''

''ان کو ایسا مت کہو...... ان کو بھگوڑا نا ہیں کہو۔'' رادھا کانپ کر بولی۔

''تو کیا اس کو شیر افگن کا خطاب دوں؟ تین روز سے بد بخت کو صرف اپنی جان کی پڑی

ہوئی تھی۔ تمہارا تو نام بھی نہیں لے رہا تھا۔ ایسے پتی پر رونے سے کہیں بہتر ہے کہ آلو کریلے پکاؤ، ساتھ میں حلوہ بناؤ۔ خود کھاؤ، ہمیں بھی کھلاؤ۔ اس موٹے سے چھٹکارے کا جشن مناؤ......''

رادھا اور زور زور سے رونے لگی۔ عمران نے اقبال کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ ''خیر، یہ جشن کا موقع بھی نہیں ہے۔ گرو کے یہاں سے نکلنے میں ہمارے لئے بھی خطرے چھپے ہوئے ہیں۔ اگر وہ کسی کے ہاتھ آ جاتا ہے تو پھر یہاں اس گاؤں میں ہماری موجودگی کا بھانڈا بھی پھوٹ سکتا ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟ ہم بھی اس لڑکی کے ساتھ رونا شروع کر دیں؟'' اقبال نے اعتراض کیا۔

اقبال اور عمران کے مکالمے کے دوران میں ایک دو بار سلطانہ سے میری نظر ملی...... میں اس کے انداز میں تذبذب اور جھجک صاف محسوس کر رہا تھا۔ وہ جیسے میری دلی کیفیت کو جانتی تھی اور اس حوالے سے پشیمان بھی تھی لیکن اس کے مداوے کے لئے کچھ کرنے سے قاصر تھی۔

اس دن بہت سے لوگ عمران سے ملنے کے لئے آئے۔ ان میں بوڑھے، بچے جوان سب ہی شامل تھے۔ سب اسے عمران بیٹا یا عمران بھیا کے نام سے پکار رہے تھے۔ وہ اس کی مسحور کن شخصیت کے اسیر تھے، اس کی دل نواز مسکراہٹوں کے شیدائی تھے۔ وہ ان کا ہمدرد و غم گسار تھا۔ وہ کسی کی بیماری کا علاج اپنی گرہ سے کرا رہا تھا۔ کسی کے جھگڑے نمٹانے میں اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔ کسی بڑھیا کی لاٹھی بنا ہوا تھا۔ نوری جیسی ایک دو اور لڑکیاں بھی تھیں جن کے ہاتھ پیلے کرنے کا بیڑا اس نے اُٹھا رکھا تھا۔ وہ جس نوجوان مچھیرے سے نوری کا بیاہ کرنا چاہ رہا تھا، وہ بھی وہاں آیا ہوا تھا۔ وہ کھلے ہڈ پیر والا ایک سادہ سا نوجوان تھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ عمران نے اسے ایک چھوٹا جال خرید کر دیا تھا۔ اس جال کی مدد سے انور نامی اس نوجوان نے معقول پیسے بنا لئے تھے اور اب ایک پرانی کشتی خریدنے اور اسے مرمت کر کے قابلِ استعمال بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ عمران کے ملنے والوں میں سے ہی ایک بیوہ عورت ایسی تھی جو اپنی ضروریات کے لئے مرحوم شوہر کی دو کشتیاں بیچنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ عمران نے دیکھتے ہی دیکھتے بڑی خوش اسلوبی سے ان دونوں افراد کا مسئلہ حل کرا دیا۔ بیوہ عورت اپنی ایک کشتی بیچ کر از حد خوش ہوئی اور انور کشتی خرید کر۔

عمران نے میری طرف دیکھا اور اپنی مخصوص پُرکشش مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''کیسی

رہی ڈیل؟"

"اچھی تھی۔"

"اچھی نہیں، بہت اچھی تھی۔ دراصل جگر! ہمارے اردگرد لوگ اپنے اپنے مسئلے اور اس کے حل کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ پرابلم صرف یہ ہوتا ہے کہ حل کسی کے پاس اور مسئلہ کسی دوسرے کے پاس ہوتا ہے۔ کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ ان دونوں افراد کو خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملا دیا جائے۔ ملانے والا خواہ مخواہ میں نیک نامی کما لیتا ہے اور جب لوگ اس پر بہت زیادہ اعتماد بھی کرنے لگتے ہیں تو وہ ہیرو بن جاتا ہے۔"

کچھ دیر بعد جب گھر کے صحن میں سے عمران کے پرستاروں کا مجمع چھٹا تو میں نے عمران سے کہا۔ "یار! تم نوری والے معاملے میں اس انور نامی لڑکے سے کچھ زیادتی نہیں کر رہے ہو؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟ وضاحت فرماؤ۔"

"نوری جس قماش کی ہے، تم نے دیکھا ہی ہوگا اور میں نے بھی تھوڑا بہت دیکھا ہے۔ تم اس سیدھے سادے لڑکے کو ایک آفت کے حوالے کر دو گے۔ اس بے چارے کی زندگی خراب ہو جائے گی۔"

"بھئی زندگی خراب ہوگی تو خبر بنے گی نا اور ہم فسادپلس کے نمائندوں کو خبریں ہی تو درکار ہوتی ہیں۔ ہم صبح سویرے اُٹھتے ہی دعا مانگتے ہیں، یا اللہ ہماری روزی میں برکت ڈال، ہم پر اپنی رحمت کا سایہ رکھ...... اور باقی سب پر سے یہ سایہ اُٹھا لے۔"

"ہم لٹھ لے کر خبر نویسوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، حالانکہ وہ صرف آئینہ دکھاتے ہیں۔"

"آئینہ تو دکھاتے ہیں لیکن عام طور پر یہ شکلیں بگاڑنے والا آئینہ ہوتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ نوری جیسی واہیات کو اس لڑکے کے پلے کیوں باندھ رہے ہو؟"

"بھئی ہو سکتا ہے کہ یہ اتنی واہیات نہ ہو جتنی تمہیں نظر آتی ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ۔"

"تو تمہارے خیال میں وہ نیک بی بی ہے؟"

"میں یہ تو نہیں کہہ رہا لیکن...... چلو...... اس بارے میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔" وہ ایک دم بات ٹال گیا۔

"ہر بات کے بارے میں تم یہی کہتے ہو کہ بعد میں بتاؤں گا...... تمہاری یہ 'بعد' کب آئے گی؟"

"آئے گی...... آئے گی...... آئے گی۔ ایک دن یہ 'بعد' ضرور آئے گی۔" وہ انڈین گانے کا حلیہ بگاڑتے ہوئے بولا۔

اسی دوران میں گرو کی تلاش میں گئے ہوئے کچھ لوگ منہ لٹکا کر آ گئے۔ عمران ان سے مصروف گفتگو ہو گیا۔

اگلے روز آدھی رات کو عمران نے ہی مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ عمران کے چہرے سے گہری سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ وہ تیزی سے بولا۔ "تابی! ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہوگا۔ گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"وہ اُلو کا پٹھا گرو سو بھاش پکڑا گیا ہے۔ استھان کے لوگ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"ایک بھروسے والا بندہ ہے۔ ہمارے پاس اب اور کوئی راستہ نہیں۔ ہمیں فوری طور پر یہ گھر چھوڑنا ہوگا۔"

میں نے دیکھا، سارے گھر کے اندر ہلچل نظر آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے جیکٹ پہنی اور گرم چادر کی بکل ماری۔ بھرا ہوا پستول بھی میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ نیچے پہنچا تو اقبال اور طلال وغیرہ بھی روانگی کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔ تاؤ افضل کی دونوں بیٹیاں برقعے پہنے ڈیوڑھی میں کھڑی تھیں۔ ڈرا ہوا تاؤ افضل بھی اپنی لٹھ سمیت ان کے پاس موجود تھا۔

اسی دوران میں سلطانہ گرم چادر میں لپٹی ہوئی میرے پاس پہنچی۔ اس کے چہرے سے بھی پریشانی ٹپک رہی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر دھیمی آواز میں بولی۔ "مہروج! یہ تمہارے دوست کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کہتے ہیں کہ وہ گرو پکڑا گیا ہے۔ استھان والے اس کو لے کر بڑی جلدی یہاں پہنچ جائیں گے۔ کیا سچ مچ ایسا ہوئیں گا؟"

"ہاں لگ تو یہی رہا ہے۔"

"لیکن مہروج! اتنی اندھیری رات میں اور ایسی سردی میں ہم گھر سے نکل کر کہاں جائیں گے؟"

''مجھے خود پتا نہیں لیکن عمران پر پورا بھروسا ہے۔ وہ جو کرے گا ٹھیک ہی کرے گا۔''

''لیکن وہ تو کوئی سیدھی بات اِچ نا ہیں کرتا۔''

''اس کی باتوں پر نہ جاؤ۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

پانچ دس منٹ کے اندر اندر ہم آدھی رات کے وقت یہ گھر چھوڑنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ تاؤ افضل کے ہاتھ میں لوہے کا بڑا تالا نظر آ رہا تھا۔ یہ تالا وہ گھر کے بیرونی دروازے کو لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گھر کو بالکل خالی کیا جا رہا ہے۔ رنجیت پانڈے کے ساتھی زخمی راہول کو بھی عمران نے ساتھ لے لیا تھا۔ احتیاطاً اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اوپر سے ایک سوتی کھیس لپیٹ دیا گیا تھا۔ گرو کی پتنی، سکڑی سمٹی رادھا بھی عمران کے پاس ہی کھڑی تھی۔ حالات کی سنگینی کا احساس اسے تھر تھر کانپنے پر مجبور کر رہا تھا۔

رات واقعی خوفناک حد تک سرد تھی۔ دھند کی ایک دبیز چادر نے بستی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ رات کے اس پہر یہ بستی سکوت اور سناٹے کی مکمل تصویر تھی اور تو اور کسی چوکیدار کی ''جاگتے رہو'' بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس اندھیری رات میں یوں عمران کا اس گھرے سے نکل آنا میری سمجھ سے بالا تھا۔ ہم اس چار دیواری اور اس بستی سے نکل کر ایک خطرے سے تو بچ رہے تھے مگر بے شمار دوسرے خطروں کو دعوت دے رہے تھے۔ ان میں رات کو گشت لگانے والے جنگلی جانوروں کا خطرہ بھی شامل تھا۔

ہم گھر سے نکلے تو گلی سنسان تھی۔ شاید تاؤ افضل کے بعد اس بستی کو کوئی پاسبان میسر نہیں آیا تھا لیکن یہ اندازہ غلط تھا۔ ابھی ہم دس پندرہ قدم ہی گئے تھے کہ ایک دراز قد شخص اپنے جسم کے گرد کمبل لپیٹے سامنے آ گیا۔ ایک طرف کونے میں اس نے اُپلوں کی تھوڑی سی آگ جلا رکھی تھی۔ ''کون ہے بھائی؟'' اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

پھر اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ عمران کے چہرے پر پھینکا اور اسے پہچان لیا۔ ''عمران بھائی آپ ہیں۔''

اسی دوران میں ایک قریبی گھر کی کھڑکی بھی کھلی اور کسی نے باہر جھانکا۔ ''کون ہے؟'' کھڑکی کی دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''عمران بھائی ہیں۔'' دراز قد چوکیدار نے بلند آواز میں کھڑکی والے کو بتایا۔

ایک دو مزید کھڑکیاں کھل گئیں۔ ''عمران بیٹا! اس وقت کہاں جا رہے ہو؟'' کسی بوڑھے شخص نے کھانستے ہوئے دریافت کیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی افراد گلی میں نکل آئے۔ دو تین لالٹینیں بھی ہمارے گرد چکرانے

لگیں۔ عمران اور تاؤ افضل کو یوں کوچ کرتے دیکھ کر سب پریشان نظر آ رہے تھے۔ کھڑکی سے جھانکنے والا بوڑھا بھی لاٹھی ٹیکتا ہوا نیچے اُتر آیا تھا۔ عمران اس بوڑھے کے علاوہ دراز قد چوکیدار اور ایک فربہ اندام سکھ کو ایک طرف لے گیا اور ان سے تین چار منٹ تک کھسر پھسر کرنے کے بعد واپس آ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے ان لوگوں کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ کچھ جنونیوں کے ساتھ ٹکراؤ سے بچنے کے لئے بستی سے نکل رہا ہے۔ اس حوالے سے اس نے بستی والوں کو یقیناً کچھ مزید ہدایات بھی دی تھیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر ہم عجلت میں آگے بڑھ گئے۔ جانے سے پہلے عمران نے دراز قد چوکیدار آفتاب خاں کو ایک بار پھر اپنے پاس بلایا تھا اور اس سے کوئی بات کی تھی۔ سخت سردی اور دھند آلود تاریکی میں ہم نے اونچے نیچے راستوں پر قریباً تین میل تک سفر کیا اور نہایت گھنے جنگل میں پہنچ گئے۔ یہاں خطرات منہ کھولے کھڑے تھے۔ کسی بھی وقت کسی موذی جنگلی جانور سے سامنا ہو سکتا تھا۔ سب کے دل میں ڈر تھا کہ لیکن زخمی راہول کا خاص طور سے برا حال تھا۔ یقیناً اسے چار دن پہلے والا بھیانک تجربہ یاد آ رہا تھا۔ سرخی مائل ریچھ نے اسے عدم آباد کا ٹکٹ تھما دیا تھا، یہ تو عمران کی ہوشیاری تھی کہ اس نے بروقت یہ ٹکٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر ''ریچھ بھائی'' کو اپنے پیچھے لگا لیا اور پھر گہرائی میں لڑھکا دیا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر ہم اسی طرح اس گھنے جنگل میں آگے بڑھتے رہے تو ریچھ کی طرز والا کوئی اور واقعہ پیش آ جائے گا۔ اس سفر کے دوران میں ایک جگہ مجھے ذرا سی ہچکی آئی تو میرے پہلو میں چلتی ہوئی سلطانہ بری طرح چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ڈر اُمڈ آیا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ یہ کوئی خاص ہچکی نہیں ہے۔ یوں لگتا تھا کہ میری ہچکی والی تکلیف کے حوالے سے اس کے دل میں خوف بیٹھ چکا ہے...... ہمارا سفر جاری رہا۔

ہمارے ہاتھوں میں اسلحہ تھا اور ہم کسی بھی ناخوشگوار صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر عمران رک گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے رک گئے۔ ہوشیار سنگھ نے پوچھا۔

''کیا بات ہے جی...... آگے کوئی خطرہ ہے؟''

''ہاں خطرہ ہی ہے۔ پانچ منٹ کے فاصلے پر۔'' عمران نے چمکیلے ڈائل والی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گیارہ بج کر پچپن منٹ ہو چکے ہیں۔ جونہی بارہ بجیں گے، تم کوئی فائیو اسٹار قسم کی حماقت کر ڈالو گے۔ اس لئے رک گیا ہوں۔''

''بارہ بجے کا وقت تو یونہی بدنام ہو گیا ہے جی۔ سچا خالصہ کسی بھی وقت کام دکھا سکتا ہے۔ جیسا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے دکھایا ہے۔''

"کیا کیا ہے؟"

"وہاں پیچھے جھاڑیوں میں ذرا رک کر پیشاب کیا ہے۔ شلوار اتار لی ہے لیکن یہ یاد ہی نہیں رہا کہ نیچے باریک پاجامہ پہنا ہوا ہے۔ سارا بھیگ گیا ہے۔" ہوشیار سنگھ نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"میرے خیال میں ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ یہ بہت برا شگون ہے۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جب سفر کے دوران میں اچانک کسی سردار کی پگڑی گر جائے تو سفر روک کر واپس پلٹ جانا چاہئے۔" عمران نے کہا۔

"کیا مطلب جی...... میری پگڑی کہاں گری ہے؟" ہوشیار سنگھ حیران ہوا۔

"تم واقعی بے وقوف ہو۔ بات کی تہ تک نہیں پہنچ رہے۔ اب تمہارا پاجامہ پیشاب سے گیلا ہو گیا ہے۔ کچھ دیر بعد تمہاری ٹانگوں میں خارش شروع ہو گی۔ تم ہماری عورتوں کے سامنے بار بار ٹانگیں اور رانیں کھجاؤ گے تو ہمیں غصہ آئے گا۔ خاص طور سے تابی بالکل برداشت نہیں کرے گا کہ کوئی اس کی جوان گھر والی کے سامنے اس طرح بے شرمی سے ٹانگیں کھجائے۔ وہ یقیناً تمہیں تھپڑ دے مارے گا اور اس کا تھپڑ تو تم نے دیکھا ہی ہے۔ تمہاری پگڑی گرے ہی گرے۔"

میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عمران واقعی واپس پلٹ رہا ہے۔ اس نے سب کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ اقبال کے سوا سب ہی حیران تھے۔ میں نے زچ ہو کر کہا۔

"عمران! یہ کیا بے وقوفی ہے۔ پہلے تم نے اتنے خراب موسم میں ہمیں کمروں سے نکالا، اب واپس چلنے کا کہہ رہے ہو۔ تم اور اقبال خود ہی کوئی فیصلہ کر لیتے ہو اور پھر ہم سے پہیلیاں بجھواتے رہتے ہو۔"

"تم کون سا کوئی پہیلی بوجھ لیتے ہو...... چلو یہی پہیلی بوجھو کہ ہم واپس کیوں جا رہے ہیں؟" وہ مزہ لیتے ہوئے بولا۔ اب وہ بالکل مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"واپس فتح پور۔ گرما گرم کمرے ہمارا انتظار کر رہے ہیں اور اُبلے ہوئے انڈے، زبردست دودھ پتی اور باداموں والا گڑ۔ ہم بڑی خاموشی سے فتح پور میں داخل ہوں گے اور سیدھے اپنے اپنے لحافوں میں گھس جائیں گے...... اتنی سردی میں لحافوں کا ذکر مزے دار لگ رہا ہے نا؟"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میری سمجھ میں آنے لگا کہ عمران نے یہ کیا چکر چلایا

ہے۔ وہ استھان کے جنوبی ٹولے کے بستی میں پہنچنے سے پہلے ہی بستی چھوڑ آیا تھا لیکن یہ سب کچھ شاید دکھاوے کے لئے تھا۔ اب وہ بڑی خاموشی سے واپس بستی میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی چالیں ایسی ہی دماغ چکرا دینے والی ہوتی تھیں۔ میں نے تصدیق کے لئے عمران سے پوچھا کہ کیا اس نے ستیش اور اس کے مشتعل ساتھیوں کو چکمہ دینے کے لئے ایسا کیا ہے؟ اس نے میری بات کی تصدیق کی۔

ایسی بے مہر رات میں دربدر بھٹکنے کے بجائے، دوبارہ کسی نیم گرم کمرے میں ہونے کے خیال نے لطف دیا...... اور اندیشے ہوا ہونے لگے۔ عمران نے بتایا کہ اب ان کی واپسی تاؤ افضل کے گھر میں نہیں کسی اور جگہ ہو گی۔

"اب پھر معمے حل کروا رہے ہو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے کہ کہاں جانا ہے؟" میں نے پھنکار کر کہا۔

"یار! تم تو ٹی وی ٹاک شوز کے شرکا کی طرح منہ سے آگ نکالنے لگتے ہو۔ میں نے تمہیں اشاروں کنائیوں میں بتا تو دیا تھا مگر تم نے غور ہی نہیں فرمایا۔ ہم اب مندر کے تین منزلہ تہ خانے میں اُتریں گے...... اور اللہ کو منظور ہوا تو دو چار دن کے لئے چین کی بانسری بجائیں گے۔ بانسری بجانی آتی ہے نا تمہیں؟"

میں نے اسے کڑی نظروں سے گھورا تو وہ جلدی سے ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "اچھا نہیں بجانی آتی تو کچھ اور بجا لینا لیکن جگر! اس طرح تو نہ گھورو...... میرے پیٹ میں گڑگڑ ہونے لگتی ہے۔"

ہم چین کی بانسری کی بات کر رہے تھے مگر جس چیز کی آواز آئی وہ بانسری سے بالکل مختلف تھی۔ ہم سب ہل کر رہ گئے۔ یہ رائفل چلنے کی آواز تھی۔ گولی ہمارے سروں کے اوپر سے سنسناتی اور پتوں، شاخوں سے ٹکراتی گزر گئی۔ ہم ایک دم نیچے جھکے۔ "لیٹ جاؤ۔" عمران نے چلا کر کہا۔

یکے بعد دیگرے ہم سب اوندھے منہ زمین پر گر گئے۔ دو گولیاں مزید چلیں...... دھماکوں سے جنگل گونج اُٹھا۔ ہمیں نشانہ نہیں بنایا جا رہا تھا، صرف ڈرایا جا رہا تھا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے نکل رہی تھیں۔ پھر کسی قریبی درخت پر سے گرج دار آواز سنائی دی۔ کسی نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ "اگر کوئی ہتھیار پاس ہے تو خود سے دور پھینک دو، ورنہ بُری طرح پچھتاؤ گے۔"

"یہ رانی خاں کا سالا کون ہے؟" عمران نے اقبال سے پوچھا۔

"ظاہر ہے کوئی انسان ہی ہے۔ جنگلی جانور تو انسانی آواز میں بات نہیں کر سکتا۔"

آواز پھر گونجی۔ "تم سب کے سب نشانے پر ہو۔ اگلی گولیاں تمہارے کھوپڑوں میں گھس جاویں گی۔"

وہ جو کوئی بھی تھا، ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ سکتا تھا لیکن ہم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ ویسے بھی بلندی پر تھا۔ ہم اس کے لئے بالکل آسان نشانہ تھے۔

سلطانہ اور رادھا نے خود کو ایک تناور درخت کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ نوری زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ عمران نے دبی آواز میں کہا۔ "رانی خاں کا سالا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کے ستارے عروج پر ہیں۔ یہ ہمیں نشانہ بنا سکتا ہے۔ ہتھیار پھینک دینے چاہئیں۔"

سب سے پہلے عمران نے ہی اپنی رائفل خود سے دور پھینکی۔ اس کے بعد اقبال نے رائفل پھینکی۔ آخر میں، میں نے بھی پستول نکالنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ میرا پستول دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اسے جیب سے تو نکال لیا مگر ہاتھ میں نہیں لیا۔

کسی درخت کے اوپر سے کرخت آواز پھر گونجی۔ "ہیرے جاؤ۔ ان کی بندوقڑیاں اُٹھا لاؤ۔"

سامنے والے چھتاور درخت سے ایک پرچھائیں جست کرتے ہوئے نیچے آئی اور ہماری طرف بڑھی۔ یہ ایک چاق و چوبند شخص تھا۔ یہ شخص قد میں چھوٹا لیکن چوڑائی میں بہت زیادہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جتنا لمبا ہے، اتنا ہی چوڑا بھی ہے۔ اس کے ہاتھ میں جدید پمپ ایکشن رائفل تھی۔ اس نے ایک بڑی ٹارچ کی روشنی ہم پر پھینک کر تیز نظروں سے ہمارا جائزہ لیا۔ پھر اس کی ٹارچ کا دائرہ درخت کے پیچھے دبکی ہوئی سلطانہ اور رادھا پر جم کر رہ گیا۔ اس روشن دائرے نے ان کے سراپا پر اوپر سے نیچے تک حرکت کی، تب چوڑے جسم والے شخص کی جوشیلی آواز ابھری۔ "استاد! دو لونڈیا بھی ہیں...... ناہیں ناہیں، تین ہیں۔ ایک وہ نیچے زمین پر پڑی ہے۔" اس نے ٹارچ کی روشنی نوری پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"ارے ذرا غور سے دیکھ۔ لونڈیا اور تین تین۔ کہیں مردوں نے تو زنانے کپڑے ناہیں پہنے ہوئے؟"

"ناہیں استاد! ایک دم چنچل لونڈیا ہیں۔ یہ دیکھو، سارا سامان پورا ہے۔" اس نے ایک بار پھر ٹارچ کا دائرہ رادھا کے جسم پر دوڑایا۔

اقبال نے اپنی جگہ سے ذرا سر اُٹھانے کی کوشش کی تو درخت پر بیٹھا شخص گرجا۔

"خبردار! بھیجا پھاڑ دوں گا۔ چپ چاپ لیٹے رہو اپنی جگہ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ایک

اور فائر کیا۔ یہ بھی ڈراوے والا فائر تھا۔ گولی اقبال کے آس پاس سے گزر کر کچ زمین میں دھنس گئی۔

تاہم اس گولی نے ایک خاص کام کیا۔ دھماکے کے ساتھ جب شعلہ نکلا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے۔ چوڑے چکلے جسم والے ہیرے نے بڑی احتیاط سے ہمارا جائزہ لیا تاکہ اسے پتا چل سکے کہ ہمارے پاس کوئی اور ہتھیار تو نہیں ہے۔ اسے ہوشیار سنگھ پر شک ہوا۔ اس نے اسے کھڑا کر کے اچھی طرح اس کی تلاشی لی اور اس کی قمیص کے نیچے سے کرپان برآمد کر لی۔ خوش قسمتی سے میرا پستول میرے پیٹ کے نیچے دبا رہا۔ ہیرا دونوں رائفلیں اور کرپان وغیرہ سمیٹ کر واپس اس درخت کے پاس چلا گیا جہاں سے جست لگا کر نیچے اُترا تھا۔

اندازے کے مطابق ہمارا واسطہ راہزنوں سے پڑا تھا جو اس علاقے میں عام پائے جاتے تھے۔ ان کی تعداد ہمارے قیافے کے مطابق دو یا تین تھی اور یہ ہمیں شوٹ کرنے کے لئے بڑی شاندار پوزیشن میں تھے۔ عمران اس صورتِ حال سے پریشان ہونے کے بجائے شاید انجوائے کر رہا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے بہ آسانی نکل سکتا ہے لیکن میرے دل میں ایک اور طرح کی امنگ پیدا ہو رہی تھی۔ اپنا حوصلہ آزمانے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں عمران سے کہا۔ "مجھے کچھ کرنے دو۔"

"کیوں؟"

"بس میرا دل چاہتا ہے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ بھابی کے سامنے نمبر بنانا چاہتے ہو۔"

"یہی سمجھ لو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ وہ مجھ پر اعتماد کرنا سیکھے۔"

"لیکن یہ تمہارے لئے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"خطرناک کا لفظ عمران عرف ہیرو کے منہ سے کچھ اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔

ایک اور وارننگ فائر ہوا۔ گولی ہمارے اوپر سے گزر کر کسی درخت کے تنے میں لگی۔ اقبال سب سے آگے لیٹا تھا۔ درخت کے اوپر سے ایک رسی اچھلتی ہوئی آئی اور اقبال کے قریب گری۔ اس کے بعد رسی کے ایسے ہی دو ٹکڑے مزید اس کے پاس گرے۔

"یہ کیا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

کرخت آواز ابھری۔ "تجھے بھی نظر آ رہا ہووے گا۔ یہ رسیاں ہیں۔ اُٹھو اور ان سے اپنے ان یاروں کے ہاتھ ان کی پیٹھ پر باندھو۔ چلو جلدی کرو۔ ہمارے پاس زیادہ سمے ناہیں

ہے۔ چلو شاباش۔"

"کیا بولتے ہو...... میں جاؤں؟" میں نے دوبارہ عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

عمران نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے مخصوص دلیرانہ انداز میں بولا۔ "او کے...... وش یو گڈ لک۔"

میں نے سرگوشی میں کہا۔ "پستول میرے پیٹ کے نیچے ہے۔ میں اسے یہیں چھوڑ رہا ہوں۔ تمہارے کام آئے گا۔" عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں زمین سے اُٹھا اور دوزانو بیٹھ کر اپنے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ "کیا بات ہے......؟" درخت کے اوپر سے کرخت آواز ابھری۔ "لیٹ جا ورنہ کھوپڑا پھوڑ دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی عین میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

ثابت ہوتا تھا کہ درخت پر چڑھے ہوئے شخص کا نشانہ شاندار ہے۔

میں بدستور بیٹھا رہا اور پکارنے والے انداز میں بولا۔ "استاد جی! میری بات سنو۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ میں ان حرام جادوں کا ساتھی ناہیں ہوں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاوت ہوں۔"

درخت پر چند لمحے سناٹا رہا، تب چوڑے چکلے جسم والے ہیرے نے ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینکی اور بڑے دھیان سے میرا جائزہ لیا۔ میں نے درخت والے کو مخاطب کر کے کہا۔ "استاد جی! آپ ان حرام جادوں کو اکیلا مت سمجھیں۔ ان کتوں کے ساتھ پندرہ بیس کتے اور بھی یہاں ہیں۔ وہ آپ کو گھیر لیویں گے۔ آپ مجھے پاس آنے دیں، میں آپ کو سب کچھ بتاوت ہوں۔"

ایک بار خاموشی کا ایک متذبذب وقفہ آیا۔ تب درخت والے نے ہیرے کو حکم دیا۔ "اس کی پھر تلاشی لو اور اسے آگے لاؤ۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ چوڑا چکلا ہیرا محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ اس نے میری کیچڑ آلود جیکٹ کی جیبیں اچھی طرح ٹٹولیں۔ تھوڑی بہت نقدی تھی جو اس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ٹھونس لی۔ اس کے بعد میری کلائی سے گھڑی اُتروائی۔ پستول زمین پر پڑا تھا۔ وہ بھی کیچڑ آلود تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ہیرے کی نظر میں نہیں آئے گا۔ میری یہ امید پوری ہوئی۔ ہیرے نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھا۔ ہیرا الٹے قدموں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ خوفناک بیرل والی پمپ ایکشن بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ کسی ذرا سی غلط فہمی کے سبب بھی وہ فائر کر سکتا تھا۔

عمران کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے شاید سلطانہ یا رادھا میں کوئی بے چینی دیکھی تھی۔ اس نے پکار کر کہا۔ "اپنی جگہ بیٹھی رہو۔ کچھ نہیں ہوگا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں اس درخت کے عین نیچے پہنچ گیا جہاں وہ استاد نامی شخص گھات لگائے بیٹھا تھا اور ہم سب اس کے نشانے پر تھے۔ اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ لوگ پہلے سے یہاں موجود تھے یا انہوں نے ہمیں ان گھنے درختوں میں گھستے دیکھا تھا اور پوزیشن لی تھی۔ ہم یہاں جنگلی جانوروں کی وجہ سے خوف محسوس کر رہے تھے مگر یہ خوف انسان نما جانوروں کے روپ میں سامنے آ گیا تھا۔ یہ اتر پردیش کے کم آباد علاقوں میں گھومنے والے وہی راہزن یا ڈکیت تھے جن کے بارے میں بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں اور فلمیں بنائی گئی ہیں...... ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے اپنی گفتگو میں سلطانہ اور رادھا کا ذکر جس انداز سے کیا تھا، اس سے صاف پتا چلتا تا کہ اگر کہیں یہ لوگ ہم پر حاوی ہو گئے تو واقعی ان لڑکیوں کے لئے جنگلی جانور بن جائیں گے۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کی تعداد دو سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک شخص اوپر درخت پر چڑھا ہوا تھا اور دوسرا پمپ ایکشن گن کے ساتھ ہمارے سروں پر مسلط تھا...... اور یہ بات باعثِ حیرت تھی۔ تعداد میں صرف دو ہونے کے باوجود انہوں نے بڑی دیدہ دلیری سے ہمارا راستہ روکا تھا اور ہمیں نشانے پر رکھ لیا تھا۔ اسے ان کی حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی بھی کہا جا سکتا تھا۔

"کیا کہنا چاہتا ہے تُو؟" اوپر سے کرخت آواز میں پوچھا گیا۔

"میں ان کے سامنے ناہیں بتا سکتا۔ آپ نیچے آ جاویں یا مجھے اوپر آنے دیں۔" میں نے کہا۔

"کوئی ہوشیاری تو دکھانا ناہیں چاہ رہے ہو؟"

"میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ آپ کے پاس اسلحہ ہے۔"

"تم نے جو کچھ کہنا ہے ہیرے سے کہو۔ یہ مجھے بتا دیوے گا۔"

"لیکن......"

"بس جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔" اوپر سے کرخت آواز میں کہا گیا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر پاٹ دار آواز سے لگتا تھا کہ کافی تحیم شحیم شخص ہے۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، فائر ہوا۔ یہ 0.38 کے پستول کا فائر تھا...... اور یہ وہی پستول تھا جو میں عمران کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ عمران کمال کا نشانے باز تھا۔ سرکس

کے خطرناک کرتبوں میں، میں اس کی مہارت دیکھ چکا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی نشانے پر لگی۔ درخت میں چھپا ہوا نامعلوم شخص ایک کراہ کے ساتھ شاخوں سے ٹکرایا اور پھر دھم سے زمین پر گرا۔ اس نے گرنے کے بعد بھی اپنے حواس برقرار رکھے اور اوپر تلے دو فائر کئے۔ ایک گولی میرے اور نوری کے اوپر سے گزری اور کسی درخت کے تنے میں لگی۔ دوسری گولی جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس نے اقبال کے قریب لیٹے زخمی راہول کو ہٹ کیا۔ اس کے منہ پر لگ کر یہ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔

پہلے فائر کے ساتھ ہی میں چوڑے چکلے ہیرے پر جھپٹا تھا۔ میں نے اس کی پمپ ایکشن پر ہاتھ ڈالا اور اس کا رخ اوپر کی طرف موڑ دیا۔ اسی دوران میں ہیرے نامی اس شخص نے ٹریگر دبا دیا۔ نہایت گرج دار آواز کے ساتھ فائر ہوا اور چھرے اوپر کی طرف نکل گئے۔ میں اور ہیرا گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ عجیب جسمانی ساخت کا شخص تھا۔ اس کے جسم میں کسی بریڈ فورڈ ٹرک جیسی طاقت تھی۔ میں اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میرے پیٹ پر ٹانگ مار کر مجھے دور پھینک دیا۔ خوش قسمتی یہ رہی کہ میں اس کے ہاتھ سے پمپ ایکشن نکالنے میں کامیاب رہا۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ کسی کے ہاتھ میں بھی نہ رہی۔ اچھل کر تاریکی میں کہیں جا گری۔ گرتے ہوئے میرا چہرہ کسی تنے سے ٹکرایا اور گردن کے پچھلے حصے پر بھی چوٹ آئی۔ ان چوٹوں کو خاطر میں لائے بغیر میں تیزی سے اُٹھا۔ میں اور چوڑا چکلا ہیرا آمنے سامنے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ مجھے میری مرضی کا مدِمقابل ملا ہے۔ میں اور وہ، پوری طاقت سے بھڑ گئے۔ اس تصادم سے تین چار سیکنڈ پہلے عمران نے میرے پستول سے اوپر تلے دو فائر کئے تھے اور زمین پر گرے پڑے استاد کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

ہیرا ان علاقوں میں گردش کرنے والا ایک روایتی ڈاکو تھا۔ بھوری چٹان کی طرح سخت اور بپھرے ہوئے جانور کی طرح خطرناک۔ اس نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے حملہ کیا۔ اس کا طوفانی مکا میری ٹھوڑی پر پڑا اور میں لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ اس مکے نے میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر دیں لیکن ان چنگاریوں نے مجھ پر کچھ اور طرح کا اثر کیا۔ بجائے اس کے کہ میں دیوانہ وار مدِمقابل پر ٹوٹ پڑتا، میرے اندر ایک غضب ناک ضد سی پیدا ہوئی۔ میں نے مدِمقابل کو خود پر مزید حملے کرنے کا موقع دیا اور خود کو ان حملوں سے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ہیرے نے کم از کم تین طوفانی مکے میرے جبڑے پر رسید کئے جنہیں میں نے حیران کن طور پر جھیلا۔ تیسرا مکا کھانے کے بعد میں نے بھی پوری طاقت

سے ہیرے کے جبڑے پر ہاتھ رسید کیا۔ وہ قوی ہیکل ہونے کے باوجود لڑکھڑایا۔ اس کے بعد جیسے یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ پھنکار کر مجھے مکا رسید کرتا، میں اسے اپنے چہرے پر لگنے دیتا اور پھر اسے جوابی مکا مارتا جسے وہ بھی چہرے پر لگنے دیتا۔ چند ہی سیکنڈ کے اندر یہ ضد اَنا اور برداشت کی لڑائی بن گئی تھی۔

یہ بات تو طے تھی کہ ہم اب خطرے سے باہر آ گئے ہیں۔ میرا اور اس گوریلا نما شخص کا تصادم اب ایک تماشے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا...... لیکن یہ ایک سنگین تماشا تھا۔ عمران اور اقبال سمیت سارے افراد اس سنگین تماشے کے تماشائی تھے۔ ہیرا نامی یہ شخص جسمانی طور پر مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس کے بہت بڑے تھوبڑے پر زخموں کے کئی پرانے نشان تھے جو اس کی جنگجو فطرت کو ظاہر کرتے تھے۔ اگر میں اس کے مکوں کی تاب لا رہا تھا اور بدستور اپنے پاؤں پر کھڑا تھا تو یہ میری وہ قوتِ برداشت ہی تھی جو پچھلے کچھ عرصے میں، میں نے اپنے اندر پیدا کی تھی۔ آج یہاں اس تاریک جنگل میں اس برداشت کا مظاہرہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عمران مجھے دیکھ رہا تھا...... اور سلطانہ بھی۔

میری ٹھوڑی پر ایک دو گہری چوٹیں لگی تھیں۔ منہ میں نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا اور ناک سے بھی خون رِس رہا تھا۔ دوسری طرف مدِمقابل کا تھوبڑا بھی لہولہان تھا۔ یہ لڑائی جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی، اسی طرح اچانک ہی ختم ہو گئی۔ میرا ایک زوردار پنچ کھا کر مدِمقابل گھٹنوں کے بل بیٹھا اور پھر پہلو کے بل کیچڑ میں گر گیا۔

عمران کسی ریفری کی طرح میرے اور مدِمقابل کے درمیان آ گیا۔ عمران کے روکنے پر میں رک گیا۔ اقبال نے آگے بڑھ کر دو زوردار ٹھوکریں اس شخص کے سر پر رسید کیں اور اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ہمارا خیال تھا کہ اس شخص نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اب ہمارے رحم و کرم پر ہے لیکن یہ ہماری توقع سے زیادہ آتش مزاج اور خطرناک نکلا۔ اچانک اس نے اپنے میلے کچیلے لباس کے اندر سے ہوشیار سنگھ والی خم دار کرپان برآمد کی اور ایک چنگھاڑ کے ساتھ اقبال پر جھپٹا۔ اقبال کو اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک لمحے کی دیر بھی ہوتی تو اس کا پیٹ چاک ہو جاتا اور انتڑیاں باہر آ جاتیں۔ تیز دھار کرپان کی نوک اس کی جیکٹ کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ عمران نے بے دریغ پستول کا فائر کیا جو سیدھا اس کی کنپٹی پر لگا...... وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹاخ سے کیچڑ میں گرا اور دوبارہ اینٹھ کر ساکت ہو گیا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے گرد آلود سر سے بہنے والا خون اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کے شانوں کی چوڑائی غیر معمولی تھی۔ اگر میرے پاس ناپنے والا فیتہ ہوتا تو میں ضرور اس

چوڑائی کو ناپتا۔ اس کے ایک شانے پر ابھی تک گولیوں والی بیلٹ موجود تھی۔ یہ ان اونچی نیچی گھاٹیوں میں گھومنے والا وہ روایتی ڈکیت تھا جس کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اپنے تمام طمطراق کے ساتھ زندہ تھا، اب ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔

اس کا ساتھی جو عمران کے شان دار نشانے کا شکار ہو کر درخت سے نیچے گرا تھا، اب ساکت و جامد پڑا تھا۔ تین چار منٹ پہلے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ یہ بھی کافی لحیم شحیم شخص تھا۔ عمر کوئی پینتیس چالیس سال رہی ہو گی۔ گرانڈیل ہیرے نے اسے استاد کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ یہ بھی شکل و صورت سے خطرناک قاتل نظر آتا تھا۔ اس کے پاس جدید ''اے کے 56'' رائفل تھی۔ گولیوں والی بیلٹ اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک قریبی درخت پر ایک چھوٹی سی مچان بھی موجود ہے اس مچان تک پہنچنے کے لئے سن کے رسّے کی ایک سیڑھی بھی بنی ہوئی تھی۔ اقبال نے اوپر چڑھ کر اس خستہ حال مچان کی تلاشی لی...... یہاں سے تاڑی کی دو بوتلیں، سگریٹوں کے پیکٹ اور کچھ نقدی وغیرہ برآمد ہوئی۔ سری دیوی اور مادھوری ڈکشٹ کی نیم عریاں تصویریں بھی اس سامان کا حصہ تھیں۔

میری گردن کے پچھلے حصے سے مسلسل خون بہہ رہا تھ۔ یہاں درخت کی کوئی ٹوٹی ہوئی شاخ لگی تھی۔ میرے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر سلطانہ بے چین ہوئی۔ ایسے موقعوں پر عورت کی اوڑھنی ہی کام آتی ہے۔ سلطانہ نے بھی اوڑھنی پھاڑی اور اور میرا خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

حکم کا ہرکارہ راہول بھی ایک جھاڑی میں مردہ پڑا تھا۔ ''اے کے 56'' رائفل کی گولی اس کا سر پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے تھے اور منظر کو حسرت ناک بنا رہے تھے۔ عمران نے اس کے ہاتھ کھول دیئے اور اس کی کھلی ہوئی آنکھیں ہاتھ سے بند کر دیں۔ یہ شخص چار دن پہلے جنگلی جانور کے حملے سے تو بچ گیا تھا لیکن آج ''جنگلی ڈاکو'' کے حملے سے نہ بچ سکا۔

تینوں لاشوں کو گھسیٹ کر ایک گڑھے میں رکھا گیا اور ان کے اوپر گھاس پھوس اور پتے وغیرہ ڈال دیئے گئے۔ دونوں ڈاکوؤں کی قیمتی رائفلیں اور ایمونیشن ہم نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ یقیناً ان چیزوں پر ہمارا حق تھا۔ عین ممکن تھا کہ عام رواج کے مطابق ان لوگوں کے سر کی قیمت وغیرہ بھی مقرر کی گئی ہو۔ ہم وہ قیمت تو حاصل نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ قیمتی رائفلیں

تو ہمیں انعام میں مل سکتی تھیں۔

عمران نے کہا۔ ''ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ یہاں فائرنگ ہوئی ہے۔ اگر ان کے کچھ ساتھی آس پاس موجود ہیں تو وہ یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

ہم فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ عمران نے میرا پستول میرے حوالے کر دیا اور پمپ ایکشن بھی مجھے تھما دی۔ ''یہ تمہارا انعام ہے جگر! تمہاری پہلی ٹرافی۔'' وہ میرا شانہ تھپک کر بولا۔ اقبال بھی مجھے قدرے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تاہم وہ اس حوالے سے کچھ بولا نہیں۔ میں واقعی اپنے اندر فخر و انبساط محسوس کر رہا تھا۔ میں نے آج پر خود کو آزمایا تھا اور اس آزمائش سے مطمئن ہوا تھا۔ اب میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ کل کلاں میرا سامنا جارج گورا یا اس جیسے کسی اور بدمعاش سے بھی ہوا تو میں مزاحمت کا حق ادا کر سکوں گا۔

سلطانہ میرے پہلو میں چل رہی تھی اور بار بار میری خونچکاں گردن کو دیکھ رہی تھی۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''اب میں کیا کروں؟ چوٹ بھی ایسی جگہ لگی ہے جہاں پٹی بھی نا ہیں باندھی جا سکتی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بڑی ٹھنڈ ہے۔ تھوڑی دیر میں خون کا رسنا خود ہی بند ہو جائے گا۔''

''لیکن چوٹ تو اپنی جگہ پر ہے نا۔ تمہیں مرہم پٹی کی جرورت ہے۔'' اس کے لہجے میں فکرمندی کے ساتھ ساتھ گونا گوں حیرت بھی تھی۔ وہ بار بار تعجب سے میری طرف دیکھنے لگتی تھی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک خطرناک ڈکیت سے دوبدو مقابلہ کیا ہے اور اس خونی مقابلے کو کھیل تماشے کی سی حیثیت دی ہے۔

عمران بھی گاہے بگاہے کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، کیوں کیا ہے۔ وہ میری اس کارروائی کو بجا طور پر سلطانہ کے ساتھ نتھی کر رہا تھا۔ وہ میرے بارے میں سلطانہ کی فکرمندی بڑھانے کے لئے بولا...... ''گردن کے پچھلے حصے پر لگنے والی چوٹ اچھی نہیں ہوتی۔ تمہیں مکمل آرام اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ ہم جتنی جلدی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''مگر ہم نے جانا کہاں ہے؟'' سلطانہ نے پوچھا۔

''وہیں پر جہاں سے آئے ہیں بھابی...... ٹھکانے پر پہنچ کر تابی آپ کو سب کچھ بتا دے گا۔''

نوری اور رادھا بالکل گم صم تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تین بندے موت کے

گھاٹ اُترے تھے، اس واقعے نے انہیں دم بخود کر رکھا تھا۔ خاص طور سے رادھا تو بالکل نیم جان ہو رہی تھی۔ ہوشیار سنگھ اس کی ہمت بندھانے میں لگا ہوا تھا۔

ہم قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے یخ بستہ سفر کے بعد واپس فتح پور کی حدود میں داخل ہو گئے۔ اب رات کا چوتھا پہر شروع ہونے والا تھا۔ فتح پور تاریکی اور سناٹے کی لپیٹ میں تھا۔ بس کسی کسی گھر میں لالٹین یا دیے کی مدھم روشنی دکھائی دیتی تھی۔ یہ روشنی بھی دھند کی چادر میں لپٹ کر مدھم تر ہو جاتی تھی۔

ہم بستی کے قبرستان کے قریب ایک جھنڈ میں پہنچ کر رک گئے۔ صرف عمران آگے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو وہی دراز قد چوکیدار اس کے ساتھ تھا جس کا نام ہمیں آفتاب خاں معلوم ہوا تھا۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ اس ساری صورتِ حال میں یہ شخص عمران اور اقبال کا رازدار ہے۔

آفتاب خاں نے عمران اور اقبال کے ساتھ تھوڑی دیر تک کھسر پھسر کی پھر وہ ہم سب کو لے کر ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کی دونوں طرف گھروں کے دروازے بند تھے۔ کہیں کوئی حرکت یا روشنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہم اس طویل بل کھاتی گلی میں دراز قد آفتاب کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' سلطانہ مسلسل اُلجھن میں تھی۔

میرے جواب دینے سے پہلے ہی سلطانہ کو جواب مل گیا...... اور مجھے بھی۔ بل کھاتی گلی اچانک ہی ختم ہو گئی اور ہمیں اپنے سامنے مندر نظر آ گیا۔ مندر کے ساتھ ہی تاؤ افضل کا گھر تھا مگر ہم گھر کی طرف نہیں، مندر کی طرف نمودار ہوئے تھے۔ یہ مندر کا پچھواڑہ تھا۔ رات کے اس پہر دھند میں لپٹا ہوا یہ مندر عجیب پُراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ نانک چندی اینٹوں کی خستہ حال سیڑھی ہمارے سامنے تھی۔ ان سیڑھیوں کے بالائی سرے پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر ایک بلی کسی ہڈی کو چچوڑنے میں مصروف تھی۔ ہڈی کے ساتھ اس کے دانتوں کے ٹکرانے کی آواز سناٹے میں واضح سنائی دیتی تھی۔

دراز قد آفتاب سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے سامنے پہنچا اور چابی کے ذریعے بڑی خاموشی سے دروازے کا قفل کھولا۔ اس کے اشارے پر ہم سب نے وہ سات آٹھ سیڑھیاں طے کیں اور ادھ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اندر عجیب سی بو باس تھی...... یہ جگہ جیسے ایک طویل عرصے سے بند پڑی تھی۔ لکڑی کی گھسی ہوئی سیڑیاں بل کھاتی نیچے اُتر رہی تھیں۔ کہیں کہیں جالے بھی لگے ہوئے تھے۔ آفتاب خاں کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ ہم اس کی روشنی میں بہت سنبھل سنبھل کر نیچے اُتر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ خطرناک سیڑھیاں

تحت الثریٰ تک یونہی چلتی جائیں گی۔ خدا خدا کر کے ہم ایک ہموار جگہ پر پہنچے۔ یہاں قدیم طرز کے تین چار کمرے تھے۔ ان کمروں میں لکڑی کے پلنگ، الماریاں، نمدے اور اس طرح کی دیگر چیزیں موجود تھیں۔ طاق دانوں میں مٹی کے دیے موجود تھے جنہیں آفتاب نے بہ آسانی روشن کر دیا۔ ایک لالٹین ہماری...... آمد سے پہلے ہی ان کمروں میں ہلکی روشنی بکھیر رہی تھی۔

عمران نے چاروں طرف گھوم کر ناقدانہ نظروں سے اس جگہ کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ یہ تہ خانہ کافی پرانا ہے اور سیلاب کے وقت لوگوں نے اس میں پناہ لی تھی۔''

اقبال بولا۔ ''سیلاب میں لوگ پہاڑوں پر چڑھتے ہیں، تہ خانوں میں نہیں اُترتے۔''

''کافر لوگ تہ خانوں میں ہی اُترتے ہیں۔ عذاب دیکھ کر ان کی مت ماری جاتی ہے۔'' عمران نے فلسفہ بگھارا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم اس ساتھ والے کمرے میں لیٹ جاؤ۔ آفتاب خاں تمہارے لئے مرہم پٹی کا انتظام کرتا ہے۔''

''ان کا خون بند ہو جائیں گا نا؟'' سلطانہ پریشانی سے بولی۔

''خون تو شاید بند ہو جائے مگر اسے بہت زیادہ آرام اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اسے کروٹ کے بل لیٹنا پڑے گا۔ رات کو بھی دھیان رکھنا ہو گا کہ کہیں چت نہ ہو جائے۔ زخم کو ٹانکے تو لگ نہیں سکتے، احتیاط سے ہی ٹھیک ہو گا۔'' عمران نے کہا۔

آفتاب خاں بولا۔ ''یہاں سے ہلدی اور چونا وغیرہ مل جائے گا۔ خون بند کرنے کے لئے راکھ بھی ہو گی۔ بس یہاں تو یہی کچھ ہو سکے گا۔''

''چلو جو کچھ ہے جلدی سے لے آؤ۔'' عمران نے ضرورت سے زیادہ فکرمندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

اگلے پانچ دس منٹ میں اس نے میری اس چوٹ کے بارے میں ہی گفتگو کی۔ اس چوٹ کے حوالے سے ایسے ایسے میڈیکل اور نان میڈیکل نکتے پیش کئے کہ مجھے خود بھی محسوس ہونے لگا کہ موت کے منہ میں ہوں اور اب کوئی کرشمہ ہی مجھے زندگی کی طرف واپس لا سکتا ہے...... میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ فالج، لقوہ اور برین ہیمرج جیسے کئی موٹے موٹے امراض نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ دوسری طرف اس نے سلطانہ کو بھی اس بات پر تقریباً قائل کر لیا کہ اگر میرے صحت یاب ہونے کا تھوڑا بہت چانس ہے تو وہ اسی صورت میں ہے کہ وہ دن رات مجھ سے چمٹی رہے اور میری تیمارداری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے۔

پھر وہ لاہور کا ایک واقعہ بیان کرنے بیٹھ گیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتے ہوئے اس کے ایک ساتھی کو گردن کے پچھلے حصے پر چوٹ لگی تھی اور کس طرح اس کی بیوی کی غفلت کی وجہ سے وہ دوبارہ غسل خانے میں پھسل گیا تھا اور اس کی چوٹ کا زہر اس کے پورے بدن میں پھیل گیا تھا۔ اس زہر کو عمران نے ایسا لمبا چوڑا میڈیکل نام دیا کہ سلطانہ تھرا کر رہ گئی۔ اقبال مکمل طور پر عمران کا چمچہ بنا ہوا تھا اور اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

مجھے چوٹ تو واقعی لگی تھی اور گردن بھی کچھ اکڑی اکڑی لگ رہی تھی مگر صورت حال ایسی بھی نہیں تھی جیسی عمران بتا رہا تھا۔ بہرحال، اس کی چرب زبانی کا خاطر خواہ اثر ہوا...... سلطانہ پوری دل جمعی سے میری تیمارداری اور دل جوئی میں لگ گئی۔

اس نے مجھے ہلدی ملا دودھ پلایا۔ میرے چہرے کی چوٹوں پر ٹکور کرنے کے لئے نمک کی تھیلی گرم کی۔ میری مرہم پٹی کے بعد اس نے مجھے لحاف اوڑھایا اور میرے سرہانے بیٹھ کر میرے کندھے دبانے میں مصروف ہوگئی۔ ساتھ ساتھ وہ بڑی فکرمندی سے اپنے بچے بالو کے بارے میں باتیں کر رہی تھی۔

اب صبح ہونے والی تھی مگر اس سہ منزلہ تہ خانے میں دن اور رات کا مطلق پتا نہیں چلتا تھا۔ تہ خانے کی حالت دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ اسے ہماری رہائش کے لئے پہلے سے تیار کیا جا چکا ہے۔ یہاں صفائی ستھرائی کی گئی تھی، بستر بچھائے گئے تھے۔ دس پندرہ افراد کے لئے دو تین ہفتوں کا راشن یہاں اکٹھا کر لیا گیا تھا۔ آفتاب خاں نے عمران اور تاؤ افضل کو بتایا تھا کہ وہ بس رات کو دوسرے پہر کے بعد ہی یہاں آ جا سکے گا۔

آفتاب خاں کی آمد اگلی رات کو بارہ بجے کے بعد ہوئی۔ عمران اس کی آمد کا بڑی شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ آفتاب کا چہرہ دیکھ کر ہی ظاہر ہو گیا کہ وہ کوئی خاص خبر لایا ہے۔ اس نے عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''عمران بھائی! ام سب کو خدا کا بہت بہت شکر کرنا چاہئے...... خو تم نے جو کچھ کیا، بالکل ٹھیک کیا۔ تم سب بال بال بچ گیا ہے...... اگر تم ابھی تک تاؤ کے گھر میں ہوتا تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ کچھ لوگ آئے ہیں؟''

''آئے ہیں جی، بالکل آئے ہیں اور دس بیس نہیں...... سو ڈیڑھ سو بندہ آیا ہے۔ سب لوگ بڑا اکٹر قسم کا ہندو ہے بلکہ ام تو سمجھتا ہے کہ ان کو ہندو بھی نہیں کہنا چاہئے...... جنونی لوگ ہے۔ کسی کا بھی دوست نہیں۔ ان کے چہرے ہی بتاتے ہیں کہ یہ خونی اور قاتل

ہیں۔ وہ موٹا گرو بھی ان کے ساتھ ہے۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کا کئی ایک نشان ہے۔ لگتا ہے کہ اسے مارا پیٹا گیا ہے۔ وہی ان لوگوں کو لے کر یہاں آیا ہے۔''

''کب پہنچے تھے وہ لوگ؟''

''کوئی آٹھ نو گھنٹے پہلے۔ عصر کی اذان کے وقت۔ سب سے پہلے انہوں نے تاؤ کے گھر پر ہلا بولا۔ دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے۔ سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا۔ تاؤ کے پڑوسیوں کو پکڑ لیا۔ مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ وہ آپ سب لوگوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ آپ لوگ کل رات کو ہی گاؤں چھوڑ کر جا چکا ہے...... پھر ان لوگوں نے مکھیا رشید اور اس کے بیٹوں کو بلا لیا۔ مکھیا رشید خانہ خراب کا بچہ کمینگی پر اُتر آیا ہے۔ وہ آپ لوگوں کو ڈھونڈنے میں استھان والوں کی پوری پوری مدد کر رہا ہے۔ اس کی وجہ سے تاؤ افضل کے دو تین رشتے داروں کو بری طرح مارا پیٹا گیا ہے۔''

تاؤ افضل کا چہرہ پریشانی کی آماج گاہ بن گیا۔ اس کی دونوں بایردہ بیٹیاں بھی سکڑ سمٹ سی گئیں۔

اقبال نے پوچھا۔ ''اب وہ لوگ کہاں ہیں؟''

آفتاب بولا۔ ''بیس بیس بندوں کی دو تین ٹولیاں آپ لوگوں کی تلاش میں نکلی ہیں۔ باقی لوگ مکھیا کے مکان میں ہے۔ وہ سب خبیث لوگ ایک دم تھانے دار بنا ہوا ہے۔ جس کسی پر شک ہو رہا ہے، اسے مکھیا کے گھر بلا رہا ہے اور بے عزت کر رہا ہے۔ شام کے بعد ام کو بھی بلا کر زمین پر بٹھایا تھا اور پولیس والوں کی طرح ام سے سوال جواب کیا تھا۔ امارا خون کول رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے ام کو کوئی گالی مالی نہیں نکالا، ورنہ ام سے برداشت نہیں ہونا تھا۔''

''نہیں نہیں، کوئی ایسی بات ہوئی بھی تو برداشت کرنی ہے۔ ہم سب کی خاطر برداشت کرنی ہے...... اور اس بات کا بھی یقین رکھنا ہے کہ ہم بعد میں اس کا پورا پورا حساب چکائیں گے۔''

عمران کا فیصلہ حیران کن حد تک درست ثابت ہوا تھا۔ ہم اس تہ خانے میں موجود تھے اور بستی میں ایک شخص کے سوا کسی کو پتا نہیں تھا کہ ہم یہاں ہیں۔

عمران نے آفتاب خاں کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور واپس بھیج دیا۔ میری گردن کے پچھلے حصے میں واقعی تکلیف تھی۔ پٹھے اکڑ سے گئے تھے مگر ایسی تکلیفوں کو جھیلنا اور جھیلنے کے لئے ان کی گہرائی میں اُترنا، اب مجھے اچھا لگتا تھا۔ سلطانہ میرے ساتھ تھی۔ اس کی موجودگی مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ آفتاب خاں کچھ پھول لے کر آیا تھا۔ ان میں دو چار پھول موتیے اور

گیندے کے بھی تھے۔ میں نے وہ پھول نکال کر سامنے تپائی پر رکھ دیئے۔ ان پھولوں کی موجودگی نے سلطانہ کے مزاج پر اچھا اثر کیا۔ سلطانہ رات آخری پہر تک جاگتی رہی اور میری دیکھ بھال کرتی رہی۔ آخری پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ میں بھی سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو گردن ے پچھلے حصے اور کمر پر چپچپاہٹ کا احساس ہوا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں نیند کی حالت میں چت لیٹ گیا تھا اور زخم پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے خون پھر جاری ہو گیا تھا۔ یہ مسلسل رستے رہنے والا خون اب گیلے پن کا احساس دے رہا تھا۔

میں نے دیکھا، اڑتالیس گھنٹے کی تھکی ہاری سلطانہ میرے بستر کے قریب ہی دری پر سکڑی سمٹی سو رہی تھی۔ اس نے ایک پھول دار لحاف اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے اسے جگانا چاہا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔

گیلی قمیص میں نے اتار کر پھینک دی۔ دوسری قمیص پاس ہی پڑی تھی لیکن اسے پہننے سے پہلے ضروری تھا کہ میں اپنی کمر صاف کر لوں۔ ایک کپڑے سے میں نے کوشش کی مگر پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں اچانک نوری اندر آ گئی۔ شاید وہ کھڑکی میں سے میرا مسئلہ دیکھ رہی تھی۔

اپنے مخصوص انداز میں بولے سے بولی۔ ''ناراض نہ ہونا بابو جی۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کی کمر صاف کر دیوت ہوں۔''

مجھے ذرا تذبذب ہوا پر میں نے کپڑا نوری کو تھما دیا۔ وہ گھوم کر میرے عقب میں آ گئی اور بستر پر بیٹھ کر بڑی ملائمت سے میری کمر صاف کرنے لگی۔ اس کی چوڑیاں میرے کانوں سکے قریب چھنچھنا رہی تھیں۔ گاہے بگاہے وہ میرے کندھوں پر ہاتھ بھی پھیر رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہو۔ جلدی کرو۔'' میں نے ذرا تحکم سے کہا۔

''بابو جی! صاف ہی کر رہی ہوں۔ آپ کے کندھوں کے بال بھی تو لتھڑے ہوئے ہیں...... اوئی ماں۔ دیکھیں پھر خون رِسنے لگا ہے۔'' وہ ایک بار پھر گڑبڑ کر رہی تھی۔ اس کا انداز لبھانے اور رجھانے والا تھا۔ اس کا جسم عقب سے بار بار میری پشت سے چھو جاتا تھا۔

''چلو چھوڑو۔ ٹھیک ہے۔'' میں ذرا بھنا سا گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ پیچھے ہٹتی، اس کا پاؤں نیچے رکھے ہوئے ایک جگ سے ٹکرایا اور اسٹیل کا یہ جگ فرش پر لڑھک گیا۔ آواز پیدا ہوئی اور سلطانہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا مہروج؟'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

پھر اس کی نظر میرے عقب میں بستر پر براجمان نوری پر پڑی اور اس کی آنکھیں کھلی رہ

گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں غصے کا دریا اُمڈ پڑا ہے۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ پھنکاری۔

''مم...... میں...... جی...... وہ بابو جی نے ہی بلایا تھا۔ دیکھیں ان کا پنڈا پیچھے سے لہولہان ہو گیا ہے۔'' اس نے ہوشیاری سے سلطانہ کی توجہ میری کمر کی طرف مبذول کروائی۔

سلطانہ کمر کی طرف متوجہ ہوئی تو نوری خاموشی سے کھسک گئی۔

''یہ کیا کیا تم نے مہروج! زخم کا منہ پھر کھل گیا ہے۔'' وہ بڑے درد سے بولی۔

اس نے کپڑا گیلا کیا اور میرا پنڈا پونچھنے میں مصروف ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ پنڈا صاف کرنے اور زخم سے خون کا رساؤ بند کرنے میں کامیاب ہو گئی تو اس نے خفا لہجے میں کہا۔

''مہروج! یہ کمینی کیوں آئی تھی یہاں؟''

میں نے چونک کر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کی نمی تھی اور آنکھوں میں طیش اور رقابت کی سرخی تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے نوری کے بارے میں عمران کی بات یاد آئی۔ عمران نے معنی خیز انداز میں کہا تھا...... ہوسکتا ہے کہ یہ لڑکی ویسی نہ ہو جیسی نظر آ رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بھی شک ہوا تھا کہ نوری نے جان بوجھ کر جگ کو اپنے پاؤں سے گرایا ہے تاکہ آواز پیدا ہو اور سلطانہ جاگ جائے...... تو کیا وہ جان بوجھ کر سلطانہ کے دل میں حسد اور رقابت کے جذبے کو جگا رہی تھی؟ کہیں وہ...... عمران کی ہدایت پر تو ایسا نہیں کر رہی تھی؟ ابھی میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ بالائی تہ خانے کی سیڑھیوں سے کسی کے دھڑ دھڑ اُترنے کی آواز آئی۔ پھر دراز قد آفتاب خاں دھواں دھواں چہرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ وہ باہر سے کوئی بری خبر لایا تھا......

O......❖......O

آفتاب خاں سیڑھیاں اُتر کر سیدھا میری طرف آیا اور ہکلائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ماف کرنا جی! ام نے آپ کو پریشان کیا۔ دراصل ام عمران بھائی کو ڈھونڈ رہا ہے۔''

''وہ ابھی کچھ دیر پہلے سویا ہے۔ پچھلے کمرے میں ہے۔'' میں نے کہا۔

''باہر حالات کچھ اچھا نہیں ہے جی۔ ام کو خون خرابے کا بُو آ رہا ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''استھان کے لوگوں نے جنگل میں سے وہ تینوں لاشیں ڈھونڈ لیا ہے جن کو آپ گڑھے میں چھپا آیا تھا۔ اب ان کو یقین ہو گیا ہے کہ آپ فتح پور کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فتح پور کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہو...... کیونکہ ایک دو جگہ سے ایسا کھرا ملا ہے جن سے ان کو اندازہ ہوا ہے کہ جنگل والی فائرنگ کے بعد آپ پھر فتح پور کی طرف پلٹا ہے۔''

''فتح پور کے آس پاس تو ہمارا کھرا نہیں ملا؟''

''نہیں جی...... لیکن وہ لوگ شک میں ضرور پڑ گیا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہوا ہے کہ استھان والوں کو پتا چل گیا ہے کہ آپ تینوں ہندو نہیں، مسلمان ہیں۔ عمران بھائی اور اقبال بھائی کے بارے میں تو بستی والوں نے بتا دیا ہے اور آپ کے بارے میں اس خبیث موٹے نے گواہی دی ہے۔ اس نے استھان والوں کو یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کے اور سلطانہ بی بی کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے۔ یہ بات جان کر کہ آپ تینوں مسلمان ہیں، وہ لوگ بہت بھپرا ہوا ہے۔ فتح پور کے سارے مسلمانوں کا کم بختی آ گیا ہے۔ ان کو بُری طرح مارا پیٹا جا رہا ہے۔ افسوس کا بات یہ ہے کہ مکھیا رشید مسلمان ہونے کے باوجود استھان والوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ وہ اپنا بدلہ چکانے کی فکر میں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''عمران بھائی نے یہاں فتح پور میں اس کی بدمعاشی کا راستہ روکا تھا اور تاؤ افضل کو خاص طور سے سہارا دیا تھا۔ اب رشید اور اس کے بیٹوں کا سارا غصہ تاؤ افضل کے رشتے داروں پر اُتر رہا ہے۔ تاؤ افضل کا چچیرا بھائی حسن دین ساتھ والی بستی میں رہتا ہے۔ مکھیا کے لوگ اس کو پکڑنے گئے تھے۔ وہ تو نہیں ملا، مکھیا کے لوگ اس کے گھر والوں کو پکڑ کر لے آئے ہیں۔ ان میں تاؤ افضل کی دو بہوئیں، ایک بیٹی اور تین چھوٹے بچے بھی شامل ہیں۔ ان سب کو مکھیا کی حویلی میں رکھا گیا ہے۔ سب کو پتا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوگا۔''

اس قسم کے اندیشے پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود تھے۔ میں نے آفتاب خاں سے کہا۔ ''تاؤ افضل یا اس کی بیٹیوں کو ابھی اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔''

''ٹھیک ہے جی...... ام نہیں بتائے گا...... لیکن...... امارا خون مسلسل ابال کھا رہا ہے جی۔ ام کو ڈر ہے کہ ام غصے میں کچھ کر نہ بیٹھے۔ ام کو سب سے زیادہ طیش اس حرامی مکھیا پر آ رہا ہے۔ وہ کافروں سے بڑھ کر کافر ہو گیا ہے۔ مکھیا کا کام تو اپنے لوگوں کا حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ وہ باہر والے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائی بندوں کا دشمن بن گیا ہے۔''

میں نے آفتاب خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، عمران بھائی نے کل بھی تم سے یہی کہا تھا نا کہ برداشت کرنا ہے۔ ایسے موقع پر تمہاری کوئی بھی غلطی تمہیں اور ہم سب کو سخت مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔ اس وقت بہادری یہی ہے کہ اپنے غصے کو خود پر حاوی نہ ہونے دیا جائے۔''

آفتاب خاں نے کہا۔ ''دوپہر سے ایک بڑھیا بھی یہاں آئی ہوئی ہے۔ اس نے الگ ناٹک رچا رکھا ہے۔ گاؤں کے سارے ہندوؤں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان کے سامنے واویلا کر رہی ہے۔ کہتی ہے کہ جس لڑکی کو استھان سے نکال کر یہاں لایا گیا ہے، وہ بہت بڑی اپرادھن ہے۔ اس کا اپرادھ اتنا بڑا ہے کہ وہ اب لڑکی نہیں رہی، بدآتما بن گئی ہے۔ وہ اگر آزاد رہے گی تو اس پورے علاقے پر بہت بڑا آفت آئے گا اور جو شخص اس بدآتما کی مدد کرنے یا اس پر ترس کھانے کا پاپ کرے گا، اس کا جیون اس دنیا میں ہی نرگ کا نمونہ بن جائے گا۔ اس بڑھیا کے ساتھ ایک بوگس پنڈت بھی ہے۔ وہ پتا نہیں کیا جنتر منتر پڑھ رہا ہے۔ اس نے دو کبوتر چھوڑ رکھا ہے اور وہ دونوں مسلسل گاؤں کے اوپر چکر کاٹ رہا ہے۔ پنڈت کا کہنا ہے کہ ان کبوتروں کی وجہ سے وہ اپرادھن کھنچ کر گاؤں کی طرف چلی آئے گی اور

اگر گاؤں میں ہے تو سامنے آنے پر مجبور ہو جائے گی۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے آفتاب خاں سے بڑھیا کا حلیہ وغیرہ پوچھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بڑھیا کون ہو سکتی ہے۔ یہ انتہا پسند ستیش کی وہی سخت گیر کٹر دادی تھی جس سے میری ملاقات نل پانی میں ہوئی تھی۔ یہ عمر رسیدہ دقیانوسی عورت اپنے فرسودہ عقیدوں کو پوری شدت سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ اپنے گھرانے پر بھی کڑی نظر رکھتی تھی اور کسی کو اس کی مرضی کے خلاف چلنے کی جرأت نہیں تھی۔ مجھے اس کی بہو مالا یاد آئی جو روشن خیال تھی اور اپنی دادی ساس سے اختلاف رکھتی تھی۔

"یہ بڑھیا یہاں کیسے آن پہنچی ہے؟" میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"کیا آپ اس کو جانتا ہے؟" آفتاب خاں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی یہاں آیا ہے؟"

"ہاں جی، بیٹا ہے جس کا نام رام پرشاد ہے۔ اس کا عمر بھی پچاس پچپن تو ہوگا ہی۔ ساتھ میں اس کا بہو ہے اور ایک دو بچہ لوگ بھی ہے۔ یہ سب لوگ رات کو مندر میں پوجا پاٹ کرتا رہا ہے...... اور رو رو کر اشلوک پڑھتا رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اپرادھن لڑکی کے بھاگ جانے کی وجہ سے یہ سب لوگ پاپی بلکہ مہا پاپی ہو گیا ہے۔"

"مہا پاپی تو یہ لوگ ہیں ہی لیکن کسی اور معنی میں۔" میں نے کہا۔

میری بات آفتاب خاں کی سمجھ میں نہیں آئی تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے آفتاب خاں سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور چوکس ہو کر حالات کا جائزہ لیتا رہے۔ کچھ دیر وہاں رک کر آفتاب خاں جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے پوری تسلی دی کہ ہم یہاں بالکل محفوظ ہیں اور فتح پور میں کسی کے سان گمان میں بھی نہیں ہو سکتا کہ مندر کے نیچے تہ خانوں میں کوئی چھپ سکتا ہے۔ جاتے جاتے آفتاب خاں نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی مصیبت آئی تو وہ اپنی جان پر کھیل جائے گا لیکن ہم سب پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔

آفتاب خاں ایک سیدھا سادہ غیور پٹھان تھا۔ جی داری کے حوالے سے دیکھا جاتا تو وہ کسی طرح بھی انور خاں سے کم نہیں تھا۔ میری سوچ کا رخ انور خاں اور چوہان وغیرہ کی طرف ہو گیا۔ میں کئی روز پہلے انہیں بغیر کچھ بتائے نل پانی کے دیوان سے نکل آیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ میری گمشدگی سے بہت پریشان ہوں گے۔ میں کسی بھی طرح انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے جیکی کی سوگوار محبوبہ شکنتلا کے بارے

میں بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ یقیناً حکم جی کے جاسوسوں اور ہرکاروں سے جس طرح مجھے اور سلطانہ کو خطرہ تھا، اسی طرح شکنتلا کو بھی خطرات لاحق تھے۔

میری اور آفتاب خاں کی گفتگو کے دوران میں سلطانہ ایک گوشے میں سمٹی بیٹھی رہی تھی۔ اس کے سر پر اوڑھنی تھی اور چہرہ نیم وا تھا۔ یقیناً اس نے بھی وہ ساری باتیں سنی تھیں جو آفتاب خاں نے کہی تھیں۔ میں اس کے پاس پہنچا تو وہ ہولے سے بولی۔ "مہروج! میں تم سے ٹھیک اچ کہتی ہوں نا کہ یہ لوگن اب مجھے چھوڑیں گے ناہیں۔ بڑے پنڈت کے داماد موہن کمار کو مار کر میں نے اپنے بہت سے دشمن بنا لئے ہیں۔ اب دیکھو، کچھ لوگن مجھے بدآتما کہہ رہے ہیں اور مجھے ڈھونڈنے کے لئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔"

"جو لوگ تمہیں ایسا کہہ رہے ہیں وہ خود جنونی بدروحیں ہیں۔ وہ اپنی آگ میں خود جلیں گے۔ تمہیں ان کی وجہ سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں اور جہاں تک تم اپنے دشمنوں کی بات کر رہی ہو تو وہ اکیلے تمہارے ہی دشمن نہیں ہیں، میرے بھی ہیں۔ ہم دونوں کو ایک ہی طرح کے خطرے لاحق ہیں لیکن ان خطروں کا سامنا کرنے کی بات کی جائے تو پھر میرا حق زیادہ ہے کیونکہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں اور اللہ کے فضل سے اب اتنا حوصلہ بھی ہے کہ ان خطروں کا منہ موڑ سکوں۔"

"تم...... کیا کہنا چاہتے ہو مہروج؟"

میں نے اس کے کندھے پر ملائمت سے ہاتھ پھیرا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں سلطانہ کہ تم اب کسی بھی صورت، کوئی ایسا کام نہیں کرو گی جس سے تم کسی مشکل میں پڑو۔ ایک اچھی بیوی کی طرح تم میری دی ہوئی محفوظ چاردیواری میں رہو گی اور چاردیواری سے باہر کے سارے معاملے مجھے نمٹانے دو گی۔ ہاں اگر...... خدانخواستہ...... خدانخواستہ میں ناکام ہوا اور تمہارے لئے زندہ نہ رہا تو پھر تم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو گی۔"

اس نے بے تاب ہو کر اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ "خدا کے لئے ایسا مت بولو مہروج۔ آپ میرے مجازی خدا ہو۔ آپ نہ ہوں گے تو پھر میں بھی نہ ہوں گی۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اسے گھما کر اپنے ہونٹ ہاتھ کی پشت سے لگا دیئے۔ وہ سرتاپا لرز گئی۔ اس نے سر جھکایا اور اس کے گندمی چہرے پر حیا کی ہلکی سی سرخی نظر آنے لگی۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھی۔ وہ اب جس طرح سکڑی سمٹی گٹھری سی بنی بیٹھی تھی، کوئی اسے دیکھ کر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ زرگاں میں چار افراد کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار چکی ہے لیکن اس نے یہ سب کیا تھا۔ بے شک جواں سال

طلال بھی اس کے ساتھ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ان خونی واقعات میں زیادہ اہم کردار سلطانہ کا ہی رہا ہے۔ چند ہفتے پہلے وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح نل پانی سے نکلی تھی اور تمام خطرات کو پس پشت ڈال کر دیوانہ وار زرگاں میں گھس گئی تھی۔ وہ بہادر راجپوت ماں کی بے خوف بیٹی تھی۔ اس کی ماں نے سنگین ترین صورتِ حال میں حکم جی کی جان بچائی تھی اور اب کئی برس بعد سلطانہ نے ثابت کیا تھا کہ جو لوگ وفاداری نبھانے کے لئے جان بچا سکتے ہیں اور جان دے سکتے ہیں، وہ وقت پڑنے پر جان لے بھی سکتے ہیں۔

سلطانہ کے چہرے پر حیا کی سرخی موجود رہی۔ پھر اس کا دھیان ایک دم اس صورت حال کی طرف چلا گیا جو آفتاب خاں کے آنے سے پہلے یہاں موجود تھی۔ اس نے اس ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے نوری کھسک کر غائب ہوئی تھی۔ حیا کی سرخی کی جگہ غصے کی ہلکی سی سرخی نے لے لی۔ وہ بولی۔ ''مہروج! مجھے لگتا ہے...... یہ کمینی...... کسی دن میرے ہاتھوں سے بری طرح پٹے گی۔ میں بہت برداشت کر چکی ہوں اسے۔''

''برداشت تو میں بھی بہت کر چکا ہوں۔ دراصل اس طرح کی خبیث عورتیں کسی ''گنجائش'' کے چکر میں رہتی ہیں۔''

''تم...... کس گنجائش کی بات کر رہے ہو مہروج؟''

''میری اور تمہاری دوری۔ نوری کو پتا ہے کہ ہمارے درمیان کچھ ناراضی ہے۔ وہ اسی ناراضی اور دوری کے درمیان گھسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک دن مجھ سے کہہ رہی تھی، میں آپ اور آپ کی بیوی کے درمیان صلح کرا سکتی ہوں۔ ایسی صلح کرانے والیاں صلح کراتے کراتے خود ہی کچھ بن بیٹھتی ہیں۔'' میں نے سخت بیزار لہجہ بنا کر کہا۔

سلطانہ کا چہرہ تمتما گیا اور سانس کی آمد و رفت تیز ہو گئی۔ اگر واقعی عمران نے ہی نوری کو میرے پیچھے لگایا تھا تو پھر اس کی عقل کو داد دینے کو دل چاہتا تھا۔ وہ واقعی ایک تیز طرار دیور کا کردار ادا کر رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ شیطان کو یاد کیا جائے تو وہ آن موجود ہوتا ہے۔ دروازہ کھلا اور عمران سوئی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں حلوے کی پلیٹ تھی اور وہ اس میں سے کھاتا ہوا آ رہا تھا۔

''معافی چاہتا ہوں بھابی! میں نے آپ دونوں کو ڈسٹرب کیا۔ دراصل مجھے باتوں کی آواز آ رہی تھی اس لئے سمجھ گیا کہ آپ جاگ رہے ہیں۔ آپ نے برا تو نہیں مانا؟''

''ناہیں...... ایسی بات ناہیں۔'' سلطانہ نارمل لہجے میں بولی۔

''دراصل آج کل وقت بے وقت بھوک لگ جاتی ہے۔ یہ تھوڑا سا حلوہ پڑا ہوا تھا، میں نے سوچا اسی سے کام چلا لیتا ہوں۔ ویسے یار! یہ نوری جیسی بھی اوٹ پٹانگ ہے لیکن حلوہ خوب پکاتی ہے۔ کل تم اس کی تعریف ٹھیک ہی کر رہے تھے۔''

''میں تعریف کر رہا تھا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

عمران نے فوراً سلطانہ کی نظر بچا کر مجھے آنکھ ماری۔ ''ہاں...... کل دوپہر جب ہم کھانا کھا رہے تھے اور کھانے کی تعریف کرنا کوئی غلط بات تو نہیں ہے۔ تم تو پریشان ہو گئے ہو...... بھابی آپ بھی چکھ کر دیکھیں۔''

''ناہیں...... اس وقت ناہیں۔'' سلطانہ نے بجھے ہوئے انداز میں کہا اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے عمران کو غصیلی نظروں سے گھورا...... پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اور وہ لکڑی کی قدیم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے تہ خانے میں آ گئے۔ ''یہ کیا حماقتیں کر رہے ہو تم؟'' میں نے اس سے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہاری مدد کر رہا ہوں، تم اسے حماقت کہہ رہے ہو؟''

''خاک مدد کر رہے ہو۔ وہ پہلے ہی غصے سے بھری بیٹھی ہے، تم اوپر سے اسے یہ بتا رہے ہو کہ میں نوری کے کھانے کی تعریفیں کر رہا تھا۔''

''یار! کبھی کبھی مریض کا درد دور کرنے کے لئے اسے تھوڑا سا اور درد دینا پڑتا ہے۔ انجکشن لگانا پڑتا ہے۔ تم اسے انجکشن ہی کہہ سکتے ہو۔''

''تم اپنی یہ ڈاکٹریاں اپنے پاس رکھو تو زیادہ اچھا ہے۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے...... اور ہاں...... ایک بات مجھے بالکل سچ سچ بتاؤ۔ یہ نوری والا چکر تم نے ہی چلایا ہوا ہے نا؟''

''کیا مطلب؟''

''ڈرامے مت کرو۔ تم کہہ رہے تھے کہ یہ نوری ویسی نہیں ہے جیسی نظر آ رہی ہے۔ مجھے لگ ہے کہ اسے تم نے ہی میرے پیچھے لگایا ہوا ہے۔''

عمران کے ہونٹوں کے گوشوں پر بے ساختہ ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے اس نے فوراً سنجیدگی میں چھپا لیا۔ ''دیکھو جگر! اب تم الزام تراشیاں کر رہے ہو اور یہ بھی نہیں سوچ ہے کہ ایسی الزام تراشیوں سے خود تمہاری ہی مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہو گی۔''

''مارکیٹ ویلیو؟''

''ہاں بھئی...... اب دیکھو نا، نوری تمہارے آگے پیچھے پھرتی ہے تو سب تمہیں رشک کی

نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دل ہی دل میں تمہاری کشش اور مردانہ وجاہت کے معترف ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھابی بھی ضرور متاثر ہوتی ہوں گی۔ اب جب تم یہ کہو گے کہ کسی نے زبردستی نوری جیسی حسینہ کو تمہارے پیچھے لگایا ہوا ہے تو پھر ویلیو تو ڈاؤن ہوگی نا۔ فتح پوری اور بہت سی لڑکیاں جنہوں نے ابھی تم پر عاشق ہونا ہے اور تمہارے لئے ٹھنڈی آہیں بھرنی ہیں، وہ سب کی سب اپنے ارادے بدل لیں گی۔"

"تم بکواس نہ کرو۔ میں سب سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا چاہ رہے ہو۔ تمہارے دماغ میں گھسا ہوا ہے کہ نوری اس طرح میرے آگے پیچھے رہے گی تو سلطانہ میں جلاپا پیدا ہوگا اور وہ میرے قریب آجائے گی...... لیکن وہ اور طرح کی لڑکی ہے۔ تمہاری اس حماقت سے کوئی الٹا اثر بھی لے سکتی ہے۔"

"تم صنفِ نازک کے بارے میں میرے تجربے اور علم کی توہین کر رہے ہو۔ میں نے عرق النسا نکالا ہوا ہے شہزادے۔ نفسیات الخواتین کے اندر اتنی گہرائی میں اُترا ہوا ہوں کہ اب کچھ بھی میرے لئے راز نہیں۔ تم دیکھنا، دو چار دن کے اندر بھابی سلطانہ میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں آئیں گی۔"

"تو تم یہ تسلیم کر رہے ہو کہ نوری کو تم نے ہی میرے پیچھے چھوڑا ہے؟"

"وہ بڑی بھلی مانس لڑکی ہے یار...... تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

"اسے شیطان ثابت کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ تم اسے بھلا مانس کہہ رہے ہو۔"

"دیکھو، تم نیوز چینل والے سے متھا لگا رہے ہو اور شاید تمہیں پتا نہیں کہ ہمارا کیمرا واش روم تک بندے کا پیچھا کرتا ہے۔"

ہمارے درمیان یہ نوک جھونک شاید کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں جھکی جھکی کمر والا تاؤ افضل وہاں آگیا۔ عمران بولا۔ "اب ہم یہاں لیتے ہیں چھوٹا سا بریک۔" تاؤ افضل کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح نادیدہ خوف کے سائے تھے۔ لٹھ حسبِ معمول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں نم تھیں۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ "مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے بیٹا! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری وجہ سے دوسرے لوگن کو نقصان پہنچ جاوے۔ کھیا رشید دل کا بڑا کھوٹا ہے۔ وہ میرے رشتے داروں کی جان عذاب میں ڈال سکت ہے۔"

میں اسے کیسے بتاتا کہ اس کا اندیشہ درست ثابت ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کا ایک چچیرا بھائی مصیبت میں آگیا ہے۔

عمران نے تاؤ افضل کو تسلی تشفی دی۔ ابھی تاؤ پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا کہ گرو کی

نئی رادھا بھی وہاں آگئی۔ اس کی آنکھیں بھی رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے محترم شوہر کے لئے پریشان تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور خوبصورت آنکھوں میں اندیشوں کے گہرے سائے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اسے شوہر سے محبت نہیں ہے۔ وہ صرف ڈر کی وجہ سے اس کے ساتھ نتھی ہے یا یوں کہا جائے کہ صرف دھرم کا پالن کر رہی ہے۔ اسے یہ خوف ہے کہ اگر اس کی وجہ سے اس کے پتی دیو پر کوئی مصیبت آئی تو بھگوان بھی اس سے ناراض ہو جائے گا...... اور وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔

وہ عمران سے جاننا چاہتی تھی کہ اس کے پتی دیو کہاں اور کس حال میں ہیں۔

عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیکھو رادھا! تمہیں اس کے بارے میں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جہاں بھی ہے، خود گیا ہے اور جس حال میں بھی ہے، اپنی مرضی سے پہنچا ہے۔ اس کے لئے تم کچھ کر سکتی ہو نہ ہم کر سکتے ہیں۔ بس پرارتھنا کی جا سکتی ہے اور وہ یقیناً تم کر رہی ہو گی۔"

"لیکن سب کچھ میری وجہ سے ہی شروع ہوا تھا نا۔ تم لوگن نے میری کمر سے بارود باندھا۔ میرا جیون بچانے کے لئے ہی گروجی نے تاڑی میں بے ہوشی کی دوا ملائی۔ اچھا ہوتا کہ انہوں نے میری ہتھیا ہو جانے دی ہوتی۔ مر جانے دیا ہوتا مجھ ابھاگن کو۔"

"اب اس نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ وہ تمہیں مرنے کے لئے یہاں چھوڑ گیا ہے صرف اپنی جان بچا کر بھاگا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ تم زندہ ہو اور وہ بھگوان کی پکڑ میں آگیا ہے۔"

عمران کی اس بات نے رادھا کو خاموش کرا دیا مگر اس کے شفاف رخساروں پر آنسو بدستور پھسلتے رہے۔ وہ ہولے سے بولی۔ "اس کے پیچھے بھی ضرور کوئی نہ کوئی وجہ ہووے گی۔ کوئی کارن ہووے گا۔ گروجی کا کوئی کرم بھگوان کی منشا سے خالی ناہیں ہوتا۔"

"ہاں، کوئی نہ کوئی بہانہ تو اس کے پاس ضرور ہوگا۔ اس کے دماغ میں بہانہ ساز فیکٹری لگی ہوئی ہے اور مزہ یہ ہے کہ ہر بہانہ دھرم کے عین مطابق بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی بہانے سے تاڑی پی لیتا ہے۔ کسی بہانے تم جیسی لڑکی سے بیاہ رچا لیتا ہے۔ کسی بہانے جاپ کے ٹھنڈے پانی کو گرم کر لیتا ہے۔ بڑا کمال کا بندہ ہے تمہارا پتی۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"

رادھا نے کانپ کر نفی میں سر ہلایا اور سسکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کی ملائم شفاف کمر پر ابھی تک بیلٹ کے فیتوں کے نیلگوں نشان موجود تھے۔ وہ واقعی نازک اندام اور معصوم تھی۔

گرو اس کی معصومیت سے خاطر خواہ ''خراج'' وصول کرتا رہا تھا۔

رادھا اور تاؤ افضل کے جانے کے بعد میں نے عمران کو بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے آفتاب خاں کیا کچھ بتا کر گیا ہے۔ تاؤ افضل کے چچیرے بھائی کی مصیبت کا سن کر عمران کے ماتھے پر بھی شکن آ گئی۔ میں جانتا تھا کہ اسے بستی والوں سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ ان کا دکھ سکھ اپنے سینے میں محسوس کرتا تھا۔ یہ جان کر کہ بستی میں مسلم گھرانوں پر مصیبت آئی ہوئی ہے، وہ بے چین سا نظر آنے لگا۔ تاہم میری طرح وہ بھی جانتا تھا کہ بڑی مصیبت سے بچنے کے لئے اس چھوٹی مصیبت کو برداشت کرنا ضروری ہے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت جب میں سلطانہ کے پاس بیٹھا تھا اور بالو کی باتیں کر کے اس کی ممتا کو مزید ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا، اچانک بالائی سیڑھیوں پر آفتاب نمودار ہوا۔ وہ رات کے وقت آتا تھا۔ اس کا سہ پہر کے وقت آنا خلافِ معمول تھا۔ میں اور عمران سب سے نچلے تہ خانے میں قیام پذیر تھے۔ آفتاب سیدھا ہمارے پاس ہی آیا۔ وہ سرگوشیوں میں عمران سے باتیں کرنے لگا۔ میں بھی ان دونوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بڑا عجیب سین ہے جی۔ ام تو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا ہے۔ وہ لوگ ایسے رو رہا ہے اور بین کر رہا ہے جیسے ان کا پورا فیملی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔''

''وہ بڑھیا بھی ہے؟''

''جی ہاں، وہی کھوسٹ تو سب سے زیادہ واویلا کرتا ہے۔ پتا نہیں کیا کیا جنتر منتر پڑھ رہا ہے۔ کبھی دیوی کے قدموں میں سر رکھ کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا ادھیڑ عمر بیٹا اور بہو بھی ساتھ ہیں۔ ساتھ میں چودہ پندرہ سال کا ایک بچہ بھی ہے جس نے سادھوؤں جیسا حلیہ بنایا ہوا ہے۔''

''بچہ کون ہے؟''

''امارے اندازے کے مطابق یہ بھی بڑھیا کا نواسا ہے۔ یہ سب لوگ کل ایک ساتھ ہی نل پانی سے یہاں آیا ہے۔''

بچے کا سن کر میرے ذہن میں فوراً وہ لڑکا آ گیا جس نے رام پرشاد کے گھر سے مجھے نیلے پتھروں والا ہار پہنا کر اور خوشبو لگا کر رخصت کیا تھا۔

آفتاب خاں سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''اگر آپ لوگ یہ تماشا دیکھنا چاہتا ہے تو ام آپ کو دکھا سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہاں اوپر والے تہ خانے کی بغل سے ایک تنگ زینہ اوپر مندر تک جاتا ہے۔ اس کا کچھ سیڑھیاں گر چکا ہے لیکن پھر بھی ام تھوڑا سا کوشش کر کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔ مندر میں کالی کی مورتی کے پیچھے دیوار میں ایک چھوٹا سا ہوادان ہے۔ یہ ہوادان فرش سے بس ڈیڑھ دو فٹ اونچا ہے۔ اس میں لال پتھر کا جالی لگا ہوا ہے۔ ام اس جالی میں سے پوجا والے کمرے کا نظارہ کر سکتا ہے۔''

ہمارے اور آفتاب کے درمیان اس بارے میں تھوڑی سی بات چیت مزید ہوئی پھر ہم آفتاب کے ساتھ ان تاریک، تنگ زینوں کی طرف بڑھ گئے۔ آفتاب کی ہدایت پر ہم نے اپنے چہروں کے گرد کپڑے لپیٹ لئے۔ آفتاب نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ خود کو چھپانے کے لئے نہیں تھا۔ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ یہ تنگ زینے نامعلوم عرصے سے بند پڑے تھے اور گرد آلود جالوں سے اَٹے ہوئے تھے۔ چہروں کو ڈھانپنے کی وجہ سے ہم ان جالوں سے محفوظ ہو گئے۔

آفتاب کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور وہ سب سے آگے تھا۔ اس نے لالٹین اس طریقے سے پکڑ رکھی تھی کہ ہمیں بھی روشنی مہیا ہوتی رہے۔ نانک چندی اینٹوں کے زینے دو تین جگہوں پر بالکل مسمار ہو چکے تھے۔ ہمیں یہاں احتیاط سے اوپر چڑھنا پڑا۔

ایک موڑ کاٹنے سے پہلے آفتاب نے لالٹین بجھا دی۔ ذرا دیر بعد ہم ایک مستطیل روشن دان کے سامنے تھے۔ آفتاب نے اسے ہوادان کا نام دیا تھا۔ اس کی چوڑائی بمشکل ڈھائی تین فٹ اور اونچائی ڈیڑھ فٹ ہو گی۔ اس میں سرخ پتھر کی جالی لگی ہوئی تھی۔ ہم تاریکی میں تھے لیکن جالی کی دوسری طرف شمع دانوں اور چراغوں وغیرہ کی روشنی تھی۔ ایک طرف لوہے کی ایک بڑی انگیٹھی بھی دہک رہی تھی۔ ہمیں پوجا پاٹ کے ایک وسیع کمرے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا اور یہ منظر چونکا دینے والا تھا۔ مجھے اس منظر میں کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ سب سے اہم چہرہ تو سرخ آنکھوں اور کھڑی ناک والے برہمن زادے ستیش کا تھا۔ ستیش مجھے استھان میں لے کر گیا تھا اور ستیش سے میری آخری ملاقات بھی استھان کے ہنگامے میں ہوئی تھی۔ تب وہ رائفل تانے قدم قدم ہماری طرف بڑھ رہا تھا...... اور ہم قدم قدم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ اب وہی ستیش سر جھکائے پوجا پاٹ میں مصروف تھا۔ اس کے پہلو میں اس کا پتا یعنی گھر کا سربراہ رام پرشاد اپنی فربہ بیوی سمیت نظر آ رہا تھا۔ دائیں طرف ستیش کی عمر رسیدہ دادی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے ایک بڑی مالا پکڑ رکھی تھی اور جھوم جھوم کر کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے عقب میں گرو کی پہلوان نما

ملازمہ بھاگ متی موجود تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے نہایت وزنی کڑے موی شمعوں کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ سب کے چہروں سے گریہ زاری ظاہر ہو رہی تھی۔ رام پرشاد کی جواں سال بہو بھی مجھے وہیں پر نظر آئی۔ تاہم وہ سب سے پیچھے بیٹھی تھی اور اس گریہ زاری کے ماحول سے قدرے الگ دکھائی دیتی تھی۔

بہت سے اور لوگ بھی اس کمرے میں موجود تھے اور اپنے اپنے انداز سے پرارتھنا کر رہے تھے۔ پوجا کے کمرے کے ماحول میں عجیب سی سوگواری اور گھمبیرتا رچی ہوئی تھی۔ اتنی بوجھل فضا تھی کہ اس کے بوجھ کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

آفتاب نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''ام کو تو یہ لوگ عام ہندوؤں سے بھی مختلف لگتا ہے۔ یہ دیکھو، اس بڑھیا نے اور اس کے بیٹے نے کس طرح اپنا ماتھا رنگا ہوا ہے۔ ام کو تو یہ خون لگتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے بھی جوابی سرگوشی کی۔

''پتا نہیں کیوں امارے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ یہ لوگ یہاں کوئی گڑبڑ کرنے والا ہے۔ ان کا نیت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

شاید آفتاب ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ پوجا کے کمرے کا ماحول سخت گھمبیر ہونے کے ساتھ ساتھ پُراسرار بھی تھا۔ غالباً پوجا کے اس کمرے میں اس بستی کا کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا۔ یہ سب لوگ باہر سے ہی آئے ہوئے تھے اور ان میں زیادہ تر استھان ہی کے تھے۔ ان میں سے سات آٹھ چہروں کو تو میں اچھی طرح پہچان رہا تھا۔ عقابی آنکھوں والا گاڑی بان بھولا ناتھ، امری اور پٹیل جس نے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی لوگ۔ ایک طرف کونے میں مجھے وہ لڑکا بھی نظر آیا جس کے بارے میں آفتاب نے ابھی بتایا تھا کہ وہ رام پرشاد کا بیٹا اور ستیش کا چھوٹا بھائی ہے۔ تاہم ستیش کا ایک خاص ساتھی مہندر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گرو کا کوئی چیلا بھی نظر نہیں آیا۔

رام پرشاد کی لرزتی کانپتی ہوئی آواز اُبھری اور پوجا کے کمرے میں پھیل گئی۔

''بھگوان! ہمرا اور امتحان نہ لو، ہمیں شما کر دو، بس ہمیں شما کر دو۔ ہمیں دکھا دو کہ تم نے ہمری پرارتھنا سویکار کی ہے۔ ہمیں دکھا دو بھگوان۔''

''ہمیں دکھا دو بھگوان...... دکھا دو۔'' کئی گڑگڑاتی آوازیں ایک ساتھ اُبھریں۔

''ہم نے پرائشچت کیا ہے بھگوان لیکن ہم کمزور ہیں۔ ہمرا پرائشچت بھی کمزور ہے مگر جیسا بھی ہے تُو اسے قبول کر لے۔ ہم پر سے اپنا قہر ہٹا لے۔'' رام پرشاد کی آواز دوبارہ اُبھری۔

''ہم پر سے قہر ہٹا لے۔'' باقی آوازوں نے تائید کی۔

کچھ دیر تک رونے گڑگڑانے کا سلسلہ جاری رہا پھر رام پرشاد کے گھر نظر آنے والا سوکھا سڑا پنڈت بھگوان داس اپنی جگہ سے اُٹھا اور دھوتی سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پوجا کے کمرے میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پیتل کا ایک بڑا سا پیالہ تھا۔ پیالے کو اوپر سے ایک تھالی کے ساتھ ڈھکا گیا تھا۔ پنڈت بھگوان داس نے یہ پیالہ بڑی احتیاط سے دیوی کے قدموں کے پاس ایک چھوٹے چبوترے پر رکھ دیا۔ یہاں کئی دیے پہلے سے روشن تھے۔

رام پرشاد نے اپنی عمر رسیدہ ماں کو سہارا دے کر اُٹھایا اور پیالے کے قریب لے آیا۔ اس نے پیالہ اُٹھا کر بڑھیا کے پاس کیا۔ پیالے میں یقیناً کوئی سیال تھا۔ بڑھیا نے یہ چلّو بھر سیال لیا اور دیوی کے قدموں میں چھڑک دیا۔ ہم دنگ رہ گئے۔ یہ سیال کچھ اور نہیں، خون تھا...... بڑھیا کی انگلیاں خون میں لتھڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب سی ہیجانی کیفیت تھی۔ خون چھڑک کر وہ لرزتی کانپتی پیچھے ہٹ گئی اور اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

اس کے بعد بڑھیا کے بیٹے رام پرشاد نے یہی عمل کیا پھر جواں سال ستیش کی باری آئی۔ خاندان کے سبھی افراد نے باری باری یہ رسم پوری کی۔ آخر میں رام پرشاد کی بہو مالا کی باری تھی۔ وہ اپنی جگہ سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ رام پرشاد ہاتھ میں پیتل کا پیالہ لئے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ بڑھیا نے قہر آلود نظروں سے مالا کو گھورا اور پھر مالا کے شوہر ستیش سے کچھ کہا۔ ستیش کے چہرے پر بھی طیش تھا۔ اس نے غصیلے لہجے میں مالا کو پکارا۔ ''اُٹھو، اِدھر آؤ۔''

وہ جیسے تھرا کر رہ گئی۔ ستیش نے دوبارہ کہا تو وہ چار و ناچار اُٹھی اور پیالے کی طرف بڑھی۔ اس کے چہرے پر سخت ناگواری تھی اور وہ پیالے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے لرز رہی تھی۔ بڑی کراہت کے ساتھ اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو ذرا سا تر کیا اور دیوی کے قدموں پر جھٹک دیا۔

اس کا انداز دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ عام خون نہیں ہے اس میں کوئی خاص بات ہے۔

''کہیں یہ کسی انسان کا خون تو نہیں تھا؟'' یہ سوال تیزی سے میرے ذہن میں اُبھرا اور سنسنی بن کر پورے جسم میں پھیل گیا۔

میں نے کنکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ نیم تاریکی میں اس کے چہرے پر بھی سنسنی آمیز اُلجھن کے آثار تھے۔

سوچنے کی بات تھی...... اگر یہ کسی انسان کا خون ہے تو پھر کس کا ہے؟ کیا اس کے جیتے جاگتے جسم سے یہ خون کشید کیا گیا ہے یا پھر اسے مار ہی ڈالا گیا ہے...... اَن گنت سوال ذہن میں کھلبلی مچانے لگے۔ اندر کی فضا مزید بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے صاف دیکھا کہ رام پرشاد کی بہو مالا واپس جاتے ہوئے سسکیوں کے ساتھ رو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد بڑھیا اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی رام پرشاد کی بیوی اور بہو مالا بھی اُٹھ گئیں۔ وہ چودہ پندرہ سالہ لڑکا بھی اُٹھ گیا جس کا نام مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا تھا۔ تیرہ من کی دھوبن بھاگ متی بھی ان سب کے پیچھے جھومتی اور ڈگمگاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے بازوؤں کے کڑے کھڑکھڑا رہے تھے اور ماحول کی پُراسراریت میں اضافہ کر رہے تھے۔

اب پوجا کے وسیع و عریض کمرے میں صرف مرد رہ گئے۔ سوکھے سڑے پنڈت کے دو تین ساتھیوں نے بلند آواز میں اشلوک پڑھنا شروع کر دیئے۔ رام پرشاد جیسے وجد کے عالم میں تھا اور پیتل کی ایک بڑی گھنٹی کو مسلسل حرکت دیتا چلا جا رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز در و دیوار میں سرایت کر رہی تھی۔ یہ آواز لحہ بہ لحہ بلند ہوتی چلی گئی۔ اشلوک بھی ہیجان خیز ہو گئے۔ اس کے بعد پنڈت پہلے کی طرح اُٹھا اور باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پنڈت واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پیتل کا ایک بڑا گول تھال تھا۔ اس تھال میں کوئی تربوز جیسی شے اروی کے پتوں سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ تھال کے کناروں پر پھول سجائے گئے تھے۔ پنڈت نے یہ تھال بہ مشکل اُٹھا رکھا تھا۔

چند قدم آگے بڑھ کر پنڈت نے یہ تھال دیوی کے قدموں میں رکھ دیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر الٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ رام پرشاد عجیب انداز میں گھنٹی کو حرکت دیتا چلا گیا۔ اشلوکوں کی آواز بلند ہوتی گئی۔ ہر چہرہ مجسم ہیجان تھا۔ پنڈت نے آگے بڑھ کر اپنا مُنحنی جسم پیتل کے تھال پر جھکایا اور تربوز نما شے کے اوپر سے اروی کے بڑے بڑے پتے جدا کر دیئے۔ شمع دانوں اور چراغوں کی مدھم روشنی میں جو منظر ہمیں دکھائی دیا، وہ دہلا دینے والا تھا۔

سب کچھ ہمارے سامنے تھا مگر ہمیں اپنی بصارت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ پیتل کے گول تھال میں ایک خون آلود انسانی سر رکھا تھا...... اور...... یہ گرو سوبھاش کا سر تھا۔ ہاں، یہ گرو سوبھاش ہی تھا۔ اس کا منڈا ہوا سر، اس کا صفاچٹ چہرہ، اس کی پھولی ہوئی ناک سب

کچھ ہمارے سامنے تھا۔ گرو کی گردن، ٹھوڑی کے بالکل پاس سے کاٹی گئی تھی اور گردن کے زخم کو پتوں سے ڈھکا رہنے دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود یہ منظر سینہ شق کر دینے والا تھا۔

''اوہ خدایا!'' آفتاب خاں نے سرسراتی سرگوشی کی۔ ''یہ تو وہی موٹا ہے جو راتوں رات یہاں سے بھاگ گیا تھا۔''

''ہاں وہی ہے۔'' عمران نے نہایت تاسف سے تائید کی۔

''میرا خیال ہے کہ پیالے میں لہو بھی گرو ہی کا تھا۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

ہم سب سناٹے میں تھے۔ اندر پوجا کا منظر قابلِ دید تھا۔ سب اوندھے لیٹ گئے تھے اور گریہ زاری کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ یہ نہایت سنگ دل لوگ تھے۔ پھر بھی ان میں سے کئی ایسے تھے جو یہ دلدوز منظر دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ پیتل کے تھال میں رکھا ہوا انسانی سر جس کے گرد پھولوں کا گھیرا تھا، فربہ چہرہ خون آلود تھا اور نقوش پر آخری وقت کی دہشت اور اذیت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ گرو کی نیچے لٹکی ہوئی ٹھوڑی اور ایک رُخسار پر چوٹوں کے نشان تھے جو اس امر کے گواہ تھے کہ گرو پر اس کے اپنے ہی لوگوں نے تشدد بھی کیا ہے۔

رام پرشاد نے فرش پر اوندھے لیٹے لیٹے بلند آواز میں کہا۔ ''دیوی! یہ بلیدان سوئیکار کرو۔ ہمیں آنے والی آفت سے بچالو۔ ہمیں شما کر دو۔''

اسی طرح کی گریہ زاری دوسرے لوگ بھی کر رہے تھے۔ مندر میں ان کی پوجا کا انداز بالکل جدا تھا۔ یہ عمومی نہیں بلکہ ایک خاص فرقے کا انداز تھا۔

مہا گرو استھان کے تیرہ سیوکوں کا قاتل تھا۔ ہم نے اس کی سزائے موت کا منظر اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا مگر چشم تصور سے یہ منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ گرو کو جان بہت پیاری تھی۔ یقیناً اس نے زندہ رہنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے۔ اپنے ساتھیوں کو من گھڑت دلیلوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ آخری وقت میں زور آزمائی بھی کی ہو۔ ذبح ہونے والے جانور کی طرح تڑپا پھڑکا بھی ہو لیکن اس کی کوئی پیش نہیں چلی تھی۔

اس کے انجام پر کچھ ترس تو آ رہا تھا لیکن وہ قابلِ ترس ہرگز نہیں تھا۔ اسی کی زیرِ ہدایت نگرانی میں شکیلہ جیسی بے گناہ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا...... کچھ دیر بعد یہ خصوصی پوجا ختم ہو گئی اور خون آلود سر کو دوبارہ پتوں سے ڈھانپ کر دیوی کے سامنے سے اُٹھا لیا گیا۔

ہم بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اُتر کر زیریں تہ خانے میں واپس پہنچ گئے۔ سب خاموش تھے۔ واقعے کی سنگینی نے چہروں کو گھمبیر کر رکھا تھا۔ رادھا اپنے کمرے میں نوری کے ساتھ سو رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے پتی دیو کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ وہ جتنی دیر تک بے خبر رہتی، اتنا ہی اچھا تھا۔

''خس کم جہاں پاک۔'' آخر اقبال نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

عمران نے اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجایا اور ہلکی سی انگڑائی لے کر بولا۔ ''محاورہ تھوڑا سا غلط ہو گیا ہے۔ خس تنکے کو کہا جاتا ہے اور گرو تو کافی بھاری بھرکم چیز کا نام تھا۔''

میں نے کہا۔ ''جتنا بھاری بھرکم تھا، اتنا ہی خطرناک بھی تھا۔ جو لوگ اپنے مذہب کو اپنی من مانیوں کے لئے ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ گولہ بارود چلانے سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔''

''لیکن گرو کو مارنے والے شاید گرو سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ جو لوگ اپنے ایک ساتھی کو اتنی بے دردی سے قتل کر سکتے ہیں، وہ ہمارے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔''

''بات تو بالکل ٹھیک ہے۔'' اقبال نے عمران کی تائید کی۔

آفتاب خاں پہلی بار تھوڑا سا نروس نظر آیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آفتاب تمہارا یوں بار بار یہاں تہ خانے میں آنا جانا کوئی مسئلہ پیدا نہ کرے۔''

آفتاب بولا۔ ''ام کو اپنا فکر نہیں ہے جی۔ ام تو اکیلا ہے۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ ام کو آپ کی طرف سے ڈر لگتا ہے۔ آپ کے ساتھ پانچ جوان عورتیں بھی ہیں اور یہ مکھیا وغیرہ بڑا ذلیل ہے۔ عورتوں کے لئے ایک دم خطرناک ہے۔'' پھر اس نے اپنی آواز کچھ مزید دھیمی کر لی اور بولا۔ ''ام نے رات کو تاؤ کے چچازاد بھائی کے بارے میں بتایا تھا نا۔ یہ ذلیل لوگ اس کے گھر والوں کو پکڑ کر یہاں لایا ہے۔ آج سویرے باقی عورتوں کو تو چھوڑ دیا ہے مگر ایک گورا چٹا جوان لڑکی ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس بے چاری کا عزت بچا رہے گا۔''

آفتاب خاں نے ہمیں کلثوم نامی اس لڑکی کے بارے میں تفصیل بتائی۔ اس نے کہا کہ کل شام لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ اس جرم میں مکھیا نے اسے بری طرح مارا پیٹا بھی تھا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ لڑکی بہت کچھ جانتی ہے اسی لئے اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔

آفتاب خاں نے کہا۔ ''آپ سچ پوچھتا ہے تو مجھے تو یہ استھان والا لوگ ایک دم دیوانہ

لگتا ہے۔ اتنا غصہ ہے ان لوگوں میں کہ ام آپ کو کیا بتائے۔ آپس میں بھی لڑ جھگڑ رہا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ یہاں آ کر دو دھڑوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک تو وہ کھڑی ناک والا ستیش ہے جس کو ابھی ام نے مندر میں دیکھا ہے۔ دوسرا اس کا ساتھی مہندر ہے۔ ام کو لگتا ہے جیسے گرو کو مارنے کے بارے میں بھی ان دونوں میں جھگڑا رہا ہے۔ ستیش شاید گرو کو مار دینا چاہتا تھا اور مہندر اس کا چیلا ہونے کی وجہ سے اس سے تھوڑا بہت رعایت کرنا چاہتا تھا۔ اب بھی آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ مندر میں مہندر نام کا وہ بندہ پرارتھنا میں موجود نہیں تھا۔ ام کو گرو کا کوئی چیلا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔''

ہمارے درمیان کافی دیر گفتگو ہوئی۔ آفتاب خاں ہمارے لئے بڑا کارآمد ثابت ہو رہا تھا۔ وہ باہر کی ساری صورتِ حال کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ مہندر اور گرو کے چار پانچ چیلے مستقل طور پر مکھیا رشید کی حویلی میں ہیں جبکہ ستیش، اس کا پتا رام پرشاد، دادی اور چند ساتھی ایک دوسرے زمیندار کے گھر میں قیام پذیر ہیں۔

جو خوفناک واقعہ ہم نے مندر میں دیکھا، اس کے بارے میں اپنے دیگر ساتھیوں کو کچھ نہیں بتایا۔ تاؤ افضل، رادھا، نوری، سلطانہ اور طلال وغیرہ اس واقعے سے بالکل بے خبر رہے۔

سلطانہ کے حوالے سے میں شام تک سخت کشمکش میں تھا۔ مجھے اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تاہم شام کے بعد کچھ بہتری کے آثار نظر آئے اور مجھے لگا کہ سلطانہ کے بارے میں عمران جو ''ماہرانہ'' پیش گوئیاں کر رہا ہے، وہ شاید درست ہیں۔ شام کے وقت سلطانہ کا موڈ کچھ بدلا ہوا نظر آیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ آج اس کے بال کچھ سنورے ہوئے ہیں۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا تھا۔ آنکھوں میں ہلکا سا کاجل بھی لگایا تھا۔ اس تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ہی وہ اچھی بھلی دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ میرے لئے کھانا لے کر آئی تو اس میں ایک پلیٹ ڈھکی ہوئی بھی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''حلوہ...... تمہارے لئے مہروج!''

میں نے دیکھا، یہ سوجی کا حلوہ تھا۔ اس پر تھوڑا سا خشک میوہ بھی ڈالا گیا تھا۔ یہ اسی طرز کا حلوہ تھا جو نوری نے بنایا تھا۔

''یہ تم نے بنایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوں۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

میں نے حلوہ چکھا۔ وہ واقعی نوری کے حلوے سے کہیں بہتر تھا۔ بہرحال میں نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''کیسا ہے؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بس...... ٹھیک ہے۔'' میں نے عام لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر مایوسی کا سایہ لہرا گیا اور وہ ایک دم چپ ہوگئی۔

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''زبردست سلطانہ...... تم نے واقعی کمال کا بنایا ہے۔''

وہ جیسے اندر سے کھل اُٹھی پھر اپنے تاثرات چھپانے کے لئے پانی لینے کے بہانے اندر چلی گئی۔

کتنا فرق تھا اس کی شخصیت کے دو رُخوں میں۔ وہ ایک خونی قاتلہ کے روپ میں سامنے آئی تھی لیکن اب بھی اس کے اندر ایک عورت مکمل طور پر مری نہیں تھی...... وہی عورت جو اپنے شریکِ حیات کے ساتھ جینا چاہتی ہے۔ اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر نہال ہوتی ہے۔ اپنے شیرخوار کو اپنے سینے پر لٹا کر اس سے اٹھکیلیاں کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ ہاں، ابھی وہ عورت کسی نہ کسی درجے میں زندہ تھی اور میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اس زخم زخم عورت کو زندہ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔

رات کو وہ دیر تک جاگتی رہی۔ میرے پاس بیٹھی اپنے بالو کی باتیں کرتی رہی۔ اس کی ممتا بیدار ہو چکی تھی۔ وہ جلد از جلد بالو کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی چھاتی سے لپٹانا چاہتی تھی۔ یہ صورتِ حال امید افزا تھی۔ اگر ممتا اس کے اندر زندہ ہوگئی تھی تو پھر امید تھی کہ مکمل عورت بھی زندہ ہو جائے گی جس کی آنکھوں میں حسرتوں کے قبرستان نہیں ہوں گے۔ جو میرے چھُونے سے سرتاپا لرزے گی نہیں۔

جب ہم اپنے اپنے بستر پر سونے کے لئے لیٹے تو میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں ہولے ہولے اس کے بالوں میں چلاتا رہا۔ بالوں کا یہ لمس میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ماضی میں، مَیں ان بالوں کے اندر چہرہ چھپاتا رہا ہوں۔ ان کی خوشبو اپنی سانسوں میں اُتارتا رہا ہوں...... دھندلی سی گواہی تھی مگر موجود تھی۔ میں اس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔ وہ اپنے تمام تر پیار بھرے ایثار کے ساتھ میرے دل میں سرایت کرتی چلی جارہی تھی۔ میں رات کی اس تنہائی میں اس کی طرف بڑھتا تو شاید...... شاید وہ مجھے راستہ دینے پر آمادہ ہو جاتی لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس کی

آزادی اور رضا بھی اس کی زندگی ہی کی طرح عزیز تھی۔ میں نے اپنی ذات کا دروازہ اس کے لئے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پوری آزادی اور پوری عزتِ نفس کے ساتھ اس دروازے میں خود قدم رکھے۔

وہ سوگئی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بالوں کی دو موٹی لٹیں اس کے گندمی چہرے پر تھیں۔ مجھے اس کے چہرے پر جارج گورا کے گندے ہاتھوں کا کوئی ہلکا سا نشان بھی نظر نہیں آیا۔ وہ چاندنی، شبنم اور سورج کی روپہلی کرنوں کی طرح شفاف اور پاک تھی۔

سلطانہ کو دیکھتے دیکھتے میرا دھیان اس کلثوم نامی لڑکی کی طرف چلا گیا جو بقول آفتاب خاں اس وقت اپنی آبرو کے خطرے سے دوچار تھی...... میں سہ پہر سے اس لڑکی کے بارے میں کئی بار سوچ چکا تھا۔ کیا ایک اور سلطانہ ایک اور جارج گورا کے پنجۂ ہوس میں جکڑی جانے والی تھی؟ کیا اس مرتبہ بھی میں کچھ نہیں کرسکوں گا یا پھر اس مرتبہ بھی مجھے تاخیر ہو جائے گی...... جیسے شکیلہ والے معاملے میں ہوگئی تھی؟ استھان میں اپنی آبرو کے بعد وہ اپنی زندگی بھی نہیں بچا سکی تھی اور اپنی کھودی ہوئی قبر میں دفن ہوگئی تھی۔ میں اور عمران سوچتے ہی رہ گئے تھے۔

میں جانتا تھا کہ عمران بھی اس کلثوم نامی لڑکی کے سلسلے میں بے چین ہے لیکن میری بے چینی شاید اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس بے چینی میں میرے اندر کی بے چینی اور وحشت بھی شامل ہوگئی تھی۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا...... کسی مشکل سے ٹکرانا چاہتا تھا...... خود کو کسی بے پناہ صورتِ حال کے رُوبرو کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ مجھے درد درکار تھا، اذیت چاہئے تھی۔ میری سہی ہوئی اذیت سے اگر کچھ لوگوں کے لئے آسانیوں کے دَر کھل جاتے تو یہ اور بھی اچھی بات تھی۔

میں نے سلطانہ کو سوتے چھوڑا اور بے چین سا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ آفتاب خاں باہر کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لئے یہاں آئے گا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں نے اپنا پسٹل جیکٹ کے نیچے لگایا اور خاموشی سے زینوں کی طرف آگیا۔ میں جانتا تھا کہ عمران کچھ دیر کے لئے سوگیا ہے اور اقبال اوپر والے تہ خانے پر تاؤ افضل اور رادھا کی دل جوئی میں مصروف ہے۔ میں خاموشی سے زینے چڑھ کر بالائی تہ خانے پر آگیا۔ یہاں کاٹھ کباڑ پڑا تھا اور تاریکی تھی۔ میں خاموشی سے لکڑی کے ایک ٹوٹے ہوئے گرد آلود بینچ پر بیرونی دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ چار پانچ دن پہلے ہم اسی دروازے سے گزر کر ان تہ خانوں میں داخل ہوئے تھے۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اگر عمران وغیرہ کو معلوم ہوتا کہ میں باہر جانا چاہ رہا

ہوں تو وہ مجھے کبھی نہ جانے دیتے۔ ان کی سب سے وزنی دلیل یہی ہوتی کہ اگر خدانخواستہ میں پکڑا گیا تو کیا ہوگا۔ وہ لوگ مجھے تشدد کے شکنجے میں جکڑیں گے اور مندر کے تہ خانوں تک پہنچ جائیں گے۔ یہ بہت وزنی دلیل تھی مگر میں جانتا تھا کہ یہ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اذیت برداشت کرنے کے حوالے سے میرے اندر عجیب سا حوصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ ناقابلِ برداشت اذیت کو جھیلنا میری فطرت بنتا جا رہا ہے۔ برداشت کی حد آتی تھی تو میں رک جاتا تھا اور اگلی دفعہ اس حد کو بڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔

دروازے سے باہر مدھم آہٹیں سنائی دیں۔ پھر تالا کھلنے کی ہلکی سی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ یخ بستہ ہوا کا جھونکا اور آفتاب خاں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ آفتاب خاں مجھے وہاں تاریکی میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر ہم نہایت مدھم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ آفتاب خاں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ میں اس وقت مندر سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ تابش بھائی! ام کو آپ کا بات سمجھ میں نہیں آ رہا۔ باہر آپ کے لئے بہت خطرہ ہے۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو......“

”دیکھو، میں جو بات کہہ رہا ہوں، پوری طرح سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے بُرے بھلے کا ذمے دار ہوں اور تمہیں پورا یقین دلاتا ہوں کہ میری وجہ سے کسی دوسرے پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔“

”مگر......“

”آفتاب! میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ تم بس یہ کرو کہ مجھے کھیا رشید کے گھر کے دروازے تک پہنچا دو۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام......“

”مگر......مگر وہاں آپ کرے گا کیا؟“

”یہ سب کچھ میں تمہیں واپس آ کر بتاؤں گا......کل رات۔“

”کیا مطلب؟ آپ آج واپس نہیں آئے گا؟“

”میں تو ان شاء اللہ آ جاؤں گا مگر تم آج نیچے نہیں جاؤ گے۔ تم سے ہماری ملاقات اب کل رات ہی ہوگی۔“

”اماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ آپ ام کو ذرا تفصیل سے بتائیں، شاید ہمارے کھوپڑے میں کچھ آ جائے۔“ آفتاب کی آواز بھرا گئی۔

اگلے چار پانچ منٹ میں وہیں سیڑھیوں کی تاریکی میں سب کچھ طے ہو گیا۔ پروگرام

کے مطابق مجھے اور آفتاب خاں کو آگے پیچھے مندر میں سے نکلنا تھا۔ ہمارے درمیان کم وبیش تیس قدم کا فاصلہ رہنا تھا۔ آفتاب نے مجھے کھیا کے مکان تک پہنچانا تھا اور پھر سیدھا آگے نکل جانا تھا۔ اس نے مجھے کھیا کے مکان کا سارا حدود اربعہ بھی بتا دیا اور اس امر سے بھی آگاہ کر دیا کہ وہاں اندازاً کتنے لوگ اور کہاں کہاں موجود ہو سکتے ہیں۔ اس گفتگو کے آخر میں آفتاب خاں کی سمجھ میں یہ بات تقریباً آ گئی کہ میں کھیا کے گھر سے اس کلثوم نامی لڑکی کو نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے اس ارادے نے اسے حیران تو بہت کیا تاہم اس نے اس حوالے سے کوئی تبصرہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔

باہر نکل کر آفتاب نے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا پھر میں بھی باہر آ گیا۔ آفتاب نے میری ہدایت کے مطابق دروازہ بند کیا اور تالا دوبارہ لگا دیا۔ اس نے تالے کو بند نہیں کیا لیکن بظاہر وہ بند ہی نظر آتا تھا۔ رات بہت ٹھنڈی تھی۔ آسمان پر ہلکے بادل تھے، مدھم ہوا چل رہی تھی۔ میں اور آفتاب آگے پیچھے گاؤں کی گلیوں میں جا رہے تھے۔ آفتاب کے ہاتھ میں لالٹین اور لاٹھی تھی۔ ایک پرانا ماؤزر بھی اس کے لباس کے اندر موجود تھا۔ چلتے چلتے وہ گاہے بگاہے آواز بلند کر دیتا تھا۔ ”جاگتے رہو۔“

وہ کہہ تو رہا تھا کہ ”جاگتے رہو“ لیکن فی الوقت وہ خواہش یہی کر رہا تھا کہ ”سوتے رہو“ اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو ہونے دو۔ گلیوں میں آوارہ کتوں کی ٹولیاں گھوم رہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی گھر میں لالٹین یا دیے کی مدھم روشنی دکھائی دیتی تھی۔ جنگلی جانوروں سے تحفظ کے لئے اکثر گھروں کے گرد کانٹوں اور جھاڑیوں کی باڑیں لگائی گئی تھیں۔ میرے سینے میں عجیب سا جوش بھر گیا تھا اور اس نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔

چھوٹے بڑے گھروں کے درمیان مجھے ایک نیم پختہ اور کشادہ مکان نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی کھیا کا گھر ہے۔ گھر کا احاطہ وسیع تھا۔ پھاٹک سے باہر دو تین خالی چھکڑے کھڑے تھے۔ یہاں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آ رہا تھا۔ آفتاب نے بتایا تھا کہ کھیا کے مویشی اور گھوڑے وغیرہ احاطے کے اندر ہی ایک اصطبل میں ہوتے ہیں۔ حسبِ پروگرام کھیا کے گھر کی نشاندہی کرنے کے بعد آفتاب سیدھا نکلتا چلا گیا۔

آفتاب نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ کھیا کے مکان کی دیوار کہاں سے بہ آسانی پھاندی جا سکتی ہے اور کس طرف سے احاطہ پار کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں نے آفتاب کی ہدایت کے مطابق ایک جگہ سے چھ فٹ اونچی کچی دیوار پھاندی اور احاطے میں چلا گیا۔ مجھے ایک طویل برآمدے میں داخل ہونے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ یہاں چقیں لگی تھیں

اور دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سی بوریاں چنی ہوئی تھیں۔ ہلکی بُو سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں خشک مچھلی ہے۔ ایک دم مجھے رکنا پڑا۔ کسی قریبی گوشے سے بھاری آواز میں گانے کی مدھم صدا اُبھر رہی تھی۔ کوئی شخص بھرائی ہوئی نشہ زدہ آواز میں بار بار یہ بول رہا تھا۔ نند لالا پن گھٹ پر چھیڑ گیو رے...... میری چولی کے بخیے ادھیڑ گیو رے...... میری چولی...... میری چولی ......

میں کچھ دیر تک یہ بھونڈی آواز سنتا رہا اور سمت کا تعین کرتا رہا پھر پستول نکال کر ایک تنگ راہداری کی طرف بڑھا۔ لالٹین کی بہت مدھم روشنی میں ایک ہٹا کٹا شخص فرش کی دری پر لیٹا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک بوتل پڑی تھی۔ اس دیسی بوتل کی ساخت سے ہی پتا چل جاتا تھا کہ اس میں تاڑی ہے۔ ویسے بھی اب میں تاڑی کی بُو اچھی طرح پہچاننے لگا تھا۔ یہ شخص دری پر اینٹھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ خمار کے عالم میں گاتا جا رہا تھا۔ نند لالا پن گھٹ پر...... نند لالا......

مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں اپنے سائے کا دھیان نہیں رکھ سکا۔ سامنے دیوار پر میرے سائے کی مدھم حرکت دیکھ کر ہٹا کٹا شخص بری طرح چونک گیا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس پر جھپٹ پڑوں۔ میں نے ڈیڑھ کلو وزنی پستول کا دستہ پورے زور سے اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ وہ کراہ کر ایک تکیے پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر چلاتا اور کسی کو اپنی مدد کے لئے بلاتا، میں اس پر سوار ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کا منہ ہی ڈھانپا۔ اس کی آواز اس کے گلے کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ وہ خاصا زور آور تھا۔ غالباً نشے نے اس کے زور میں مزید اضافہ کیا تھا۔ اس نے غیر معمولی طاقت کے ساتھ ہاتھ پاؤں چلائے اور میری گرفت سے نکل جانا چاہا۔ اس کی مزاحمت توڑنے کے لئے میں نے اس کی زخمی کنپٹی پر پستول کا ایک اور وار کیا۔ وہ نڈھال سا ہو گیا۔ میں نے اس کے ادھ کھلے منہ میں ایک کپڑا ٹھونسا اور پھر اس کپڑے کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ اردگرد مکمل خاموشی تھی۔ غالباً اس مکان کے مکین بند کمروں میں لحاف اور کمبل لپیٹے سو رہے تھے۔

میں نڈھال شخص کو بے آواز گھسیٹتا ہوا برآمدے میں لے آیا۔ برآمدے کے آخری سرے پر جہاں بہت سی چارپائیاں اُفقی رخ پر کھڑی تھیں، ایک چھوٹا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں اس وزنی شخص کو گھسیٹتا اور کھینچتا ہوا اس دروازے تک لے آیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا، اس میں بھوسا بھرا ہوا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرا مکان کے وسیع احاطے میں تھا۔ اس کے دو دروازے

تھے، ایک برآمدے میں اور دوسرا احاطے میں کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر میں اپنے شکار سمیت کمرے میں آ گیا اور دونوں دروازے اندر سے بند کر دیئے۔ یہ میری خوش قسمتی رہی تھی کہ اس ساری کارروائی کے دوران میں گھر کے باقی مکین بے خبر رہے تھے۔

میں نے جیکٹ سے چھوٹی ٹارچ نکال کر جلائی اور روشنی اپنے شکار کے چہرے پر پھینکی۔ اس کی کنپٹی لہولہان تھی اور وہ ناک کے راستے کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ بہرحال، وہ ہوش میں تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ وہ اسی بستی کا رہائشی لگتا تھا۔ تاڑی کے نشے سے اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ میں نے پستول اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم جتنا بھی سوچ رہے ہو، میں اس سے زیادہ بے رحم ہوں۔ تمہاری گردن توڑ کر تمہیں اس پرالی کے ڈھیر میں پھینک جاؤں گا، کل کا سورج نہیں دیکھ سکو گے......''

وہ دیکھ چکا تھا کہ میں نے کتنی بے دردی سے اسے پستول کی دو شاندار چوٹیں لگائی تھیں۔ وہ سخت جان نہ ہوتا تو شاید یہ چوٹیں ہی اسے عدم آباد روانہ کر دیتیں۔ وہ میری جسمانی مضبوطی کا بھی اندازہ کر چکا تھا۔ میں نے اس کی اندھا دھند مزاحمت کو بے اثر کر دیا تھا اور اسے اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ حالانکہ میری گردن کے عقب میں گہرا زخم بھی موجود تھا۔ اس زور آزمائی کی وجہ سے یہ زخم پھر کھل گیا تھا اور میں ایک بار پھر اپنی پشت پر لہو کی ہلکی سی نمی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم واویلا نہ کرو اور میرے دو تین سوالوں کے جواب دینے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ میں سے کپڑا نکال سکتا ہوں۔''

اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پستول کی نال اس کی چوڑی پیشانی پر رکھے رکھے اس کی جامہ تلاشی لی...... اس کے کوٹ کی جیبوں سے کچھ نقدی، سگریٹ کا پیکٹ اور چھوٹی موٹی اشیاء نکلیں...... یہ اشیاء میں نے دوبارہ اس کی جیبوں میں ٹھونس دیں۔ ایک چیز میرے علم میں نہیں آ سکی اور وہ اس شخص کی قمیص کے نیچے رہی۔

میں نے اس کے منہ میں بری طرح ٹھنسا ہوا کپڑا نکال لیا اور اس سے پوچھا۔ ''تمہارا نام؟''

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پہلے تو یہ بتاؤ تم کون ہو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

"شاید تم عمران اور اقبال کے ساتھ ہمارے گاؤں میں آئے تھے۔"

"میں تمہارے سوال کا جواب ہاں میں دیتا ہوں...... اور دیکھو، یہ آخری سوال ہے اور اس کو آخری ہی رہنا چاہئے۔ نہیں تو گولی دماغ میں جائے گی اور تمہارا یہ گندا بھیجا ناک کے راستے باہر آ جائے گا۔" میں نے پستول کا دباؤ اس کی پیشانی پر اتنا بڑھایا کہ وہاں گہری خراش آ گئی اور خون رسنے لگا۔

"پپ...... پوچھو۔"

"تمہارا نام؟"

"سس...... سلمان...... سلو۔"

"او...... ہو...... تو تم کھیا عبدالرشید کے نور چشم ہو؟"

ہم سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟" وہ ہکلایا۔

"پھر سوال۔ میں نے کہا تھا نا کہ سوال نہیں پوچھنا۔" میں نے پستول کا بے رحم دباؤ پیشانی پر بڑھا دیا۔ وہ تھرا کر رہ گیا۔

میں نے ٹارچ کے روشن دائرے میں غور سے اس کا صحت مند چہرہ دیکھا تو یہ تھا وہ عیاش چودھری زادہ جس نے نوری کو رکھیل کی حیثیت سے رکھا ہوا تھا اور اسی نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر تاؤ افضل کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آج رات اس طرح اچانک اس شخص سے ملاقات ہو جائے گی۔ بہرحال، میں یہاں اس کے جرائم اور گناہوں کا حساب کتاب کرنے نہیں آیا تھا، میرا مقصد کچھ اور تھا اور میری خواہش تھی کہ میں فی الحال اسی مقصد تک محدود رہوں۔

میں نے سلمان سلو نامی اس جواں سال شخص سے پوچھا کہ وہ لڑکی کلثوم کہاں ہے جسے اس گھر میں بند کیا گیا ہے اور مارا پیٹا جا رہا ہے۔

اس نے صاف انکار کر دیا کہ یہاں کوئی لڑکی موجود ہے۔ اس نے کہا کہ تاؤ کی رشتے دار ساری عورتوں کو کل ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا اور اسے کہا کہ میں صرف دس تک گنوں گا، اس کے بعد ہر نتیجے سے بے پروا ہو کر گولی چلا دوں گا۔

اس نے میرے لہجے کی بے پناہ تپش محسوس کی اور اس کی تاڑی زدہ آنکھوں میں خوف جم گیا۔ میں نے چھ تک ہی گنا تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا...... پسینے سے تر پیشانی کے ساتھ بولا۔ "میں تم سے جھوٹ ناہیں بول رہا۔ وہ لونڈیا یہاں ناہیں ہے۔

میں قسم کھاوت ہوں۔"

"تو پھر کہاں ہے؟"

"وہ...... وہ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کے پاس ہے۔ وہ اسے آج ہی ہمارے گھر سے گئے تھے۔"

"پھر جھوٹ؟"

"میں قسم کھاوت ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ ستیش اسے خود لینے کے لئے آیا تھا۔ اس کی پتنی مالا بھی اس کے ساتھ تھی۔"

"وہ کیوں لے گئے تھے؟"

"مجھے...... ٹھ...... ٹھیک سے تو پتا ناہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کو ڈر تھا۔ خاص طور سے ستیش کی پتنی مالا کو ڈر تھا۔"

"کیسا ڈر؟"

"شاید...... وہ سمجھت تھی کہ یہاں اس لونڈیا کے ساتھ اچھا برتاؤ ناہیں ہووے گا۔ وہ کہوت تھی کہ ہم خود اس سے پوچھ گچھ کر لیویں گے۔"

یہ میرے لئے انکشاف تھا۔ میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے سلمان کو دیکھا...... شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

"ہمارے...... ساتھ والے تین گھر چھوڑ کر چوتھے گھر میں۔ زمیندار پردیپ کے مکان میں۔ ستیش اور اس کے گھر والے بھی وہیں ہیں۔ عورتیں زنانے میں ہیں، مرد دوسرے حصے میں۔"

میں نے تھوڑی سی مزید تفصیل پوچھی تو پتا چلا کہ زمیندار پردیپ کے گھر میں زنانہ حصہ مکان کی بالائی منزل پر ہے...... اور امکان ہے کہ لڑکی کلثوم ستیش کی پتنی مالا کے ساتھ سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے میں ہوگی...... یہ تفصیل میرے لئے کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے مکان کا حدود اربعہ بھی سلمان سے دریافت کیا اور وہاں پہرے وغیرہ کی صورت حال بھی دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ زمیندار پردیپ کے گھر میں داخل ہونے کے لئے مجھے کھیا کے مکان میں سے نکلنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں اگر کوشش کروں تو چھتوں کے اوپر سے ہی اس چھت پر پہنچ سکتا ہوں۔

میں نے کہا۔ "تم نے مجھے سب کچھ بتایا ہے لیکن یہ ابھی تک نہیں بتایا کہ مجھے دائیں طرف والے تین گھر چھوڑنے ہیں یا بائیں طرف والے؟"

''دائیں طرف والے۔'' سلمان نے ہکلا کر کہا۔

جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں کمینگی کی جھلک نظر آئی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید وہ مجھے غلط معلومات فراہم کر رہا ہے لیکن جلد ہی پتا چل گیا کہ یہ دوسرا معاملہ ہے اور میری توقع سے کہیں زیادہ خطرناک بھی۔

سلمان کی قمیص کے نیچے ایک تیز دھار چاقو موجود تھا۔ یہ چاقو اس نے چمڑے کی بیلٹ کے ذریعے پیٹ کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جو تلاشی لی تھی، اس میں یہ چاقو میرے علم میں نہیں آ سکا تھا۔ غیر محسوس طور پر سلمان سلو اپنے ہاتھ کو کھسکاتا ہوا اس چاقو تک پہنچا چکا تھا۔ یکا یک وہ مچھلی کی طرح تڑپا۔ یہ اتنا برق رفتار وار تھا کہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ چاقو سیدھا میری گردن کی طرف آیا۔ یہ میری اضطراری حرکت ہی تھی جس نے میری گردن کو چاقو کی مہلک نوک سے بچایا۔ موت جیسے مجھے چھو کر نکل گئی تھی۔ میں نے اندھا دھند ایک طوفانی مکا مدِمقابل کے سر پر رسید کیا۔ سینڈ بیگ کے ساتھ جیکی نے مجھے جو لگاتار مشقیں کرائی تھیں، انہوں نے میرے ہاتھوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ خاص طور سے ہاتھ کی ہڈیوں، کلائی اور کہنی کے جوڑ میں غیر معمولی سختی پیدا ہو چکی تھی۔ سلمان سلو نامی اس بدمعاش کے سر پر میں نے جو مکا رسید کیا، اس سے پہلی مرتبہ مجھے اپنے وار کی اصلی طاقت اور اثر کا اندازہ ہوا۔ اس وار نے جیسے مدِمقابل کی کھوپڑی کو چٹخا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر ایک اور زوردار ضرب اس کے سر پر لگائی۔ ایک دم اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ تیسری ضرب کے لئے میں نے ہاتھ اُٹھائے لیکن ضرب لگائی نہیں۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ تیسری ضرب کی ضرورت نہیں رہی۔ ایک خفیف جھرجھری کے ساتھ مدِمقابل کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور آنکھیں بے جان ہو گئیں۔ چاقو ابھی تک اس کے ادھ کھلے ہاتھ میں تھا۔ میں نے چاقو اس کے ہاتھ سے علیحدہ کیا اور بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ اگر سلمان یہ اچانک حملے والی حرکت نہ کرتا تو میں اسے زندہ چھوڑتا یا نہیں۔ بہرحال اپنی اس حرکت سے اس نے میری ایک بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ میں نے اپنے دفاع میں اس پر حملہ کیا تھا اور اس حملے میں لگنے والی چوٹ سے اس کی جان چلی گئی تھی۔

میں نے دروازہ کھول کر باہر کا جائزہ لیا۔ احاطے میں مکمل خاموشی تھی۔ ایک چھپر تلے دو بلیاں گتھم گتھا تھیں اور چلا رہی تھیں چھپر کے پاس ہی ایک چھوٹا کنواں نظر آ رہا تھا۔ اس

کے اوپر پانی نکالنے کے لئے لکڑی کی چرخی لگی ہوئی تھی۔ غالباً یہ کنواں خشک تھا۔ ایسے کنوئیں کو دیہات میں ''کھوئی'' کہا جاتا ہے۔ پنجاب میں تو جہاں زیرِ زمین پانی کی سطح بلند ہے، ایسی کھوئیاں عام نظر آتی ہیں۔

میں نے تیزی سے سوچا اور واپس اس کمرے میں پہنچا جہاں کچھ دیر پہلے سلمان قالین نما دری پر لیٹا تاڑی پی رہا تھا اور رنند لالا...... گنگنا رہا تھا۔ تاڑی کی نصف بوتل ابھی تک وہیں پڑی تھی۔ میں نے بوتل اُٹھائی اور جا کر کنوئیں میں پھینک دی۔ بوتل کے گرنے سے اندازہ ہوا کہ کنواں واقعی خشک ہے۔ بوتل کے بعد میں نے سلمان کی لاش بھی کنوئیں میں دھکیل دی۔ یہ قدرے گونج دار آواز سے گری۔ میں تھوڑی دیر تک ایک تاریک گوشے میں رک کر ردِعمل کا انتظار کرتا رہا۔ حسبِ توقع ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں نے بھوسے والے کمرے میں جا کر چھوٹی ٹارچ روشن کی اور تین چار منٹ کے اندر وہ سارے آثار مٹا دیئے جن سے یہاں کسی کی موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد میں سیڑھیاں چڑھ کر مکھیا کے مکان کی چھت پر آ گیا۔

سلمان سلو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دائیں طرف کچھ چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ یہاں سرد ہوا سوئیوں کی طرح جسم میں چبھن رہی تھی اور یہ چبھن مجھے مزہ دے رہی تھی۔ گردن کے زخم سے اُٹھنے والی ٹیسیں بھی اسی مزے دار کیفیت کا ایک حصہ تھیں۔ آہستہ آہستہ درد، دوا بنتا جا رہا تھا اور یہ میرے اندر کی بڑی انقلاب آفریں کیفیت تھی۔

مجھے چھتیں پھلانگنے میں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی۔ ایک منڈیر پر میں پھسلتے پھسلتے بچا، تاہم تین چار منٹ کے اندر میں زمیندار پردیپ کی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا اور میں اپنے اردگرد سے پوری طرح باخبر تھا۔ چار پانچ سیڑھیاں اُتر کر میں اس دروازے کے سامنے پہنچ گیا جس کی نشاندہی مکھیا کے بیٹے سلمان سلو نے کی تھی۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر مجھے چند مدھم آوازیں سنائی دیں۔ میں نے کان دروازے سے لگا دیا۔ کوئی لڑکی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ پھر نیند میں ڈوبی ہوئی سی ایک اور نسوانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''اچھا، میں تمہارے لئے کچھ لاتی ہوں۔''

''مم...... مجھے اکیلا ناہیں چھوڑو دیدی۔'' وہ کراہتی ہوئی آواز نے کہا۔

''یہاں کوئی ناہیں آ سکتا۔ بالکل بے فکر رہو۔ میں بس دو منٹ میں آوت ہوں۔'' دوسری آواز اُبھری۔

میں جلدی سے ایک تاریک گوشے میں سمٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد دروازے کی چٹخنی گری

اور ایک سایہ نظر آیا۔ میں ایک لمحہ میں پہچان گیا۔ یہ رام پرشاد کی بہو اور ستیش کی پتنی مالا تھی۔ وہ حسبِ سابق امیرانہ لباس میں تھی۔ کانوں میں طلائی جھمکوں کی چمک بھی نظر آئی۔ وہ اپنی گرم چادر سنبھالتی ہوئی سیڑھیاں اُتر گئی۔ اندر سے ہولے ہولے کراہنے کی آواز بدستور آتی رہی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کمرے میں اب ایک لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں دو پلنگ، لکڑی کی الماری اور جستی صندوق وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ ایک کونے میں ادھ بجھی انگیٹھی بھی سلگ رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ایک لڑکی بستر پر اوندھی پڑی ہے۔ اس کا بالائی جسم یکسر عریاں تھا۔ شاید انگیٹھی کی حرارت کے سبب وہ لحاف کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس کی سفید شفاف کمر پر چھڑیوں کے کئی نیلگوں نشان تھے۔ کہیں کہیں سے خون بھی رِس آیا تھا۔ ان نشانات پر کوئی دوا لگائی گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی نے اپنا ایک ہاتھ کان پر رکھا ہوا تھا اور کراہ رہی تھی۔

یقیناً میرے اندر داخل ہونے سے مدھم آہٹ پیدا ہوئی ہو گی مگر لڑکی چونکی نہیں اور نہ ہی اس نے بستر پر سیدھا ہونے کی کوشش کی۔ غالباً وہ یہی سمجھی تھی کہ رام پرشاد کی بہو مالا واپس آ گئی ہے۔

میں نے قریب پہنچ کر اچانک لڑکی کا منہ اپنے ہاتھ سے دبوچا اور پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ وہ بری طرح مچلی مگر میں نے اسے اپنے بوجھ تلے دبا لیا تھا۔ میری سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ وہ کوشش کے باوجود آواز نہ نکال سکی۔ اس کا منہ میری ہتھیلی سے پوری طرح ڈھک چکا تھا۔ میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''کلثوم! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے تاؤ افضل نے بھیجا ہے۔ میں یہاں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں۔''

اس نے ایک بار پھر تڑپ پھڑک دکھائی اور غوں غاں کی آوازیں نکالیں۔ میں نے پستول اس کی کنپٹی سے ہٹا لیا اور نرمی سے کہا۔ ''دیکھو...... اگر شور کرو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ میں پکڑا جاؤں گا اور تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔''

اس کا جسم قدرے ڈھیلا پڑ گیا۔ اب وہ چہرہ گھما کر مجھے دیکھنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کی اور کہا۔ ''اگر تم وعدہ کرو کہ شور نہیں مچاؤ گی تو میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا دیتا ہوں اور...... تمہیں بتاتا ہوں کہ ہمیں یہاں سے کیسے نکلنا ہے۔''

اسے پُرسکون کرنے کے لئے مجھے دو تین فقرے مزید بولنے پڑے۔ آخر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا سکتا ہوں۔

میں نے ہاتھ ہٹایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تیزی سے پلٹے گی اور میرا چہرہ دیکھے گی لیکن وہ اوندھی پڑی رہی۔ اس نے فقط اپنا چہرہ گھمانے پر اکتفا کیا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک ہراس اور بے یقینی کی کیفیت موجود تھی تاہم شکر کا مقام تھا کہ اس نے کوئی آواز نہیں نکالی۔

''کک...... کون ہو تم؟'' وہ بری طرح ہکلائی۔

''فی الحال تم صرف اتنا جانو کہ میں تمہارا ہمدرد ہوں اور مجھے تاؤ افضل نے تمہارے لئے بھیجا ہے۔ باقی ساری باتیں ہم یہاں سے نکلنے کے بعد کریں گے۔''

وہ یک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ اس نے خود کو سمٹا رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی بے لباسی کی وجہ سے سیدھی نہیں ہو رہی۔ میں نے اسے ایک گرم چادر دی تاکہ وہ اپنا جسم ڈھانپ لے۔ وہ چادر لپیٹ کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور سفید رنگ بالکل لٹھے کی طرح ہو گیا تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل اکیس بائیس سال رہی ہو گی۔ وہ اچھے نین نقش کی ایک غریب دیہاتن نظر آتی تھی۔ شاید عام حالات میں اسے خوبصورت بھی کہا جا سکتا ہو مگر فی الوقت دہشت سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ میں نے پستول اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔

''تت...... تاؤ...... خود کہاں ہیں؟''

''اگر تم مجھ پر بھروسا کرو اور میرے کہنے کے مطابق چلو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے آدھ گھنٹے میں تم اپنے تاؤ اور تاؤ زاد بہنوں سے مل سکو گی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔

اس کے چہرے کا تناؤ ایک دم کم ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ بھروسے کی طرف آ رہی ہے۔

''لیکن...... تم نکلو گے کیسے؟'' وہ منمنائی۔

''یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس یہ کرو کہ قمیص اور جوتی وغیرہ پہن لو۔''

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں آئیں۔ کلثوم کے چہرے پر ایک دم ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ''میرا خیال ہے...... دیدی آ رہی ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے آوازوں پر بغور کان لگائے۔ کوئی واقعی سیڑھیوں کے پاس موجود تھا۔ میں نے تیزی سے سوچا۔ اب باہر نکلنے کا وقت نہیں تھا۔ اگر مجھے چھپنا تھا تو کمرے کے اندر ہی چھپنا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ بہترین جگہ الماری کا عقبی خلا تھا۔ اب قدموں کی چاپ سیڑھیوں پر سنائی دے رہی تھی۔ میں کلثوم کو اس کے حال پر چھوڑ کر تیزی سے الماری کے پیچھے چلا گیا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور مالا اندر آ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز اُبھری۔ ''یہ دیکھو، سرسوں کے تیل میں لہسن کی پھلی جلا کر لائی ہوں۔ یہ بہترین دوا ہے کان کے درد کے لئے۔''

کلثوم اب بھی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ میں نے الماری کی اوٹ سے دیکھا۔ وہ اسی طرح اوندھی لیٹی تھی جیسے میرے آنے سے قبل تھی۔ مالا اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پیتل یا تانبے کی چھوٹی سی پیالی اور چمچ تھا۔ اس نے چمچ کی مدد سے تھوڑا سا گرم تیل کلثوم کے کان میں انڈیلا اور پھر کان کو ہاتھ سے ہولے ہولے ہلانے لگی۔ کلثوم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

''دیکھنا، ابھی پانچ دس منٹ میں آرام آ جاوے گا۔ یہ بڑا پرانا نسخہ ہے۔'' وہ غنودگی بھری آواز میں بولی۔

اس کے حلیے سے پتا چلتا تھا کہ کلثوم کی کراہیں وغیرہ سن کر وہ نیند سے بیدار ہوئی ہے۔

وہ دو چار منٹ کلثوم کے سرہانے بیٹھی رہی۔ پھر اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ کلثوم بھی اسی طرح آنکھیں بند کئے اوندھی لیٹی رہی۔ لالٹین کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کا رخسار ہلکا نیلا نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مار پیٹ کے دوران میں اسے زوردار تھپڑ مارا گیا ہے۔ غالباً اسی تھپڑ کے سبب اس کے کان میں ہوا بھر گئی تھی اور درد شروع ہو گیا تھا۔

کلثوم کی حالت دیکھ کر وہ تمام اندیشے درست ثابت ہو گئے تھے جو ہمارے ذہن میں موجود تھے۔ اسے یہ لوگ جسمانی تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے...... پہلے وہ مہندر پٹیل اور کھیا وغیرہ کے پاس تھی۔ اب یہاں آ گئی تھی مگر یہاں بھی کون سے فرشتے تھے۔ ستیش، بھولا ناتھ اور ارون وغیرہ بے رحم انتہا پسند تھے۔ وہ کسی بھی وقت اس لڑکی کو بدترین حالات سے دوچار کر سکتے تھے۔ اکیلی مالا کہاں تک اس کے آگے ڈھال بن سکتی تھی۔ غالباً اس صورتِ حال کو کلثوم بھی سمجھ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اب تک مالا کو میری موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

میں الماری کے عقب میں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ میری گردن کے زخم سے درد کی ٹیسیں اُٹھتی رہیں۔ بارونداجیکی کہتا تھا...... درد اتنا نہیں ہوتا جتنا ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔ ہم درد کے ساتھ اپنی طرف سے بہت کچھ شامل کر لیتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ درد کے اصل حجم اور شدت کو سمجھنا چاہئے...... اور وہ ٹھیک کہتا تھا۔

چند منٹ بعد مالا نے نیند بھری آواز میں کلثوم سے پوچھا۔ ''کچھ فرق پڑا؟''

''ہوں، کچھ پڑا ہے۔'' کلثوم نے اسی طرح لیٹے لیٹے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر بعد مالا اپنے پلنگ پر سو چکی تھی۔ اس کی بھاری سانسیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

میں اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور بغیر آواز پیدا کئے کلثوم تک پہنچ گیا۔ تب تک کلثوم قمیص پہن کر گرم چادر اپنے گرد لپیٹ چکی تھی۔ تاہم وہ ابھی تک پلنگ پر ہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ ایک بار پھر تذبذب میں نظر آئی مگر جب میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ ڈری ہوئی نظروں سے مالا کی طرف دیکھتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ میرے ساتھ جانے کے لئے تیار تھی۔ اس کی آمادگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں مالا کی موجودگی کے باوجود وہ باقی لوگوں سے سخت خوفزدہ ہے۔

سب سے مشکل مرحلہ یہ لگ رہا تھا کہ بغیر آواز پیدا کئے چٹخنی گرائی جا سکے اور دروازہ کھولا جا سکے۔ میں نے پستول پھر ہاتھ میں لے لیا۔ بہت احتیاط کے ساتھ میں نے چٹخنی گرا دی۔ دروازہ کھولا تو ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ مالا ذرا کسمسائی مگر بیدار نہیں ہوئی۔ میں کلثوم کو لے کر کمرے سے باہر آیا اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

اگلا آدھ گھنٹہ کافی سنسنی خیز تھا۔ اس آدھ گھنٹے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں نے احاطے میں اُترنے کے بجائے چھتوں کے راستے واپس جانا مناسب سمجھا۔ دو چھتیں پار کرنے کے بعد وہی خطرناک منڈیر آ گئی جہاں سے میں پھسلتے پھسلتے بچا تھا مگر میں اس مرحلے کو طے کرنے کا لائحہ عمل پہلے سے سوچ چکا تھا۔ یہاں پچھواڑے کی طرف گلی میں پرالی کا ایک بڑا ڈھیر پڑا تھا۔ پہلے میں نے کلثوم کو چھلانگ لگانے پر آمادہ کیا۔ وہ قریباً چھ فٹ نیچے پرالی پر بے آواز گری۔ میں نے بھی کلثوم کے پیچھے چھلانگ لگائی۔ کہیں قریب موجود دو پہرے داروں کو کچھ شبہ ہوا، وہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے پرالی کے ڈھیر کے پاس پہنچے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر چکراتے رہے اور ایک ٹارچ کو حرکت دیتے رہے پھر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد ہم پرالی کے ڈھیرے سے نکلے اور دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے مندر کی طرف بڑھ گئے۔

○......❖......○

آدھ گھنٹے بعد میں کلثوم کے ساتھ مندر کے سب سے نچلے تہ خانے کی خوشگوار حرارت میں موجود تھا۔ عمران، اقبال، تاؤ افضل، سلطانہ سب ہمارے گرد جمع تھے۔ تمام چہرے حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں، مَیں نے جو کچھ کیا تھا...... وہ میری توقع

سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا تھا۔ بے شک وہ سب کچھ جذباتی اور کسی حد تک غیر دانش مندانہ بھی تھا لیکن وہ جو کچھ بھی تھا، کامیابی سے ہو گیا تھا اور کامیابی ایک ایسی دلیل ہے جو ہر بڑی سے بڑی دلیل پر حاوی آ جاتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فتح اور کامرانی کو منطق درکار نہیں ہوتی۔

تاؤ افضل نے کلثوم کو اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا اور مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ وہ سسک رہی تھی۔ تاؤ افضل کو بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہوتا رہا ہے۔ پہلے کھیا اور مہندر وغیرہ نے اس سے بری طرح مار پیٹ کی تھی۔ پھر اسے ستیش اور ارون وغیرہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں بھی اس سے سخت رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ طیش میں آ کر ستیش نے اسے زوردار تھپڑ بھی رسید کیا تھا جس سے اس کا کان اب تک سُن تھا اور اندر سے درد بھی کر رہا تھا۔

کلثوم نے تاؤ کو بتایا۔ ”یہ لوگن مجھ سے آپ کے بارے میں اور آپ کے مہمانوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ میں اس بارے میں جانت ہوں کیونکہ میں نے کھیا کے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔“

”تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟“ تاؤ نے شفقت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اس کی گردن جھک گئی۔ وہ دکھ آمیز شرم کے ساتھ بولی۔ ”کھیا بہت برا بندہ ہے۔ مجھ کو اس سے ڈر لگت تھا۔ وہ شراب پی کر مجھ کو لال لال آنکھوں سے دیکھت تھا۔ بے شری کی باتیں کرت تھا۔“

عمران اور اقبال یہ جاننے کے لئے بے تاب تھے کہ میں کس طرح مندر سے نکلا اور کیسے کلثوم کو استھان والوں کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ میں نے انہیں تفصیل بتائی۔ بہرحال، اس تفصیل میں، مَیں نے سلمان سلو کی موت کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بات میں عمران کو اکیلے میں بتانا چاہتا تھا۔ عمران مجھے مصنوعی ناراضی سے گھورتا رہا۔ اس کے گھورنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے میری اس دیدہ دلیری پر خوش بھی ہے...... اس نے کہا۔ ”کام تو تم نے دلیری کا کیا ہے اور بڑا فائیو سٹار کیا ہے...... لیکن تہ خانے سے نکلتے ہوئے تم شاید اپنی ”چیپ“ کے بارے میں بھول گئے تھے۔“

”نہیں...... یہ نحوست مجھے یاد تھی مگر میں زیادہ دیر باہر نہیں رہا ہوں۔“

”پھر بھی رسک تو رسک ہی ہوتا ہے۔“ عمران نے کہا۔

”تم نے کئی دفعہ تین گولیاں ریوالور میں رکھ کر اپنے اوپر ٹریگر دبایا ہے۔ اس سے تو کم

رسک ہی تھا۔“

”اچھا، اکیلے میں تم سے بات کروں گا۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔

میری کارروائی کے حوالے سے سلطانہ کی حیرت سب سے زیادہ تھی۔ وہ ماضی میں مجھے ایسی حالت میں دیکھتی رہی تھی جب میں اپنا بوجھ بھی سہار نہیں سکتا تھا...... لیکن اب میں بدترین حالات میں بڑی بے خوفی سے دوسروں کا سہارا بن رہا تھا۔

وہ میری قمیص پر گردن کے پاس خون کے داغ بھی دیکھ چکی تھی۔ ان نشانات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ میرا زخم پھر خون اُگلنے لگا ہے۔ وہ بے چین تھی کہ میں اپنی بات چیت ختم کروں تو وہ مجھے کمرے میں لے جائے اور میرا زخم دیکھے۔

عمران نے بھی میرے زخم سے خون کا رساؤ دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے کمرے میں جانے اور قمیص بدلنے کا کہا...... رات آخری پہر تک سلطانہ میری دیکھ بھال میں مصروف رہی۔ وہ اندر سے خوش بھی تھی۔ وہ مجھ سے اس سارے واقعے کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تفصیل پوچھ رہی تھی۔ آخر میں اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”تم نے بہت خطرناک کام کیا ہے مہروج! اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو پھر......؟“

”تو کیا تمہاری دعا میرے ساتھ نہیں تھی؟“

”وہ تو ساتھ ہی ہوتی ہے۔“

”کیا آئندہ بھی ساتھ رہے گی؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو مہروج؟“

”جب میں جارج گورا کو لاش کی شکل دینے کے لئے اس کی طرف جاؤں گا...... اس وقت بھی تمہاری دعا میرے ساتھ ہو گی نا؟“

وہ سسک کر میرے کندھے سے لگ گئی۔ میں نے اس کے بالوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ میرے ہاتھ اس کے کشادہ شانوں پر متحرک تھے۔ یہ شانے...... یہ شانے میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ میں انہیں جانتا تھا۔ بہت اچھی طرح، بہت قریب سے...... اور ان شانوں کو ہی نہیں، شاید اس پورے جسم کو جانتا تھا۔ ہاں، یہ ایک بے پناہ جسم تھا۔ یہ اپنی ساری رعنائی اور پُرجوش محبت کے ساتھ میرے بہت قریب رہا تھا۔ مجھے اس جسم کے تمام ترلمس یاد آ رہے تھے۔ یہ کسی گمشدہ خزانے کی طرح تھا۔ مجھے لگا کہ اس جسم کے لئے، ان شناسا شانوں کے لئے، اس نہایت چمکیلی اور پتلی کمر کے لئے اور ان گھنے بالوں کے لئے میرے اندر ایک بہت بڑا خلا موجود ہے...... مجھے یہ سب درکار تھا۔ پوری شدت اور چاہت سے درکار تھا۔ مجھے لگا

کہ میں سلطانہ سے محبت کرنے لگا ہوں...... کیا یہ محبت اب شروع ہوئی تھی یا پھر بہت پہلے سے شروع تھی جب وہ اس جسم کے ساتھ میری خلوتوں کی ساتھی بنی تھی؟

میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر اس کا شفاف رخسار چوما تو...... پھر وہی ہوا جو اس سے پہلے ہوتا رہا تھا۔ کوئی شے جیسے ایک چھناکے سے سلطانہ کے اندر بجھ گئی۔ اس کے جسم میں لرزش نمودار ہوئی اور وہ اپنا آپ سمیٹنے لگی۔ اس کے بازو میرے ہاتھوں کی گرفت سے نکل گئے۔ جیسے سوکھی ریت مٹھی سے نکل جاتی ہے۔ اس کا سر جھکتا چلا گیا۔

میں ایک دم اکیلا ہو گیا۔ میرے قریب ہونے کے باوجود قریب نہ رہی۔ پھر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ میرے قریب آتے آتے دور چلی جاتی تھی۔ پتا نہیں، یہ کیسی دیوار تھی جو ہم دونوں کے درمیان حائل ہو جاتی تھی۔

کچھ دیر کے لئے میری آنکھ لگ گئی۔ جاگا تو سلطانہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ اسے اپنے اردگرد نہ پا کر مجھے شاک سا محسوس ہوتا تھا۔ یہ خوف برق کی طرح ذہن میں لہراتا تھا کہ کہیں وہ پھر تو کسی طرف رخ نہیں کر گئی۔

"سلطانہ...... سلطانہ۔" میں اسے پکارتا ہوا اندرونی کمرے کی طرف گیا...... وہ نانک چندی اینٹوں کے بنے ہوئے قدیم غسل خانے سے نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں۔ لگتا تھا کہ آج وہ پھر اس کیفیت سے دوچار ہوئی ہے جس سے نل پانی میں ہوتی رہی تھی۔ وہ پہروں تک نہاتی تھی اور پتھر سے اپنے جسم کو رگڑ رگڑ کر سرخ کر لیتی تھی۔ میں نے دیکھا، آج بھی اس کی کلائیاں، ہاتھ اور گردن وغیرہ پتھر کی رگڑ سے سرخ دکھائی دے رہے تھے...... میرا دل رو دیا۔ اس کا ذہنی صدمہ اس کے اندر بہت گہرائی تک اُتر گیا تھا۔ وہ کسی طور اس سے چھٹکارا نہیں پا رہی تھی۔ کوشش کرتی تھی مگر ناکام ہو جاتی تھی۔ دو تین دن پہلے مجھے لگا تھا کہ وہ خود کو بدل رہی ہے مگر اب پھر صورتِ حال جوں کی توں تھی۔

میرے دل نے گواہی دی کہ سلطانہ کو اس کی نارمل زندگی کی طرف واپس لانا آسان نہیں ہے۔ میرے اندر سے طیش کی ایک لہر اُٹھی۔ یہ لہر ہر اس شخص کے لئے تھی، جو کسی مجبور عورت کو اپنے مردانہ اختیار تلے روندتا ہے۔ تھوڑی دیر کی عشرت کے لئے اس کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا داغ لگا دیتا ہے...... اور وہ عشرت بھی کیا عشرت ہوتی ہے۔ وہ کھوکھلی خوشی اکثر مہیب پچھتاووں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ میرے اندر جارج گورا کے لئے بھڑکنے والی آگ کچھ اور بھی شعلہ فشاں ہو گئی۔

اگلے روز میں نے عمران کو اس سنگین ترین واقعے کے بارے میں بتا دیا جو کھیا عبدالرشید کے مکان میں پیش آیا تھا۔ کھیا کا بیٹا سلمان سلو اتفاقیہ مجھ سے ملا تھا اور پھر جہنم واصل ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش احاطے کے خشک کنوئیں میں پھینک دی تھی۔

ہم سارا دن اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ اصل حالات کا علم تو آفتاب خاں کی آمد کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ امکان یہی تھا کہ اس موت نے فتح پور میں زبردست ہلچل مچائی ہو گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس واقعے کو کوئی خاص رخ دیا جا رہا ہو۔ آفتاب خاں کی آمد رات بارہ بجے سے کچھ پہلے ہی ہو گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ آج بھی اس کے پاس ہمارے لئے اہم خبریں موجود ہیں۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ فتح پور میں زبردست ہلچل تو ہے مگر یہ ہلچل سلمان سلو کی موت کی وجہ سے نہیں، لڑکی کلثوم کی وجہ سے ہے۔ آفتاب خاں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"خو، سلو کی موت کو سب نے اتفاقیہ ہی سمجھا ہے جی۔ سب کا خیال ہے کہ وہ تاڑی کے زوردار نشے میں تھا۔ باہر نکلا اور کنوئیں میں گر گیا۔ اس کا بوتل بھی کنوئیں سے ہی ملا ہے۔"

پھر آفتاب میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ کیا کہتا ہے تابش بھائی! یہ اتفاقیہ تھا یا پھر......؟"

"تمہارے سوال کا جواب وہی ہے جو تمہارے ذہن میں بھی ہے۔" عمران نے معنی خیز انداز میں کہا۔

آفتاب خاں نے تفہیم میں سر ہلایا اور کچھ مزید پُر جوش نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "عمران بھائی! آپ سب کے لئے ایک اچھا اطلاع ہے۔ کلثوم بی بی کے غائب ہو جانے کی وجہ سے استھان والا آپس میں جھگڑا مگڑا کر رہا ہے۔ مرنے مارنے پر آ گیا ہے۔ بڑا زوردار تماشا لگا ہوا ہے۔"

"کیسا تماشا؟" عمران نے پوچھا۔

"مہندرا اور کھیا وغیرہ نے رام پرشاد پر الزام لگایا ہے کہ اس کی بہو مالا نے لڑکی کو جان بوجھ کر بھگا دیا ہے۔ اس طرح اس نے دھرم کو بری طرح نشٹ کیا ہے۔ وہ اس کو سزا دینے کا بات کر رہا ہے۔"

یہ دلچسپ صورتِ حال تھی۔ عمران نے کہا۔ "ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

آفتاب بولا۔ "ام نے اندازہ لگایا ہے جی کہ یہ سب جنونی لوگ ہے۔ ذرا ذرا سی بات

پران کی آنکھوں سے شعلہ نکلنے لگتا ہے۔ پرسوں رام پرشاد کا بہو مالا اور بیٹا ستیش اس لڑکی کلثوم کو مکھیا کے پاس سے لے آیا تھا۔ دراصل یہ سب مالا کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کو پتا چل گیا تھا کہ یہ لڑکی مکھیا اور مہندر وغیرہ کے پاس رہا تو اس کا عزت خراب ہو جائے گا۔ مکھیا اور مہندر نے سب کے کہنے پر کلثوم کو بھیج تو دیا تھا، پر ان کو یہ سب بہت برا لگا تھا۔ گرو کی موت کی وجہ سے بھی ان لوگوں میں تھوڑا بہت چپقلش موجود تھا۔ کل سویرے جب یہ پتا چلا کہ کلثوم زمیندار پردیپ کمار کے گھر سے غائب ہے تو مہندر اور ان کا ساتھی لوگ ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ انہوں نے رائفلیں اور تلواریں تان لیا اور کوئی ایک سو بندہ پردیپ کمار کے گھر کے سامنے جمع ہو گیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ رام پرشاد کی بہو مالا مجرم ہے۔ اس نے لڑکی کو بھگا دیا ہے، حالانکہ وہ لڑکی اپنے تاؤ اور سلطانہ وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا تھا۔"

"رام پرشاد کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنی بہو کو بالکل بے گناہ بتا رہا ہے۔ ستیش بھی یہی کہتا ہے۔ وہ بولتا ہے کہ اس کی بیوی کو کچھ پتا نہیں۔ وہ کلثوم کے ساتھ اوپر والے کمرے میں سو رہی تھی۔ گھر کے اندر اور باہر پہرے دار تھے۔ گھر کی نگرانی ان پہرے داروں کا ذمے داری تھا، میری بیوی کا نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کسی نے سلو کے مرنے اور کلثوم کے غائب ہونے والے معاملے کو آپس میں جوڑا تو نہیں؟"

"ابھی تک تو ایسا کچھ نہیں ہوا جی۔ کسی کا دھیان بھی اس طرف نہیں گیا اور امارا خیال ہے کہ جائے گا بھی نہیں۔"

"اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟" اقبال بولا۔

"کون سا اونٹ جی؟" آفتاب خاں نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اب صورتِ حال کس طرف جاتی نظر آتی ہے؟

"ام ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا جی...... معاملہ گڑبڑ ہے۔ دونوں طرف سے بہت سخت باتیں ہو رہا ہے...... ام نے سنا ہے کہ کل کچھ اور لوگ بھی یہاں پہنچ رہا ہے۔ مکھیا کی حویلی پر کوئی بہت بڑا پنچایت ہوگا۔ اگر اس پنچایت میں فیصلہ نہ ہو سکا تو پھر جھگڑا اور بڑھ سکتا ہے۔ اب بھی دو چار لوگ ایسا ہے جو غصے میں جھگڑا بڑھانے والا باتیں کر رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ام نے ابھی شام کو سنا ہے۔ مہندر کا ایک ساتھی چوپال میں کہہ رہا تھا کہ اگر رام پرشاد کو یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ مہندر صاحب کے پاس اس لڑکی کا عزت محفوظ نہیں تھا تو ام بھی رام

پرشاد اور اس کے بیٹے پر اس طرح کا شک کر سکتا ہے۔ کیا پتا وہاں زمیندار کے گھر میں اس لڑکی کا عزت لوٹا گیا ہو اور اسے مار کر کہیں گاڑ دیا گیا ہو۔ بس جی اس طرح کا بہت سا باتیں گاؤں میں چکرا رہا ہے۔"

یہ بالکل نئی صورتِ حال سامنے آئی تھی۔ دنیا بھر کے انتہا پسندوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ روز بروز محدود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے بے لچک رویوں کی وجہ سے وہ گروہ در گروہ تقسیم ہوتے ہیں۔ ان میں فرسٹریشن بڑھتی ہے اور وہ زیادہ سفاک اور بداخلاق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لگتا تھا کہ یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔

اگلے چوبیس گھنٹے عجیب کشمکش و بے چینی میں گزرے۔ ہمیں دیکھنا تھا کہ باہر کے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ گرو کے بے رحمانہ قتل کے بعد تو ان لوگوں کی سفاکی میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ آفتاب خاں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اردگرد سے اور بہت سے لوگ بھی یہاں فتح پور میں جمع ہو رہے ہیں...... وہ ہر صورت اپرادھن یعنی سلطانہ کو اس کے انجام تک پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس علاقے میں جاہلیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا...... اور اب یہ جادو دھیرے دھیرے اس مچھیرا بستی کو اپنے پنجوں میں جکڑ رہا تھا۔

میں سلطانہ کی طرف سے بھی بہت پریشان تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک حصہ میری طرف آنا چاہتا ہے اور اپنے شیرخوار بچے کی طرف۔ دوسرا حصہ اسے ہم دونوں سے دور لے جا رہا ہے۔ اس حصے کو زرگاں کشش کر رہا ہے۔ زرگاں جہاں اس کی عزت کا قاتل جارج گورا اپنی پوری نحوست اور نجاست کے ساتھ موجود ہے۔ ہر طرح کی من مانیاں کرتا ہوا اور اپنی من پسند لڑکیوں میں گھرا ہوا۔ جنہیں وہ اور حکم پتا نہیں کس ناتے سے پریاں قرار دیتے تھے۔

اب پچھلے تقریباً چھتیس گھنٹے سے سلطانہ بالکل گم صم تھی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ وہ ٹھیک سے کچھ کھا بھی نہیں رہی تھی۔ رات کو میری ناراضی کے ڈر سے اس نے چند لقمے لئے اور کلثوم کے ساتھ تھوڑی بہت باتیں کیں۔ رات کو ہم اپنے اپنے بستر پر خاموش لیٹے رہے۔ ہم دونوں جاگ رہے تھے مگر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اندھیری رات ہے یا چاندنی۔ بارش ہو رہی ہے یا کڑاکے کی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ باہر کی دنیا سے ہمارے رابطے کا واحد ذریعہ آفتاب تھا اور اسے آج پتا نہیں آنا تھا یا نہیں۔

میں آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ "مہروج!" اچانک سلطانہ کی مدھم آواز میرے کانوں

میں پڑی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسی طرح اپنے بستر پر چت لیٹی تھی۔ ''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مہروج!'' وہ پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔

''ہاں ہاں...... کہو۔''

''مہروج! میں تمہیں بہت دکھ دے رہی ہوں نا؟ تمہیں رات دن پریشان کر رہی ہوں۔''

''میں صرف اس وجہ سے دکھی ہوں کہ تم دکھی ہو۔ تم خود کو سنبھال نہیں پا رہی ہو۔''

''مہروج! کیا تم مجھے ماف ناہیں کر سکتے؟''

''کیا مطلب؟''

''مہروج! تم مجھ کو بھول جاؤ۔ سمجھو...... کہ...... میں نل پانی سے جانے کے بعد دوبارہ تمہیں ملی ہی ناہیں تھی۔''

''اگر تم نے اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو بہتر ہے کہ سو جاؤ۔''

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''مہروج! میں جانتی ہوں کہ تم کسی سے پیار کرتے تھے، بہت جیادہ پیار کرتے تھے۔ وہ تم سے دور چلی گئی اور میں تم دونوں کے بیچ میں آ گئی۔ شاید یہ اسی کی سجا ہے جو مجھے ملی ہے۔''

''یہ تم کیا باتیں لے بیٹھی ہو؟'' میں جھلا گیا۔

''مہروج! جن دنوں تم اپنے ہوش میں ناہیں تھے، تم راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اس کا نام پکارتے تھے۔ تم آج بھی اس کو پریم کرتے ہو مہروج! اور شاید وہ بھی کہیں پر بیٹھی تمہاری راہ دیکھتی ہوئیں گی۔ کیا ایسا ناہیں ہو سکتا مہروج کہ وہ پھر تم کو مل جائے۔ تم اس راجواڑے سے نکلنے کے بعد اسے ڈھونڈو۔ مہروج! مجھے یخین (یقین) ہے کہ وہ جرور تمہیں ملے گی، جرور ملے گی۔ وہ تمہاری جندگی کی ہر کمی کو پورا کر دے گی۔ تم میرے بالو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا مہروج! بالو کو اس کی گود میں ڈال دینا۔ مجھے یخین ہے کہ تمہاری طرح وہ بھی بہت اچھی ہوئیں گی۔ وہ میرے بچے کو اپنے بچوں کی طرح پیار دے گی۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو مہروج؟''

میرا دماغ ہنڈی کی طرح اُبل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ سلطانہ کو اس کے شانوں سے پکڑوں اور بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دوں۔ پھر دھکا دے کر دور گرا دوں یا پھر یہاں سے اُٹھوں اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جاؤں...... کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔

وہ اپنے جذباتی دھارے میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک اُٹھ کر اس نے اپنا سر میرے پاؤں میں رکھ دیا اور سسک کر بولی۔ ''مہروج! مجھے تم سے کوئی گلہ ناہیں ہوئیں گا۔ تم تو مجھ پر بہت بڑا احسان کرو گے۔ میری جندگی کا کوئی پتا ناہیں لیکن جب تک جندہ رہوں گی تم کو یاد رکھوں گی۔ تمہارے لئے دعائیں کرتی رہوں گی۔ یہ سوچ کر مجھے خوشی ملے گی کہ تم جہاں کہیں ہو، آباد ہو اور اس کے ساتھ ساتھ میرا بچہ بھی آباد ہے۔ میری خاطر مہروج! میری خاطر...... میری یہ بات مان لو۔ سمجھو کہ میں تم سے جندگی میں پہلی اور آخری بار کچھ مانگ رہی ہوں۔''

میں بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے پاؤں ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے چھڑائے اور چارپائی سے اُتر کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی سسکتی رہی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکایا ہوا تھا۔ اس کے بالوں کی موٹی چوٹی نے بستر پر کنڈلی مار رکھی تھی۔

میں نے اس کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ! بدقسمتی سے جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، وہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس پر تمہارا کوئی بس نہیں تھا مگر اب تم جو کچھ کر رہی ہو، یہ اُس سے کہیں زیادہ برا ہے۔ جو دکھ تم اب دے رہی ہو، یہ بالکل ہی برداشت سے باہر ہے۔ تم مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دو گی۔ ساری اُمنگیں ترنگیں جو مجھ میں پیدا ہوئی تھیں، میرے اندر ہی مر جائیں گی۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ شاید ماں سے پہلے باپ کا سایہ بالو کے سر پر سے اُٹھے گا۔''

''خدا کے لئے مہروج! ایسی بات مت کرو۔'' اس نے بے تاب ہو کر میرا بازو تھام لیا۔

میں نے بازو چھڑایا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ نل پانی کی نیلی جھیل ہو۔ یخ بستہ ہوائیں بدن کو چیر رہی ہوں۔ میں جھیل کے کنارے بھاگتا چلا جاؤں، ہانپتا چلا جاؤں یہاں تک کہ بے دم ہو کر گر پڑوں لیکن جھیل تھی نہ کنارہ، نہ یخ بستہ ہوائیں۔ میں اپنے ساتھیوں سمیت اس تین منزلہ تہ خانے کا اسیر تھا۔ میں اس قبر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

میں بالائی تہ خانے میں آ گیا اور بے قراری سے ایک برآمدہ نما مستطیل کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک سیڑھیوں کے بالائی دروازے پر مدھم آہٹیں اُبھریں۔ یقیناً آفتاب خاں آیا تھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ اپنی لاٹھی اور لالٹین سمیت میرے سامنے تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ بولا۔ ''بہت خاص خبریں ہیں تابش بھائی۔ عمران بھائی کدھر ہے؟''

میں آفتاب کو لے کر سیڑھیاں اُترا اور زیریں تہ خانے میں آ گیا۔ عمران اور اقبال میری

ایک آواز پر ہی کمرے سے نکل آئے۔ یقیناً وہ بھی آفتاب کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ آفتاب نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''امارا تو مت مارا گیا ہے جی۔ ام نے سنا تھا کہ کچھ لوگ اپنے دین دھرم کے لئے بالکل جنونی ہو جاتا ہے۔ یہ ادھر استھان والا لوگ بھی ایک دیوانہ پن دکھا رہا ہے۔ آج سارا دن گاؤں میں خوب تماشا لگا ہے۔''

پھر آفتاب نے اپنی گول ٹوپی اُتار کر ایک طرف رکھی اور تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

''جھگڑا بہت لمبا ہو گیا ہے جی۔ آج سارا دن چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لوگ فتح پور میں آتا رہا ہے۔ اب یہاں ہزار ڈیڑھ ہزار کے قریب لوگ جمع ہو چکا ہے۔ آج دوپہر مکھیا کے مکان پر بہت بڑا پنچایت ہوا ہے۔ اس پنچایت میں مہندر اور اس کے ساتھیوں نے یہ الزام دہرایا ہے کہ رام پرشاد کی بہو نے لڑکی کلثوم کو بھگایا ہے اور ایک ایسا اپرادھ کیا ہے جس کا سخت سے سخت سزا ملنا چاہئے۔ دوسری طرف رام پرشاد اور اس کے بیٹے ستیش نے اس الزام کو ماننے سے صاف انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لڑکی موقع دیکھ کر خود فرار ہوا ہے...... ان کا صفائی ماننے کو کوئی بھی تیار نہیں ہے۔ خود مہندر اور اس کے سیکڑوں ساتھیوں نے مطالبہ کیا ہے کہ اگر ستیش کی پتنی مالا سچا ہے تو پھر وہ پرکھشا دے۔''

''پرکھشا سے کیا مطلب؟'' اقبال نے پوچھا۔

''وہ اس کا آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی بہت پرانی رسم کا بات کر رہا ہے۔ اس میں ستیش کی پتنی کو بہت نقصان پہنچنے کا ڈر ہے۔''

''کیسا نقصان؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ لوگ کہتا ہے کہ اگر ستیش کا بیوی یعنی رام پرشاد کا بہو سچا ہے تو وہ مندر میں جا کر اپنا سچ ثابت کرے۔ وہ ابلتے ہوئے تیل کی کڑاہی کا بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ستیش کی پتنی سچا ہے تو تیل میں اپنا ہاتھ ڈال کر ثابت کرے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے کہا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ ''یہ میں آپ کو بتاتا ہوں جی۔ دراصل ہندوؤں کی دیومالا میں یہ واقعہ موجود ہے۔ جب رانی سیتا جی پر بہتان لگا تھا تو اس نے تیل کی ابلتی ہوئی کڑاہی میں اپنے دونوں ہاتھ ڈال کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دیا تھا۔ بھگوان کی کرپا سے اس کے ہاتھ جلنے سے بچ گئے تھے۔ کچھ خبطی لوگ اس واقعے کو اب تک لے کر چل رہے ہیں۔ جب کسی بڑے جرم میں کسی کو اپنی صفائی پیش کرنی ہوتی ہے تو اس کو اس آزمائش سے گزرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔''

''یہ تو بڑی جاہلیت کی بات ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''مکر و فریب کے اس دور میں ایسی آزمائش کا مطلب بھی مکر و فریب ہی ہے۔''

''لیکن جناب! سیانا لوگ سچ کہتا ہے کہ بندہ جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔'' آفتاب خاں نے مونچھیں سہلا کر کہا۔ ''اب بات یہ ہے کہ ستیش کا دادی وہ کھوسٹ بڑھیا بھی ایک دو موقع پر ایسے ہی دوسرے لوگوں کو یہ آزمائش دینے پر مجبور کر چکا ہے۔ اب اس کا مخالف لوگ یہی بات پکڑ رہا ہے...... وہ کہتا ہے کہ اگر تب ایسا آزمائش کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا تو اب کیوں نہیں۔ اس بڑھیا کی وجہ سے اب اس کا بیٹا رام پرشاد اور اس کا پھیملی (فیملی) پھنس گیا ہے۔ یا تو اب رام پرشاد کی بہو کو یہ آزمائش دینا پڑے گا یا اس کو مجرم ٹھہرا دیا جائے گا۔''

یہ واقعی دلچسپ اور سنگین صورتِ حال تھی۔ ان لوگوں کا بے پناہ کٹر پن اور ان کے اندر کی سفاکی تو اب ثابت ہو ہی چکی تھی۔ یہ لوگ جس طرح سلطانہ کو زندہ جلانے پر تل گئے تھے اور پھر جس طرح انہوں نے اپنے ہی ''محترم گرو'' کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا اور اس کا کٹا ہوا سر دیوی کے چرنوں میں رکھا تھا، اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ اپنے عقیدے کی پیروی میں ہر حد تک جا سکتے ہیں۔

عمران نے پوچھا۔ ''اب پنچایت کس نتیجے پر ختم ہوئی ہے؟''

آفتاب بولا۔ ''خو، پورا نتیجہ تو اب تک کوئی نہیں نکلا ہے جی۔ جب شور بہت بڑھ گیا اور پنچوں نے فیصلہ دیا کہ ستیش کی پتنی کو آزمائش دینا پڑے گی تو ستیش ایک دم طیش میں آ گیا۔ اس نے کہا کہ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ اگر تم نے ہاتھ جلانے ہی ہیں تو پھر میں اپنے ہاتھ جلاؤں گا۔ بڑے پنچ نے کہا کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر تم کو وشواس ہے کہ تمہارا پتنی سچا ہے تو پھر تم اس کے نام پر آزمائش دے سکتا ہے۔ اگر تمہارا پتنی سچا ہے تو بھگوان تمہارا رکھشا کرے گا۔''

''ستیش کی پتنی کیا کہتی ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''وہ تو مسلسل رو رہا ہے جی۔ ایک ہی بات کہہ رہا ہے کہ اگر وہ دوشی ہوتا تو فوراً اپنا دوش مان لیتا، اس نے یہ سب نہیں کیا ہے۔ کلثوم خود وہاں سے نکلا ہے۔ کس طرح نکلا ہے، اسے کچھ پتا نہیں۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ مہندر اور گرو کے چیلوں نے گرو کا قتل ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا ہے۔ اب انہیں رام پرشاد کی بہو کے خلاف اپنا اندرونی غصہ نکالنے کا موقع مل رہا ہے اور وہ اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

آفتاب خاں باہر کی خبریں دے کر چلا گیا۔ ہم پھر انتظار کی سُولی پر لٹک گئے۔ تہ خانوں کے اندر فضا بہت بوجھل اور یاسیت سے بھری ہوئی تھی۔ میرے اور سلطانہ کے درمیان بول چال تقریباً ختم تھی۔ ایک ہی کمرے میں ہوتے ہوئے ہم جیسے ایک دوسرے سے طویل فاصلے پر تھے۔ یہ فاصلہ اس رات کی سیاہی سے بھرا ہوا تھا۔ جب بے بسی کی انتہا کو چھو کر سلطانہ نے مجھے جارج گورا کے کمرے سے نکالا تھا اور خود کو اس فاتح کے حوالے کرنے کے لئے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی تھی۔

گرو کی پتنی رادھا ہر وقت پرارتھنا کرتی رہتی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے پتی کے سفاکانہ قتل سے بے خبر تھی۔ وہ اس کی طرف سے پریشان رہتی تھی اور اس سے بڑھ کر پریشانی اسے اس بات کی تھی کہ کہیں اس کے گرو پتی کو پہنچنے والے کسی نقصان کی وجہ سے بھگوان اس سے ناراض نہ ہو جائیں۔ آفتاب جب بھی آتا تھا، وہ اس سے گرو کے بارے میں پوچھتی تھی۔ آفتاب خاں اسے گول مول جواب دے کر مطمئن کر دیتا تھا۔

اگلے روز کی ساری خبریں چونکا دینے والی تھیں۔ سب سے پہلے تو یہی بات چونکانے والی تھی کہ آفتاب خاں آدھی رات کو آنے کے بجائے شام کو ہی آ گیا تھا۔ دن کے وقت اسے مندر میں آنے کے لئے خصوصی احتیاط کرنا پڑتی تھی۔

اس نے اطلاع دی کہ باہر ڈرامائی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ رام پرشاد نے کہا ہے کہ اسے اپنے بیٹے ستیش اور بہو مالا پر پورا اعتماد ہے۔ وہ جو کہہ رہے ہیں، سچ کہہ رہے ہیں اور سانچ کو آنچ نہیں۔ لہٰذا اپنے بیٹے ستیش کی جگہ وہ خود پرکھشا دے گا۔ پنچوں نے پنڈت بھگوان داس سے مشورہ کرنے کے بعد اس کی یہ پیشکش قبول کر لی ہے۔ اب فیصلہ ہوا ہے کہ کل شام کے بعد پہلے پہر کی دوسری گھڑی میں اسی مندر کے اندر خاص خاص پجاریوں اور پنڈتوں کے رُوبرو رام پرشاد از خود اپنی بہو اور بیٹے کی سچائی کے لئے آزمائش دے گا۔

''یہ سب تو پرانے زمانے کی کہانیوں جیسا لگ رہا ہے۔'' اقبال نے کہا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ ''لیکن یہاں انڈیا میں کچھ لوگ اب بھی پرانے زمانے کی طرح ہی رہ رہے ہیں۔ کئی علاقے تو ایسے ہیں جہاں اب تک بڑی باقاعدگی سے دیوی دیوتاؤں کو زندہ بچے بچیوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ اس بلیدان کو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق کئی نام دیئے جاتے ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں سنا تھا کہ راجستھان میں ایک ایسی ہی خونی رسم کو پوارشا کہا جاتا ہے۔''

آفتاب بولا۔ ''رام پرشاد بہت کٹر قسم کا بندہ ہے۔ وہ جو کہہ رہا ہے، اس پر ضرور عمل

کرے گا۔ اس کو پورا یقین ہے کہ اس کا بہو اور بیٹا سچا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو پھر بھگوان ضرور بہ ضرور اس کا مدد کرے گا۔ اس نے آج شام سے آٹھ پہر کا بھرت رکھ لیا ہے اور پوجا پاٹ میں مصروف ہو گیا ہے۔ اس نے کسی خاص پنڈت سے اپنے ماتھے پر قشقہ لگوایا ہے اور کسی تیرتھ سے آنے والا سفید لباس پہنا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کڑاہے میں ڈالنے کے لئے ایک دم تیار ہے۔''

''وہ بڑھیا کیا کہتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ پہلے تو چپ رہا ہے لیکن اب اس نے رام پرشاد کو ہلاشیری دینا شروع کر دیا ہے۔ رام پرشاد کی طرح بڑھیا نے بھی بھرت رکھا ہے۔ اس نے رام پرشاد کو نیلے پتھروں والا ایک مالا پہنایا ہے اور اسے وشواس دلایا ہے کہ وہ اپنی آزمائش میں ضرور کامیاب ہوگا۔''

نیلے پتھروں والی مالا سے یاد آیا کہ مجھے بھی رام پرشاد کے گھر میں اس کی بوڑھی ماتا نے ایسی ہی مالا پہنائی تھی۔ یہ بوڑھی عورت کہنہ رسموں رواجوں کی ایسی گٹھڑیوں میں سے تھی جن کی گرہیں کھولنا بڑے بڑے دانشوروں اور نفسیات دانوں کے لئے بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ گٹھڑیاں اپنی بوسیدگی سمیت جل جاتی ہیں، مٹی میں دفن ہو جاتی ہیں لیکن کھلتی نہیں ہیں۔ اب رام پرشاد اور اس بڑھیا کا اندھا عقیدہ انہیں ایک خاص صورتِ حال کی طرف لے جا رہا تھا۔

آفتاب خاں بولا۔ ''ام بھی وہیں پنچایت والی جگہ پر موجود تھا جی۔ رام پرشاد بڑے غصے میں بول رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، ایشور کے بنائے ہوئے اصول کسی ایک زمانے کے لئے نہیں ہوتے۔ ہر زمانے کے لئے ہوتے ہیں۔ اگر سچ کی پرکھشا دینے والے لوگ پرانے زمانے میں جلتے تیل سے بچ سکتے ہیں تو آج بھی بچ سکتے ہیں۔ بات صرف پکے وشواس کی ہے اور من کی شکتی کی ہے...... اور وہ یہ سب کچھ کر کے دکھا دے گا۔ اس موقع پر رام پرشاد کا بیٹا ستیش پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ یہ سراسر ظلم ہے۔ یہ مہندر اور اس کا ساتھی لوگ ام سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ رام پرشاد بیٹے پر بھی بگڑ گیا۔ اس نے اسے بری طرح جھڑکا اور کہا کہ بس یہی فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ تم آزمائش دینے سے پہلے ہی ہارے ہوئے ہو۔ اس لئے کہ تم ایشور کے چمتکاروں (معجزوں) پر پورا وشواس نہیں رکھتے اور یہ سارا کھیل ہی وشواس کا ہے۔ بڑھیا نے بھی بیٹے رام پرشاد کا حمایت ہی کیا اور پوتے کو یقین دلایا اور کہا کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ رام پرشاد کے ہاتھ جلنے سے بچ جائیں گے۔''

''کچھ نہ کچھ سے بڑھیا کا کیا مطلب ہے؟'' عمران نے سوال کیا۔

''جہاں تک اماری عقل میں آیا ہے جی...... بڑھیا کا خیال ہے کہ اگر رام پرشاد اور وہ

خود اپنے ارادے پر قائم رہے تو آزمائش سے پہلے ہی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آزمائش ٹل جائے اور اگر نہ بھی ٹلا اور رام پرشاد کو اپنے ہاتھ تیل میں ڈالنا ہی پڑا تو دیوی مدد کرے گا۔ رام پرشاد کا ہاتھ کسی خاص نقصان سے بچا رہے گا۔ پنچایت کے بعد بڑھیا نے ایک دو ایسا مثالیں بھی دیا جن میں کسی سچے شخص نے پورے وشواس کے ساتھ اپنا دونوں ہاتھ ابلتے تیل میں ڈالا اور ہاتھوں پر بس معمولی سا نشان ہی پڑ سکا اور یہ چھوٹا موٹا نشان بھی چند دن تک گنگا جل لگانے سے ٹھیک ہو گیا۔''

یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ یہ بات تو ہرگز یقین کرنے والی نہیں تھی کہ رام پرشاد ابلتے ہوئے تیل میں ہاتھ ڈالے گا اور ہاتھ جل بھن کر کباب ہونے سے بچ جائیں گے۔ ہاں، اس میں کوئی شعبدہ بازی ضرور ہو سکتی تھی۔ کوئی کیمیکل یا کوئی ایسی شے ہاتھوں اور بازوؤں پر لگائی جا سکتی تھی جو چند سیکنڈ کے لئے ہاتھوں کو تیل کی بے پناہ حدت سے بچا لیتی، مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا مخالف ٹولہ اس قسم کی شعبدہ بازی چلنے دے گا؟ وہ کوئی سیدھے سادے دیہاتی نہیں تھے، رام پرشاد اور ستیش کے ساتھی ہی تھے اور استھان کے سارے اچھے برے بھیدوں سے آگاہ تھے۔

آفتاب خاں نے کہا کہ اگر کل شام کے بعد واقعی مندر میں یہ تماشا لگا تو پھر وہ ہمیں یہ تماشا دکھانے کے لئے پہلے کی طرح اوپر لے جائے گا اور ہوادان کے سوراخوں میں سے ہال کمرے کا منظر دکھائے گا۔

اگلے چوبیس گھنٹے بڑے تجسس میں گزرے۔ اقبال کا خیال یہی تھا کہ اس آزمائش سے پہلے ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا اور رام پرشاد کو کھولتے تیل میں ہاتھ نہیں ڈالنا پڑیں گے۔ تاہم ہوشیار سنگھ کی رائے مختلف تھی۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ''بارہ صرف سکھوں کے ہی نہیں بجتے۔ کسی نہ کسی موقع پر کسی نہ کسی ڈھنگ سے ساری قوموں کے بارہ بجتے ہیں۔ آپ لوگ دیکھنا، یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا نتیجہ واہگرو کی کرپا سے برا ہی نکلنا ہے۔ یہ لوگ ہندو دھرم سے زیادہ ہٹ دھرم کو ماننے والے ہیں۔ یہ اپنی اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''

ہوشیار سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگلے روز شام سے کچھ پہلے ہی آفتاب خاں نمودار ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''ام آپ کو لینے آیا ہے جی۔ ادھر اوپر بس تماشا شروع ہونے ہی والا ہے۔ آپ ذرا غور سے سنیں۔ ڈھول کا آواز یہاں تک بھی سنائی دے رہا ہے۔''

ہم نے کان لگا کر سنا۔ واقعی کسی بہت بڑے ڈھول کی مدھم گونج ان تہ خانوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ پہلے کی طرح ہم آفتاب خاں کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جانے

والوں میں، مَیں، عمران، اقبال اور ہوشیار سنگھ شامل تھے۔ طلال کو سلطانہ کے پاس ہی رہنے دیا گیا۔ کل رات سے اسے بخار تھا اور وہ گاہے بگاہے شدید سردی بھی محسوس کر رہی تھی۔ غالباً یہ اس کی بے وقوفی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ وہ اس دن دیر تک ٹھنڈے پانی سے نہاتی رہی تھی۔

حسبِ سابق ہم ان تنگ و تاریک زینوں میں پہنچے جہاں سے بمشکل ایک آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ گرد و غبار اور جالوں سے بچنے کے لئے ہم نے اپنے چہرے ایک بار پھر کپڑوں میں لپیٹ لئے تھے۔ عمران کے پاس رائفل تھی۔ میں اور اقبال بھی مسلح تھے۔ زینوں میں داخل ہوتے ہی ہمیں ڈھول کی دھما دھم صاف سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ سنکھ بھی بجائے جا رہے تھے۔ جوں جوں ہم اوپر گئے، یہ آوازیں مزید بلند ہوتی گئیں۔ زینوں کا ایک چوبی دروازہ کھولنے سے پہلے آفتاب نے لالٹین بجھا دی اور اشاروں سے ہمیں سمجھا دیا کہ اب ہمیں بالکل خاموش رہنا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی پوجا کے ہال کمرے کا بے پناہ شور ہمارے کانوں سے ٹکرایا۔ یہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جلد ہی ہم اس قابل ہو گئے کہ اپنی آنکھیں ہوادان کی پتھریلی جالی سے لگا سکیں۔ ہال نما کمرے کا منظر دیدنی تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ سو افراد یہاں موجود تھے...... اور اس سے کئی گنا افراد شاید باہر موجود تھے۔ ان سب کا شور بھی ہماری سماعتوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ہال کمرے میں موجود افراد ایک نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ ان کے عقب میں دیواروں کے ساتھ ساتھ بھی درجنوں افراد کھڑے تھے۔ بہت سے افراد کے ہاتھ میں لاٹھیاں اور بھالے تھے۔ کسی کسی کی کمر سے تلوار بھی بندھی ہوئی تھی۔ زیادہ تر کے سروں پر رنگ دار پگڑ نظر آ رہے تھے۔ پجاری حضرات اور چیلے وغیرہ اپنے مخصوص لباسوں میں تھے۔ اس اجتماع میں عورتیں بھی موجود تھیں تاہم ان کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں مجھے رام پرشاد کی فربہ اندام بیوی بی نظر آئی۔ تاہم رام پرشاد کی بہو مالا اور بیٹا ستیش کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہال کمرے میں موجود ہر فرد کے چہرے پر بے پناہ تناؤ نظر آ رہا تھا۔ بہت بڑے ڈھول کی دھنا دھن سے دیواریں لرز رہی تھیں۔

ہال کمرے میں دیوی کی مورتی کے سامنے قریباً بیس مربع فٹ جگہ خالی تھی۔ یہاں لوہے کے ایک بڑے چولہے پر تیل کی کڑاہی دھری تھی۔ چولہے میں سرخ انگارے دہک رہے تھے اور آگ کی لپک پیدا ہو رہی تھی جو اس امر کی شاہد تھی کہ تیل میں کوئی بھی چیز ڈالی گئی تو وہ سیکنڈوں میں روسٹ ہو جائے گی۔

''وہ فساد کی جڑ بڑھیا کہاں ہے؟'' عمران نے سرگوشی میں آفتاب سے پوچھا۔

''امارا خیال ہے کہ وہ رام پرشاد کے ساتھ ہی اندر آئے گا۔'' آفتاب نے جواب دیا۔

''اور وہ کب آئے گا؟''

''بس آنے ہی والا ہے۔ وہ دیکھیں، جی، مہندر اور اس کا ساتھی لوگ اندر آ رہا ہے۔'' آفتاب نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے بھی لمبوتری شکل والے دراز قد مہندر کو پہچان لیا۔ وہ اپنے قریباً ایک درجن ساتھیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا اور پہلے سے مقررہ جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ چٹان کی طرح سخت دکھائی دے رہا تھا۔ ایک پستول ہولسٹر میں بند اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ اس کے ساتھ گہرے سیاہ رنگ والا ایک فربہ اندام شخص تھا۔ اس نے رنگ دار پگڑ باندھ رکھا تھا، یہ شخص بھی پستول سے مسلح تھا۔

''یہ کالے منہ والا کون ہے؟'' میں نے آفتاب سے پوچھا۔

''یہی کھیار رشید ہے۔'' آفتاب کے بجائے عمران نے جواب دیا۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ مجھے اس شخص کی صورت میں سلمان سلو کی تھوڑی بہت جھلک نظر آئی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے...... ہال کمرے میں بے چینی کی لہر بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اکثر لوگ مڑ مڑ کر داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''کہیں رام پرشاد اُڑن چھو تو نہیں ہو گیا؟'' اقبال نے سرگوشی کی۔

عمران بولا۔ ''میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ وہ واقعی اُڑن چھو ہو جائے اور اس کی جگہ یار لوگ اس بڑیا کو پرکھشا دینے پر مجبور کر دیں۔ سارے فسادوں کی بنیاد تو وہی ہے۔''

''ایسے لوگ اپنا امتحان کبھی نہیں دیتے، بس دوسروں کو آگے کرتے ہیں۔ یہ جتنے بوڑھے ہوتے ہیں، ان کو زندگی اتنی ہی پیاری ہوتی جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''بلکہ ان میں سے زیادہ تر تو بوڑھے ہی نہیں ہوتے۔'' عمران نے کہا۔ ''دل ہی دل میں یہی الاپتے رہتے ہیں، ابھی تو میں جوان ہوں......''

یکا یک ڈھول کی دھنا دھن مزید بلند ہو گئی۔ لگا تار کئی سنکھ بجنے لگے۔ پھر ڈھول کی سماعت شکن آواز میں گھنٹیوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ داخلی دروازے سے پانچ چھ افراد والہانہ رقص کرتے اور جھومتے ہوئے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے عقب میں پچاس پچپن سالہ رام پرشاد تھا۔ اس نے ایک لمبا سفید چولا پہن رکھا تھا۔ ماتھے پر قشقہ اور گلے میں نیلے پتھروں والی لمبی مالا تھی۔ رام پرشاد کے دونوں ہاتھوں میں پیتل کی گھنٹیاں تھیں جنہیں وہ زور زور سے بجا رہا تھا اور آنکھیں بند کر کے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ رام

پرشاد کے عقب میں اس کی بوڑھی ماتا تھی۔ وہ زرد ساڑھی میں تھی۔ اس کے چہرے پر بھی وجدانی کیفیت تھی اور اس نے بھی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ لکڑی اور پتھر کی دو تین مالائیں اس کے گلے میں بھی جھول رہی تھیں۔ ان دونوں کے عقب میں سوکھا سڑا پنڈت بھگوان داس تھا۔ وہ رام پرشاد اور اس کی ماتا پر کوئی چیز چھڑکتا چلا آ رہا تھا۔

ان لوگوں کے اندر داخل ہوتے ہی مندر کا اندرونی منظر مزید ڈرامائی اور سنسنی خیز ہو گیا۔ ہمیں یہی لگ رہا تھا کہ ہم پندرہویں صدی کے جدید دور میں نہیں، کسی قدیم زمانے میں بیٹھے ہیں۔ رام پرشاد کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی کے عین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی گھنٹیوں کو زور زور سے بجا رہا تھا اور گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ گھنٹیوں کی آواز میں شدت آتی جا رہی تھی۔ جوں جوں گھنٹیوں کی لے بلند ہوئی، رام پرشاد کے گرد رقص کرنے والے افراد کے رقص میں بھی تیزی آتی گئی۔ رام پرشاد خود بھی جھومنے والے انداز میں اپنے سر کو آگے پیچھے حرکت دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا اور کچھ یہی کیفیت بڑھیا کے چہرے کی بھی تھی۔ گھنٹیاں بجاتے بجاتے اور اپنے سر کو حرکت دیتے دیتے رام پرشاد نے صرف ایک دو سیکنڈ کے لئے آنکھیں کھولیں۔ شمع دانوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ نظر آئیں۔ اب معلوم نہیں کہ یہ سرخی اس کے اندرونی جذبات کے سبب تھی یا اس نے خود کو ایک خاص کیفیت میں لانے کے لئے بھنگ آمیز مشروب پیا تھا۔ اس نے آستینیں اڑسی ہوئی تھیں۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ بظاہر اس کے ہاتھوں پر کوئی بھی چیز لگی نظر نہیں آئی۔

ڈھول تاشوں اور سنکھوں کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ رام پرشاد کڑاہی کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اب وہ کسی بھی وقت خود کو پرکھشا کے عمل سے گزار سکتا تھا لیکن یوں لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر تاخیر کر رہا ہے یا شاید اسے تاخیر کرنے کے لئے کہا گیا تھا...... اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ عین موقع پر مخالف گروہ آزمائش کے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائے۔

تین چار منٹ مزید گزر گئے۔ مہندر اور اس کے قریبی ساتھیوں کے چٹانی چہروں پر کسی طرح کی نرمی نمودار نہیں ہوئی۔

رقص کرنے والوں نے جوش میں آ کر ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ سوکھے سڑے پنڈت بھگوان داس نے آگے بڑھ کر رام پرشاد کا کندھا مخصوص انداز میں دبایا۔ رام پرشاد نے مزید زور سے گھنٹیاں بجانا شروع کر دیں۔ اس کے چہرے پر وجدانی کیفیت تھی۔ یہ کیفیت بے پناہ وشواس اور جذبے میں لتھڑی ہوئی تھی۔ رام پرشاد جانتا تھا کہ اس کی بہو اور بیٹے پر غلط

الزام لگایا جا رہا ہے، وہ سچا ہے......اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سب سے بڑی چیز وشواس اور جذبہ ہی ہے اور اب یہ ثابت کرنے کی گھڑی آ گئی تھی۔

وہ ایک ہیجانی منظر تھا۔ شور سے کانوں کے پردے شق ہو رہے تھے۔ رام پرشاد نے دونوں گھنٹیوں کو پورے زور سے آخری بار حرکت دی اور پھر انہیں دونوں طرف پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک پُر جوش نعرہ بلند کیا۔ جذبے میں لتھڑے ہوئے اس زوردار نعرے کے ساتھ ہی وہ کڑاہی کی طرف جھکا۔ ہم نے وہ منظر دیکھا جسے دیکھنے کے لئے مضبوط دل گُردے کی ضرورت تھی۔ رام پرشاد نے اپنے دونوں ہاتھ تقریباً کہنیوں تک ابلتے ہوئے تیل میں جھونک دیئے۔

......اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بے حد لرزہ خیز تھا۔ ہال کمرے میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ گرم تیل کی بلند چڑچڑاہٹ سنائی دی......اس کے ساتھ ہی رام پرشاد کرب ناک انداز میں چلایا۔ اس نے دیوانہ وار اپنے دونوں ہاتھ کڑاہی میں سے کھینچے، ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں نے کڑاہی کے کنارے سے رگڑ کھائی۔ وہ ایک دل دوز منظر تھا۔ اس کے بازوؤں کی گندمی کھال اُتر گئی اور نیچے سے سرخ سرخ گوشت جھانکنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک بے طرح جل چکے تھے۔ وہ فرش پر گر پڑا اور تکلیف سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

یہ سب کچھ ہم سے فقط چھ سات فٹ کی دوری پر ہو رہا تھا۔ ہوادان کی پتھریلی جالی کے سوراخوں میں سے ہم سب کچھ بالکل واضح دیکھ رہے تھے۔ زمین پر لوٹ پوٹ ہونے سے رام پرشاد کے ہاتھوں اور بازوؤں کی جلی ہوئی کھال کئی اور جگہ سے بھی اُتر گئی...... جلے ہوئے گوشت کی مکروہ بُو ہمارے نتھنوں تک پہنچی۔

اس وقت میری نگاہ روتی چلاتی ہوئی بڑھیا پر پڑی۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر دنیا جہان کی حیرتیں سمٹ آئی تھیں۔ اسے جیسے اپنی نگاہ پر یقین ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ یکا یک مہندرا اور اس کے ساتھیوں نے گرج دار نعرہ بلند کیا۔ ”جے ماتا کی“ آواز بڑی شدت سے در و دیوار میں گونجی۔ بہت سی لاٹھیاں اور بلم وغیرہ فضا میں بلند ہوئے۔ وہ سب لوگ جو رام پرشاد اور اس کے بچوں کو جھوٹا سمجھ رہے تھے، ایک دم بپھرے ہوئے نظر آئے۔ وہ للکارے مارتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے تمتما گئے اور آنکھوں میں جنون نظر آیا۔ یوں لگا کہ آزمائش میں ناکام ہونے کے بعد وہ رام پرشاد کو واجب القتل سمجھ رہے ہیں۔

اس کے بعد جو منظر ہم نے دیکھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ مہندر آگے آیا اور پکار کر بولا۔

”پھیسلہ (فیصلہ) ہو گیا...... بھگوان کا پھیسلہ ہو گیا۔“ اس کی آواز میں بلا درجے کی درندگی تھی۔

یکا یک بہت سے لوگ فرش پر لوٹ پوٹ ہوتے رام پرشاد پر جھپٹے۔ ایک بٹے کٹے شخص نے اس طرح کھینچ کر تلوار چلائی کہ وہ تقریباً ایک فٹ تک رام پرشاد کے پیٹ میں گھس گئی۔ اس کے بعد کئی افراد اس پر پل پڑے۔ رام پرشاد کی آخری کرب ناک آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ وہ مشتعل ہجوم کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

ہم اپنی جگہ سکتہ زدہ بیٹھے تھے۔ مکھیا کی گرج دار آواز ہجوم کے شور میں سے اُبھری۔

”اس حرامی کا بیٹا اور بہو کہاں ہیں۔ وہ اصل دوشی ہیں۔ ان کو پکڑو......

ایک اور للکار اُبھری۔ ”اس کی بہو پاپی ہے۔ اس کتیا کو جندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ جان سے ماردیں گے۔“

”......ہاں جان سے ماردیں گے۔“ کئی آوازیں اُبھریں۔

ہجوم میں ایک لہر سی دوڑی۔ کچھ لوگ باہر کی طرف لپکے۔ جونہی ہاتھ جلنے کے بعد رام پرشاد فرش پر گرا تھا اور مخالفین نے فلک شگاف نعرے بلند کئے تھے، رام پرشاد کے حمایتی وہاں سے کھسکنا شروع ہو گئے تھے۔ اب مندر کے اندر مہندرا اور اس کے ساتھیوں کا غلبہ تھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

”لگتا ہے کہ اب مالا کی جان کو بھی خطرہ ہے۔“ ہوشیار سنگھ لرزاں آواز میں بولا۔

ہجوم کے درمیان سے ہمیں اب رام پرشاد کی خون چکاں لاش سیاہی مائل فرش پر نظر آ رہی تھی۔ اس کا سفید براق چولا خوں رنگ تھا۔ لوگ اسے روندتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اس کے پاس ہی مندر کا بہت بڑا ڈھول اوندھا پڑا تھا۔

”لو، وہ بھی آ گئی۔“ عمران نے سنسناتی سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا، کچھ مشتعل لوگ مالا کو کھینچتے ہوئے مندر میں لا رہے تھے۔ ان مشتعل لوگوں میں لمبی ناک اور عقابی آنکھوں والا گاڑی بان بھولا ناتھ سب سے آگے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مالا کے بال تھے اور دوسرے میں ایک چھوٹی تلوار تھی۔ کئی دوسرے لوگوں نے بھی مالا کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ دہشت سے چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب ایک بلند دھاڑ سنائی دی۔ یہ برہمن زادہ ستیش تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا سیاہ پستول تھا۔ ”پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں کہوت ہوں پیچھے ہٹ جاؤ“ وہ چنگھاڑا

اوراس نے مندر کے اندر ہی کئی ہوائی فائر کیئے۔

لوگ کائی کی طرح پھٹ گئے۔ چند لمحوں کے لئے لگا کہ ستیش آگے بڑھ کر اپنی پتنی کو چھڑانے اور شاید یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر پھر اچانک دو افراد نے جھپٹ کر ستیش کو عقب سے دبوچ لیا۔ ستیش نے فائر کیا تاہم پستول کا رخ اب زمین کی طرف تھا۔ دھماکے سے گولی چلی اور کسی کے پاؤں میں پیوست ہو گئی۔ پکڑنے والوں نے ستیش کو اوندھے منہ پکے فرش پر گرا دیا اور جکڑ لیا۔ تب وہ لوگ اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے مندر سے باہر لے گئے۔ اسی دوران میں مالا کی نگاہ فرش پر پڑی۔ وہاں اپنے سسر کی خونچکاں لاش دیکھ کر وہ کرب ناک انداز میں چلانے لگی۔ ''پتا جی...... پتا جی۔''

اسے پکڑنے والوں نے اسے اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ اس کے بازو پیچھے موڑ کر اس کے ہاتھ ایک رسّی سے باندھ دیئے گئے۔ پاؤں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اس کی ساڑھی بالائی جسم پر سے کھل گئی تھی اور بالائی جسم نیم عریاں ہو رہا تھا۔ اس کی عریانی تو رہی ایک طرف، اس کی جان کی پروا بھی کسی کو نہیں تھی۔ وہ لوگ بے دردی سے اسے اِدھر اُدھر گھسیٹ رہے تھے۔ فرش پر اوندھا گرنے سے اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ وہ چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کے لئے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ تاہم میں نے دیکھا کہ دہشت کے پہلے شدید جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اب اس کے چہرے پر عجیب طرح کا طیش بھی پایا جا رہا تھا۔

وہ مہندر کی طرف منہ کر کے اشکبار انداز میں پکاری۔ ''تم جانور ہو، تم ہتھیارے ہو۔ تم بھگوان کے نام پر راکھشس کے پجاری ہو۔ تمہارا انجام بہت برا ہووے گا...... بہت برا ہووے گا۔''

بھولا ناتھ کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ اس نے تلوار سونتی اور خطرناک انداز میں مالا کی طرف بڑھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

''ناہیں...... ناہیں، یہ ٹھیک ناہیں۔''

''کیوں ٹھیک ناہیں؟'' مہندر کا ساتھی پٹیل گرج کر بولا۔ ''یہ نڑکی دھرم دشمن ہے۔ یہ ہمیشہ سے دھرم دشمن رہی ہے۔ ہم تو سمجھت ہیں کہ...... رام پرشاد کی جان لینے والی بھی یہی ہے۔ اسے دہری سزا ملنی چاہئے۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ حرامزادی کے ٹکڑے کر دو یہیں پر لٹا کر......'' ایک اور کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''یا پھر اسے کڑاہے میں ڈال دو۔''

یوں لگا جیسے کئی افراد مالا کی طرف بڑھنا چاہ رہے ہیں۔ ایک دم ہجوم میں شدید ہلچل نظر آئی۔

ہوشیار سنگھ نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''یہ لوگ اس لڑکی کو مار دیں گے جی۔ کڑاہے میں پھینک دیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ پرکھشا ناکام ہو تو ایسا ہی کیا جاتا ہے۔''

بپھرا ہوا ہجوم اب بالکل آگ بگولا دکھائی دے رہا تھا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی، آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹتی ہوئیں۔ وہ سب کے سب ہوش وحواس سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہجوم کی نفسیات ایک اکیلے شخص کی نفسیات سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ ہجوم میں موجود شخص ایسے ایسے کام کر گزرتا ہے جن کا انفرادی طور پر وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہجوم کے اندر منفی اور مثبت دونوں طرح کی کیفیات انتہائی عروج پر پہنچ سکتی ہیں۔ جیسے بہادری، ہمت، ایثار اور جواں مردی یا پھر نفرت، انتقام، خوں خواری اور درندگی۔

یہاں اس ہال کمرے میں بھی اچانک درندگی اپنے عروج پر پہنچی نظر آئی۔ وحشت کی لہر نے ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آیا کہ تیل کی کڑاہی اتنی بڑی کیوں تھی۔ کھولتے ہوئے تیل میں ہاتھ ڈالنے کے لئے تو چھوٹی سی کڑاہی بھی کام دے سکتی تھی۔ یہ شاید کوئی قدیم کڑاہا تھا جو خاص اسی رسم کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

''ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔'' عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں نے چونک کر عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا کھلنڈرا انداز اس کے اندر کہیں بہت دور گہرائی میں جا چھپا تھا۔

کچھ مشتعل لوگوں نے بندھی ہوئی مالا کو اُٹھایا اور بلاتردد تیل کے کڑاہے کی طرف بڑھے۔ ان میں مہندر بھی شامل تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب آٹھ دس افراد کا ایک ٹولہ زبردستی ہال کمرے میں گھس آیا۔ ان کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ ستیش کے دوستوں میں سے تھے۔

ان میں سے ایک گرجا۔ ''مالا بہن کو چھوڑ دو۔ ناہیں تو گولی چلے گی۔''

''چلاؤ گولی...... چلاؤ۔'' مہندر زہرناک انداز میں دھاڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے مالا کو اس کے پاؤں پر کھڑا کیا اور پستول کی نال اس کے سر پر رکھ دی۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ ٹریگر دبانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ اس کا چہرہ ایک انتہا پسند کا چہرہ تھا۔ اَن گنت صدیوں سے یہ چہرہ مذہب کے نام پر سفاکی اور درندگی کی بدترین مثالیں قائم کرتا رہا ہے۔ اب دونوں طرف سے رائفلیں تان لی گئی

تھیں۔ کسی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ مہندر کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ ماحول گواہی دے رہا تھا کہ یہ فساد اب روکنے سے رکے گا نہیں۔ میں نے دیکھا، عمران نے اپنی رائفل کی نال جالی کے ایک سوراخ میں رکھ دی ہے اور کسی ماہر نشانہ باز کی طرح رائفل کا کندا اپنے شانے سے لگا کر نشانہ باندھ رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ایک نہایت خطرناک نشانہ لگانے جا رہا ہے۔ یہ نشانہ خطا جاتا یا پوری طرح کارگر نہ ہوتا تو مالا کی جان جا سکتی تھی۔ وہ مالا کے عقب میں مہندر کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا اور مالا کے پیچھے مہندر کے چہرے کا ایک تہائی حصہ ہی نظر آ پا رہا تھا۔ اسے اندازاً دو انچ چوڑے اور چھ انچ لمبے ٹارگٹ کو نشانہ بنانا تھا...... مگر یہ بھی عیاں تھا کہ اب اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ مجھے وہ تماشا یاد آ گیا جو عمران اور اقبال نے لاہور میں مجید مٹھو کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے سر پر سیب رکھ کر عمران نے حیران کن مہارت سے نشانہ لگایا تھا۔ شاید آج پھر وہی مہارت استعمال ہونے والی تھی۔

اوپر پھر دھماکا ہوا۔ میں نے مالا کے پیچھے مہندر کی پیشانی پر ایک داغ نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے پختہ فرش پر گرا۔ عمران کے بے مثال نشانے کا دوسرا شکار مہندر کا قریبی ساتھی پٹیل تھا۔ اس کی کنپٹی نشانہ بنی اور وہ پہلی گولی چلانے کی حسرت دل میں لئے سفرِ آخرت پر روانہ ہو گیا۔ ان دونوں فائرز کے درمیان بمشکل ایک سیکنڈ کا وقفہ تھا۔ اتنے مختصر وقت میں دوسری مرتبہ اتنا صاف نشانہ لینا حیرت ناک تھا۔

میں نے مالا کو مہندر کے ہاتھ سے چھوٹ کر پختہ فرش پر گرتے دیکھا۔ اس کے بعد جیسے یکا یک قیامت برپا ہو گئی۔ دھماکوں اور شعلوں نے ہال کمرے کو ڈھانپ لیا۔ کئی افراد زخمی ہو کر گرے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ ستیش کا ایک ساتھی مالا کو بچانے کے لئے مالا کے اوپر گر گیا تھا۔ تب ہم نے دیکھا کہ ستیش کے دو ساتھی مالا کو چکنے فرش پر گھسیٹتے ہوئے ہال سے باہر لے گئے اور وہ اندھی گولیوں کی زد سے بچ گئی...... اور ہم فی الوقت یہی چاہتے تھے۔ ہمارے سامنے خوں ریز مناظر تھے۔ آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ نہایت نزدیک سے ایک دوسرے پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ آتشیں اسلحے کے علاوہ تلواریں بھی نکل آئی تھیں۔ جس ہوادان سے ہم جھانک رہے تھے، اس کے عین سامنے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر کھیا رشید نے ایک شخص کی گردن پر تلوار ماری اور اس کی شہ رگ کاٹ کر رکھ دی۔ دفعتاً وہ کچھ ہوا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ کوئی اندھی گولی اس بڑے شمع دان کے رسّے سے ٹکرائی جو تیل کے کڑاہے کے عین اوپر جھول رہا تھا...... پیتل کا شمع دان اپنی قریباً دو درجن موم بتیوں سمیت

ابلتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں گرا۔ ابلتا ہوا تیل اچھلا۔ کئی افراد کرب سے بے تاب ہو کر چلائے۔ اس کے ساتھ ہی تیل نے آگ پکڑ لی۔ ہم نے ایک شخص کو آگ کی لپیٹ میں آ کر بگولے کی طرح بیرونی دروازے کی طرف دوڑتے اور پھر راستے میں ہی گرتے دیکھا۔ کڑاہا الٹ چکا تھا۔ اس کا تیل جہاں جہاں گیا، اپنے ساتھ آگ کا ریلا سا لے گیا۔ چند سیکنڈ پہلے جو جنونی ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے، اب اپنی جانیں بچانے کے لئے بیرونی دروازوں کی طرف دوڑے۔ دروازے صرف دو تھے اور نکلنے والے درجنوں۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ سیاہ گاڑھا دھواں ہر شے کو ڈھانپتا چلا جا رہا تھا۔ یہ دھواں ہوادان کے اندر سے ہماری طرف بھی آ رہا تھا۔ اب ہمارا یہاں رکنا خطرناک تھا۔

''نیچے چلیں جی۔'' آفتاب خاں پکار کر بولا۔

ہم آگے پیچھے تنگ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ چند زینے اُتر کر ہم نے وہ دروازہ بند کر دیا جسے کھول کر اوپر آئے تھے۔ اس دروازے کے بند ہونے سے عارضی طور پر سیڑھیاں دھوئیں سے محفوظ ہو گئیں۔ جن کپڑوں سے ہم نے چہرے لپیٹے تھے، وہ ابھی تک ہمارے پاس تھے۔ ہم نے ان میں سے دو تین کپڑے دروازے کی درزوں میں ٹھونس دیئے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم زیریں تہ خانے میں موجود تھے۔

''کیا ہوا؟'' سب سے پہلے رادھا نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

اسے ہر وقت اپنے شوہر نامدار کی پڑی رہتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شوہر صاحب کو سورگ باشی ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں اور اب اس کی وفات سے کہیں زیادہ اہم خبریں موجود ہیں۔

مندر میں جو آگ بھڑکی تھی، وہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ ہم یہاں ان تہ خانوں کے اندر سے کچھ دیکھ نہیں سکتے تھے مگر تصور کی نگاہ ہمیں سب کچھ دکھا رہی تھی۔ قدیم مندر دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ شعلے اس کے دروازوں سے نکل کر باہر تک جا رہے تھے۔ تاریکی میں ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔

''گولیاں چل رہی ہیں۔'' عمران نے بیرونی آوازوں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ غور سے سننے پر فائرنگ کی بہت مدھم آواز یہاں بھی نوٹ کی جا سکتی تھی۔

''اگر آگ یہاں لکڑی کے زینے تک پہنچ گئی تو؟'' اقبال نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔

''تو ہم گانا گائیں گے۔ خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے زینے میں۔'' عمران نے

حسبِ عادت بات کو مذاق میں اُڑا دیا۔

لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ آگ جس طرح بھڑکی تھی، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ تہ خانے بھسم ہو سکتے تھے۔ اگر آگ مندر کے اس بیرونی دروازے تک ہی پہنچ جاتی جس میں سے گزر کر آفتاب خاں ہر رات یہاں ہمارے پاس آتا تھا تو بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

''کیا خیال ہے آفتاب خاں؟'' میں نے پوچھا۔ ''آگ نیچے تو نہیں آ جائے گی؟''

''بس جی، آپ سب کی طرح ام بھی دعا ہی کر سکتا ہے۔ خطرہ تو ہر صورت میں موجود ہے۔ اگر آگ یہاں تک نہ پہنچا لیکن دھواں بھر گیا تو بھی ام سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔''

آفتاب خاں درست کہہ رہا تھا۔ ہم دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہلکا ہلکا دھواں سیڑھیوں سے اُتر بھی رہا تھا مگر یہ اتنی کم مقدار میں تھا کہ ہم فی الحال خطرے سے باہر تھے۔ تہ خانوں میں گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔

عمران اور میں، آفتاب کے ہمراہ ایک بار پھر تنگ زینوں پر چڑھے اور اس دروازے کو ائرٹائٹ کرنے کی کوشش کی جہاں سے دھواں اندر آ رہا تھا۔ اس کوشش میں ہم بری طرح کھانسنے لگے اور آنسو بہاتے ہوئے واپس آئے۔ بہرطور یہ کوشش فائدہ مند ہوئی اور دھوئیں کی آمد کم ہو گئی۔

......اگلا تقریباً ایک گھنٹہ سخت تشویش میں گزرا۔ پھر صورتِ حال بہتر ہونے لگی۔ فائرنگ کی آوازیں بھی اب معدوم ہو چکی تھیں......فائرنگ کے علاوہ اور کسی طرح کا شور یہاں پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب رات کے قریباً دس بجنے والے تھے۔ ہمیں اتنا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ باہر آگ بجھائی جا چکی ہے لیکن باقی حالات کیا ہیں، اس کے بارے میں آفتاب خاں ہی کوئی خبر لا سکتا تھا......اور آفتاب ابھی تک ہمارے پاس موجود تھا۔ رات قریباً ایک بجے کے لگ بھگ وہ بالائی دروازے تک گیا اور سن گن لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ اب مندر کے ارد گرد خاموشی ہے۔ وہ باہر نکلنے کا چانس لے سکتا ہے۔ عمران نے اسے تھوڑی دیر مزید انتظار کرنے کے لیے کہا۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ ابھی کچھ دیر مزید انتظار کرے۔ آخر رات تین بجے کے لگ بھگ آفتاب باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنی لاٹھی اور لالٹین سنبھال لی۔ بستی سے غیر حاضری کے لیے اس کے پاس ایک نہایت معقول جواز موجود تھا۔ اس کے ایک دوست کی بیوی سخت بیمار تھی۔ شام کو اس نے کھیا سے اجازت لی تھی کہ وہ ایک دو گھنٹوں کے لیے اپنے دوست کی طرف جائے گا۔ اب وہ کہہ سکتا تھا کہ اسے وہاں دیر ہو گئی ہے۔

اب آفتاب کو کل رات ہی کسی وقت آنا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کل رات بھی نہ آ سکتا۔ اس کی واپسی تک ہمیں انتظار کی سولی پر لٹکنا تھا۔ مندر کے خونی مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ خاص طور سے جو کچھ مالا کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کا قصور اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بڑی اس کو سزا دی جا رہی تھی۔ کھینچا تانی کے دوران میں وہ نیم عریاں ہو گئی تھی۔ اس کے جسمانی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حاملہ بھی ہے۔ اگر اسے سچ مچ تیل کے کھولتے ہوئے کڑاہے میں ڈال دیا جاتا تو آناً فاناً دو زندگیاں ختم ہو جاتیں۔

......اگلے روز دوپہر کا واقعہ ہے۔ سلطانہ اوپر والے تہ خانے میں کلثوم اور نوری کے پاس تھی۔ کلثوم کے کان کا درد ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا، وہ تکلیف میں تھی۔ اس کی کمر کو بھی مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ میں رات کا جاگا ہوا بستر پر لیٹا تو نیند آ گئی۔ اچانک کسی آہٹ کے سبب میں جاگ گیا۔ تہ خانوں میں رات دن برابر تھے۔ کمروں میں شمعیں یا لالٹینیں جلتی رہتی تھیں۔ میرے کمرے میں لالٹین بجھی ہوئی تھی اس لیے تاریکی تھی۔ مجھے کمرے کی سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک ہیولا سا حرکت کرتا نظر آیا۔ یہ سلطانہ تو ہرگز نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ بے حرکت لیٹا دیکھتا رہا۔ ہیولا اس کھونٹی کی طرف بڑھا جہاں جیکٹ کے نیچے میرا پستول لٹک رہا تھا۔

میں نے پہچان لیا۔ یہ پندرہ سالہ طلال تھا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ میرے پستول تک رسائی حاصل کی اور اسے ہولسٹر سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

''طلال'' میں اچانک بلند آواز میں کہا۔

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ہولسٹر جلدی سے کھونٹی پر لٹکا دیا......میں نے ماچس جلا کر موم بتی روشن کی۔ وہ دیوار سے لگا کھڑا تھا اور ایک دم پریشان نظر آ رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے تھا؟'' میں نے تحکم سے پوچھا۔

''کچھ نہیں جی۔ میں وہ......دراصل......آپ کا پستول دیکھنا چاہ رہا تھا۔''

''دیکھنا چاہ رہے تھے یا لے جانا چاہ رہے تھے؟''

''نا ہیں جی۔ میں بس دیکھنے لگا تھا۔''

میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''طلال! مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟''

اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ اس کے تاثرات دیکھ کے مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ واقعی اس لڑکے نے سلطانہ کے ساتھ مل کر زرگاں میں چار

سنگین وارداتیں کی ہیں۔اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجب سی سرد مہری تھی۔

''طلال! اُدھر بیٹھ جاؤ۔'' میں نے سامنے نشست کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ہچکچاتا ہوا بیٹھ گیا۔''مجھے سچ بتاؤ طلال! تم نے ایسا کیوں کیا؟...... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، تم کچھ چھپاؤ گے نہیں تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ بلکہ اگر تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مدد بھی کروں گا۔'' اچانک میں چونک گیا۔لالٹین کی زرد روشنی میں طلال کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نمودار ہوئی۔

میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''طلال! مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟''

وہ اشک بار ہوگیا۔گلوگیر آواز میں بولا۔''میری خالہ مر جائے گی۔وہ اپنی جان دے دے گی۔میں اسے مرتا ہوا ناہیں دیکھ سکتا۔اس سے پہلے میں مر جانا چاہتا ہوں یا پھر اس کتے کو مار دینا چاہتا ہوں۔آپ مجھے جانے دیں...... خدا کے لیے جانے دیں۔'' اس نے زاروقطار رونا شروع کردیا۔اس کے آنسوؤں میں آگ اور زہر تھا۔

''کیا تم جارج گورا کی بات کر رہے ہو؟''

''اور کس کی کر سکتا ہوں۔وہی ہے جس نے میری خالہ کو برباد کیا۔اسے جندوں میں چھوڑا نہ مُردوں میں۔ہر جگہ اس کو بدنام کر دیا۔میں اچھی طرح جانتا ہوں۔وہ فیصلہ کر چکی ہے۔وہ ایک دو دن میں چپ کر کے یہاں سے نکل جائے گی۔وہ جارج گورا سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔اس بدلے کے بغیر وہ جندہ ناہیں رہ سکتی......اور میں ناہیں چاہتا کہ وہ یہ خطرناک کام کرنے کے لئے جائے۔وہ عورت جات ہے۔وہ اسے بہت تکلیف دے کر ماریں گے۔یہ کام میں کروں گا۔میں جارج کو قتل کروں گا......اس کا سر لا کر خالہ کے خدموں (قدموں) میں ڈالوں گا...... یا پھر خود بھی وہیں رہ جاؤں گا۔''

میں طلال کی باتوں اور اس کے انداز پر ششدر تھا۔میں نے پوچھا۔تم کیسے جانتے ہو کہ وہ ایک دو دن میں یہاں سے چلی جائے گی؟''

''مجھے سب پتا ہے۔میں ہمیشہ سے اس کے ساتھ رہا ہوں۔وہ میری بہن بھی ہے، ماں بھی اور خالہ بھی۔میں سب جانتا ہوں کہ وہ کب کیا کریں گی۔ان کے پاس زہر کی پڑیا ہے۔جب وہ نل پانی سے گئی تھیں تو یہ پڑیا انہوں نے اپنے بالوں میں چھپائی ہوئی تھی۔بعد میں جب ہم یہاں آئے تو میں نے وہ پڑیا ان سے چھین لی تھی اور چھپا لی تھی۔وہ پڑیا پھر غائب ہے۔مجھے یقین ہے کہ وہ پڑیا پھر انہوں نے لے لی ہے۔ان کی باتیں بھی مجھے یہی

سمجھا رہی ہیں کہ انہوں نے بس ایک دوروج میں اِچ یہاں سے نکل جانا ہے۔''

میں سناٹے کی سی کیفیت میں طلال کی باتیں سن رہا تھا۔وہ قد کاٹھ میں اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا اور وہ باتیں بھی بڑی ہی کر رہا تھا۔

ایک دم مجھے لگا کہ میں مجرم ہوں۔میں سلطانہ کا ہی نہیں ان سب لوگوں کا مجرم ہوں جو سلطانہ کے قریبی ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں۔ان میں طلال بھی شامل تھا۔سلطانہ کا بوڑھا والد مختار راجپوت بھی اور اس کا اپاہج بھائی بھی۔جس نے میری صحت کے بدلے میں ایک تکلیف دہ بیماری گلے لگائی ہوئی تھی اور اب اپنی بہن کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد منہ چھپاتا پھرتا تھا۔میں سلطانہ سمیت ان سب لوگوں کا مقروض تھا۔ان کے بے پایاں احسانوں تلے دبا ہوا تھا۔ان احسانوں کے بے پناہ بوجھ سے نکلنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا۔میں کسی طرح...... کسی طرح سلطانہ کو پھر سے زندہ کر سکتا اور اسی جگہ، اسی گھڑی...... وہیں اس تنہا اشک بار لڑکے کے سامنے بیٹھے بیٹھے میں نے یہ تہیہ کیا کہ میں یہ کام کروں گا......اور اس کے کرنے میں مزید تاخیر نہیں کروں گا۔اندازہ تو مجھے پہلے ہی تھا، آج کامل یقین بھی ہو گیا تھا کہ سلطانہ کے مردہ تن میں جان ڈالنے کی کوشش ایک ہی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے۔اس کی کچلی مسلی زخمی روح کو انصاف دیا جائے۔

میں نے کہا۔''طلال! تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اس طرح میرا پستول لے کر یہاں سے نکل جاؤ گے اور زرگاں پہنچ کر جارج کو گولی مار دو گے؟ تم اپنی جان گنوانے کے سوا اور کچھ نہیں کرو گے۔وہ ایک آسان دشمن نہیں ہے۔وہ تمہیں کسی بازار میں گھومتا ہوا نہیں مل جائے گا۔اس نے اپنی حفاظت کا مضبوط گھیرا بنا رکھا ہے۔کیا تمہیں پہلے تجربہ نہیں ہوا کہ یہ گھیرا کتنا مضبوط ہے؟''

وہ خاموش رہا۔اس کا سر جھکا ہوا تھا۔کچھ دیر بعد سسکی لے کر بولا۔''مجھے بتائیں میں کیا کروں...... میں کیا کر سکتا ہوں؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔تم اپنی خالہ کے بہت قریب ہو۔اسے میرے بارے میں بتاؤ کہ میں ابھی زندہ ہوں۔وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو وہ خود کرنا چاہتی ہے اور میں یہ سب کروں گا بھی۔جارج گورا اب زیادہ دن سانس نہیں لے پائے گا۔یہ تمہاری خالہ سے میرا وعدہ ہے۔''

طلال نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔میں نے کہا۔''طلال! میں کوئی ہوائی بات نہیں کر رہا۔میں اب وہ ''مہروج'' نہیں رہا جو کبھی تھا۔کیا تمہیں مجھ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں

آتی؟'' وہ اب بھی خاموش رہا۔ تاہم اس کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ میری بات سے اختلاف نہیں کر رہا۔ وہ اتنا بھی ناسمجھ نہیں تھا۔ وہ بھی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں رنجیت پانڈے کی جو درگت بنی تھی وہ تو اس کی اور سلطانہ کی نگاہوں سے اوجھل رہی تھی لیکن ابھی پانچ دن پہلے کا واقعہ تو اس نے دیکھا تھا۔ میں تن تنہا مندر سے نکلا تھا اور کلثوم کو چھڑا کر یہاں لے آیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ کتنا مشکل کام تھا۔ میرے اس کام پر اعتراض تو کئے گئے تھے لیکن اندر سے سب معترف ہوئے تھے۔

طلال روہانسی آواز میں بولا۔ ''آپ کہہ رہے ہیں کہ میں انہیں سمجھاؤں۔ میں انہیں کیا سمجھاؤں گا؟ میں کس گنتی میں آتا ہوں۔ وہ تو آپ کے سمجھانے سے بھی ناہیں سمجھ رہیں اور جتنا کہا وہ آپ کا مانتی ہیں، کسی اور کا نہیں مان سکتیں۔ وہ آپ سے جتنا پیار کرتی ہیں کچھ میں اِچ (ہی) جانتا ہوں۔ وہ آپ کو بہت چاہتی ہیں خالو! بہت اِچ جیادہ۔''

''میں کب کہتا ہوں کہ وہ نہیں چاہتی۔''

''لیکن آپ کو اندازہ نہیں کہ وہ آپ کو کیا سمجھتی ہیں...... وہاں استھان میں بھی وہ دن رات آپ کا نام لیتی رہتی تھیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیا مطلب؟''

''آپ نے دیکھا اِچ ہوئیں گا کہ وہاں خالہ کو زنجیریں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ خالہ کو یکین ہو چکا تھا کہ استھان والے موہن کمار کے کتل کے بدلے میں ان کو جندہ جلا دیں گے۔ ان کو وہ دن بھی بتایا گیا تھا جب ان کو جندہ جلایا جانا تھا۔ اس سے ایک رات پہلے انہوں نے مجھ سے کہا تھا...... طلال! تم جندہ رہو گے اور ایک نہ ایک دن اپنے خالو سے جرور ملو گے۔ جب بھی ملو، ان سے کہنا میری خالہ آپ سے بہت پریم کرتی تھی۔ اتنا جیادہ جتنا سوچا جا سکتا ہے۔ آپ ان کو دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر پیارے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر اللہ میاں نے بندوں کی پوجا کی اجاجت دی ہوتی تو وہ آپ کی پوجا کرتیں۔ پھر انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔''

''وہ کیوں؟''

''کہنے لگی تھیں۔ یہ دیکھو...... جس طرح میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں، اسی طرح میری طرف سے ان کے سامنے ہاتھ جوڑنا اور کہنا کہ وہ میری گلتیوں کے لئے مجھے ماف کر دیں۔''

طلال نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''جس روج ان کو چتا میں جلایا جانا تھا، اس روج شام سے پہلے انہیں کھانے میں بے ہوشی کی دوا دے دی گئی تھی۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں بے ہوش ہونے والی ہوں۔ اب دوبارہ ہوش میں ناہیں آؤں گی، میری باتیں یاد رکھنا۔ بے ہوش ہوتے ہوتے انہوں نے بس ایک دو بار بالو کا نام لیا، اس کے بعد آپ ہی کا نام لیتی رہیں اور نام لیتے لیتے ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔''

شاید میری اور طلال کی گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں لکڑی کے زینوں پر سلطانہ کی جانی پہچانی چاپ سنائی دی۔ وہ نیچے آ رہی تھی...... ہم خاموش ہو گئے۔

رات تک ہمیں بے چینی سے آفتاب کا انتظار رہا۔ خدا خدا کر کے گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر یکجا ہوئیں۔ دس پندرہ منٹ بعد سیڑھیوں کے بالائی دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور آفتاب خاں اپنی لاٹھی اور لالٹین کے ساتھ اندر آ گیا۔ میں اس وقت کپڑے بدل رہا تھا۔ کپڑے بدل کر میں درمیانی تہ خانے میں پہنچا تو آفتاب خاں عمران کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہ رہے ہیں لیکن جب میں نے عمران سے پوچھا تو وہ بولا۔ ''یار! ہر جگہ ناک کیوں گھساتے ہو۔ ہر بندے کی پرائیویسی ہوتی ہے، میری بھی ہے۔''

''کس طرح کی پرائیویسی؟'' میں نے پوچھا۔

''دو ٹانگوں والی۔ عمر کوئی تئیس چوبیس سال۔ نین نقشہ اچھا ہے۔ ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔''

''کس کی؟''

''بھئی پرائیویسی کی...... اگر تم شادی شدہ نہ ہوتے تو تمہارا عشقِ پیچاں چھوٹی سے لگوایا جا سکتا تھا۔ مقامی حسن کا بے مثال نمونہ ہے وہ بھی۔''

''یار! کیا ہانک رہے ہو؟''

''ہانک نہیں رہا جگر! میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہاں ایک لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے اور مجھے دیکھ کر اس لڑکی کو کچھ کچھ ہوتا ہے...... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں کو دیکھ کر لڑکی کے اباجی کے دل میں بھی کچھ کچھ ہوتا ہے۔ وہ لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور جہاں کہیں میری شکل دیکھتے ہیں، ہوا میں لٹھ گھمانا شروع کر دیتے ہیں...... آفتاب یہی بتا رہا تھا کہ اس کے اباجی یہاں فتح پور میں دیکھے گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو میرے دل میں بھی کچھ کچھ ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ غصہ رفع کرنے کے لئے تمہارا سر پھاڑ دوں یا اپنا پھاڑ لوں۔''

اسی دوران میں اقبال بھی آ گیا۔ اس نے آتے کے ساتھ ہی آفتاب پر سوالات کی

بوچھاڑ کردی۔ میری طرح وہ بھی یہ جاننے کے لئے بے تاب تھا کہ اوپر کے حالات کیا ہیں۔

آفتاب نے اپنے مخصوص پٹھانی لب و لہجے میں جو انکشافات کئے وہ کچھ اس طرح تھے۔ مندر کی آگ بجھ چکی تھی۔ سیکڑوں افراد نے قریبی جوہڑ سے پانی بھر بھر کر آگ پر پھینکا تھا اور اسے پوری طرح پھیلنے سے روک لیا تھا۔ تاہم اس دوران میں مندر کا قریباً ایک تہائی حصہ جل کر راکھ ہو گیا تھا اور کہیں کہیں سے یہ راکھ ابھی تک سلگ رہی تھی۔ اس آگ میں اور آگ سے پہلے ہونے والی لڑائی میں تقریباً نو افراد کی جانیں گئی تھیں۔ زخمیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ قریباً ایک سو افراد زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے دس پندرہ افراد کو آگ یا تیل سے جلنے کے زخم آئے تھے۔ ان میں سے کچھ کی حالت تشویشناک تھی۔ مکھیا عبدالرشید بھی آگ میں جھلس کر شدید زخمی ہوا تھا۔ اسے نل پانی لے جانے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مہندر، اس کا دوست پٹیل اور اس کے دو اور ساتھی موقع پر ہی مارے گئے تھے۔

اچھی خبر یہ تھی کہ مالا اور ستیش جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ زوردار ہنگامے کے دوران میں ہی ستیش اپنی فیملی کے ساتھ فتح پور سے نکل گیا تھا۔ اس کے پتا کی لاش ساری رات مندر کے اندر پڑی رہی اور جل کر بری طرح مسخ ہو گئی۔

عمران نے پوچھا۔ ''اب اس کے پتا اور مہندر وغیرہ کی لاشیں کہاں ہیں؟''

''آج صبح علاقے کا بہت سا معزز لوگ فتح پور میں جمع ہوا ہے جی۔ ان میں پنچایت والا بڑا لوگ بھی شامل ہے۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ جب تک گاؤں میں پورا امن نہیں ہو جاتا، وہ لوگ یہاں رہے گا اور نگرانی کرے گا۔ ان لوگوں نے دونوں طرف کا لاشیں بھی ان کے وارثوں کے حوالے کیا ہے۔ شام کے وقت وہ لوگ اپنا اپنا لاشیں لے کر چلا گیا ہے۔ باہر کا جو پندرہ بیس لوگ ابھی تک گاؤں میں موجود ہے، ان سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ صبح تک گاؤں چھوڑ دے۔ ان لوگوں سے ہتھیار وغیرہ لے لیا گیا ہے۔ جب یہ لوگ گاؤں چھوڑے گا تو انہیں ہتھیار واپس دے دیا جائے گا۔''

میں آفتاب خاں کی باتیں سن رہا تھا اور میرے سینے میں عجیب سا دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ جاہلیت اور توہم پرستی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ وہ اندھے عقیدوں کا غلام بن جاتا ہے۔ ان عقیدوں کا نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے، اپنے خیالات پر اس کا یقین پختہ سے پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ انتہا پسندی کی وجہ سے یہ لوگ اپنے ہی دشمن ہونے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے پر شک کرتے ہیں۔ ذرا ذرا سے اختلاف پر ایک دوسرے کو دین دھرم سے خارج قرار دے دیتے ہیں۔ یہاں بھی تو یہی کچھ ہوا تھا۔ انتہا پسندی کی وجہ سے موہن کمار کی قاتلہ

(یعنی سلطانہ) کو بے دردی سے زندہ جلانے کی سزا دی گئی تھی۔ اسی انتہا پسندی نے ایک اور خود ساختہ فیصلہ کیا اور تیرہ سیوکوں کی ہتھیا کرنے کے الزام میں اپنے ہی ساتھی گرو سوبھاش کو موت کے گھاٹ اُتارا اور اس کا سر دیوی کے چرنوں میں رکھا۔ اس سفا کی کا ردِعمل یہ ہوا کہ اب مہندر، پٹیل اور خود رام پرشاد موت کے گھاٹ اُتر چکے تھے اور ابھی یہ سلسلہ رکا نہیں تھا۔ دونوں طرف کے مرنے والے خود کو رتبۂ شہادت پر فائز سمجھ رہے تھے۔ بڑھیا کی دقیانوسیت اپنے پچاس پچپن سالہ صحت مند بیٹے کی جان لے چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی اس خونی حماقت کو بھی ایشور کا کوئی بھید قرار دے رہی ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا جب اندھے وشواس کے ساتھ رام پرشاد اپنے ہاتھ تیل کی کڑاہی میں ڈال رہا تھا۔ ایک جھرجھری سی آ گئی۔

یہ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا تہ خانوں میں زیادہ تر افراد سو چکے تھے، شاید تاؤ افضل جاگ رہا ہو۔ عمران اور اقبال والے کمرے میں بھی خاموشی تھی۔ سلطانہ میرے ساتھ والے بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ زرد نظر آ رہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں کچھ اُبھری ہوئی تھیں۔ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھی مگر اس کے چہرے کی سادگی میں ایک کشش تھی۔ جسمانی موزونیت اور اس کشش نے مل کر اس کی شخصیت کو پُراثر بنا دیا تھا۔ کسی وقت جب وہ ہلکا سا سنگھار کر لیتی تھی تو مزید قابلِ توجہ ہو جاتی تھی۔

مجھے لگا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ثروت مجھ سے دور ہو جا چکی تھی۔ ثروت کے بے پناہ خلا کو پُر کرنے کے لئے سلطانہ میری زندگی میں آئی تھی...... اور اس نے آنے کا حق ادا کیا تھا۔ کچھ باتیں میرے علم میں تھیں اور کچھ نہیں تھیں۔ ہمارے ایک استاد کہا کرتے تھے، محبت اور ناکامی میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ محبت میں ناکامی کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ کچھ لوگ تو سچی محبت ہی اس کو کہتے ہیں جو ناکام ہو۔ مرد جب محبت میں ناکام ہوتا ہے تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ زندگی گزارنا دنیا کا دشوار ترین کام لگنے لگتا ہے۔ ایسے میں ایک ''دوسری عورت'' اس کی زندگی میں آتی ہے۔ یہ دوسری عورت تائیدِ غیبی کی طرح ہوتی ہے۔ یہ مرد کی زندگی کے مسمار کھنڈر میں سے ایک نئی عمارت کے خدوخال ابھارتی ہے۔ خداداد صلاحیتوں، جذبوں اور خوبصورتیوں کی مدد سے مرد کی زندگی کو پھر سے زندگی بناتی ہے۔ پہلی عورت بے شک پہلی ہوتی ہے لیکن یہ دوسری بھی قدرت کی صناعیوں اور عنایتوں کا بے مثل نمونہ ہے۔ یہ دوسری چارہ گر عورت نہ ہوتی تو شاید ناکام محبت کا عفریت اَن گنت بدنصیبوں کو نگل چکا ہوتا۔

یہ بات کہنے کے بعد ہمارے استاد محترم نے کلاس میں بیٹھی ہوئی ایک گم صم لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا تھا...... ہاں اس ''دوسری عورت'' کی طرح ایک دوسرا مرد بھی ہوتا ہے۔ قدرت نے مرد و زن میں سے کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے۔

میں سلطانہ کو دیکھ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ آج میں اس ''دوسری عورت'' کو دیکھ رہا ہوں۔ جب میں نے ثروت کو کھویا تھا تو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، زخم زخم ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے مہلک زخموں کا مداوا کرنے والی وہ دوسری عورت لاہور سے ہزاروں میل دور اتر پردیش کے اس دور دراز راجواڑے کے ایک چھوٹے سے گھر میں موجود ہے اور میری تقدیر مجھے اس کی طرف کھینچ رہی ہے۔

نیند کی حالت میں سلطانہ کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھے تھے۔ یہی وہ ہاتھ تھے جن سے اس نے مجھے کبھی جلتے ہوئے پگوڈا کے اندر سے نکالا تھا۔ میں نے محبت سے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ نرمی سے اس کے بالوں کو چھوا، پھر نگاہوں سے اس کی پیشانی کو الوداعی بوسہ دیا اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ہاں، میں جانے کے لئے تیار تھا۔ میرے اندر کے بے پناہ اضطراب کا علاج اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا کہ میں سارے اندیشوں اور خطروں کو ایک دیوانی ٹھوکر مار کر یہاں سے نکل جاؤں۔ زرگاں کا رخ کروں اور سلطانہ کی عزت کے ہتھیارے سے قرار واقعی انتقام لے لوں۔ میں نے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اس بارے میں بہت سوچ بچار کی تھی۔ ہر چھوٹی بڑی تفصیل پر غور کیا تھا۔ اس وقت میرے کپڑے کی جیکٹ کی جیب میں بھرا ہوا پسٹل موجود تھا۔ پسٹل کے دو فالتو میگزین اور قریباً سو راؤنڈ بھی میرے پاس تھے۔ اس کے علاوہ ایک شکاری چاقو اور ٹارچ بھی تھی۔ تھوڑا سا خشک راشن بھی میں نے لے لیا تھا۔

کل دوپہر جب سلطانہ میری گردن کے زخم کی پٹی کرنے کے بعد اوپر کلثوم اور رادھا کے پاس چلی گئی تھی، میں نے دروازہ اندر سے بند کیا تھا اور طلال کے ساتھ مل کر کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ ایک دراز میں بچھے ہوئے موٹے کپڑے کے نیچے سے مجھے پولی تھین کی وہ چھوٹی سی پڑیا مل گئی جس کا ذکر طلال نے کیا تھا۔ اس پڑیا میں نیلے تھوتھے جیسا کوئی مہلک سفوف موجود تھا۔ طلال اپنی عمر سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ میں نے اسے اعتماد میں لے کر سمجھا دیا تھا کہ میں کہاں جانے اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے اور طلال کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ میرے جانے کے بعد وہ سلطانہ اور عمران وغیرہ کو بتا دے گا کہ میں کہاں گیا ہوں...... اور میری طرف سے سلطانہ کو پوری تسلی بھی دے گا کہ میں تین چار

دن کے اندر اندر یہاں واپس پہنچ جاؤں گا۔

نصف شب کی ان گھڑیوں میں، مَیں نے خود کو ریاست کپل وستو کے راجا سدھارت کی طرح محسوس کیا، جو آدھی رات کو اپنی محبوب بیوی کو سوتا چھوڑ کر گھر سے نکل گیا تھا اور نامعلوم منزلوں کا راہی ہو گیا۔ میں بھی یہاں سے نکل رہا تھا لیکن...... لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں زیادہ دور نہیں جا سکوں گا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرے ساتھ کچھ ایسا ہو گا جو میرے پروگرام میں بالکل شامل نہیں۔

پروگرام یہی تھا کہ میں پہلے کی طرح مندر سے نکلوں گا۔ مجھے سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل کے کمرے میں جانا تھا جہاں کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ امید تھی کہ بارہ سوا بارہ کے قریب آفتاب یہاں آئے گا...... مجھے دروازے پر سے ہی ساتھ لے کر باہر نکل جانا تھا اور اسے پابند کر دینا تھا کہ وہ آج رات واپس مندر میں، عمران وغیرہ کے پاس نہیں آئے گا۔

حسبِ پروگرام میں خاموشی سے لکڑی کی کشادہ سیڑھیاں چڑھ کر سب سے اوپر والے تہ خانے میں پہنچا اور پھر کاٹھ کباڑ والے تاریک کمرے میں چلا گیا۔ آفتاب کی آمد میں اب پندرہ بیس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ آج کہیں ناغہ نہ کر لے۔ میرے کان باہر کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ آوارہ کتوں کی مدھم آوازوں کے علاوہ باہر مکمل خاموشی تھی۔

اچانک ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکایا۔ یہ باہر سے نہیں تاریک کمرے کے اندر سے ہی آئی تھی۔ یہ عمران تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''جگر! چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے۔ یہ تو آدھی رات ہے...... بھئی یہ تو آدھی رات ہے۔''

وہ بلی کی چال چلتا ہوا اتنی صفائی و مہارت سے مجھ تک پہنچا تھا کہ میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ مجھ سے فقط دو تین فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔

''تت...... تم یہاں؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے...... یہ تو آدھی رات ہے......'' اس نے پھر عر پڑھا۔

''میں آفتاب کا انتظار کر رہا تھا۔''

''کس لئے؟''

"بتانا ضروری ہے؟" میں نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

"نہیں...... کیونکہ مجھے کافی حد تک اندازہ ہو گیا ہے۔" اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے میری جیکٹ کے اُبھرے ہوئے حصے کو ٹٹولا۔ یہاں پسٹل کے فالتو راؤنڈ موجود تھے۔ میں بھنا گیا۔ کبھی کبھی وہ حد سے تجاوز کر جاتا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارا؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"مسئلہ تو تمہارا ہے جو اس طرح بغیر کسی کو بتائے آفتاب کے ساتھ باہر نکل جاتے ہو اور میرا اندازہ ہے کہ اس مرتبہ تمہارا ارادہ کہیں آس پاس جانے کا نہیں تھا۔"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے میں جا رہا تھا...... بلکہ میں جا رہا ہوں۔ میں تمہارا ماتحت نہیں ہوں کہ کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے تم سے اجازت لوں۔"

"جگر! یہاں کوئی ماتحت اور باس نہیں ہے لیکن ہمارا نفع نقصان تو ایک ہے نا۔ ہم میں سے کوئی نہیں چاہے گا کہ اس کی وجہ سے کسی دوسرے کا نقصان ہو۔"

"میرے جانے سے بھی کسی کا نقصان نہیں ہوگا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اپنی جان دے دوں گا لیکن تم لوگوں کے بارے میں ایک لفظ...... ہاں، ایک لفظ زبان سے نہیں نکالوں گا۔"

"واہ...... یہ بات تم نے اچھی کہی ہے۔ کیا تمہارے جان دے دینے سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا؟ گدھے! ہم تو جیتے جی مر جائیں گے۔ کم از کم میں تو ضرور وفات پا جاؤں گا۔"

"مسخرہ پن نہ کرو عمران...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے مجھے یہاں سے جانا ہے۔"

"جارج گورا کی طرف؟" اس نے ڈرامائی لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، جارج گورا کی طرف۔" میں نے سینہ تان کر کہا۔

وہ چند لمحے تک میرے پُرتپش، باغی لہجے پر غور کرتا رہا پھر بولا۔ "جارج گورا کی طرف ہم دونوں جائیں گے لیکن اس وقت جب جانا مناسب ہوگا۔"

"مناسب اور نامناسب کا فیصلہ تم مت کرو۔ یہ میرا معاملہ ہے۔ اس معاملہ سے میں ہی نمٹوں گا۔"

"یہاں کسی کا کوئی معاملہ ذاتی نہیں ہے۔" عمران کے لہجے میں پہلی بار ترشی آئی۔ "ہم سب کی قسمت ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ کوئی ایسا قدم نہ اُٹھانا جس سے دوسروں کے لئے مصیبت ہو۔"

"میں نے کہا ہے نا میری وجہ سے تم لوگوں کو......"

"پلیز تابی، پلیز...... سمجھنے کی کوشش کرو...... ہمارا دشمن بہت خطرناک ہے۔ ہماری جلد بازی اسے اور خطرناک بنا سکتی ہے...... ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"انتظار...... انتظار...... میں نہیں کر سکتا اب انتظار۔ وہ مر جائے گی۔ وہ مر رہی ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔"

اسی دوران میں بیرونی دروازے سے باہر آہٹیں سنائی دیں۔ چند لمحے بعد آفتاب اپنے ٹریڈ مارک لالٹین اور لاٹھی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی نہایت سرد ہوا کا جھونکا بھی اندر آیا۔ آفتاب کے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی جس میں راشن وغیرہ تھا۔ ہم دونوں کو تناؤ کی حالت میں وہاں کھڑے دیکھا تو...... حیران رہ گیا۔

میرے اندر عجیب سا اشتعال پیدا ہو چکا تھا۔ دروازہ کھلا تو میں بے جھجک دروازے کی طرف بڑھا۔ عمران نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روکا۔ "کیا کرتے ہو تابی! تم اپنے ہوش میں تو ہو؟"

"ہاں...... اور تم بھی ہوش کرو...... آقا بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، سوچ سمجھ کر رہا ہوں۔"

"تم سوچ سمجھ کر نہیں کر رہے۔ تمہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ ادھر آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں۔" اس نے میرا بازو پکڑا اور اس کے ساتھ ہی آفتاب کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ آفتاب نے دروازے کو کنڈی چڑھا دی۔

"آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہاری آنکھیں کھولوں۔"

عمران نے کہا۔ میرا بازو بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔

"تم جو مرضی کر لو عمران...... لیکن میں آج رکوں گا نہیں۔"

"پہلے میری بات سن لو پھر فیصلہ کرنا۔"

عمران مجھے لے کر بالائی تہ خانے میں آ گیا۔ اس نے آفتاب کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔ ایک کمرے میں آ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ یہاں ایک بڑی لالٹین روشن تھی اور فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ عمران نے مجھے اور آفتاب کو چٹائی پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "تمہیں خطرے کا اتنا احساس نہیں جتنا ہونا چاہئے۔ تمہیں یاد ہے، کل میں آفتاب سے باتیں کر رہا تھا اور تمہیں دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ تم نے پوچھا تھا، کیا باتیں ہو رہی ہیں۔"

"اورتم نے ہمیشہ کی طرح بات کو مذاق میں ٹال دیا تھا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"اس مذاق کی کوئی وجہ تھی۔ اگر میں وجہ بتا دیتا تو شاید تمہارا اب تک وقت بڑی پریشانی میں گزرتا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"چھ سات دن پہلے تم نے اپنی من مانی کی اور باہر چلے گئے۔ ٹھیک ہے کہ اس من مانی کا نتیجہ اچھا نکلا اور تم کلثوم کو تیش اور مہندر وغیرہ سے بچا کر یہاں لے آئے لیکن اس کا ایک نتیجہ برا بھی نکلا ہے۔ بے شک تم تھوڑی دیر کے لئے تہ خانے سے باہر رہے ہو مگر یہ تھوڑی دیر بھی نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ آفتاب خاں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم بتاؤ خاں!"

آفتاب نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ "تابش برادر! منگل کے روز صبح سویرے کچھ لوگ ایک جیپ پر سوار ہو کر یہاں آیا تھا۔ اس وقت گاؤں کا سب لوگ سو رہا تھا۔ ان جیپ والوں نے ام کو بتایا کہ وہ شکاری ہے اور ایک ایسے بندے کو ڈھونڈ رہا ہے جو ان کا دو انگلش رائفلیں اور بہت سا کارتوس لے کر بھاگ گیا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے ایک تصویر دکھایا۔ ام یہ تصویر دیکھ کر ایک دم حیران رہ گیا۔ وہ آپ کا تصویر تھا۔ لگتا تھا کہ آپ جیل میں کھڑا ہے...... شاید زرگاں کے جیل میں۔ آپ نے جیل کے قیدیوں والا وردی بھی پہنا ہوا تھا۔ ام یہ تصویر دیکھ کر حیران تو بہت ہوا لیکن ام نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ام نے کہا کہ کچھ مہمان وغیرہ تو گاؤں میں ضرور آیا ہوا ہے لیکن ام ان سب کو جانتا ہے۔ ان میں یہ بندہ تو نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ام کو آپ کا دو فوٹو اور بھی دکھایا لیکن ام نے ماننے سے صاف انکار کیا۔"

آفتاب نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ "ان لوگوں کے پاس جیپ میں ایک انٹینا قسم کا چیز بھی رکھا تھا۔ وہ اس انٹینا کو لے کر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ مکھیا کے گھر کی طرف بھی گیا پھر مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ اس نے جاتے جاتے ام کو پانچ سوے روپیہ بخشش دیا اور بولا۔ "خان! امارے آنے کے بارے میں تم کسی کو بتائے گا نہیں۔ اس شکل کے بندے کا دھیان رکھنا۔ ام کچھ دن بعد پھر یہاں کا چکر لگائے گا۔ اس کے بعد وہ لوگ چلا گیا۔"

عمران نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تابی! اس رات تم اور ہم سب اس لئے حکم کے لوگوں سے بچے رہے کہ تم سب سے نیچے والے تہ خانے میں تھے۔ اگر تم اوپر

والے تہ خانے میں ہی ہوتے تو ہوسکتا ہے کہ وہ منحوس انٹینا تمہاری چپ کے سگنل پکڑ لیتا...... وہ لوگ دفان نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اس علاقے میں تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب تم کلثوم کی مدد کرنے کے لئے اوپر بستی میں گئے تو ان لوگوں نے تمہارے سگنل پکڑے۔ تمہارے باہر نکلنے کا مطلب پکڑے جانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔"

"یا خدا! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ایک گاڑھا دھواں میرے سینے میں بھرنے لگا۔ مجھے لگا جیسے میں آزاد نہیں ہوں۔ ایک نہایت تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند ہوں۔ اتنی تنگ کوٹھڑی ہے کہ میں سیدھا کھڑا بھی نہیں ہو سکتا اور اب سے نہیں لاتعداد زمانوں سے اس کوٹھڑی میں ہوں۔ بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن بھاگ نہیں سکتا۔

میری فرسٹریشن انتہا کو پہنچ گئی۔ شدید جھنجلاہٹ اور تپش کے زیر اثر میں نے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر زوردار مکا مارا۔ موٹی لکڑی کی یہ تپائی ٹوٹ گئی...... میرے بازو میں ہاتھ سے لے کر کندھے تک درد کی ٹیس اُٹھی لیکن ایسی ٹیسیں مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں کرتی تھیں۔

آفتاب حیرت سے کبھی میری طرف اور کبھی ٹوٹی ہوئی تپائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران بھی کچھ دیر بھونچکا رہا۔ پھر اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ "حوصلہ رکھو تابی! سب ٹھیک ہو جائے گا مگر...... ہمیں طریقے سے چلنا ہوگا۔ سب سے پہلے ہم اس منحوس "چپ" سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی ہم یہاں سے نکلنے اور کچھ کرنے کے قابل ہو سکیں گے...... تم دیکھنا......"

"کچھ نہیں ہوگا...... کچھ نہیں۔" میں نے تیزی سے عمران کی بات کاٹی اور پاؤں پٹختا ہوا نچلے تہ خانے کی طرف چلا گیا۔

میرے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا ابھی جیکٹ سے شکاری چاقو نکالوں اور آئینے کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو جاؤں۔ پھر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی گردن کا پچھلا حصہ چیر ڈالوں اور اس منحوس دھاتی ٹکڑے کو اکھاڑ کر پھینک دوں جس نے کئی برس سے مجھے اس "اسٹیٹ" میں زنجیر کر رکھا ہے۔ میرے اس دیوانے "آپریشن" کا نتیجہ کچھ بھی ہو مگر میں یہ کام کر گزروں۔

میرے ہاتھ سے تھوڑا سا خون رسنے لگا تھا۔ میں نے روئی سے اسے صاف کیا۔ سلطانہ ابھی تک سو رہی تھی۔ نیند کی حالت میں بھی اس کے ملیح چہرے پر وہی کرب تھا جو بیداری میں اسے گھیرے رکھتا تھا۔ اس کرب اور بے قراری کی وجہ وہ بے پناہ زخم تھا جو سلطانہ

کے جسم سے لے کر اس کی روح تک اُترا ہوا تھا۔ مجھے اس زخم کا مرہم تو معلوم ہو گیا تھا مگر مرہم تک رسائی ممکن نظر نہیں آ رہی تھی۔

طلال ابھی جاگ رہا تھا۔ اس نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں اسے لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا اور اسے بتایا کہ میری روانگی ملتوی ہو گئی ہے۔ کم از کم میں آج رات تو نہیں جا رہا۔

"کیوں جی؟"

"بس کوئی وجہ ہے...... تم ابھی اپنی خالہ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔"

"ٹھیک ہے جی۔" اس نے فرماں برداری سے سر ہلایا۔

میں نے طلال سے پوچھا۔ "تمہاری خالہ کو اب تک پڑیا کا پتا تو نہیں چلا؟"

"نہیں جی۔ ابھی تک تو نہیں۔"

"کوئی اور بات کی ہے انہوں نے؟"

"نہیں جی...... لیکن کل دوپہر جب آپ اوپر عمران بھائی اور تاؤ افضل کے ساتھ بیٹھے تھے، وہ نوری سے کچھ بات چیت کر رہی تھیں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"میں نے سنا تو کچھ ناہیں جی...... پر میں نے نوری کو خالہ کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ ایک دم گم صم نجر آ رہی تھی۔"

میرے اور طلال کے درمیان دو چار منٹ مزید بات ہوئی پھر وہ سونے کے لئے چلا گیا۔

میں نے بے حد مایوسی کے عالم میں اپنا پسٹل، ٹارچ اور فالتو راؤنڈز وغیرہ جیکٹ سے نکال کر پھر سے الماری میں رکھ دیئے اور بستر پر لیٹ گیا۔ اندر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد میں پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دفعتاً دھیان نوری کی طرف چلا گیا۔ وہ مجھے بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ سلطانہ سے زبردست جھاڑیں کھانے کے بعد وہ جیسے ایک دم اوجھل ہو گئی تھی۔ آج بند کمرے میں سلطانہ اس سے نہ جانے کیا بات کرتی رہی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں سیڑھیاں چڑھا اور درمیانی تہ خانے میں آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ رات کو دیر سے سوتی ہے اور پھر دن چڑھے تک پڑی رہتی ہے۔ شاید اس کی یہ عادت کھیا کی حویلی میں پختہ ہوئی تھی جہاں وہ سلمان سلو کی رکھیل تھی۔ یقیناً سلمان سلو کے ساتھ ساتھ اسے اس کے یار دوستوں کی میزبانی بھی کرنا پڑتی ہو گی اور ایسی میزبانیاں عموماً

رات کو ہی ہوتی ہیں۔

میں نوری کے کمرے کے پاس سے گزرا تو اندر لالٹین کی مدھم روشنی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی گنگنانے کی نہایت مدھم آواز بھی سنائی دی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ نوری ابھی جاگ رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس میں نوری کے ساتھ پہلے گرو کی پتنی رادھا بھی سوتی تھی لیکن رادھا پکی دھرمی لڑکی تھی۔ ایک مسلمان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا اس کے دھرم کو تلپٹ کرتا تھا اس لئے اسے اوپر والے تہ خانے میں نسبتاً بڑا کمرا دے دیا گیا تھا جہاں پوجا کے لئے بہت سی مورتیاں موجود تھیں۔

میں نے تھوڑی سی کوشش کی اور ایک کھڑکی میں ایک باریک سی جھری ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ میں نے جھری سے آنکھ لگائی۔ کمرے کا ایک تہائی منظر نظر آ سکا اس منظر میں نوری بھی شامل تھی۔ وہ حسبِ معمول گھاگرا چولی میں تھی تاہم سر پر چنری نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ پر مہندی لگائی ہوئی تھی اور دائیں ہاتھ سے اپنے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی لالی لگا رہی تھی۔ اس کے سامنے پرانی طرز کا ایک بیضوی آئینہ تھا۔

لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ان تاثرات میں انتظار، امید، خواہش سب کچھ شامل تھا۔ شاید یہ امید اور خواہش وہی تھی جو ہر لڑکی کے دل میں اس کی عمر کے ساتھ پروان چڑھتی ہے اور پھر ایک روز شدید تمنا کا روپ دھار لیتی ہے...... ایک شوہر، ایک گھر اور پھر ایک ہمکارتے ہوئے بچے کی آمد۔ خوش رنگ شام، کسی کے قدموں کی چاپ کا انتظار...... اور پھر پھولوں بھرے آنگن میں زندگی کی کھٹی میٹھی خوشیاں۔ نوری کوئی کنواری دوشیزہ نہیں تھی۔ اس کے جسم پر نہ جانے کتنے گندے ہاتھوں کے نشان تھے لیکن پھول تو سڑے ہوئے کیچڑ میں بھی اُگتے ہیں۔ آرزوؤں پر کوئی روک نہیں لگائی جا سکتی۔ عمران نے نوری کو ایک اچھی زندگی کی آس دلائی تھی اور شاید وہ اس وقت آئینے میں اسی آس کے نقش دیکھ رہی تھی۔

میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا...... اور پھر اندر چلا گیا۔ نوری نے مجھے گھوم کر دیکھا اور ایک دم ٹھٹک گئی۔ اس نے چنری کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ وہ سامنے کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ وہ اسے لینے کے لئے لپکی۔ مہندی والی تھالی پر اس کا پاؤں پڑا اور بری طرح رپٹ گیا۔ وہ گر گئی۔ "اوئی اللہ جی۔" اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے اسے اُٹھانا چاہا مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بری طرح سمٹی ہوئی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے چنری کھونٹی سے اُتاری اور اپنا سر اور سینہ ڈھانپ لیا۔

وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی تھی۔ ''بابو جی! آپ یہاں کیسے؟'' وہ ہکلائی۔

''یونہی روشنی دیکھ کر آ گیا ہوں۔ پر تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

''کچھ ناہیں جی۔ آپ کی ''وہ'' بڑی سخت ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا تو میرا حشر نشر کر دیویں گی۔ آپ کا تو کچھ ناہیں جاوے گا، پر ان کی مار سے مجھ غریبنی کی ساری چولیں ہل جاویں گی۔'' وہ بار بار سینے پر دوپٹا درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سلطانہ نے اس حوالے سے اسے خاص ہدایات دے رکھی ہیں۔

میں نے کہا۔ ''زیادہ گھبرانے کی بات نہیں۔ وہ اس وقت کمرے میں ہے اور سو رہی ہے۔ اس کے ادھر آنے کا چانس بالکل نہیں۔''

''لیکن...... بب...... بابو جی...... میں...... دراصل...... اس طرح کی لڑکی ناہیں ہوں۔ وہ تو آپ کو پتا لگ ہی گیا ہوگا۔ مجھے عمران بابو نے کہا تھا کہ آپ سے ذرا ہنس کھیل کر بات کروں۔ وہ چاہت تھے کہ آپ میاں بیوی میں ذرا جلدی سے صلح ہو جاوے۔ اس کے علاوہ کوئی بات ناہیں تھی جی۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے سب پتا ہے۔ تمہیں صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہی تھی۔ ''میں تم سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کل دوپہر سلطانہ نے تمہیں کیوں بلایا تھا...... کچھ کہا تھا اس نے؟''

''کوئی خاص بات تو ناہیں تھی جی۔ بس وہی باتیں تھیں جو وہ پہلے بھی دو تین بار کر چکی ہیں...... وہ آپ سے بہت زیادہ پریم کرتی ہیں جی۔ جتنا آپ کو بتاتی ہیں، شاید اس سے بھی کئی گنا زیادہ۔ وہ آپ کے پاس میرا سایہ بھی دیکھنا ناہیں چاہتیں بلکہ شاید کسی لڑکی کا سایہ بھی ناہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انہوں نے مجھے بس چھوڑا ہے، معاف نہیں کیا اور اگر آئندہ مجھ سے اس بارے میں کوئی چھوٹی سی غلطی بھی ہوئی تو وہ ایسا کچھ کر گزریں گی کہ میں سوچ بھی ناہیں سکتی۔ انہوں نے مجھ سے کہلوایا کہ میں آپ کو اپنا بھائی سمجھت ہوں۔ میں نے فوراً کہہ دیا۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ ناہیں ہے جی۔ میں نے بتایا ہے نا، میں نے جو کچھ کیا......''

''ہاں ہاں، مجھے پتا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا عمران کے کہنے پر کیا۔ میں صرف یہی پوچھنے آیا تھا کہ تمہارے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟''

''باتیں تو بس یہی ہوئی تھیں جی...... بس مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے...... کہیں چلے جانا ہے اور وہ سوچ رہی ہیں کہ ان کے جانے کے بعد بھی میں کوئی ایسی ویسی غلطی نہ

کروں...... یا پھر شاید وہ ویسے ہی بہت زیادہ وہمی ہو گئی ہیں۔'' نوری نے اپنے کشادہ گریبان پر پھر آنچل درست کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا کہ اسے کہیں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس جی، یونہی۔ ایویں میرے دل میں بات آ رہی تھی۔ وہ مجھے سمجھا رہی تھیں کہ بندہ، بندوں سے تو چھپ سکت ہے لیکن خدا سے ناہیں چھپ سکت۔ یہ بات کبھی ناہیں سوچنی چاہئے کہ جھوٹ چھپا رہے گا۔ جلدی یا دیر سے اس کا پتا ضرور چل جاوت ہے۔ بس اس طرح کی باتیں کر رہی تھیں۔''

ایک دم سیڑھیوں کی طرف آہٹ ہوئی۔ نوری کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ اس نے آنچل کو مضبوطی سے سینے پر تھاما اور ڈری ڈری آواز میں بولی۔ ''کوئی آ رہا ہے۔''

میں نے دروازے پر پہنچ کر نیچے جھانکا۔ کوئی سیڑھیوں پر تھا مگر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے میں نے سیڑھیوں کی اونچی ریلنگ پر دونوں ہاتھ رکھے اور اپنا جسم آگے کو جھکایا تاکہ نیچے دیکھ سکوں۔ اس کے لئے مجھے گردن کو پورا خم دینا پڑا۔ گردن کے پچھلے حصے میں سر کے نیچے، زخم میں ٹیس سی اُٹھی۔ بہرحال میں دیکھنے میں کامیاب رہا۔ وہ تاؤ افضل تھا۔ ہاتھ میں چوکیداری والی لٹھ لئے وہ ڈگمگاتا ہوا دو تین زینے چڑھا پھر ایک زینے پر بیٹھ گیا۔ میں نے رات کو اسے اکثر اسی زینے پر بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ زینہ اس دروازے کے عین سامنے تھا جہاں اس کی دونوں بیٹیاں کلثوم کے ساتھ سوتی تھیں۔ وہ اس تہ خانے میں بھی ان کا پہرا دیتا تھا۔ اس کا دل شاید یہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹیاں چند لمحوں کے لئے بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوں۔ وہ فتح پور کا نگہبان تھا۔ کالی راتوں میں وہ اپنے گھر کو بھول کر دوسروں کے گھروں کا پہرا دیتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس کے اپنے ہی گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ اس کی بیوی جان سے چلی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا زخم تھا جس نے فتح پور کے اس نگہبان کو نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ اب وہ صرف اپنی جوان بیٹیوں کا نگہبان تھا۔ ان کی طرف سے آنکھ جھپکنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

میں واپس مڑا۔ نوری سے چند منٹ اور گفتگو کی۔ وہ بہت ڈر رہی تھی اس لئے میں نے زیادہ دیر اس کے کمرے میں رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ نوری سے گفتگو کے دوران میں بھی میری گردن سے ٹیسیں اُٹھتی رہیں لیکن میں نے انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی۔ گردن کے اس زخم کا مناسب علاج نہیں ہو سکا تھا اس لئے ذرا سے کھچاؤ کے سبب زخم سے خون رسنا شروع ہو جاتا تھا۔

میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور آئینے میں دیکھ کر خود ہی خون کا رساؤ روکا۔ تازہ پٹی باندھ کر میں بستر پر لیٹ گیا۔ درد میں کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گردن کا سارا پچھلا حصہ اور کندھے وغیرہ سن ہو رہے ہیں...... میں درد برداشت کرنے میں ماہر ہو گیا تھا۔ میں درد کی لہروں میں ڈوب جاتا تھا اور جس طرح دھند کے اندر چلے جانے سے دھند اوجھل ہونے لگتی ہے، میرا درد بھی شدت کھونے لگتا تھا۔ مگر آج معاملہ کچھ مختلف تھا۔ جوں جوں رات بھیگتی گئی، درد کی شدت بڑھتی گئی۔ یہی کیفیت میں نے کچھ دیر کے لئے کل رات بھی محسوس کی تھی مگر آج تو حد ہو رہی تھی۔

میں درد سے لڑتا رہا۔ بارونداجیکی اس حوالے سے مجھے بہت کچھ سونپ گیا تھا اور وہ جو کچھ سونپ گیا تھا، میں اسے بروئے کار لا رہا تھا۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ میں ہولے ہولے کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ لگایا تو وہ پسینے سے تر تھی۔ گردن ہی نہیں پورے جسم میں درد کی شدت سے اینٹھن محسوس ہو رہی تھی۔ بے پناہ درد سے لڑتے لڑتے مجھے محسوس ہونے لگا جیسے درد کے حوالے سے میرا سارا فلسفہ بے کار ہے۔ تکلیف، تکلیف ہی ہوتی ہے...... اسے کب تک اور کس حد تک سہا جا سکتا ہے مگر پھر فوراً ہی اپنے اس خیال کو...... رد بھی کیا۔ رات تین بجے کے قریب میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا...... تاہم میں نے سلطانہ کو جگایا اور نہ کسی دوسرے کو مدد کے لئے پکارا۔ میرے اور درد کے درمیان ایک جنگ جاری تھی اور ہم میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ایک ضد سی میرے اندر پروان چڑھتی جا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بے ہوش ہو جاؤں گا لیکن کسی کو مدد کے لئے نہیں بلاؤں گا۔

اور تب واقعی مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ میرے کندھے اور ریڑھ کی ہڈی سن ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دفعتاً ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا اور مجھے بری طرح چونکا گیا۔ میری گردن کا یہ تازہ زخم اس جگہ کے بالکل قریب تھا جہاں زرگاں کے سرجن اسٹیل نے میرے اندر ''چپ'' پلانٹ کر رکھی تھی۔ کہیں میرا یہ زخم اس ''چپ'' کو تو افیکٹ نہیں کر رہا تھا؟

یہ خیال کسی دہکی ہوئی سلاخ کی طرح میرے سینے میں لگا۔ ڈاکٹر لی وان نے کہا تھا کہ وہ چپ بڑی نازک جگہ پر پلانٹ کی گئی ہے۔ اسے نکالتے ہوئے میرے عصبی نظام کو بھی گزند پہنچ سکتی ہے...... کیا میرے ہاتھ کچھ اسی طرح کا معاملہ تو نہیں ہونے والا تھا؟

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پسینے سے میرے سارے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ کرب کی شدت

سے میری آنکھوں کے سامنے تاریکی سی چھانے لگی۔

''کیا بات ہے مہروج؟'' سلطانہ کی بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ تشویش سمٹ آئی تھی......

درد کی ٹیسیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے سلطانہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کچھ نہیں۔ بس زخم میں تھوڑا سا درد ہے۔'' کوشش کے باوجود میری آواز بھرا گئی۔

سلطانہ چونک کر کھڑی ہو گئی اور سیدھی میری طرف آئی۔ اس کے چہرے کی تشویش کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اب چھوٹی موٹی تکالیف کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ میری غیر معمولی جسمانی قوتِ برداشت کی بھی قائل ہو چکی تھی۔ وہ بہت ذہین تھی۔ سمجھ گئی کہ اگر اتنی برداشت کے باوجود میرے چہرے پر تکلیف کے آثار ہیں اور میں نے درد کی بات کی ہے تو پھر یہ کوئی معمولی درد نہیں ہے۔

وہ پلٹ کر میرے عقب میں آئی۔ اس نے میری گردن پر ہاتھ رکھا۔ اس کا ہاتھ مجھے ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا محسوس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری گردن اور شاید پورا جسم ہی بری طرح تپ رہا ہے۔ اس نے منہ سے چچ چچ کی آواز نکالی اور سراسیمہ لہجے میں بولی۔ ''مہروج! لگتا ہے کہ زخم خراب ہو رہا ہے۔ ساری جگہ سرخ ہو رہی ہے۔ سوجن بھی جیادہ ہو گئی ہے...... میں عمران کو بلا کر لاتی ہوں۔''

میرے روکتے روکتے وہ باہر نکل گئی۔ ذرا دیر بعد عمران اور اقبال بھی میرے کمرے میں تھے۔ میری صورت دیکھتے ہی وہ دونوں سمجھ گئے کہ میں بے پناہ تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ عمران نے بھی میرے زخم کا معائنہ کیا۔ بے شک زخم کی حالت اچھی نہیں تھی لیکن میرا درد زخم کی نوعیت سے زیادہ تھا۔

جلد ہی عمران بھی اس نتیجے پر پہنچ گیا جس پر تھوڑی دیر پہلے میں پہنچا تھا۔ وہ دبے دبے لہجے میں بولا۔ ''یہ معاملہ کچھ اور لگ رہا ہے......''

سلطانہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید وہ وضاحت چاہ رہی تھی لیکن عمران نے وضاحت نہیں کی۔ اس نے ایک طرف جا کر اقبال سے کچھ کہا۔ اقبال کمرے سے باہر گیا اور چند ہومیو پیتھک دوائیں لے کر آیا۔ یہ وہی دوائیں تھیں جو وہ استھان میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے سنتیش اور گروسو بھاش وغیرہ کے سامنے خود کو ہومیو پیتھک ڈاکٹر ظاہر کیا ہوا تھا اور اس طرح گروسو بھاش کی نگاہوں میں اہمیت حاصل کر رکھی تھی۔ حالانکہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا اور

ہومیوپیتھی کے بارے میں بھی معمولی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ ان دواؤں میں ایک دو درد کش ادویات موجود تھیں۔ عمران اور اقبال نے ان دواؤں کے ذریعے میرا درد کم کرنے کی کوشش کی۔ کچھ فرق نہیں پڑا۔ میرا بالائی دھڑ سُن ہوتا جا رہا تھا۔ سلطانہ کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، اگر درد کوئی چھین لینے والی چیز ہوتی تو وہ کسی کو خاطر میں لائے بغیر اور اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے یہ درد مجھ سے چھین لیتی اور کسی صورت واپس نہ کرتی۔

بے پناہ درد اور میری قوتِ برداشت کے درمیان پانی پت کی لڑائی جاری رہی۔ ہم میں سے کوئی بھی ہارا نہیں۔ میں نے اپنی ہر کراہ کو اپنے ہونٹوں کے اندر محصور رکھا پھر قدرت کو مجھ پر ترس آ گیا۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہوش سے بے ہوشی کی سرحد میں داخل ہوتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا ہے اور کپڑے بھیگ چکے ہیں۔ سلطانہ میرے چہرے پر ہاتھ پھیر رہی ہے اور کرب ناک انداز میں کچھ کہہ رہی ہے۔ عمران کی آواز بھی مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

......دوبارہ ہوش آیا تو میں کروٹ لئے بستر پر لیٹا تھا۔ سر بھاری تھا اور ہلکا سا خمار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میری نگاہ سامنے بیٹھے اقبال پر پڑی۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''اب طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میرا دھیان فوراً اپنی گردن کے درد کی طرف گیا۔ درد کی لہریں اب بھی اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی جس کے سبب میں ان لہروں کو زیادہ شدت سے محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تاؤ افضل نے تمہیں افیم کھلانے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ مشورہ کامیاب رہا ہے۔ تم پچھلے آٹھ پہر اطمینان سے سوئے رہے ہو۔'' اقبال نے اطلاع دی۔

میں حیران رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ میں اپنی صورتِ حال سے بے خبر رہا ہوں۔ متلی کی سی کیفیت محسوس ہوئی، اس کے علاوہ مثانے پر بوجھ بھی محسوس ہوا۔

''سلطانہ کدھر ہے؟'' میں نے اقبال سے دریافت کیا۔

اقبال نے انگلی سے دائیں طرف اشارہ کیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا، سلطانہ ایک گوشے میں گدیلے پر کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ نڈھال ہو کر سوئی ہے۔

اقبال نے بتایا۔ ''بھابی، کل رات پچھلے پہر سے مسلسل جاگ رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ ایسے تو آپ خود بیمار ہو جاؤ گی۔ بڑی مشکل سے کہہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے لٹایا ہے۔''

''عمران کہاں ہے؟''

''وہ کہیں گیا ہے۔ کل صبح سویرے نکل گیا تھا۔''

''اب کیا وقت ہوا ہے؟''

''صبح کے چار بجنے والے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ عمران کو نکلے تقریباً چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں...... اس نے بتایا نہیں کہ کدھر جا رہا ہے؟'' میرے لہجے میں تشویش داخل ہو گئی۔

''تمہیں تو پتا ہی ہے، اس سے کچھ پوچھنا کتنا مشکل ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے لئے ہی گیا ہے۔ شاید کوئی ڈاکٹر یا حکیم وغیرہ ڈھونڈنے کے لئے۔''

ہم بہت مدھم آواز میں بات کر رہے تھے لیکن جب بات کرتے کرتے میں کھانسا تو سلطانہ ذرا سا کسمسائی۔ چند لمحے کے لئے لگا کہ وہ جاگ جائے گی مگر پھر کمبل اپنے جسم پر درست کرتے ہوئے دوبارہ بے حرکت ہو گئی۔

میرا گلا خشک ہو رہا تھا اور جسم کی حدت بتا رہی تھی کہ بخار بھی جوں کا توں موجود ہے۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی مگر پانی پینے سے پہلے میں اس پانی کا بوجھ کم کرنا چاہتا تھا جو میرے مثانے میں موجود تھا۔ میں بستر سے اُٹھا تو یوں لگا جیسے گردن کے عقبی حصے پر کسی نے ہتھوڑا رسید کر دیا ہو۔ ایک بار پھر کندھے سن ہونا شروع ہو گئے۔ اقبال نے سہارا دینا چاہا مگر میں جیسے تیسے خود ہی غسل خانے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو درد کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر میں نے اپنی قوتِ برداشت کو آواز دی۔ کتنی ہی دیر تک درد سے لڑتا رہا۔ اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا رہا اور اس کے سامنے جھکنے سے انکار کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے آنکھیں پھر بوجھل ہو گئیں، احساس کند ہونے لگا۔ میں پھر سو گیا یا شاید نیم بے ہوش ہو گیا۔

○......❖......○

دوبارہ آنکھ کھلی تو سلطانہ میرے پاس موجود تھی۔ غالباً اس نے ہولے ہولے آواز دے کر مجھے جگایا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر اپنے کپڑوں پر پڑی۔ یہ کپڑے وہ نہیں تھے جو میں نے پہلے پہن رکھے تھے۔ ''میرے کپڑے کس نے بدلے؟'' میں نے سلطانہ سے پوچھا۔

''میں نے...... آپ کے زخم کو صاف کر کے نئی پٹی کی تھی۔ کپڑوں کو خون وغیرہ لگ گیا تھا۔'' سلطانہ نے سادگی سے جواب دیا۔

زرگاں کے حجام عبدالرحیم نے کچھ عرصے پہلے مجھے سلطانہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ماضی میں جب میں پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں نہیں

تھا، وہ بچوں کی طرح میری دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی۔ میرا منہ ہاتھ دھلاتی تھی، غسل کراتی تھی، میرے کھانے پینے اور سونے جاگنے کا دھیان رکھتی تھی۔ شاید آج اس نے جو کچھ کیا، وہ اس کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

میں اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک وہ بات کی تہ تک پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ اس نے بند کمرے میں میرا پورا لباس تبدیل کیا تھا۔ وہ اکثر بہت سنجیدہ رہتی تھی لیکن جب وہ کسی بات پر شرماتی تھی تو اس کے چہرے پر عجیب سے دلکش رنگ بکھر جاتے تھے۔ ان رنگوں کو چھپانے کے لئے وہ دائیں بائیں ہو جاتی تھی۔ آج بھی اس نے یہی کیا۔ ''میں تمہارے لئے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

اسی دوران میں آفتاب خاں کمرے میں داخل ہوگیا۔ گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ''اب آپ کا حالت پہلے سے کچھ اچھا لگتا ہے۔'' اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کچھ فرق تو ہے۔''

''اصل میں کل شام آپ کی بی بی نے اقبال بھائی کے ساتھ مل کر آپ کا زخم اچھی طرح صاف کیا ہے اور پٹی وغیرہ بھی باندھا ہے۔''

''عمران واپس آیا یا نہیں؟'' میں نے آفتاب سے پوچھا۔

''آ گیا جی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی ساتھ لے کر آیا ہے۔''

''کہاں ہے ڈاکٹر؟''

آفتاب خاں چند سیکنڈ تک چپ رہا پھر سرگوشی میں بولا۔ ''اگر آپ اُٹھ کر آ سکتا ہے تو آئیں...... ام آپ کو دکھاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خو، زیادہ دور نہیں۔ بس عمران بھائی کے کمرے تک۔''

میں اُٹھا اور آفتاب کے ساتھ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر عمران کے کمرے تک پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ آفتاب خاں مجھے ایک جانب سے گھما کر کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف لے گیا۔ اس نے ادھ کھلے پٹ میں سے مجھے اندر کا منظر دکھایا۔ منظر دیکھنے سے پہلے ہی مدھم آوازیں میرے کانوں میں پڑنا شروع ہوگئیں۔ ان میں سے عمران کی آواز کو میں نے بہ آسانی پہچان لیا۔ اندر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر ایک جانے پہچانے

چہرے پر پڑی۔ یہ ڈاکٹر لی وان تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے جاپانی خد و خال صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس نے فر کا کوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے کھچڑی بالوں کا ہم رنگ تھا۔ وہ اپنے دبلے پتلے جسم کے ساتھ کرسی پر تن کر بیٹھا تھا۔ طیش کے سبب اس کی آنکھوں سے شرارے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

''تم علاج کی بات کرتے ہو، میں تم لوگوں کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ تم لوگ مجھے زبردستی لے کر آئے ہو۔ مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کیا ہے تم لوگوں نے۔ میں تمہارے خلاف مقدمہ کروں گا۔ تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔'' وہ غصے کے سبب کرسی سے اچھل پڑ رہا تھا۔

عمران نے انگریزی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں ڈاکٹر! لیکن میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ آپ میری بات سمجھ نہیں پا رہے تھے اور میرے پاس وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ یقین کریں ڈاکٹر......''

''میں تمہاری کوئی بکواس سننا نہیں چاہتا۔'' ڈاکٹر لی وان دھاڑا...... ''تم میری آنکھوں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ...... میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ۔'' ڈاکٹر نے طیش میں سالن سے بھری ہوئی ایک پلیٹ اُٹھا کر عمران کو دے ماری۔ عمران نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ کر خود کو پلیٹ کی زد سے بچایا۔

عمران کے بچ جانے سے ڈاکٹر کے طیش میں مزید اضافہ ہوا۔ اس نے ٹرے میں سے دو تین برتن اُٹھا کر عمران پر کھینچ مارے، آخر میں اسٹیل کی وزنی ٹرے بھی عمران کی طرف روانہ کر دی۔ عمران نے اچھل کود کر یہ سارے وار بچائے۔ عمران پر چیزیں پھینکنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر چلا بھی رہا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ...... مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

عمران کو نشانہ بنانے کی کوششوں میں ناکام ہو کر ڈاکٹر نے دیوار پر سے کالے رنگ کا چھاتا اُتار لیا۔ اس چھاتے کو چھڑی کی طرح پکڑ کر وہ عمران پر پل پڑا...... وہ عمران جیسے برق رفتار کو کیسے نشانہ بنا سکتا تھا...... یہ عمران کی مہربانی تھی کہ اس نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے دو چار چوٹیں ڈاکٹر سے کھا لیں۔ اس سے ڈاکٹر کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ اس مارا ماری میں چھاتا بھی ٹوٹ گیا۔ ڈاکٹر نے پھنکارتے ہوئے چھاتا ایک طرف پھینکا اور پھر نیم جان سا ہو کر بستر پر گر گیا۔ اس کا سینہ بری طرح پھول پچک رہا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ۔'' وہ ایک بار پھر چنگھاڑا اور اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ عمران اور اقبال پر نہ پڑے۔ سرہانے کی طرف ڈاکٹر کا جہازی سائز میڈیکل باکس بھی نظر آ رہا تھا۔

چھاتے کی چوٹیں عمران کے کندھوں پر لگی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کندھوں کو ذرا سا سہلایا پھر اس کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے چند سیکنڈ تک ڈاکٹر کے مزید ردِعمل کا انتظار کیا پھر ہولے سے اس کے پاؤں کی طرف چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر بدستور آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا...... عمران نے ہولے ہولے اس کے پاؤں دبانا شروع کر دیئے۔ غیر متوقع طور پر ڈاکٹر نے کوئی خاص ری ایکشن نہیں دکھایا۔ موقع بہتر جان کر عمران نے اقبال کو بھی آنکھ سے اشارہ کیا۔ اقبال بھی خاموشی سے ڈاکٹر کے سرہانے بیٹھ گیا اور نرمی سے اس کے کندھے دبانے لگا۔

آفتاب نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''عمران بھائی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے لگتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کسی کو گولی مار دے گا یا پھر اپنے آپ کو شوٹ فرما لے گا۔''

تین چار منٹ اسی طرح گزر گئے۔ ڈاکٹر لی وان چارپائی پر چت لیٹا رہا اور عمران اور اقبال خشوع و خضوع سے اس کی مٹھی چاپی کرتے رہے۔ آخر ڈاکٹر لی وان کی بھرائی ہوئی ناراض آواز سنائی دی۔ ''کہاں ہے تمہارا مریض؟''

عمران بولا۔ ''میں آپ کو بتاتا ہوں لیکن پہلے آپ کو مجھے معاف کرنا پڑے گا۔ یہ دیکھیں، میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں اور سچے دل سے معافی مانگتا ہوں۔'' اس نے دونوں ہاتھ ڈاکٹر کے سامنے جوڑ دیئے۔

ڈاکٹر نے منہ پھیر لیا۔ عمران اُٹھ کر گیا اور قریبی دیوار سے ایک اور چھاتا اُتار کر لے آیا اور ڈاکٹر کے پاس رکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ کا غصہ کم نہیں ہوا تو مزید مار لیں لیکن پلیز آخر میں معاف ضرور کر دیں۔''

اس نے اتنی مسکین صورت بنا رکھی تھی کہ ڈاکٹر کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا...... اس نے گہری سانس لی اور اُٹھ کر چارپائی پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ قدرے نرم آواز میں بولا۔ ''اب خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے بتاؤ مریض کہاں ہے؟''

عمران نے بڑے جذباتی انداز میں ''تھینک یو ڈاکٹر'' کہا پھر اسے بتایا کہ مریض یہاں پاس ہی ایک کمرے میں ہے۔

میں اور آفتاب کھڑکی کے سامنے سے ہٹے اور تیزی کے ساتھ واپس کمرے میں پہنچ گئے۔ سلطانہ گرم دودھ لئے میری چارپائی کے قریب کھڑی تھی اور کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔

''کہاں چلے گئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

میں اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ نقل و حرکت کی وجہ سے گردن میں اُٹھنے والی ٹیسیں شدید تر ہو گئی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی چند سیکنڈ میں اس راجواڑے کا قابل ترین ڈاکٹر کمرے میں قدم رکھنے والا ہے۔ میں اس کے لئے نیا مریض نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی نل پانی کے مضافات میں اپنے اسپتال کے اندر میرا تفصیلی معائنہ کر چکا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر چوہان بھی میرے ساتھ تھا۔ میرے معائنے کے بعد ڈاکٹر لی وان نے یہ حتمی رائے دی تھی کہ راجواڑے میں سہولتیں ناکافی ہیں۔ ان ناکافی سہولتوں کے ساتھ میرا آپریشن ایک بہت بڑا رسک ہو گا۔

سوچنے کی بات تھی کہ کیا اب یہاں ڈاکٹر لی وان اپنی رائے تبدیل کر سکے گا جبکہ یہاں اتنی سہولتیں بھی نہیں تھیں جتنی نل پانی کے اسپتال میں تھیں۔

میں نے سلطانہ کو دودھ سمیت کمرے سے باہر بھیج دیا۔ حسبِ توقع چند سیکنڈ بعد عمران اور اقبال ڈاکٹر لی وان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنی تفصیلی روداد میں عمران کے سامنے ڈاکٹر لی وان کا ذکر تو کیا تھا مگر اب یوں لگ رہا تھا کہ عمران اور اقبال اس امر سے بے خبر ہیں کہ یہی وہ ڈاکٹر ہے جس کے پاس چوہان مجھے لے کر گیا تھا۔

مجھے بغور دیکھ کر ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے اپنی عینک درست کی اور ایک بار عمران کی طرف دیکھنے کے بعد دوبارہ مجھ پر نظر جما دی۔ ''تو یہ ہے مریض؟'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا...... اور ڈاکٹر کا میڈیکل باکس تپائی پر رکھ دیا۔

''ہم ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہارا نام تابش ہے نا...... جیکی کی ڈیتھ کے بعد تم ڈاکٹر چوہان کے ساتھ میرے پاس آئے تھے۔''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ٹھیک پہچانا ہے ڈاکٹر۔''

''تمہیں یہاں اتنی دور دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہو رہی ہے۔ بہرحال، یہ باتیں تو بعد میں بھی پوچھی جا سکتی ہیں۔ فی الحال تمہارا فوری مسئلہ کیا ہے؟''

میں نے گردن گھماتے ہوئے کہا۔ ''چند روز پہلے یہاں پیچھے کی طرف مجھے زخم آیا تھا۔ یہ زخم اب بہت تکلیف دینے لگا ہے...... بہت زیادہ۔''

ڈاکٹر نے اپنے میڈیکل باکس میں سے ایک ٹارچ اور دو چار اوزار نکالے۔ اس کے بعد بڑی توجہ سے میرا زخم دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ سیٹی کی سی

آواز نکلی اور وہ میرے زخم پر کچھ اور بھی جھک گیا۔ ''یہ تو بہت سیریس معاملہ ہے۔'' چند سیکنڈ بعد جاپانی ڈاکٹر نے لرزاں آواز میں کہا۔

''اسی لئے تو آپ کو یہاں لائے ہیں۔'' عمران نے گہرے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

ڈاکٹر نے سنسنی خیز نظروں سے پہلے مجھے اور پھر عمران کو دیکھا۔ تب عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟''

''ہم بہت قریبی دوست ہیں۔''

''اپنے قریبی دوست کے بارے میں تم کیا کچھ جانتے ہو؟ خاص طور سے اس کے اس زخم کے بارے میں؟''

''آپ کس حوالے سے پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے اس موقع پر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''عمران! ڈاکٹر لی وان ہی وہ ڈاکٹر ہیں جن کے پاس چوہان مجھے لے کر گیا تھا۔ انہوں نے اپنے اسپتال میں میرے ٹیسٹ لئے تھے اور تفصیلی معائنہ بھی کیا تھا۔ اتفاق ہے کہ آج تم ڈاکٹر لی وان کو ہی میری مدد کے لئے لائے ہو۔''

عمران نے ہونٹ سکیڑے اور ایک بار پھر غور سے لی وان کو دیکھنے لگا۔ یقیناً اسے اور اقبال کو وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جو میں نے انہیں اس ماہر ڈاکٹر کے بارے میں بتائی تھیں۔

آخر عمران نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ہمیں اب ڈاکٹر صاحب کو زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''ہاں، تمہیں زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور نہ ہی مجھے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت پڑے گی۔'' ڈاکٹر کا لہجہ ایک بار پھر ترش ہو گیا۔

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر نے ایک بار پھر ٹارچ روشن کی اور میری گردن کے عقبی حصے کا بغور معائنہ کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ایک لفظ کہے بغیر اپنے اوزار وغیرہ واپس میڈیکل باکس میں رکھ دیئے اور گھمبیر انداز میں بولا۔ ''میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ اس مریض کا جلد سے جلد اسٹیٹ سے باہر جانا ضروری ہے تاکہ الہ آباد یا جھانسی وغیرہ میں اس کا آپریشن ہو سکے۔ اب تم لوگوں نے معاملہ بہت خراب کر لیا ہے۔''

''آپ...... کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ زخم تمہیں کیسے لگا؟'' ڈاکٹر لی وان نے پوچھا۔

''ہم جنگل سے گزر رہے تھے۔ ڈکیتوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان کے ساتھ لڑائی ہوئی جس میں یہ چوٹ لگی۔'' میں نے سچ بتا دیا۔

''یہ چوٹ تمہیں ایسی جگہ لگی ہے جہاں ہرگز ہرگز نہیں لگنی چاہئے تھی۔ تمہارا اندر کا نظام گڑبڑ ہو گیا ہے۔''

''آپ چپ کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر لی وان نے تاسف سے اثبات میں سر ہلایا۔

''چپ کے اردگرد کا ایریا متاثر ہو گیا ہے...... تمہارے کندھے اور کمر کا اوپر والا حصہ تو سن نہیں ہو رہا ہے؟''

''ہاں، ایسا تو اب بھی محسوس ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

ڈاکٹر لی وان کے نہایت تجربہ کار چہرے کی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ وہ عمران اور اقبال کو لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ ان کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں ناقابلِ برداشت درد سے میری طویل جنگ جاری رہی۔ ڈاکٹر کمرے میں واپس نہیں آیا تھا۔ عمران اور اقبال کے چہرے ستے ہوئے تھے۔

میں سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''پریشانی کی بات نہیں۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''یار! یہ رسمی باتیں مت کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ، ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟''

وہ چند لمحے تک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''ڈاکٹر کہتا ہے کہ معاملہ اور بگڑ سکتا ہے۔ فوری آپریشن ضروری ہے...... اور یہ آپریشن یہاں کسی صورت نہیں ہو سکتا۔''

''...... اور اس کے لئے اسٹیٹ سے باہر جانا ہو گا۔'' میں نے عمران کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اب وہ یہ نہیں کہہ رہا۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ زیادہ دیر انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ہم کسی طرح نل پانی پہنچ سکیں تو وہ وہاں اپنے اسپتال میں یہ آپریشن کر دے گا...... لیکن......''

''لیکن کیا؟'' میں نے پوچھا۔

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ کہہ رہا ہے کہ اس میں بھی کچھ نہ کچھ

خطرہ تو ہے۔"

میں جانتا تھا کہ عمران صورتِ حال کی سنگینی کو بہت کم کر کے بیان کر رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر نے پہلے کی طرح اس آپریشن کے سلسلے میں خاصے خدشات کا اظہار کیا ہوگا۔

"پھر کیا خیال ہے؟" میں نے اپنی کراہیں سینے کے اندر ہی گھونٹتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا پڑے گا اور جلد ہی نکالنا پڑے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں تکلیف بہت زیادہ ہے۔"

عمران بہت کم پریشان نظر آتا تھا مگر اس وقت وہ پریشان تھا۔ کچھ یہی کیفیت اقبال کی بھی تھی۔ صورتِ حال واضح تھی۔ اگر ہم اس تین منزلہ تہ خانے سے نکل کر نل پانی پہنچنے کی کوشش کرتے تو زیادہ دور نہ جا سکتے۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ حکم کے لوگ اردگرد موجود ہیں اور پوری جاں فشانی سے چپ کے سگنل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ہم اس تہ خانے کے اندر رہتے تو بھی نتیجہ سامنے تھا...... میری تکلیف ہر گھڑی بڑھتی جا رہی تھی۔

ابھی ہم تینوں کی بات چیت جاری تھی کہ آفتاب خاں اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "عمران بائی! آپ یہ کیا چیز پکڑ لایا ہے۔ آپ اس کو ڈاکٹر کہتا ہے لیکن ام کو تو یہ خود مریض لگتا ہے۔ ایسا چڑ چڑا بندہ تو ام نے پورے انڈیا میں نہیں دیکھا۔"

"ایسے بندے انڈیا میں نہیں جاپان میں ہوتے ہیں لیکن ہوا کیا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"بس ایک دم آگ بگولا ہو رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ ام کو واپس چھوڑ کر آؤ۔ ام ایک منٹ یہاں نہیں آر کے گا۔ ام اس کا دل بہلانے کے لئے چائے لے کر گیا لیکن اس نے چائے کا پیالی ام پر پھینک دیا۔ یہ دیکھیں، سارا کپڑا خراب ہو گیا امارا۔ یہ آپ کا لحاظ ہے کہ ام چپ رہا۔ ورنہ ایسے چڑی جیسے بندے کو تو ایک دم مسل کر رکھ دے۔"

"خبردار! کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنی۔" عمران نے اسے جھاڑا۔ "اس کے چڑی جیسے جسم پر نہ جاؤ...... وہ ایک بہت بڑا ڈاکٹر ہے اور اس وقت ہمیں اس کی بہت سخت ضرورت بھی ہے۔ اس کی ہر بات برداشت کرنی ہوگی۔"

"نن...... نہیں جی...... ام نے اس کے سامنے تو کوئی بات نہیں کہی۔ صرف آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ اب وہ مسلسل آپ کو بلا رہا ہے۔ اب کیا کہوں اس سے؟"

"ٹھیک ہے، میں خود دیکھتا ہوں۔" عمران نے کہا اور اُٹھ کر ڈاکٹر کی طرف چلا گیا۔

دوپہر تک میر حالت مزید بگڑ گئی۔ بخار 104 تک چلا گیا اور کمر کا بالائی حصہ بالکل سُن ہونے لگا۔ سلطانہ مسلسل میرے سرہانے بیٹھی تھی اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں میری پیشانی پر رکھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے وہ گیلا کپڑا میرے پورے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر بھی پھیر دیتی تھی۔ عمران نے ڈاکٹر لی وان کی ہدایت کے مطابق مجھے کچھ پین کلرز دی تھیں، تاہم محسوس ہوتا تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان دواؤں کا اثر ختم ہوتا جا رہا ہے...... اب تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں طویل سفر کے قابل ہی نہیں رہا...... اگر عمران وغیرہ مجھے نل پانی لے جانا چاہیں تو میں جا نہیں پاؤں گا۔ مجھے گاہے بگاہے غشی کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی تھی اور یہ میری تکلیف کے لئے خطرناک علامت تھی۔

سہ پہر کے وقت جب میری طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو عمران اور ڈاکٹر ایک بار پھر میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے دوبارہ میرے زخم کا معائنہ کیا...... تب وہ دونوں بغیر کچھ کہے سنے واپس چلے گئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد اقبال اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر امید کی ہلکی سی کرن تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا...... ڈاکٹر لی وان آپریشن کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہیں پر...... وہ کہتا ہے کہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تیاری کر لیتا ہوں۔ پھر "لوکل انستھیسیا" دے کر آپریٹ کر دوں گا۔ ابھی اس نے تمہارے زخم کو اچھی طرح دیکھا ہے...... اس نے امید دلائی ہے کہ وہ چپ علیحدہ کر لے گا۔"

اقبال میرے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ سلطانہ کو حوصلہ دینے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ وہ اصل صورتِ حال بتا نہیں سکتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ اصل صورتِ حال کہیں زیادہ سنگین ہے۔

ڈاکٹر لی وان تو نل پانی میں بھی آپریشن کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس تہ خانے کے نامناسب ترین حالات میں کیسے تیار ہو گیا؟ اس سوال کا ایک ہی جواب تھا...... اور وہ یہ کہ میری جان خطرے میں تھی۔ تاخیر کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ "کوشش" کے بغیر ہی مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیا جائے۔

عمران اور جیکی جیسے لوگوں کے ساتھ رہنے کے بعد میں بہت بدل چکا تھا۔ میری کم ہمتی ایک خاص قسم کی بے خوفی اور دلیری میں ڈھل چکی تھی۔ مگر زندگی کی خواہش تو انسان بلکہ ہر جاندار کی فطرت میں شامل ہے۔ میں بھی یوں مرنا نہیں چاہتا تھا...... میں ابھی زندہ رہنا چاہتا

تھا۔ ابھی میرے کندھوں پر کچھ ''بوجھ'' تھے۔ اگر میں یہ بوجھ لے کر راہی ملکِ عدم ہو جاتا تو شاید مر کر بھی میری روح بے قرار بھٹکتی رہتی۔

کچھ دیر بعد مجھے کسی قریبی کمرے میں طبی اوزاروں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اسپرٹ اور پائیوڈین وغیرہ کی بُو بھی نتھنوں میں گھسنے لگی۔ غالباً میرے آپریشن کی تیاری ہو رہی تھی۔

کمرے میں، مَیں اور میرا درد تنہا تھے۔ اگر کوئی اور تھا تو وہ سلطانہ تھی۔ وہ مسلسل میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ دیوانوں کی طرح میری تیمارداری میں مصروف تھی۔ کبھی میرا سر تکیے پر رکھتی۔ کبھی آغوش میں لے لیتی۔ کبھی گیلے کپڑے سے میرے چہرے اور ہتھیلیوں کو تر کرنے میں مصروف ہو جاتی۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو...... میں ایک شکوہ اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو مہروج!'' وہ سسک پڑی اور میرا سر آغوش میں دبا لیا۔

میں نے کہا۔ ''پوچھو گی نہیں، کیا شکوہ ہے؟''

''تم کیا کہہ رہے ہو مہروج؟''

''میں تمہاری من مانی کی بات کر رہا ہوں سلطانہ...... میں نے تمہاری منت کی تھی کہ آئندہ مجھے اس طرح کا دکھ نہ دینا جیسا نل پانی میں دیا تھا۔ مجھے بتائے بغیر کوئی ایسا ویسا قدم نہ اُٹھانا...... لیکن تم نے بڑی بے حسی کے ساتھ میری بات رد کی......'' تکلیف اور دکھ کے بوجھ سے میری آواز بھرا گئی۔

''میں نے ایسا نا ہیں کیا مہروج! تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہوئیں گی۔ کیا میں اس جگہ سے باہر کہیں گئی ہوں؟''

''تم نہیں گئیں...... لیکن جانے کا ارادہ تو رکھتی تھیں اور مجھے پتا ہے تم نے چلے جانا تھا۔''

''نا ہیں مہروج! میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تم خود کو خواہ مخواہ کیوں پریشان کر رہے ہو؟'' وہ مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر بولی۔

میں نے درد کی بے پناہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اب تم مجھے دہرا دکھ دے رہی ہو۔ مجھ سے جھوٹ بھی بول رہی ہو۔ تم مجھ سے بہت کچھ چھپا رہی ہو اور یہ دیکھو اس کا ثبوت۔'' میں نے اپنی جیب سے نیلے تھوتھے والی پڑیا نکال کر سلطانہ کو دکھائی۔

اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ وہ بے ساختہ بولی۔ ''یہ...... یہ تمہیں کہاں سے ملی؟''

''جہاں تم نے چھپائی تھی۔''

میں نے طلال کے حوالے سے ساری باتیں اسے بتائیں اور دو تین منٹ کے اندر لاجواب کر دیا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس کی نگاہیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ! میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میں ایسی جگہ کھڑا ہوں جہاں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہو جاؤں۔ کیا آج بھی تم میرا شکوہ دور نہیں کرو گی؟''

ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ناک سرخ ہو گئی۔ وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''ایسی باتیں مت کرو مہروج! میں تمہارے لئے جان بھی دے سکتی ہوں......''

''تو پھر مجھ سے ایک وعدہ کرو۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

وہ سرتاپا لرز گئی۔ اس نے ڈری ڈری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ایک دو لمحوں کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنا ہاتھ میرے سر پر سے کھینچنا چاہتی ہے لیکن پھر اس نے ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا اور نڈھال لہجے میں بولی۔ ''کہو مہروج! کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھ سے وعدہ کرو سلطانہ! میری زندگی میں، تم میری مرضی کے بغیر، میری چار دیواری سے باہر قدم نہیں نکالو گی اور جارج گورا والا معاملہ مکمل طور پر...... مکمل طور پر مجھ پر چھوڑ دو گی۔''

وہ کچھ دیر آنسو بہاتی رہی۔ پھر دل دوز آواز میں بولی۔ ''ٹھیک ہے مہروج! میں وعدہ کرتی ہوں۔''

''اس طرح نہیں سلطانہ! یہ سارے الفاظ دہرا کر وعدہ کرو۔''

وہ کچھ دیر جھجکتی رہی پھر اس نے میرے کہے ہوئے تمام الفاظ دہرا دیئے اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے ذرا جھک کر اپنا سر میرے سینے سے ٹکا دیا۔ اس نے اپنا ''سر'' نہیں جیسے اپنا دکھ میرے سینے پر رکھا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اس انداز سے روئی تھی۔ وہ دل فگار لہجے میں بولی۔ ''وہ شیطان جندہ رہنے کے خابل نا ہیں ہے مہروج! اسے ماف نہ کرنا...... اسے ماف نہ کرنا۔''

......ایک گھنٹے کے اندر اندر میری حالت مزید خراب ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ فالج کس طرح اور کس انداز میں حملہ آور ہوتا ہے مگر لگ یہی رہا تھا کہ میرا بالائی دھڑ مفلوج ہوتا جا رہا ہے۔ اب میں ڈاکٹر لی وان کی ''آپریشن ٹیبل'' پر تھا۔ یہ آپریشن ٹیبل بھی عجیب تھی...... لکڑی کا ایک بوسیدہ تخت تھا جس کے نیچے کچھ اینٹیں رکھ کر آفتاب خاں نے اسے کچھ اونچا کر دیا تھا۔ روشنی بڑھانے کے لئے اقبال نے ان تہ خانوں کی تقریباً ساری لالٹینیں اس کمرے

میں جمع کر دی تھیں۔ اسٹیل کی ایک دیگچی میں ڈاکٹر لی وان کے چند سرجیکل آلات ابل رہے تھے۔ عمران، ڈاکٹر لی وان کے معاون کا کردار ادا کر رہا تھا۔ عمران کی موجودگی سے مجھے ایک عجیب طرح کا حوصلہ مل رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی جسے میں کبھی سمجھ نہیں سکا اور نہ بیان کر سکا...... اور شاید اس طرح کی حوصلہ بخش کیفیت ہر وہ شخص محسوس کرتا جو اس کے اردگرد موجود ہوتا تھا اور اس سے محبت کا تعلق رکھتا تھا......

شروع میں آگ بگولا ہونے کے بعد ڈاکٹر لی وان ایک بار پھر پُر سکون تھا۔ آپریشن پر رضامند ہونے کے بعد اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز کر لی۔ وہ اور عمران آپس میں گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر لی وان نے کہا۔ ''ریڑھ کی ہڈی میں انجکشن دے کر اوپر والے حصے کو سن کیا جا سکتا ہے...... لیکن اس میں تھوڑا بہت خطرہ موجود رہے گا۔ میرے ذہن میں آرہا ہے کہ کیوں نہ انجکشن کے بغیر ہی کام چلایا جائے۔''

''یہ زیادہ تکلیف دہ تو نہیں ہوگا؟'' عمران نے پوچھا۔

''تکلیف تو ہوگی...... لیکن تمہارا یہ دوست اس حوالے سے کافی ہمت دکھا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ برداشت کر لے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ پچھلے تین دن سے یہ بغیر کسی خاص پین کلر کے اتنی تکلیف جھیل رہا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس کی برداشت دیکھ کر مجھے امید ہے کہ یہ بغیر انجکشن کے بھی آپریشن کروا لے گا۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری رائے لی۔

میں نے کہا کہ میں تیار ہوں۔

آپریشن کا عمل شروع ہوا۔ میرے جسم کو زیادہ کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ یہاں زخم تو پہلے سے ہی موجود تھا۔ بس ڈاکٹر نے اپنے میڈیکل کٹر سے اس زخم کو تھوڑا کشادہ اور گہرا کر لیا۔ اصل مسئلہ چپ کی ''سپریشن'' کا تھا۔ جب ڈاکٹر لی وان کے باریک نشتر نے چپ کو چھونا شروع کیا تو میری گردن کے پچھلے حصے اور دونوں کندھوں میں جیسے آگ سی بھر گئی۔ میں درد کے ایک نئے بھنور میں گھر گیا۔

اس نئے درد سے لڑنے کے لئے میں نے اپنے پردۂ تصور پر بار وندا جیکی کی شبیہہ کو نمایاں کیا۔ وہ برداشت کا پیکر...... درد کا خوگر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ اپنے فلسفے کے حوالے سے بڑی وزنی دلیلیں دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا...... جب ہمارے جسم کے کسی سنگین زخم کو مرہم پٹی کے لئے چھیڑا جاتا ہے تو ہم

شدید تکلیف محسوس کرتے ہیں مگر اس تکلیف میں سے پچھتر فیصد تکلیف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم اپنے زخم کو دیکھ رہے ہوتے ہیں یا کم از کم اس کی نوعیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اگر وہی زخم ہماری نظر کے سامنے نہ ہو اور نہ ہی ہمیں اس کی نوعیت کا پتا ہو تو یہ تکلیف صرف پچیس فیصد رہ جائے گی یا شاید اس سے بھی کم۔

میں نے بھی اپنا دھیان اپنے زخم کی طرف سے ہٹا لیا۔ تمام واہمے، خدشات اور اندیشے ذہن سے نکال دیئے۔ ڈاکٹر لی وان ایک ماہر ترین سرجن تھا اور سرجن کا بیشتر کمال اس کے ہاتھوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جیسے ایک مصور یا ہیرا تراش کے ہاتھوں کی معمولی سی لرزش اس کے کام کو تباہ کر سکتی ہے، سرجن کے ہاتھ کی لرزش بھی اس کے مریض کو زیر زمین پہنچا سکتی ہے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کی بے پایاں مہارت ہی تھی کہ وہ لالٹینوں کی روشنی میں بغیر کسی تھیٹر کے یہ نازک آپریشن کرنے پر تیار ہو گیا۔

''او گاڈ...... او مائی گاڈ'' ڈاکٹر نے لرزاں لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ روک لئے۔

''کیا ہوا؟'' عمران نے ٹھٹک کر پوچھا۔

ڈاکٹر لی وان نے چہرے سے ماسک ہٹایا۔ اپنی عینک اُتاری اور ایک جانب رکھی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ماتھا پکڑ لیا تھا۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر؟'' عمران نے پھر پوچھا۔

''یہ بہت خبیث لوگوں کا کام ہے۔ بہت عیار اور...... بے رحم۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہو ڈاکٹر؟''

''ہم یہ نہیں کر سکیں گے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔'' ڈاکٹر لی وان نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں کروٹ لے کر لکڑی کے تختے پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا سردی کے باوجود ڈاکٹر کے ماتھے پر پسینے کی چمک تھی۔

''آپ کچھ وضاحت تو کریں۔'' عمران نے کہا۔

ڈاکٹر کچھ دیر خاموش رہا، جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے میرے سامنے اپنی مشکل بیان کرنی چاہئے یا نہیں۔ پھر اس نے وہی فیصلہ کیا جو آج کل عام معالج کرتے ہیں...... یعنی مریض کو اندھیرے میں نہ رکھنے کا فیصلہ۔

وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اس نے دوبارہ عینک لگائی اور ماسک چڑھایا پھر عمران کے ساتھ میرے عقب میں آن کھڑا ہوا۔ اس نے کسی اوزار کی مدد سے

میرے جسم میں لگی ہوئی چپ کو آہستہ سے چھوا۔ ایک بار پھر پورے جسم میں درد کی لہریں دوڑنے لگیں۔

ڈاکٹر نے نہایت بے بسی سے بتایا۔ ''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اگر ہم نے اس چپ کو اسپائنل کینال کی ہڈی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی تو اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''اگر واقعی ایسا ہے تو یہ بہت خطرناک ہے۔'' عمران نے زیرلب کہا۔

ڈاکٹر اور عمران پھر نشستوں پر جا بیٹھے۔ میں بھی چند تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پورے کمرے میں اسپرٹ اور دیگر ادویات کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ سرجن اسٹیل شیطان صفت بندہ ہے۔ میرے خیال میں تو ایسے شخص کے نام کے ساتھ ڈاکٹر یا سرجن وغیرہ کے الفاظ لگانا ہی گناہ ہے۔ یہ قاتل شخص ہے۔ طب کے شعبے پر ایک بدنما دھبا ہے۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ چپ اسی شخص نے پلانٹ کی ہے۔ اس قسم کا گھناؤنا کام وہی کرسکتا ہے۔''

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' عمران نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اب ہم اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتے کہ زخم کو صاف کریں اور ٹانکے لگا کر بند کردیں۔ باقی خدا پر چھوڑ دیں۔'' ڈاکٹر کے لہجے سے مایوسی اور نقاہت جھلک رہی تھی۔

''لیکن تھوڑی دیر پہلے آپ نے خود ہی کہا تھا کہ فوری آپریشن کے سوا کوئی راستہ نہیں۔'' عمران نے کہا۔

''اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے نکالنا اس قدر خطرناک تھا۔'' ڈاکٹر نے جھلائی ہوئی بلند آواز میں کہا۔

ان مشکل ترین حالات میں بھی عمران کا حوصلہ برقرار تھا۔ اس نے تسلی بخش انداز میں میرا شانہ دبایا اور ڈاکٹر کے پیچھے باہر نکل گیا۔

میں سناٹے میں تھا۔ ڈاکٹر اسٹیل، جارج گورا اور اس کی بہن ماریا وغیرہ کے منحوس چہرے میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ماریا، ڈاکٹر اسٹیل کی بیوی تھی۔ یہ وہی ماریا تھی جس کی انگلی اسحاق نے کاٹی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی بے رحمی و بے حسی میں یکتا تھے۔ آج ڈاکٹر لی وان نے جو انکشاف کیا، وہ دہلا دینے والا تھا۔ اسٹیل نے میرے سر کے پچھلے حصے میں جو چپ ڈال رکھی تھی، وہ پھٹ سکتی تھی اور اس کے پھٹنے سے میرا اسپائنل میرو یعنی حرام مغز ختم ہو سکتا تھا۔ حرام مغز ختم ہونے کا مطلب فوری موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

کسی قریبی کمرے سے بحث وتکرار کی مدھم آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ بحث اور تکرار یقیناً عمران اور ڈاکٹر لی وان کے درمیان ہورہی تھی۔ ڈاکٹر کسی وقت بہت بلند آواز میں بولتا تھا اور اس کے لہجے سے غصہ چھلکا پڑتا تھا۔

پین کلرز کا اثر کم ہورہا تھا۔ درد کی ٹیسیں پھر بلند ہونے لگیں۔ بہت ضبط کے باوجود میں ایک بار پھر ہولے ہولے کراہنے پر مجبور ہوگیا۔ اسی دوران میں ادھ کھلے دروازے سے میری نگاہ سلطانہ پر پڑی۔ اس نے سہمے سہمے انداز میں کمرے میں جھانکا۔ اس کے گداز ہونٹ خشک تھے اور دنیا جہان کے اندیشے اس کی سیاہ آنکھوں میں سمٹے ہوئے تھے۔ اسے دروازے میں کھڑے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ عمران کی آواز آئی۔ وہ سلطانہ کو بلا رہا تھا۔ شاید وہ ڈاکٹر کو قائل کرنے کے لئے سلطانہ کی مدد بھی چاہتا تھا۔

میرے حواس پر ایک بار پھر غشی کی دھند چھانے لگی۔ اردگرد کے مناظر مدھم ہونے لگے، آوازیں جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دینے لگیں۔ نہ جانے کتنا وقت اسی کیفیت میں گزرا۔ شاید پچیس تیس منٹ...... یا شاید ایک ڈیڑھ گھنٹا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ عمران اور ڈاکٹر لی وان ایک بار پھر میرے قریب موجود ہیں۔ وہ دونوں ایک بار پھر میری زخمی گردن پر جھکے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں مجھے ایک دو انجکشن بھی دیئے گئے۔ ان انجکشنز کے بعد میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند قدرے چھٹ گئی اور درد میں بھی عارضی افاقہ محسوس ہونے لگا۔ میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر! جو بھی کرنا ہے جلدی کرو......''

ڈاکٹر نے میرے کندھے پر تھپکی دی مگر کہا کچھ نہیں۔

کچھ دیر بعد میں نے ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل کیمرا دیکھا۔ اس جدید کیمرے سے ڈاکٹر نے میری گردن کے عقبی حصے کی کئی تصویریں اُتاریں۔ یہ کیمرا ان تصویروں کو بیس تیس گنا بڑا کرکے دکھا سکتا تھا۔ ان تصویروں میں، مَیں نے پہلی بار وہ منحوس چپ دیکھی جس نے ایک طویل عرصے سے مجھے پابہ زنجیر کیا ہوا تھا۔ کیمرا اپنی اسکرین پر اس چپ کو کئی گنا بڑا کرکے دکھا رہا تھا اور اس کی سنہری مائل سطح کی ساری جزئیات نظر آرہی تھیں۔

''پلیز ڈاکٹر! آپ رسک لیں۔ اگر میری زندگی ہے تو کچھ نہیں ہوگا اور اگر نہیں ہے تو پھر کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔''

ڈاکٹر ایک بار پھر بڑی باریک بینی سے چپ کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ یہ معائنہ ڈیجیٹل تصویروں کے ذریعے کررہا تھا۔ وہ ماہر ترین سرجن تھا۔ نہ جانے کتنے نازک مرحلوں سے گزر چکا تھا...... اس کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا۔ بالآخر فیصلہ کن مرحلہ آگیا۔

ڈاکٹر لی وان نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک حوصلہ مند شخص ہو مسٹر تابش! میں نے تم سے کچھ بھی چھپایا نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ کرنا پڑ رہا ہے، یہ میرا جاب نہیں ہے۔ میں ایک سرجن ہوں لیکن یہاں مجھے سرجری کے ساتھ ساتھ دوسری کارروائی بھی کرنا پڑ رہی ہے۔ اب یہ سراسر قسمت کا کھیل بن گیا ہے، اس میں کسی طرح کی مہارت یا صلاحیت کو عمل دخل نہیں ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر! آپ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں۔ میں ہر صورت میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ اگر آپ کو کسی طرح کی تحریری اجازت چاہئے تو وہ بھی میری طرف سے عمران آپ کو دے سکتا ہے یا میری بیوی دے سکتی ہے۔''

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے دستانے پہننے میں مصروف ہو گیا۔ کوئی نصف درجن لالٹینیں میرے اردگرد روشن تھیں۔ عمران کے ہاتھ میں ایک بڑی ٹارچ بھی تھی جو اسے بوقتِ ضرورت روشن کرنا تھی۔ اس بند کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ تاہم اس کمرے سے باہر جس طرح کی ہلچل مچی ہوئی تھی، وہ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔ سلطانہ اور میرے سارے ساتھی یقیناً میرے لئے دست بہ دعا تھے اور بڑی بے قراری سے اس انوکھے آپریشن کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس ہنگامی آپریشن کا نتیجہ کیا نکلنا تھا، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

پھر ایک اور اندیشہ میرے ذہن میں سر اٹھانے لگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس چپ کو ہلانے یا نکالنے کے سبب دوبارہ میری یادداشت کے ساتھ کوئی معاملہ ہو جائے۔ میں ایک بار پھر اپنے اردگرد کو فراموش کر کے کسی بے نام تاریکی میں کھو جاؤں۔

'' ڈاکٹر اور عمران میری گردن کے زخم کے ساتھ مصروف ہو گئے، میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے پیاروں کے چہرے تصور میں بسا لئے۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ آخر عمران کی گھمبیر آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''ہمت کریں ڈاکٹر! جو سمجھ میں آتا ہے کر گزریں۔''

یکایک میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ میری پائنتی کی طرف اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا اس کے دستانہ پوش ہاتھوں میں ایک سرجیکل قینچی تھی مگر ابھی تک ڈاکٹر یہ کام کر نہیں سکا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر نظر آیا۔ آنکھیں زرد ہو رہی تھیں۔

''یہ گیمبلنگ ہے۔ یہ میں نہیں کر سکوں گا۔ بہت بڑا رسک ہے یہ۔'' ڈاکٹر عجیب اضطراب کے عالم میں بولا۔

یکایک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کمرے میں ایک اور شخص موجود تھا جو بڑے بڑے رسک لے سکتا تھا۔ وہ قسمت کا دھنی تھا، تقدیر اس کا ساتھ دیتی تھی۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر کا چہرہ تک رہا تھا......

میں نے ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر! میری ایک خواہش ہے...... میں چاہتا ہوں کہ یہ کام، میرا یہ دوست کرے۔''

عمران اور ڈاکٹر نے ایک ساتھ چونک کر مجھے دیکھا۔ ''...... ہاں ڈاکٹر! مجھے یقین ہے...... یہ جو کرے گا میرے لئے بہت اچھا ہو گا۔'' میں نے اپنی بات دہرائی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' عمران نے حیران ہو کر کہا۔

''کیا یہ کوئی بہت مشکل کام ہے؟''

''لیکن......''

''پلیز عمران! تم یہ کام کرو۔ ڈاکٹر صاحب تمہاری مدد کریں گے۔''

ڈاکٹر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔

''کیا تم ایسا کرو گے؟'' ڈاکٹر نے عمران سے پوچھا۔

''ہاں، یہ کرے گا۔'' عمران کے بجائے میں نے جواب دیا۔ ''آپ دستانے، سرجیکل اوزار اس کو دے دیں۔''

میرے لہجے میں چھپے ہوئے یقین کو محسوس کرنے کے بعد عمران کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے لیکن پھر وہ ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''یار! کیوں مروانا ہے مجھے۔ اگر میں ناکام ہو گیا تو......''

''مذاق نہیں عمران! تم یہ کام کرو...... اور جلدی کرو۔''

''بڑی بھاری ذمے داری ڈال رہے ہو۔'' عمران کا لہجہ پھر گھمبیر ہو گیا۔

''کسی نہ کسی کو تو یہ ذمے داری اُٹھانی ہے اور میری خواہش ہے کہ تم اُٹھاؤ۔''

...... کچھ ہی دیر بعد عمران میڈیکل باکس میں سے سرجیکل دستانے نکال کر پہن رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔ عمران اور ڈاکٹر میری پشت پر آن کھڑے ہوئے۔ لالٹینوں کی لو اونچی کر دی گئی۔ بڑی ٹارچ اب ڈاکٹر لی وان کے پاس تھی۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے عمران کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دائیں ہاتھ میں قینچی لے کر عمران میری گردن پر جھک گیا۔ میرے اردگرد ایک اذیت ناک دھند تھی۔ میں نے غنودگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ مشکل نہیں عمران! تم پہلے بھی بہت

دفعہ کر چکے ہو...... دو خانے میں گولی...... چار خانے خالی......'' عمران نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

عمران کا حوصلہ اکثر ''دو...... چار'' کے کھیل میں جیت جاتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ اس مرتبہ بھی جیت جائے گا؟

''اوگاڈ!'' ڈاکٹر لی وان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس آواز میں اطمینان اور خوشی کی لہر تھی۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ میرے عقب میں عمران اور ڈاکٹر بغلگیر ہو گئے ہیں۔ عمران نے جھک کر میرے سر کو بوسہ دیا اور کندھا تھپکا۔ پھر مقامی لہجے کی نقل کرتے ہوئے بولا۔ ''وشواس ناہیں ہووت ہے کہ میں نے اس منحوس چپ کو اپنی جگہ سے ہلا دیا ہے۔ یہ تو چمتکار ہے۔ نیا جیون مبارک۔''

ڈاکٹر لی وان نے ہلکے ہلکے جوش کے ساتھ کہا۔ ''اچھا مسٹر عمران! اب تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ مجھے باقی کا کام کرنے دو۔ اب مجھے چپ کو ٹشوز سے علیحدہ کرنا ہے اور یہ بھی مشکل کام ہے۔''

اگلے دس منٹ تک ڈاکٹر لی وان بڑے انہماک سے اس کام میں مصروف رہا۔ اس کام میں کچھ وقفے شدید درد کے بھی آئے، بالآخر عمران نے اسٹیل کا باؤل آگے کیا اور اس میں ''ٹن'' کی آواز سے چپ گری۔ ''تمہیں مبارک ہو مسٹر تابش! تم اب ایک آزاد شخص ہو۔''

میں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ ابھی مجھے لیٹے رہنا ہے۔ میرے زخم کو ٹھیک سے صاف کر کے اسٹیچز لگائے گئے اور پٹی باندھ دی گئی۔

میں نے واقعی خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میرا دل چاہا کہ ابھی اس تین منزلہ تہ خانے کی گہرائی میں سے نکلوں اور کھلی جگہ پر پہنچ جاؤں۔ پوری آزادی سے سانس لوں اور ہر اندیشے سے بے نیاز ہو کر کھیتوں کھلیانوں میں اور آبی گزرگاہوں کے کناروں پر بھاگوں دوڑوں۔ خوشی سے چلاؤں...... آج میں آزاد ہوں۔ آج مجھے اپنے ہر ارادے کو پورا کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ مجھے لگا کہ اب میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ سلطانہ کے لئے، اپنی کچلی مسلی ہوئی عزتِ نفس کے لئے اور پھر اس اسٹیٹ کی حدوں سے پار نکلنے کے لئے بھی۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسٹیل کے باؤل میں اس چھوٹے سے دھاتی ٹکڑے کو دیکھا جس نے ماضی قریب میں مجھے اَن گنت زخموں سے دوچار کیا تھا۔ سلطانہ، چوہان اور دیگر لوگ مجھے بتاتے تھے کہ میں اس اسٹیٹ سے نکل جانے کے لئے اَن تھک کوششیں کرتا رہا ہوں اور ناکامیاں جھیلتا رہا ہوں۔ بہت دنوں بعد مجھے ثروت کی یاد بھی آئی۔ وہ کہاں تھی؟

کس حال میں تھی؟ عمران کی مبہم باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شاید اس کی شادی ہو چکی ہے لیکن جو کچھ بھی تھا، میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر وہ واقعی آباد ہو چکی تھی اور خوش تھی تو پھر اسے اچھے طریقے سے خیر باد کہنا چاہتا تھا۔

ایک دم میرا دھیان سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ آپریشن سے پہلے وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے اس کی سیاہ آنکھوں میں دنیا جہان کے اندیشے سمٹے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کے خشک ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔ ''وہ بہت پریشان ہو گی۔ اسے بتا دو اور اقبال کو بھی......''

عمران چہکا۔ ''اقبال کا نام تو تم بس یونہی لے رہے ہو۔ اصل میں تو سلطانہ بھابی کو اطلاع دینا چاہ رہے ہو۔ ویسے یہ بیویاں اتنی پریشان ہوتی نہیں جتنی نظر آتی ہیں۔''

''کیوں، تمہارا کوئی ذاتی تجربہ ہے؟'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''کوئی ایک تجربہ ہے...... میں تو اس پر پوری کتاب لکھ سکتا ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے اپنے چینل فساد پلس پر اس حوالے سے پچاس پچاس منٹ کے کوئی دس پروگرام پیش کئے ہیں۔ پروگرام کا عنوان تھا ''بیویوں کے اصل چہرے......'' اس پروگرام کو دیکھ کر بیویاں اتنا سٹپٹائیں کہ انہوں نے چینل کے دفتر پر چڑھائی کر دی۔ پروگرام کے پروڈیوسر صاحب ایک باتھ روم میں سے زندہ پکڑ لئے گئے۔ مظاہرین کا خیال تھا کہ انہیں دفتر کے سامنے گولی مار دی جائے لیکن مظاہرین کی لیڈر آنسہ شاہ زوری نے کہا کہ مار دینا کوئی سزا نہیں۔ آج کل پروڈیوسر صاحب شاہ زوری صاحبہ کے شوہر ہیں......''

''اس چپ کا اب کیا کرنا ہے؟'' ڈاکٹر لی وان نے باؤل میں پڑی خون آلود چپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عمران نے اپنی زبان پھر متحرک کر دی۔ ''دل تو چاہتا ہے کہ یہ چپ کسی نیولے کے جسم میں رکھ دی جائے۔ وہ سارے جنگل میں بھاگتا پھرے اور حکم کے کارندے اس کے پیچھے ہلکان ہوتے رہیں۔ کتنا مزہ آئے کہ جب دو تین مہینے کی بھاگ دوڑ کے بعد نیولا پکڑا جائے تو حکم کے کارندے فرطِ حیرت سے بے ہوش ہو جائیں اور پھر نیا محاورہ وجود میں آئے...... کھودا پہاڑ نکلا نیولا۔''

ڈاکٹر لی وان نے کہا۔ ''واقعی کوئی ایسا کام کیا تو جا سکتا ہے جس سے اس بدمعاش سرجن اسٹیل کو عبرت حاصل ہو۔''

چپ نکلتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میری گردن اور کندھوں میں کبھی درد ہوا

ہی نہیں، جسم کے اس حصے میں فالج کا سا احساس بھی ناپید ہو گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد سب میرے ارد گرد جمع تھے۔ سلطانہ، اقبال، ہوشیار سنگھ، تاؤ افضل اور شکیلہ وغیرہ۔ سب خوش تھے۔ ڈاکٹر لی وان کا خیال تھا کہ ابھی مجھے آرام اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ اس کے کہنے پر عمران نے ایک ایک کر کے سب کو باہر بھیج دیا۔ آخر میں وہ اور سلطانہ رہ گئے۔ سلطانہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ وہ بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب تو ہمارے لئے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اور ایک اور فرشتہ یہاں تمہارے پاس بھی تو کھڑا ہے۔''

وہ حیرت سے عمران کو دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اس نے دوسری مرتبہ میری جان بچائی ہے۔ آج اس نے آپریشن میں ڈاکٹر کی مدد کی ہے۔ اس کی مدد کے بغیر شاید یہ آپریشن مکمل نہ ہوسکتا اور آج سے کچھ سال پہلے بھی اس نے ایسا ہی ایک کام کیا تھا۔ تب میں اپنی جان کا خود دشمن بنا ہوا تھا۔ خودکشی کی حرام موت مرنے کے لئے گندم کی گولیاں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور واپس جینے کے راستے پر کھینچ لایا تھا۔''

عمران بولا۔ ''اب مجھے اوتار ہی نہ بنا دینا۔ یہ نہ ہو کل یہاں کے لوگ میرا مجسمہ بنا کر پوجنا شروع کر دیں...... اور مجسمہ بنانے کے سلسلے میں یہ لوگ بڑے بے صبرے ہیں۔ بعض اوقات زندہ اوتار کو ہی گردن توڑ کر مار دیتے ہیں اور پھر مسالے وغیرہ لگا کر اس کا مجسمہ بنا دیتے ہیں۔'' وہ ہنستا ہوا اور ہمیں خدا حافظ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں خالی خالی نظروں سے دروازے کو دیکھتا رہا۔ سلطانہ بولی۔ ''عمران بھائی بہت اچھے ہیں، پر ان کے بارے میں مجھے جیادہ پتا نا ہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں...... کون ہیں؟ اور آپ دونوں کا ملنا کیسے ہوا؟''

''مجھے ابھی تک خود اس کے بارے میں زیادہ پتا نہیں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔''

''اچھا مہروج! ابھی تم جیادہ باتیں نا ہیں کرو۔ ڈاکٹر جی نے آرام کا کہا ہے...... لیکن یہ گندم کی گولیوں والی کیا بات تھی؟''

''زبردست۔ ایک طرف باتیں نہ کرنے کا کہہ رہی ہو اور دوسری طرف اتنی لمبی چوڑی داستان بھی پوچھ رہی ہو؟''

''کتنی لمبی ہوئیں گی؟'' وہ سادگی سے بولی۔

''جتنی لمبی تمہاری، نیلے تھوتھے کی پڑیا والی داستان ہے۔'' وہ ایک دم خجل سی ہوگئی۔

وہ تھوڑی دیر سر جھکا کر بیٹھی رہی پھر میرے گھٹنے کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ''مجھے ماف کر دینا

مہروج! میں نے تم سے وعدہ کر لیا ہے۔ اب ایسا نا ہیں ہوئیں گا۔ میرے من پر جو کچھ بھی بیتے، پر میں اپنا وعدہ نا ہیں توڑوں گی۔''

''ایک وعدہ میں نے بھی تم سے کیا ہے اور میں بھی وہ نہیں توڑوں گا۔ جب تک جارج گورا سے بدلہ نہیں لے لیتا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔''

وقتِ رخصت ڈاکٹر لی وان کے گلے شکوے کافی حد تک دور ہو چکے تھے۔ عمران نے اس سے دست بستہ معافی مانگ لی تھی اور ڈاکٹر نے اسے معاف بھی کر دیا تھا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوا، اس کے مطابق عمران نے ڈاکٹر تک پہنچنے کے لئے نل پانی کے نواح تک سفر کیا تھا۔ ہوشیار سنگھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں کھیت مزدوروں کے روپ میں نکلے تھے۔ ان کے پاس ایک ایسا چھکڑا تھا جس پر ترپال ڈالی گئی تھی اور ترپال کے نیچے سبزیاں تھیں۔ پُرخطر سفر کے بعد عمران نے ڈاکٹر کو اس کے بیڈروم میں جا پکڑا تھا۔ ڈاکٹر اپنے اصولوں کا پابند تھا۔ کسی صورت اسپتال سے جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مجبوراً عمران کو دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس نے گن پوائنٹ پر ڈاکٹر کو زبردستی چھکڑے میں بٹھایا۔ عمران اور ہوشیار سنگھ ویران لیکن دشوار راستوں پر سفر کرتے ہوئے بصد مشکل یہاں تک پہنچے۔ کم از کم دو مقامات ایسے تھے جہاں ان کی مڈبھیڑ حکم کے کارندوں سے ہوتے ہوتے رہی۔ چھکڑا ہوشیار سنگھ نے ہانکا تھا۔ عمران اور ریوالور سمیت ڈاکٹر لی وان کے ساتھ موجود رہا تھا۔ فتح پور پہنچنے سے کافی پہلے ہی ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

اب یہ سب کچھ ماضی قریب کا حصہ بن چکا تھا۔ میرے آپریشن کو دو روز ہو چکے تھے۔ اس کا کامیاب آپریشن کے بعد ڈاکٹر لی وان اب نل پانی واپس جا رہا تھا۔

ڈاکٹر کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس علاقے میں اور کس مقام پر ہے اور اس نے پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اب پروگرام یہ تھا کہ عمران پہلے کی طرح ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھے گا اور اسے چھکڑے کے ذریعے قریباً پندرہ میل دور ایک ایسی جگہ تک چھوڑ آئے گا جہاں سے اسے آگے جانے کے لئے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی یا پھر وہ معقول معاوضہ دے کر کسی کسان کو اپنے ساتھ سفر کرنے پر تیار کر لے گا۔

عمران نے انگلش میں کہا۔ ''ڈاکٹر! آپ کو ہمارے لئے جو تکلیف اُٹھانا پڑی ہے اس کی کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر بھی ہم سب چاہتے ہیں کہ......''

''نہیں مسٹر آمران! اس سے آگے ایک لفظ نہیں بولنا۔ ورنہ ہمارے درمیان پھر دشمنی شروع ہو جائے گی۔ اگر تم مجھے کچھ دینا چاہتے ہو تو بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ مجھے افسوس

ہے کہ میں اس نیپالی باروندا کے لئے کچھ نہ کر سکا...... مگر خوشی ہے کہ میں یہاں باروندا اور ڈاکٹر چوہان کے اس ساتھی کی مدد کر سکا ہوں۔"

"لیکن ڈاکٹر......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" ڈاکٹر کا لہجہ حتمی تھا۔ "جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔"

عمران نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے ڈاکٹر! لیکن کم از کم اتنے پیسے تو لے لیں کہ آپ کو آگے سفر کرنے میں آسانی ہو اور خدانخواستہ راستے میں کوئی دشواری ہو تو اس کا سامنا کیا جا سکے۔"

اس کے ساتھ ہی عمران نے کرنسی نوٹوں کی ایک گڈی ڈاکٹر لی وان کے سامنے کر دی۔

ڈاکٹر نے اس میں سے صرف چار پانچ نوٹ اُٹھائے اور جیب میں رکھ لئے۔

ڈاکٹر لی وان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مسٹر تابش! کیا تمہارے دوستوں، ڈاکٹر چوہان وغیرہ کو پتا ہے کہ تم کہاں اور کن لوگوں کے ساتھ ہو؟"

"نہیں ڈاکٹر! انہیں ابھی پتا نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میری وجہ سے انہیں بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔ وہ مجھے ڈھونڈتے رہے ہوں گے اور شاید اب بھی ڈھونڈ رہے ہوں گے لیکن اب میں زیادہ دیر انہیں اس پریشانی میں نہیں رکھوں گا۔ بہت جلد ان سے رابطہ کروں گا۔"

"کیا تم ان تک کوئی پیغام پہنچانا چاہتے ہو؟"

"میں یہ تو نہیں چاہتا کہ آپ انہیں براہِ راست کوئی پیغام دیں۔ اس طرح آپ کے لئے مشکل ہو سکتی ہے۔ ہاں، اگر آپ کسی گمنام ذریعے سے انہیں میری خیر خیریت سے آگاہ کر دیں تو اور بات ہے۔"

ڈاکٹر لی وان نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جیکی کی حسین بیوی شگفتلا بیمار ہے اور وہ ایک دن مشورے کے لئے اس کے پاس آئی تھی۔

میں نے ڈاکٹر لی وان کے سامنے وضاحت کی کہ وہ جیکی کی بیوی نہیں۔ ان دونوں کے درمیان محبت کا تعلق تھا اور یہ اتنا قریبی تعلق تھا کہ شگفتلا نے جیکی کی موت کو ایک بیوی ہی کی طرح محسوس کیا۔

روانگی کے وقت عمران نے بڑی معذرت کے ساتھ ڈاکٹر لی وان کی آنکھوں پر پٹی باندھی پھر وہ عمران اور ہوشیار سنگھ کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

O......❖......O

میرے آپریشن کو دس روز گزر چکے تھے۔ اب میں خود کو بالکل صحت مند اور چوکس محسوس

کرتا تھا۔ یہ ایک تاریک رات تھی۔ تاریک اور یخ بستہ۔ میں اور عمران قدیم مندر کے عقبی دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے سرد تازہ ہوا کو اپنے جسم پر محسوس کیا اور ایک ماہ بعد سہ منزلہ تہ خانوں سے نکلا تھا۔ مجھے لگا کہ میں زمانوں بعد کھلی فضا میں پہنچا ہوں۔ میں نے تاروں بھرے آسمان کو دیکھا، درختوں کو دیکھا، فتح پور کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھا اور یہ سب کچھ بالکل نیا لگا...... شاید یہ اس لئے بھی نیا تھا کہ آج میں آزاد تھا۔ اپنی مرضی سے بلاخوف جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ نادیدہ نگاہیں میرا تعاقب نہیں کر سکتی تھیں۔

"یہ دیکھو جگر!" عمران نے دائیں طرف اشارہ کیا۔ مجھے قدیم مندر کا جلا ہوا حصہ نظر آیا۔ کوئلہ شہتیر، جلی ہوئی لکڑیاں اور ملبہ وغیرہ ابھی تک ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس ڈھیر کو دیکھ کر وہ سارے پُر ہنگام منظر میری نگاہوں میں گھوم گئے جو چند ہفتے پہلے ہم نے اس مندر میں دیکھے تھے۔ ان میں سے رام پرشاد کی موت کا منظر سب سے دردناک تھا۔

آفتاب خاں کی ہدایت کے مطابق ہم نے قدیم دروازے پر کھڑے ہو کر اچھی طرح قرب و جوار کا جائزہ لیا پھر شکستہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئے۔ اس طرف آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک بڑا جوہڑ تھا اور اس کے کنارے لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی اور کائی بھی موجود تھی۔ ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک سایہ سا ایک دیوار کی اوٹ سے نکلا اور ہمارے آگے آگے چل دیا۔ یہ آفتاب خاں تھا۔ حسبِ معمول اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی تھی۔ ہمارے اور آفتاب خاں کے درمیان قریباً تیس قدم کا فاصلہ تھا۔

ہم آفتاب کے پیچھے چلتے چلتے دو تین سنسان گلیوں سے گزرے اور خالی احاطے میں داخل ہو گئے۔ اس احاطے کے چاروں طرف چھ سات فٹ اونچی کچی دیواریں تھیں۔ شاید یہ جگہ مویشیوں کو باندھنے کے لئے استعمال ہوتی تھی مگر سردی کی وجہ سے اسے وقتی طور پر ترک کر دیا گیا تھا۔ یہاں ایک ٹوٹے پھوٹے چھپر کے نیچے ایک چھکڑا کھڑا تھا۔ چھکڑے کو ترپال سے اچھی طرح ڈھانپ دیا گیا تھا۔ چھکڑے کے آگے دو تازہ دم گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ عمران نے ترپال اُٹھا کر ٹارچ جلائی اور چھکڑے کے اندر جھانکنے کے بعد مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

عمران نے ابھی تک مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ چھکڑے میں تازہ سبزیاں ہیں اور ہم انہیں زرگاں لے کر جائیں گے۔ اس چھکڑے اور سبزیوں وغیرہ کا سارا انتظام آفتاب خاں نے ہی کیا تھا۔ اس سے پہلے اسی آرام دہ چھکڑے پر عمران، ڈاکٹر لی وان کو یہاں لانے کے لئے تل پانی بھی جا چکا تھا۔

وقتِ رخصت عمران نے آفتاب خاں کو کچھ ضروری ہدایات دیں پھر ہم دونوں آفتاب خاں سے گلے ملے اور چھکڑے میں آ بیٹھے۔ ہم دونوں دیہاتی لباس میں تھے۔ سروں پر بڑے بڑے پگڑ تھے۔ ہم دونوں کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ سخت سردی سے بچنے کے لئے ہم نے چادروں کی بکلیں بھی مار رکھی تھیں۔ مقامی رواج کے مطابق بکل اس طرح ماری جاتی تھی کہ اس میں سر کے علاوہ دو تہائی چہرہ بھی چھپ کر رہ جاتا تھا۔

چھکڑے میں نہایت اعلیٰ قسم کے لیموں اور صحت مند قسم کی سبز مرچیں لدی ہوئی تھیں۔ عمران نے مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے میں لیموں، سبز مرچوں اور لہسن کی بڑی شاندار فصل ہوتی ہے۔ خاص طور سے لیموں اور سبز مرچوں کی فصل منڈی تک پہنچتی ہی نہیں۔ اردگرد کے زمیندار اور کھاتے پیتے لوگ فصل تیار ہونے کے انتظار میں رہتے ہیں اور منہ مانگے داموں خرید لیتے ہیں۔ اس چھکڑے میں ہم قریباً ایک من نہایت اعلیٰ قسم کی سبز مرچ اور قریباً اتنے ہی لیموں لے کر زرگاں جا رہے تھے۔ یہ سوغات مختلف مرحلوں سے گزر کر حکم جی کے راج بھون تک پہنچتی تھی۔

عمران نے گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں۔ آفتاب نے احاطے کا دروازہ کھول دیا۔ ہم اپنے طویل سفر پر روانہ ہو گئے۔

لیموں زبردست خوشبو دے رہے تھے، مرچوں کی بھی اپنی ایک مہک ہوتی ہے۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ”اتنے زیادہ لیموؤں کا حکم کرے گا کیا؟“

”بھئی، اس کے بہت سے استعمال ہیں۔ سنا ہے کہ حکم کی پانچ پتنیاں اور کافی رکھیلیں وغیرہ ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے دو چار کو ہر وقت کھٹائی کی ضرورت پیش آتی رہتی ہو۔“

”بس تمہارا ذہن تو ہر وقت اسی طرح کی باتیں سوچتا ہے؟“

”اور تمہارا ذہن کیا سوچتا ہے اس بارے میں؟“

”میرا تو خیال ہے کہ ان دونوں چیزوں کا اچار بنایا جاتا ہوگا اور بڑے بڑے مرتبانوں میں سنبھال لیا جاتا ہوگا۔“

”جب تم خود اتنے سمجھدار ہو تو خواہ مخواہ اپنے سوال ضائع کیوں کرتے ہو؟ یہ چیزیں واقعی اچار بنانے میں استعمال ہوں گی۔ دنیا کے ہر خطے کی طرح یہاں بھی بہترین چیزوں پر طاقتور لوگوں اور حکمرانوں کا حق ہی ہے۔ ہر اچھی چیز کا رخ ان لوگوں کے گھروں کی طرف رہتا ہے۔ بہترین خوراک، شراب، عورتیں، معالج، ہنرمند سب کچھ ایک ہی سمت میں دوڑتا چلا جاتا ہے۔“

”یہ تو ناانصافی ہے۔“

”ہے تو ناانصافی لیکن قدرت کبھی کبھی حساب برابر بھی کر دیتی ہے۔ کسی وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ بری چیزیں بھی ان لوگوں کے گھروں کی طرف دوڑ پڑتی ہیں۔“

”بری چیزیں؟ کیا مطلب؟“

”یار! ہم کوئی اچھی چیزیں ہیں؟ اور جس ارادے سے ہم تشریف لے جا رہے ہیں وہ بھی خاصا خراب ہے۔ اللہ ہمیں اس خراب ارادے میں کامیاب کرے اور اس خرابی میں اتنا اضافہ کر دے کہ یہاں کے لوگ مدتوں یاد رکھیں۔ بلکہ اگر کسی نے کسی سے کہنا ہو کہ تمہیں عبرت ناک سزا ملے گی تو یہ کہے کہ تمہیں ’جارج ناک‘ سزا ملے گی۔“

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”ہم کب تک پہنچ جائیں گے زرگاں؟“

”اگر حالات ہمارے حق میں رہے اور کالی بلیوں نے رستہ نہ کاٹا تو کل رات کسی وقت۔“

”اگر کالی بلیوں نے راستہ کاٹا تو پھر؟“ کالی بلیوں سے مراد حکم کے ہرکارے تھے۔

”پھر ان سے وہی کچھ کہنا ہے جو طے کیا ہے...... وہی پہلے والے فرضی نام ہیں ہمارے۔ میرا نام امیت اور تمہارا گوپال۔ ہم کھیا عبدالرشید کی طرف سے یہ سامان لے کر زرگاں کے راج بھون جا رہے ہیں۔“

ہم نے اپنا اسلحہ اور ایمونیشن سبزی کے اندر اس طرح چھپایا تھا کہ سخت کوشش کے بعد ہی اسے تلاش کیا جا سکتا تھا لیکن اگر ہم چاہتے تو دو تین سیکنڈ کے اندر ان اشیاء تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔

عمران کے ساتھ نے میرے اندر ایک عجیب سا جوش بھر دیا تھا۔ کل شام جب ہم اس کارروائی کی منصوبہ بندی کر رہے تھے تو عمران نے کہا تھا۔ ”بے شک یہ خطرناک کام ہے لیکن ہمیں اس کے تناؤ اور خطرناکی کو خاطر میں لائے بغیر اسے انجوائے کرنا ہے۔“ اور واقعی آج یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی خطرناک مشن پر نہیں، سیر و تفریح کے لئے جا رہے ہیں۔ عمران گاہے بگاہے کوئی فلمی گانا گنگنانے لگتا تھا یا پھر اپنی کسی فرضی محبوبہ کو یاد کر کے آہیں بھرنے لگتا۔ پیاز کی طرح اس کے اوپر تہ در تہ چھلکے تھے۔ اس کے اندر کیا ہے؟ کچھ خبر نہیں ہوتی تھی۔

میں نے کہا۔ ”بس مجھے ایک ہی فکر ہے عمران! ہماری غیر موجودگی میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے۔ میرا مطلب ہے کہ آفتاب کا تہ خانوں میں آنا جانا کہیں بھانڈا نہ پھوڑ

دے۔"

"لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ میں نے آفتاب کو منع کر دیا ہے۔ وہ ہماری واپسی تک تہ خانوں میں نہیں جائے گا۔"

"تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"بس یونہی۔ جب تم مجھ سے سوال پوچھتے ہو تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ میں خود کو باس باس محسوس کرنے لگتا ہوں۔"

"اور میرا خیال ہے کہ تمہارے دماغ میں کیڑا ہے۔ تم دوسروں کو اُلجھن میں رکھ کر خوشی محسوس کرتے ہو۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ میں دوسروں کو بے خبر رکھ کر انہیں پریشانیوں سے بچاتا ہوں۔ اب یہی دیکھو۔ نالا پار کرنے کے بعد پچھلے ایک گھنٹے تک ہم سخت خطرے میں رہے ہیں لیکن تم مزے سے جماہیاں لیتے رہے ہو اور میرے گانے سنتے رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"نالا پار کرتے ہی "کلرے" کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں کے سرکنڈوں میں بے تحاشا سانپ ہیں۔ ہوشیار سنگھ نے بھی کہا تھا کہ یہ چار پانچ میل کا راستہ ہمارے سفر کا سب سے خطرناک حصہ ہے۔ سانپ گھوڑا گاڑیوں میں گھس آتے ہیں اور سواری کے جانوروں کو ڈس لیتے ہیں۔ اگر میں تمہیں بتا دیتا تو اس کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہونا تھا کہ پچھلا ایک گھنٹا تم بھی سخت ٹینشن میں گزارتے۔"

"لیکن اس سے میرا اعتماد تو گڑبڑ ہوا ہے نا۔ اب آئندہ بھی تم مجھ سے پتا نہیں کیا کیا چھپاؤ گے۔"

"نہیں...... باقی سب کچھ تمہارے علم میں ہے۔ سوائے ایک بات کے۔" اس نے آخری الفاظ عجیب سے لہجے میں کہے۔ اس کے لہجے میں یہ عجب پن بس تین چار سیکنڈ پہلے ہی آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، اس نے بیٹھے بیٹھے جست لگائی اور سبزیوں کے اوپر جا گرا۔ میں نے گھبرا کر ٹارچ جلائی اور یہ دیکھ کر سکتے میں رہ گیا کہ عمران کے ہاتھ میں ایک سانپ کی گردن ہے۔ یہ درمیانے سائز کا سانپ تھا اور اس کے جسم پر گول داغ سے تھے۔

سانپوں کے بارے میں میرا علم زیادہ نہیں تھا۔ بس یہی سنا تھا کہ ایسے سانپ کو "کوڈی والا" سانپ کہا جاتا ہے اور یہ بہت زہریلا ہوتا ہے۔ گردن پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے سانپ کا منہ پورا کھل گیا تھا اور اس کے نکیلے دانت دکھائی دینے لگے...... عمران نے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر سبزیوں کے نیچے سے موٹے کینوس کا وہ چھوٹا بیگ نکالا جس میں ریوالورز کے راؤنڈز رکھے تھے۔ عمران کے اشارے پر میں نے بیگ کو الٹا کر خالی کیا۔ عمران نے بڑی چابک دستی سے سانپ کو بیگ میں ڈال کر اوپر سے زپ کھینچ دی۔

اب ہمیں شک ہو گیا تھا کہ گاڑی میں کوئی اور سانپ بھی نہ ہو۔ ہم نے گاڑی روک دی اور ٹارچ کی مدد سے اچھی طرح تلاشی لی۔ سبزیوں کو بھی الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔

"لگتا ہے کہ یہ اکیلا ہی تھا۔" میں نے کہا۔

"تم اتنے یقین سے ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہ اکیلا تھا۔"

"کیا مطلب...... گاڑی کا ایک ایک انچ تو دیکھ لیا ہے۔"

"تم ایک ایک ملی میٹر بھی دیکھ لو تو یہ نہیں کہہ سکتے۔"

"بھئی، کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"یار! ہو سکتا ہے کہ یہ اکیلا نہ ہو بلکہ اکیلی ہو۔ ہم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نر ہی ہے۔ اس کے لئے تو دن کی روشنی میں تفصیلی معائنے کی ضرورت پڑے گی اور اگر یہ سانپ نہیں سانپنی ہے تو ہو سکتا ہے کہ ہم مردوں سے معائنہ کرانے سے ہی انکار کر دے۔ آخر "ناگنی حقوق" بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔"

"ناگنی حقوق؟"

"بھئی جس طرح انسانی حقوق ہوتے ہیں......"

وہ پٹڑی سے اُتر گیا تھا پھر بولتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چھکڑا بھی چلتا رہا۔ دور جنگل کی گہرائی سے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی رہیں۔

O......❖......O

یہ اگلی رات، گیارہ بارہ بجے کا عمل تھا۔ ایک طویل اور پُرخطر سفر طے کر کے ہم زرگاں کی بھری پُری آبادی میں داخل ہو چکے تھے۔ زرگاں میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں کم از کم تین جگہ روکا گیا تھا اور باقاعدہ سوال جوب کئے گئے تھے۔ چھکڑے میں رکھی سبزیوں کا بھی سرسری معائنہ ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ فتح پور اور اس کے گرد و نواح سے اس طرح کی سوغاتیں اکثر راج بھون کے لئے آتی رہتی ہیں۔ زرگاں کے مسلح محافظوں نے ہمیں زیادہ شک و شبے کا

نشانہ نہیں بنایا۔ بہرحال، اگر ہمارا خیال یہ تھا کہ ہم اسی طرح چھکڑا ہانکتے ہانکتے راج بھون میں داخل ہو جائیں گے تو یہ ہماری غلط فہمی تھی۔ راج بھون سے کچھ فاصلے پر ہی مسلح محافظوں نے ہمیں روک لیا اور چھکڑا ایک طرف لگانے کا حکم دیا...... یہاں پہلے سے کئی چھکڑے، گھوڑا گاڑیاں اور لوڈر وغیرہ کھڑے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر پر وہ سامان خورد ونوش تھا جو راج بھون میں جانا تھا۔ سبزیاں، دودھ، پھل اور اس قسم کی دیگر اشیاء۔ ہم نے دیکھا کہ ایک گھوڑا گاڑی میں شراب کی بہت سی بوتلیں لدی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ خوبرو طوائفیں اور ان کے سازندے وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب لوگ منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ راج بھون میں جانا چاہتے ہیں مگر انہیں اس کی اجازت نہیں مل سکی۔ راج بھون کی شاندار عمارتیں ایک اونچی فصیل نما دیوار کے اندر محفوظ تھیں۔ میں یہ دیوار پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن اب یہ پہلے سے زیادہ اونچی نظر آ رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے زرگاں میں ہونے والے پے در پے خونی واقعات کے بعد ہی اس دیوار کو مزید بلند کیا گیا ہے۔ اس طرح کے اضافی حفاظتی انتظامات ہر جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ بھی تھی کہ سامان خورد ونوش والی گاڑیاں اب براہِ راست راج بھون کی حدود میں نہیں جا سکتی تھیں۔ یہ سارا سامان اب یہاں سے خاص شاہی گھوڑا گاڑیوں میں منتقل کیا جا رہا تھا اور ان گاڑیوں کو راج بھون کے باوردی کوچبان چلا رہے تھے۔

راج بھون کی قریباً ایک درجن عمارتوں میں وہ عمارت بھی شامل تھی جہاں جارج گورا آج کل رہتا تھا۔ اس سے پہلے جارج گورا، راج بھون کی حدود سے باہر رہائش پذیر تھا مگر جب سے سلطانہ والا واقعہ ہوا تھا اور بپھرے ہوئے لوگوں نے اس کی رہائش گاہ پر دیوانہ وار چڑھائی کی تھی، وہ اپنی رہائش راج بھون کی حدود کے اندر لے آیا تھا۔ وہ آہنی رکاوٹوں، بلند دیواروں اور مسلح محافظوں کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ ہمیں یہ سارے گھیرے توڑ کر اس تک پہنچنا تھا۔ مارنا تھا یا مر جانا تھا۔

''تم نے ایک خاص چیز نوٹ کی؟'' عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ہم دونوں اپنے چھکڑے کے قریب ہی کھڑے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ بولا۔ ''راج بھون میں ضرورت سے زیادہ روشنی نظر آ رہی ہے۔''

''اور میرے خیال میں آتش بازی بھی ہو رہی ہے...... وہ دیکھو ایک اور ہوائی گئی۔'' میں نے انگلی سے اشارہ کیا۔

''اس کا مطلب ہے، کوئی جشن وغیرہ ہے۔''

عمران نے قریب کھڑے ایک گاڑی بان سے پوچھا تو اس نے مقامی لب و لہجے میں بتایا۔ ''آج بڑا شبھ دن ہے۔ بھگوان نے ہمیں خوشی دکھائی ہے۔ حکم جی کے ہاں بیٹے نے جنم لیا ہے......''

دو اور گاڑی بان بھی وہاں آ گئے اور اس پُرمسرت موقع کے حوالے سے باتیں کرنے لگے۔ عمران نے مجھے ٹھوکا دیا اور ہم اپنے چھکڑے میں چلے آئے۔ سب سے پہلے ہم نے سبزیوں کے نیچے سے اپنا اسلحہ نکالا۔ یہ دو ریوالوروں اور دو عدد شکاری چاقوؤں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ گولیاں وغیرہ تھیں۔ یہ سب کچھ ہم نے موٹے پولیتھین میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا تاکہ بارش یا پانی وغیرہ سے محفوظ رہے۔ ایک ریوالور، ایک چاقو اور تھوڑا سا ایمونیشن میں نے اپنے لباس میں رکھ لیا اور اوپر سے گرم چادر کی بکل مار لی۔ باقی اشیاء عمران نے سنبھال لیں۔ ان میں وہ کینوس بیگ بھی تھا جس میں ایک آوارہ سانپ استراحت فرما رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''اس چھکڑے کے ساتھ راج بھون میں گھسنے کی امید تو ختم ہو گئی ہے۔ اب دوسرے آپشن پر عمل کرنا ہو گا۔ دوسرا آپشن پتا ہے نا؟''

''اتنا ہی پتا ہے جتنا تم نے بتایا تھا۔ راج بھون کی شمالی دیوار کی طرف ایک جھیل ہے جس میں سے گزر کر دیوار تک پہنچا جا سکتا ہے۔''

''بندے کو جتنا تھوڑا پتا ہوتا ہے، وہ اتنا ہی سکون میں رہتا ہے۔ اب اگر میں تمہیں یہ بتا دیتا کہ جھیل کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہے اور اس میں سے گزرتے ہوئے ہمیں دیوار پر سے دیکھا جا سکتا ہے اور ہم پر چاند ماری ہو سکتی ہے...... اور جھیل پار کرنے کے بعد ہمیں بغیر کسی سیڑھی کے قریباً پینتیس فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا ہو گا تو یقیناً تمہاری صحت پر بہت بُرے اثرات پڑتے۔''

''میری صحت کا اتنا خیال رکھنے کا بہت شکریہ...... ٹھنڈے پانی اور چاند ماری کی زیادہ فکر نہیں۔ جو کچھ ہو گا، دونوں کے ساتھ ہو گا لیکن یہ جو دیوار کی بات کر رہے ہو، اس کا کیا کریں گے......؟''

''یہ بڑا اوریجنل سوال ہے اور اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تم بالغ ہو گئے ہو۔ اب تم وہ ساری فلمیں دیکھ سکتے ہو...... جو پہلے بھی دیکھ لیتے تھے...... اور جن میں قابلِ اعتراض بات صرف یہی ہوتی تھی کہ ان میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں

تمہارے اس اوریجنل سوال کا جواب دیتے ہوئے بہت مسرت محسوس کر رہا ہوں۔"

"فرماؤ......کیا جواب ہے؟"

"اوئے گھامڑ! تمہارے ساتھ سرکس کی دنیا کا نمبرون جمناسٹر موجود ہے...... یہ دیوار پینتیس فٹ کے بجائے پینتیس میٹر بلند بھی ہوتی تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میری معلومات کے مطابق یہاں ہمارے لئے ایک بونس سہولت بھی موجود ہے۔ ایک رسّی اس دیوار پر چڑھنے کے لئے پہلے سے لٹک رہی ہے اور امید ہے کہ وہ اب تک لٹک رہی ہو گی۔"

"کس نے لٹکائی ہے؟"

"جادو برحق ہے یار۔" اس نے بات کو گول کیا اور مجھے لیتا ہوا چھکڑے سے باہر آ گیا۔

راج بھون کے اردگرد رات میں بھی دن کا سماں تھا۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ کھا پی رہے تھے اور ہلا گلا کر رہے تھے۔ کہیں سے طربیہ ساز بجنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے راج بھون کے اردگرد بھی آتش بازی شروع ہو گئی۔ ہم راج بھون کی بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ ایک طویل چکر کاٹ کر شمال کی جانب آ گئے۔ یہاں نسبتاً سکون تھا۔ روشنیاں بھی بس کہیں کہیں دکھائی دیتی تھیں۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، خاموشی مزید گہری ہوتی گئی۔ یہاں دور تک برفیلی جھیل کا پانی چمک رہا تھا۔ قریباً دو سو میٹر چوڑی جھیل کے آخری سرے پر راج بھون کی بلند فصیل تھی اور فصیل کے اندر چراغاں اور آتش بازی کی روشنی تھی۔ فصیل نما دیوار کے اوپر بھی کہیں کہیں مشعلیں اور قندیلیں روشن نظر آتی تھیں۔ ہم دونوں نے خود کو زمانۂ قدیم کے جنگجوؤں کی طرح محسوس کیا جو دشمن کے کسی اہم قلعے پر شب خون مارنے کے لئے جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک پُرخطر تاریکی میں اُترے تھے۔

ہمارے ہتھیار موٹے پولیتھین میں لپٹے تھے اور بالکل محفوظ تھے۔ ہم نے میچ کا آغاز کرنے والے پُرجوش کھلاڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور یخ بستہ پانی میں اُتر گئے۔ اس پانی کو صرف یخ بستہ کہنا کافی نہیں تھا۔ یہ سیال برف تھی جو ہمارے جسم سے ٹکرائی اور اپنی ٹھنڈک کو ہماری ہڈیوں تک لے گئی۔ پانی ہماری کمر تک پہنچ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سینے تک چلا گیا پھر ہم تیرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ جہاں جھیل ختم ہو گی اور دیوار شروع ہو گی، وہاں اِکا دُکا محافظ موجود ہوں گے۔ ہماری خواہش یہی تھی کہ پانی کی گہرائی جلد از جلد کم ہو جائے تاکہ ہم تیرنے کے بجائے چل سکیں۔ تیرنے سے شور پیدا

ہوتا تھا اور یہ ہمارے لئے خطرناک تھا۔

جلد ہی ہماری پریشانی اطمینان میں بدل گئی۔ ہمارے پاؤں پھر سے زمین سے لگنا شروع ہو گئے۔ اب پانی پر ہاتھ پاؤں چلنے کی آواز معدوم ہو گئی اور ہم خاموشی سے آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے صرف سر ہی پانی سے باہر تھے۔ اب ہمیں فصیل کے اندر کا بلند و بالا شور بھی ایک بھنبھناہٹ کی صورت سنائی دینے لگا تھا۔ گاہے بگاہے تاریک آسمان پر آتش بازی کے رنگ بکھرتے تھے اور ان کا مدھم عکس جھیل کے پانی پر جھلک دکھاتا تھا۔

ابھی ہم پانی کے اندر ہی تھے کہ ہمیں دیوار نما فصیل کے پاس پہرے داروں کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ ایک کیبن نما جگہ پر ہلکی سی روشنی دکھائی دی اور قہقہوں کی آواز آئی۔ کیبن زیادہ بڑا نہیں تھا، اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں تین چار افراد موجود ہوں گے۔ عمران اور میں انتہائی خاموشی کے ساتھ پانی سے باہر نکلے اور یخ بستہ ریت پر اوندھے لیٹ گئے۔ تیز ہوا ہمارے تربتر کپڑوں سے ٹکرائی اور یوں لگا کہ جھیل سے باہر کی سردی جھیل کی سردی سے زیادہ ہے۔ عمران نے کمال مہارت کے ساتھ لکڑی کے کیبن کی طرف رینگنا شروع کیا۔ میں نے بھی جیسے تیسے اس کی تقلید کی۔ ہم ہر طرح کے خطرے اور مار دھاڑ کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ ہم کیبن کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے جب اچانک لکڑی کا دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ ایک ہٹا کٹا پہرے دار جو واضح طور پر نشے میں تھا، کندھے سے رائفل لٹکائے باہر نکلا۔ ہمیں دیکھے بغیر وہ ہم سے صرف دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور ایک پتھر کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنے لگا۔ اس کی حاجت ابھی آخری مراحل میں تھی کہ عمران کسی عفریت کی طرح اس پر جا پڑا۔ یہ ایک پرفیکٹ حملہ تھا۔ ہٹا کٹا پہرے دار ہلکی سی آواز بھی نہیں نکال سکا۔ فقط اس کے گرنے سے مدھم آواز پیدا ہوئی...... عمران نے اس کا سر اتنی شدت کے ساتھ پتھر سے ٹکرایا کہ اس نے ایک لمحے میں ہاتھ پاؤں پھینک دیئے۔ عمران نے پھرتی سے اس کی رائفل کندھے سے اُتار لی۔

ہٹے کٹے پہرے دار کے گرنے سے جو مدھم آواز پیدا ہوئی تھی، اس نے کیبن تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ "کانتے! یہ کیا آواج ہے بھائی؟"

عمران نے تیزی کے ساتھ بے ہوش پہرے دار کو گھسیٹ کر پتھر کی اوٹ میں کیا۔ اسی دوران میں کیبن کا دروازہ پھر چرچرایا۔ دوسرا پہرے دار باہر نکلا۔ اس نے ہاتھ میں بوتل پکڑ رکھی تھی۔ اس نے کھوجی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور ایک بار پھر اپنے ساتھی کانتے کو آواز دی۔

میں تاریکی میں، مَیں کیبن کی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور اس سے فقط چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا۔ میں نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ میرا ریوالور والا بازو اس کی گردن سے لپٹ گیا اور خالی ہاتھ سے میں نے اس کا منہ ڈھانپ لیا۔ اس کی خاردار مونچھیں میری ہتھیلی پر چبھیں۔ اس کے منہ سے الکحل کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ بارونداجیکی نے مجھے انسانی گردن کے ان نازک حصوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا جن پر خاص انداز میں دباؤ ڈالنے سے انسان ہوش وحواس سے بیگانہ ہوسکتا ہے۔ میں نے اس تربیت کو آزمانے کی کوشش کی لیکن صرف جزوی کامیابی حاصل ہوسکی۔ میرے شکار کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور نرم ریت پر گری۔ میں نے تب تک اس کی گردن پوری طاقت سے دبائے رکھی جب تک وہ میرے ہاتھوں میں چھپکلی کی طرح جھول نہیں گیا۔ میں نے اسے آرام سے ریت پر لٹا دیا۔ عمران نے ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھا اور دونوں انگوٹھے اوپر اُٹھا کر ''ویلڈن'' کا اشارہ دیا۔

اندر فقط ایک اور پہرے دار موجود تھا مگر اس کے خلاف کسی طرح کی کارروائی کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ شراب کے نشے میں اتنا ٹن تھا کہ بس نیم مردہ ہی نظر آتا تھا...... ایک آہنی انگیٹھی کے قریب وہ بے سدھ پڑا تھا۔

عمران نے اس باوردی پہرے دار کو ہلکی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ حکم کے گھر بِلا پیدا ہونے کی خوشی میں یہ فوت ہو چکا ہے یا صبح تک ہو جائے گا۔''

کیبن میں سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے اور یہاں وہاں تاش کے پتے پڑے تھے۔ کیبن کی کھونٹیوں پر پہرے داروں کی تین چار وردیاں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں مزید افراد بھی متعین ہیں لیکن فی الحال وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ گشت پر ہوں یا پھر راج بھون کے جشن طرب میں شریک ہونے کے لئے فصیل کے اندر چلے گئے ہوں۔

ہمارے کپڑے بُری طرح بھیگ چکے تھے۔ سرد ہوا کے سبب عمران جیسا شخص بھی کپکپانے پر مجبور ہو رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اس سردی کو خوش دلی سے برداشت کر رہا ہوں۔

میں نے کیبن کی کھڑکی میں سے باہر نظر دوڑائی۔ دور جھیل کے کنارے پر ایک روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ یقیناً یہ بھی کوئی ایسا ہی کیبن تھا۔ بہرحال، وہ ہم سے خاصی دوری پر واقع تھا۔ میں نے دیکھا کہ عمران وردیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ پھر ایک وردی میری طرف

بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے جسم پر فٹ آئے گی۔''

''اور تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بھی کوئی ڈھونڈ لیتا ہوں یار۔'' اس نے کہا۔

کیبن میں نظر دوڑانے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پتھر کے قریب بے ہوش پڑے شخص کے جسم سے وردی اُتار رہا ہے۔

صرف چار پانچ منٹ بعد وہ نئے روپ میں میرے سامنے آ گیا۔ اب وہ وردی اور سرخ پگڑی کے ساتھ حکم کا ایک چوکس محافظ نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی عمران کی تقلید کی اور باہر تاریکی میں جا کر کپڑے تبدیل کر آیا۔ ایک ایک رائفل بھی ہم نے اپنے کندھوں سے لٹکا لی۔

یہ بات ہمیں بڑی اچھی طرح معلوم تھی کہ اس جانب سے راج بھون کی فصیل میں سے گزرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس حوالے سے عمران نے بس ہلکا سا اشارہ دیا تھا کہ کوئی رسّی یہاں لٹک رہی ہے جس کے ذریعے بتیس پینتیس فٹ اونچی دیوار پر چڑھا جا سکتا ہے۔ ہم کیبن سے نکلے اور فصیل نما دیوار کے ساتھ ساتھ رسّی کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ ہمیں زیادہ آگے نہیں جانا پڑا...... ہمیں وہ رسّی نظر آ گئی۔

O......❖......O

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں